قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہذا جن صفحات پر آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

جلد 26 ❖ شمارہ 07 ❖ اگست 2016ء

ماہنامہ کرن کراچی

مدیرہ اعلیٰ : عذرا رسول

شعبہ اشتہارات

منیجر اشتہارات	محمد شہزاد خان	0333-2256789
نمائندہ کراچی	محمد رمضان خان	0333-2168391
	رانا محمد حمید	0323-2895528
نمائندہ لاہور	افراز علی نازش	0300-4214400

قیمت فی پرچہ 60 روپے ❖ زرِ سالانہ 800 روپے

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول

مقام اشاعت: C-63، فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ، کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن

مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس، ہاکی اسٹیڈیم کراچی

خط کتابت کا پتا ● پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

Phone :35804200 Fax :35802551
E-mail: jdpgroup@hotmail.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قارئین کرام!
السلام علیکم!

آج بھی ایک کہانی سن لیں۔ یہ ڈائری ہے ایک ایسی لڑکی کی جو پیدا ہی نہیں ہوئی۔ کہانی کچھ یوں ہے:

”15 جون: آج میں نے تخلیق کی پہلی سیڑھی طے کرلی۔

17 جون: آج میں نے نمو پالی۔

30 جون: آج ممی نے ڈیڈی کو بتایا کہ وہ باپ بننے والے ہیں۔ ممی اور ڈیڈی بہت خوش ہیں۔

15 ستمبر: آج میں نے اپنے دل کی دھڑکن محسوس کی ہے۔

30 اکتوبر: واہ میرے ہاتھ پیر بھی ہیں اور سر بھی۔

14 نومبر: میں نے الٹرا ریز محسوس کیا... واؤ میں لڑکی ہوں۔

15 نومبر: آہ، میں مرچکی ہوں۔ میری ممی اور ڈیڈی نے مجھے قتل کر دیا، اس لیے کہ میں لڑکی ہوں۔ یہ کیسا انصاف ہے؟ لوگ ماں سے پیار کرتے ہیں۔ محبوبہ اور بیوی سے پیار کرتے ہیں لیکن بیٹی کی تمنا سے دور بھاگتے ہیں۔ اچھا ہوا میں اس دنیا میں نہیں آئی۔“

یہ کہانی کس طرح کہی گئی، اس سے بحث نہیں ہے۔ مجھے یہ پیغام بہت پسند آیا ہے۔ ہمارے نبیؐ تو اپنی بیٹی سے پیار کریں اور ہم؟ بیٹی کی پیدائش کا سنتے ہی منہ بنا لیتے ہیں۔ کس منہ سے ہم حب نبیؐ کا دعویٰ کرتے ہیں؟ بیٹی تو رحمت ہوتی ہے۔ بیٹی پر منور رانا کے دو شعر:

گھر میں رہتے ہوئے غیروں کی طرح ہوتی ہیں
بیٹیاں دھان کے پتوں کی طرح ہوتی ہیں
اڑ کے اک روز بہت دور چلی جاتی ہیں
گھر کی شاخوں پہ یہ چڑیوں کی طرح ہوتی ہیں

معراج رسول

محققِ اردو

صوبہ بنگالہ کا مغربی حصہ کاٹ کر ایک نیا صوبہ بہار بنا۔ جب کہ بہار ایک انتہائی چھوٹا سا قصبہ ہے جو سنسکرت لفظ وہار سے بگڑ کر پیدا ہوا۔ عہد قدیم میں جب سمراٹ اشوک کے زمانے میں ایک شہر پاٹلی پتر تھا جو بگڑ کر پٹنہ بنا۔ اس پٹنہ شہر سے مشرق کی سمت میں دو سو کوس دور ایک یونیورسٹی تھی جسے نالندہ وہار کہا جاتا تھا۔ سنسکرت میں یونیورسٹی کے لیے وہار یعنی سیرگاہ، خوشنما علاقہ استعمال ہوتا ہے۔ وہی لفظ بگڑ کر بہار بنا۔ تعلیمی مرکز ہونے کی وجہ سے صوبہ بھر میں اہمیت کا حامل علاقہ سمجھا جاتا۔ بختیار خلجی نے اس علاقے کو فتح کیا تو مسلمان صوفیوں نے تبلیغ کے لیے رخ کرلیا۔ بہار میں ایک صوفی کا نام خاصہ مشہور ہے جنھیں شاہ مخدوم کہا جاتا ہے۔ ان کی قبر اسی شہر میں ہے اس وجہ سے وہ چھوٹا شہر مراجع خلائق مشہور ہوا اور اس شہر کو عقیدت مند بہار شریف کہنے لگے۔ اسی علاقے کی نسبت سے اس صوبہ کو بہار کا نام دیا گیا لیکن دارالخلافہ پٹنہ ہی رہا۔ مسلمانوں نے اقتدار حاصل کیا تو پاٹلی پتر کا نام بدل کر عظیم آباد کر دیا۔ عظیم آباد میں یوں تو بہت سے شرفا کے خاندان آباد تھے لیکن ان میں ایک مشہور خاندان کو امتیاز حاصل تھا۔ یہ خاندان تاج فقیہی کہلاتا تھا۔ اس خاندان کی نسبت مُلّا غلام یحیٰی سے تھی جو پہلے قاضی تھے بعد میں فقیہی بھی بن گئے۔ ان کے بیٹے قاضی کمال الحق نے شاعری میں بڑا نام کیا تھا۔ ان کے بیٹے نوجوانی میں راہی ملک عدم ہوئے لیکن پوتے قاضی اکرام الحق جو سید احمد بریلوی کے مرید تھے ان کی شادی قاضی امام بخش (قاضی شہر پٹنہ) کی بیٹی سے ہوئی تھی، ان سے قاضی اسماعیل ہوئے۔ قاضی اسماعیل اردو فارسی کے شاعر تھے۔ ان کے بیٹے قاضی عبدالحمید تھے۔ انھیں بھی شعروشاعری سے شغف تھا۔ ان کے بیٹے قاضی عبدالوحید تھے۔ قاضی عبدالوحید کے گھر 1898ء میں ایک بچے نے جنم لیا جس کا نام عبدالودود رکھا گیا۔ ابتدائی تعلیم تو گھر پر ہوئی پھر اس کا داخلہ محمڈن اسکول میں کرایا گیا پھر وہاں سے اسے علی گڑھ بھیج دیا گیا لیکن وہ علی گڑھ اسکول میں زیادہ دن نہ رہ سکا۔ ڈیڑھ سال بعد اسے میجر سید حسن بلگرامی کے قائم کردہ بلگرامی ٹیوٹوریل کالج منتقل کر دیا گیا۔ وہاں کا ماحول بالکل انگریزی تھا تاکہ طلباء جب اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان جائیں تو اجنبیت محسوس نہ کریں۔ وہاں رہ کر اس نے انگریزی ادب پر خصوصی توجہ دی۔ تھیکرے اور جین آسٹین کے ناولوں میں دلچسپی لی۔ میجر سید حسن بلگرامی کی وفات کے بعد ان کا کالج جاری نہ رہ سکا اور وہ واپس پٹنہ آگیا۔ یہاں آکر اس نے کلکتہ یونیورسٹی سے میٹرک کرنے کی تیاری شروع کردی۔ امتحان دیا اور کامیاب ٹھہرا۔ جنگ عظیم جاری تھی اور انگلستان جانا ممکن نہ تھا اس لیے اس نے پٹنہ کالج میں داخلہ لے لیا۔ سیاسی طور پر وہ مظہرالحق، مولانا ابوالکلام اور محمد علی جوہر کا معتقد تھا۔ 1922ء میں اس کی شادی شاہ رشید اللہ سربرآوردہ وکیل پٹنہ کی بیٹی سے ہوئی۔ پھر اگلے ہی سال وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلینڈ چلا گیا۔ وہاں اس کا داخلہ مڈل ٹمپل میں ہوا لیکن دو تین ماہ بعد ہی جرمنی چلا گیا۔ دوران قیام جرمنی میں ڈاکٹر روز برگر سے جرمنی سیکھی اور پھر واپس انگلستان آگیا۔ واپسی کے بعد اس نے کیمرج یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ ابھی وہ آخری امتحان کی تیاری کر ہی رہا تھا کہ بیمار پڑ گیا اور اسے ایک سینٹوریم میں داخل ہونا پڑا، وہاں چھ ماہ تک زیرِ علاج رہا پھر سوئٹزرلینڈ چلا گیا جہاں موتھانائے استفانو سینٹوریم میں مزید چھ ماہ گزارے۔ وہاں سے تندرست ہو کر کیمرج واپس آیا اور امتحان میں شریک ہوا۔ کامیابی کے بعد 1929ء میں وطن واپس آگیا۔ واپسی کے بعد بیرسٹری میں تو بس برائے نام دلچسپی لی زیادہ وقت وہ ادبیات اردو کو دینے لگا۔ اسی دوران اسے ادبیات فارسی سے بھی شغف پیدا ہوگیا۔ 1936ء میں اس نے ایک رسالہ بنام "معیار" نکالا تھا کہ اس کی صحت پھر بگڑ گئی۔ بگڑتی صحت کے ساتھ وہ تصنیف و تالیف میں لگا رہا۔ "جہانِ غالب" اشتر و سوزاں، عیارستان، اردو شعروادب، چند مطلع، زبان شناسی، تحقیقاتِ ودود، آوارہ گرد اشعار، اردو میں ادبی تحقیق، تذکرہ شعراء، قاطع برہان، تذکرۂ مسرت افزا، دیوانِ جوشش، قطعاتِ دلدار، ارمغانِ بہار، معاصرِ غالب کے علاوہ بے شمار تحقیقی مضامین لکھ ڈالے۔ ڈھیروں ڈھیر ریسرچ ورکس کرنے والے اس محقق کو اردو دنیا میں قاضی عبدالودود کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔

☆☆☆

☆ وحید ریاست بھٹی کی آمد کلرسیداں سے۔ ''ماہ جولائی کا سرگزشت خلافِ توقع 29 جون کو موصول ہوا۔ سب سے پہلے آپ کا اداریہ پڑھا۔ اس مرتبہ بھی آپ نے ''شیخ سعدی، مولانا روم'' کی تقلید میں اصلاحِ معاشرہ کے لیے ایک حکایت بہت دلچسپ انداز میں رقم فرمائی۔ آخر میں مولانا حالی کے اشعار پڑھے تو ذہن معروف قوالی خواں شہید امجد فرید صابری کی طرف چلا گیا جن کو شہر قائد میں دن دیہاڑے نہایت بے دردی و بے رحمی کے ساتھ رمضان شریف میں شہید کردیا گیا۔ ان کا قصور کیا تھا؟ سارا پاکستان مہر بہ لب ہے۔ مرحوم نے بہت گراں قدر شہ پارے ہماری سماعتوں کی نذر کیے ہیں۔ حضرت مولانا حالی کی کلاسک نظم مسدس حالی سے ''اے خاصہ خاصان رسل وقت دعا ہے'' کو بہت قلبی ذوق وشوق سے پڑھا ہے۔ اللہ پاک مرحوم کے درجات بلند فرمائے اور ہمیں راہِ ہدایت عطا فرمائے۔ (آمین) یک صفحی سرگزشت ''تلوک چند محروم'' کا احوال زیست پڑھا۔ لطف دو بالا ہوگیا۔ ہمارا اگلا پڑاؤ ''شہرِ خیال'' میں ہوا۔ آفتاب نصیر اشرفی کو کرسیٔ صدارت مبارک ہو۔ ان کا نامہ پورے سرگزشت پر جامع تبصرہ لیے واقعی اوّل نمبر کا مستحق تھا۔ باقی پرانے اور نئے احباب کے خطوط بھی قابلِ ستائش کے زمرے میں آتے ہیں۔ محترمہ سدرہ بانو ناگوری اور سعید احمد چاند کے حسن تخیل کی داد نہ دینا زیادتی ہوگی۔ آپ نے محترم شاہد جہانگیر شاہد کی بیماری کی اطلاع دے کر مغموم کردیا مگر جب معلوم ہوا کہ ان کی بینائی بھی متاثر ہوگئی ہے تو رنج کی انتہا نہ رہی پورا رمضان شریف دفتری امور میں حد درجہ مصروف رہا۔ کسی بھی عزیز سے علیک سلیک نہ ہوسکی۔ جب عید کی چھٹیاں ہوئیں تو میں نے سب سے پہلے فیس بک اوپن کی۔ پوسٹ پر نظر جیسے تھم سی گئی، سکتہ طاری ہوگیا جب میں نے پڑھا کہ جناب شاہد جہانگیر شاہد صاحب کا یکم جولائی بروز جمعۃ الوداع انتقال ہو گیا ہے۔ یقین جانیں دل کی دنیا میں ایک حشر بپا ہوگیا۔ یاالٰہی یہ کیا ماجرا ہے؟ کیوں فرشتۂ اجل کی نگاہ ہماری ہی محبوب شخصیات پر آن ٹھہری ہے؟ شاہد صاحب کو مرحوم لکھتے ہوئے قلم پر بھی جیسے کپکپی طاری ہے۔ میرا پروگرام تھا کہ اس عید الفطر پر جن محترم شخصیات سے رابطہ کروں گا ان میں جناب شاہد صاحب سرِفہرست تھے مگر ان کی اچانک ملک عدم کی جانب رخصتی نے سب کچھ بدل کر رکھ دیا۔ ہر سال کی طرح اس سال بھی ہماری عید غموں کے بوجھ تلے کہیں دب سی گئی۔ تمام قارئین سرگزشت سے مرحوم کی بلندی کے لیے التجائے دعا کا خواستگار ہوں۔ جہاں غم ہوتے ہیں وہیں کہیں کسی کونے میں خوشی بھی موجود ہوتی ہے۔ میری مراد عبدالجبار رومی کی شادی سے ہے۔ پیارے بھائی آپ کو زندگی کا یہ سہانا سفر مبارک ہو۔ اس کے بعد ڈاکٹر ساجد امجد صاحب کا تحقیقی مقالا ''قصیدہ گو'' پڑھا۔ ڈاکٹر صاحب نے اس بار ماضی کے گوشوں سے ایک بڑے قصیدہ گو شاعر کا زیست نامہ بڑے احسن انداز میں مرقوم فرمایا۔ ''لازوال'' کے نام سے جناب انور فرہاد صاحب نے روبن گھوش کو بہت اچھا ٹریبوٹ پیش کیا۔ جناب ندیم اقبال صاحب کا سفرنامہ ''شمشال سے ٹورنٹو'' اپنے اندر حسنِ تحریر سمیٹے ہوئے نہایت کامیابی کے ساتھ رواں دواں ہے۔ اس کے بعد محترمہ صائمہ اقبال صاحبہ کا مضمون ''جولائی کی شخصیات'' پڑھا، بہت مزہ آیا خاص کر قدرت اللہ شہاب، ابن صفی، نصیرالدین شاہ، ڈاکٹر محبوب الحق کا مختصر احوال جان کر معلومات میں اضافہ ہوا۔ منظر امام صاحب اس بار بھی ''تاریخ عالم'' سے کشید کیے گئے خاص واقعات کو خوب صورتی وندرت کے ساتھ بیان کرنے میں کامیاب رہے۔ شکور پٹھان کی اچھوتے انداز کی تحریر ''قابلِ فخر'' اس بار بھی خاص ترین کے زمرے میں آتی ہے۔ قسط وار سلسلہ ''سراب'' دوبارہ قارئین کی اکثریت کی دلچسپی حاصل کرنے میں کامیاب نظر آرہا ہے لاجواب انداز میں کہانی اختتام کی جانب گامزن ہے۔ باقی ابھی بہت سا سرگزشت پڑھنے کو باقی ہے کیونکہ ہم اس کے بغیر پورا مہینا نہیں گزار سکتے۔ اپنی انہی معروضات کے ساتھ آپ سے اجازت چاہوں گا اللہ پاک آپ کی اور آپ کی پوری ٹیم کی حفاظت فرمائے، آمین ثم آمین۔''

☆ شاہد جہانگیر شاہد آف پشاور کے بیٹے نے ابھی ابھی اطلاع دی ہے کہ ایک سال تک بیماری سے نبرد آزما شاہد جہانگیر شاہد اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جوار رحمت میں جگہ عطا کرے۔ آمین

☆ ناصرہ احمد کا خط نیویارک یو ایس اے سے، مندرجات سے ظاہر ہے کہ کافی پہلے یہ خط چلا ہے۔ ''آپ کا تعلیم کے بارے میں اداریہ پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ آپ کے لکھے ہوئے الفاظ یقیناً سرگزشت پڑھنے والوں کی توجہ لیں گے۔ ملک بھر میں برسوں سے اسکولوں کا حال اور تعلیم کی کمی شدت سے محسوس کی جارہی ہے مگر اس بارے میں کچھ نہیں ہو سکا اور اگر کسی حکومت نے کوشش بھی کی تو سب گھوسٹ اسکولوں اور گھوسٹ استادوں کی نذر ہو گیا۔ اسی کمی کو ذہن میں رکھ کر میں نے اپنے پچھلے خط میں آپ کی خدمت میں ''اپنی مدد آپ'' کے اصول پر بچوں کی تعلیم کے بارے میں ایک تجویز لکھی تھی۔ مقصد یہ تھا کہ اگر فی زمانہ حکومت اس کام کو اپنے ہاتھ میں لینے کے قابل نہیں تو مخیر حضرات کو یہ کام کچھ عرصہ کے لیے اپنے ہاتھ میں لینے سے گریز نہیں کرنا چاہیے لیکن جن لوگوں کو بیٹھ کر شکایت کرنے کی عادت ہو گئی ہو جیسے ہماری قوم کے زیادہ لوگوں کو ہے وہ کوئی ایکشن لینے کے لیے تیار نہیں۔ میری تجویز کے بارے میں یہ کہہ کر بات ختم کر دی گئی کہ یہ باتیں صرف کتابوں میں اچھی لگتی ہیں، عملی زندگی میں ان پر کوئی عمل نہیں کرتا۔ مجھے اس سے قطعی اتفاق نہیں ہے۔ کچھ مثالیں تو خود آپ کے رسالوں میں بھی لکھی گئی ہیں۔ اگست 2015ء کے شمارے میں فریڈ نے اپنی جان بچانے والوں کے لیے کس طرح اسکول اور تعلیم کا انتظام کیا۔ اسی طرح ستمبر 2015ء کے شمارے میں ''خدمت گار'' میں انوار صاحب نے اکیلے بنگلہ دیش کے لوگوں کی امداد کرنے کا بیڑا اٹھایا اور کتنے لوگ ان کے ساتھ کیمپوں میں رہنے والوں کی امداد کے لیے آن ملے۔ اس سے قبل بنگلہ دیش میں ہی پروفیسر یونس نے خود اپنی کوششوں سے وہاں کی عورتوں کی بہبودی کے لیے قرض دینے کا سلسلہ شروع کیا جو بعد میں سارے ملک میں پھیل گیا۔ ابھی چند روز قبل پاکستانی دیہاتوں میں رہنے والی اللہ بچائی، عاصمہ ابڑو، حاکم زادی، بی بی باگڑی، حسینی نگرانی، عائشہ لغاری، حلیمہ اور حمیرا اچل کے نام خبروں میں آئے۔ ان سب نے اپنی تھوڑی سی تعلیم کے باوجود اپنے گاؤں میں بچیوں کو پڑھانا شروع کیا اور اب انہوں نے چھوٹے چھوٹے اسکول بنا لیے لیکن ان سب مثالوں کے ہوتے ہوئے آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ کتابی باتیں ہیں۔ آپ کے سرگزشت پڑھنے والے احباب علم کا خزانہ ہیں اگر ان صاحبان کو بچوں کو اپنے دروازے پر بٹھا کر پڑھانا منظور نہ ہو تو انہیں چاہیے کہ اپنے علاقے کے پرائمری اسکولوں کا پتا لگائیں اور وہاں جا کر استادوں کی مدد کریں۔ یہ تعلیم یافتہ افراد وہاں بچوں کو کتابوں سے کہانیاں سنائیں۔ ان کو اسکول کی کتابوں کو پڑھنے میں مدد کریں۔ ان کی ذہنی نشوونما اور کردار بنانے میں حصہ لیں اور ان کو اچھے اور ایماندار شہری بننے کی تربیت دیں۔ ہماری کتنی ہی نسلیں برباد ہو چکی ہیں۔ نسل در نسل رشوت، بے ایمانی، چوری چکاری اور چھینا جھپٹی عروج پر ہے۔ کالجوں میں استاد طلباء کو نقل کرانے میں مدد کرتے ہیں تو پھر اب آج کے چھوٹے بچے ہی رہ گئے ہیں جن پر قوم کے مستقبل کا دارومدار ہے...... اگر وہ اچھے کردار کے مالک اور اچھے شہری بن سکیں تو وہ قوم کو بچا سکیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر چند مخیر حضرات اس کام میں آگے بڑھیں تو کئی لوگ ان کے ساتھ شامل ہو جائیں گے۔ پچھلے ہفتے یہاں کے ایک اخبار میں ملالہ کے اعزاز میں ایک بیان چھپا تھا اس کے آخر میں بڑے بڑے حروف میں لکھا تھا۔

"One Chield one Teacher, one Book and one Pen can change the world.

اب اس کے بعد اور کچھ لکھنے کی گنجائش نہیں۔''

☆ سید امتیاز حسین بخاری سرگودھا سے لکھتے ہیں۔ ''جون 2016ء کا تازہ شمارہ مل گیا ہے لیکن فلم نگری ''ذرہ بنا آفتاب'' انور فرہاد نے صفحہ 151 پر لکھا ہے انسان اور آدمی کے بول تھے، ہم نے تم سے پیار کیا ہے، الفت کا اقرار کیا ہے، یہ میری غزل کا شعر ہے جو میں نے 1968ء میں تخلیق کیا تھا، بعد میں تخیل میں دوسرے شعر آتے ہی غزل تخلیق ہو گئی جو میں آپ کو خط کے ذریعے ارسال کر رہا ہوں۔ میری یہ غزل ماہنامہ تقدیر انٹرنیشنل لاہور میں شائع ہو چکی ہے۔ اس وقت یہ شمارہ کتابوں رسائل و جرائد اور اخبارات کے انبار میں موجود ہے لیکن تلاش کرنا مشکل ہے۔ (حیرت ہے کہ اتنا مشہور گانا جو مقبول بھی ہوا لیکن اب آپ کو خیال آیا کہ گانے کے شعر آپ کے ہیں آپ فوراً کسی فلمی پرچے سے اپنی صداقت کے ثبوت کے ساتھ رابطہ کریں تاکہ وہ آپ کو انصاف دلا سکیں) میں نے 1965ء میں شاعری کا آغاز کیا اور 1971ء میں برصغیر پاک و ہند کے معروف غزل گو شاعر حافظ محمد یوسف آزاد کی شاگردی اختیار کی۔''

☆ آفتاب احمد نصیر اشرفی نے کورنگی کراچی سے لکھا ہے۔ ''اداریہ پڑھا تو یہی سمجھ میں آیا کہ درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو بلکہ آپ شہر خیال میں ہم سید مسرت حسین رضوی سے متفق نہیں کہ دو سلسلہ وار کہانیاں شروع کی جائیں، ایک ہی کے انتظار کا عذاب کافی ہے۔ سدرہ بانو ناگوری بلندیوں کی حقیقت سے آشنائی کے باوجود سلمٰی اعوان صاحبہ سے ناآشنا رہیں۔ شاہد جہانگیر شاہد صاحب ڈائیلسز پر چلے گئے ہیں خدا انہیں اس عذاب سے نجات دے کر جلد صحت یاب کرے (آہ...... ان کا انتقال ہو چکا ہے)۔ مہر

زبیر اعجاز کی کہانی اگر قابل اصلاح ہو تو ان کی حوصلہ افزائی ضرور کریں۔ عبدالجبار روی کو شادی مبارک۔ قیصر خان، چیف صاحب سے معلوم کرلیں کہ سرگزشت کی اگر ویب سائٹ ہے تو پھر آپ وہ سب کچھ پڑھ سکتے ہیں جو چھپ چکا ہے اگر نہیں ہے تو اب بنانے کی کوشش کی جائے تاکہ سرگزشت محفوظ کیا جاسکے (ویب سائٹ کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی ہے اس لیے بنائی نہیں گئی) خود کو خدائے قصیدہ سمجھنے والا متنبی بلاشبہ قصیدہ گوئی میں یکتا ہے لیکن نخوت و تکبر میں وہ یہ بھول گیا کہ اپنی ذات کو پہنچنے والی ناگواریت کی شکایت قصیدے کو داغ دار کر لیتی ہے۔ قصیدہ صرف قصیدہ ہوتا ہے، اس میں نفی کی گنجائش نہیں ہوتی، ورنہ وہ سب کچھ ہوتا ہے قصیدہ نہیں ہوتا۔ واقعی لازوال شہرت بخشی پاکستان فلم انڈسٹری نے اداکارہ شبنم اور ان کے شوہر روبن گھوش کو لیکن انہوں نے حق ادا نہ کیا اور زوال پذیر ہوگئے، گمنام ہو گئے۔ دنیا کی دس بہترین اساتذہ کا فخر پانے والی عقیلہ خاتون کی طرح افغان مرد بھی بندوق چھوڑ کر قلم سنبھال لیں تو افغانستان میں کشت وخون کم ہوجائے۔ جولائی کی شخصیات میں عظیم المرتبت محترمہ فاطمہ جناح تاریخ کی سطروں میں پاکیزگی کا مینارہ نور ثابت ہو چکی ہیں جب کہ ان کی ذات پر اپنے مفاد کی کیچڑ اچھالنے والے اپنی غلاظتوں سمیت بے نام دفن ہوگئے۔ اسی طرح قدرت اللہ شہاب کی ذات کو بھی پرکھا جاسکتا ہے۔ بانو قدسیہ، اشفاق احمد، ابن انشاء، جمیل الدین عالی اور ممتاز مفتی کی گواہیاں ایک طرف رکھ بھی دی جائیں تو ان کے ناقدین اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ وہ انسان دوست تھے۔ صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے۔ اگر ان میں یہ اوصاف موجود تھے تو وہ خدا دوست شخصیت تھے۔ اگر ناقدین ان میں یہ اوصاف نہیں بھی پاتے تو بھی ان کے کہنے سے وہ خدا کی دوستی سے خارج نہیں ہوتے کیونکہ ناقدین تو مستند ولیوں کو بھی نہیں مانتے یہ تو پھر شہاب صاحب ہیں۔ ناقدین نے تو عبدالستار ایدھی صاحب جیسی شخصیت کو بھی نہیں بخشا جو انسانیت کے تمام اوصاف پر پورا اترتے ہیں۔ ایک ایسا گوہر نایاب جو ہماری اور صرف ہماری ملکیت تھا افسوس کہ وہ ہمارے ہاتھوں سے جاتا رہا۔ دنیا کا کوئی پروٹوکول کوئی ایوارڈ اور کوئی ریوارڈ ان کی خدمات کا بدل نہیں ہوسکتا۔ کاش ہمارے رہبر رہنما بھی ان کی پیروی کرلیں تو بحیثیت قوم ہم ترقی کے سنگھاسن پر بیٹھ سکتے ہیں۔''

☆ قیصر خان نے بھکر سے لکھا ہے۔ ''شہر خیال'' کے دوستوں کو عید کی خوشیاں مبارک ہوں۔ اداریہ میں کہا گیا ہے کہ معاشرہ بے لگام ہو رہا ہے لیکن ہم کہتے ہیں ہو چکا ہے۔ مجھے زیادہ اتفاق نہیں ہوا سرکاری دفاتر کا لیکن جو ہوا ہے بہت ہی خراب ہوا ہے۔ شاعر جذبات، واقعی بہت اعلیٰ، ذہین آدمی تھے اور سب سے بڑھ کر ہمارے پڑوسی ضلع کے تھے۔ مجھے آج تک معلوم نہ ہوا۔ شہر خیال میں کرسی صدارت پر آفتاب نصیر صاحب تھے۔ بہت خوب صورت الفاظ کے ساتھ تبصرہ پڑھنے کو ملا۔ بھکر سے شاہ جی اور فقیر غلام حسین ضیاء صاحب غیر حاضر ہیں۔ ڈاکٹر صاحبہ، معظم علی بنوں کے علاوہ اور بہت سے ساتھی غیر حاضر تھے۔ انکل شاہد جہانگیر شاہد کا سن کر بہت افسوس ہوا ان کی پرچہ سے اور شہر خیال سے دوستی محبت دیکھ کر رشک آتا ہے۔ واقعی اللہ تعالیٰ اپنے پیاروں اور خصوصی بندوں کو بہت حوصلہ، صبر او ظرف عطا کرتا ہے۔ اس تکلیف میں انہوں نے دوستوں کو یاد رکھا اور اپنی کمی محسوس نہیں ہونے دی۔ اللہ پاک ان کو جلد از جلد بہت اچھی صحت سے نوازیں گے۔ وہ بے شک قادر مطلق ذات ہے اور اپنے بندوں کو مشکل حالات سے آزماتی ہے۔ میری رب سے دعا ہے اس بابرکت مہینے میں ہمارے محسن، دوست اور انکل کو صحت کاملہ عاملہ نصیب ہو، آمین (افسوس عین جمعہ الوداع کو وہ خالق حقیقی سے جاملے) محمد احمد رضا انصاری کوئی مضامین ضرور بھیجیں ہمیں خوشی ہوگی ملکہ شہر خیال آپا طاہرہ حاضر تھیں لیکن بہت مختصر تبصرہ کے ساتھ ان کا خط آٹھ فل اسکیپ پر محیط تھا جس میں کام کی یہی چند سطریں تھیں۔ خالد صاحب ملتان والے کا کرارا تبصرہ بہت ماہ سے نہیں پڑھ سکے۔ ڈاکٹر ساجد امجد ہمیشہ کی طرح اس بار بہت خوب صورت شاعر قصیدہ گو داستان حیات لائے۔ اس کا انجام برا ہوا جو غرور کرتا تھا۔ غرور کا سر نیچا ہوتا ہے۔ انور فرہاد صاحب کا قلم کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ انہوں نے خراج تحسین پیش کیا۔ واقعی روبن جی اس اعزاز کے مستحق موسیقار تھے۔ زویا اعجاز صاحبہ میرے نزدیکی ضلع سے بہت خوبصورت اور دلیر خاتون کی کہانی لائیں مجھے خوشی ہوئی خاتون خانہ کی محنت لگن پڑھ کر۔ ویلڈن، زویا اعجاز صاحبہ کمال کا مضمون پیش کیا۔ سلمیٰ اعوان صاحبہ تو کمال پر کمال کیے جارہی ہیں۔ سفر نامے میں نہیں پڑھتا لیکن اب سوچ تبدیل کرلی ہے ندیم صاحب کیا مزے دار سیر کرارہے ہیں جیسے ہم ساتھ ہوں۔ ان کے قلم کی تعریف نہ کرنا زیادتی ہوگی۔ صائمہ اقبال ہر ماہ کی شخصیت والا مضمون میرا پسندیدہ ہے۔ شکور پٹھان صاحب تو بہت نرالے انداز سے لکھتے ہیں ہم سب کو اچھا لگا۔ ہمیشہ کی طرح الجھانے والا اور دماغ کا تسلیم نہ کرنے والا مضمون آپ کو ملے گا اگر ابن کبیر صاحب تواتر سے لکھتے رہے۔ شکیل صدیقی بہت خوب صورت کہانی لائے۔ شائلہ حسن نے بھی عجیب داستان بدنصیبی سنائی۔ منظر امام بہت اچھے جارہے ہیں۔ فلرٹ مہناز صاحبہ نے خود سے کیا یا شوہر سے یا باس سے بہت ذلت آمیز کام کیا۔ بے حسی اس کو مجبوری بھی نہیں کہہ سکتے معاشرہ میں کوئی لڑکا تھانہ میں چلا جائے تو لوگ لاکھ سوالات کرتے ہیں۔ یہاں تو لڑکی تھی وہ بھی پندرہ دن غائب رہی ہو، بس پڑھ کر رونا آگیا کہ ماں جیسی ہستی مجبور ہوگئی۔ اللہ برا دن نہ دکھائے۔ ''سزا'' جناب کو بہت کم سزا ملی ہے۔ وہیل چیئر کچھ نہیں ان بدنصیبوں کے واسطے جو جنت کو ٹھوکر مارتا ہے وہ اس سے آگے کا عذاب کا سوچے۔ ''پولیو زدہ محبت'' ایسے بدنصیب محبت کرنے والے بہت ہیں جو دوسروں کے استعمال کی چیزیں بن جاتے ہیں ان کا مقدر پر کیا کہنا۔ ''کالا علم'' ان کی صحت کا بگڑنا ثابت کرتا ہے وہ کالا علم تھا۔ باقی

مرگِ مفادات ہے۔"

☆ عبدالغفار فردوس نواح شہر ایبٹ آباد سے لکھتے ہیں۔ "جاب کے وقت میں سے بہانے بہانے سے ڈنڈی مارتے شدید گرمی میں روزے کی حالت میں ایبٹ آباد کے چکر لگاتے لگاتے آخر کو تیس جون کو سرگزشت کے درشن ہو ہی گئے۔ خوب صورت دلکش ٹائیٹل کے ساتھ، آخر ہمیں ہماری محنت کا ثمر مل ہی گیا۔ خوب صورت دیدہ زیب ڈریس میں حسینہ محو خواب تھی۔ پاکیزہ کے علاوہ جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کے سبھی شمارے زیرِ مطالعہ رہتے ہیں۔ بے تابی سے ہر ایک شمارے کا انتظار رہتا ہے۔ پر یہ ایک الگ بات ہے کہ کافی بھاگ دوڑ کے بعد مل پاتے ہیں۔ سرگزشت سے پرانا رشتہ ہے۔ یوں تو پورا رسالہ ہی بہترین مضامین اور سچ بیانیوں سے سجا ہوتا ہے اگر جدید ترین معلومات اور پُراسراریت پر بھی پڑھنے کو ہر ماہ کچھ مل جایا کرے تو کیا ہی بات ہو۔ خاص نمبر کے لیے تو آنکھیں ترس گئی ہیں نہ جانے اب کب ہوں گے خاص نمبر کے درشن؟ کہانیوں میں فلرٹ، بے حسی، فریب نظر اور جڑواں بہترین کہانیاں تھیں۔ باقی رسالہ ابھی زیرِ مطالعہ ہے۔"

☆ طاہرہ گلزار کی آمد پشاور سے۔ "رمضان کا مہینا آیا بھی اور گزر بھی گیا۔ آج تین جولائی ہے۔ مجھے سرگزشت کل دو بجے بک شاپ سے ملا۔ سرگزشت کے رائٹر اور تبصرہ نگار شاہد جہانگیر صاحب کے گزر جانے کی خبر ملی۔ دل بہت اداس ہوا۔ رمضان سے پہلے میں نے فون کیا تو انہوں نے کہا تھا طاہرہ دعا کرو کہ یہ دیوار گرنے کے قریب ہے۔ رمضان میں اپنی امی کی بیماری کی وجہ سے میں ان کے پاس نہ جا سکی ایک ہفتہ مری میں رہی۔ واپس آنے کے بعد میں نے تین چار بار فون کیا لیکن کسی نے نہیں اٹھایا ورنہ شاہد صاحب فون ضرور اٹھاتے تھے۔ جانا تو ہر ذی روح نے ہے۔ ہم نے بھی جانا ہے لیکن کسی کو رمضان کا مبارک مہینا مل جائے تو کیا کہنا۔ پہلے امجد صابری کو شہید کیا گیا اور اب اس مبارک مہینے کے آخری دن ہمارے پیارے دوست شاہد جہانگیر شاہد چلے گئے۔ میں تو ان سے مل بھی چکی ہوں۔ اس وقت بھی وہ زندگی سے کچھ خفا اور بے زار لگتے تھے۔ ان کی زندگی کے کچھ اہم رازوں کی میں بھی امین بن گئی ہوں، انہوں نے اپنے ساتھ گزرے ہوئے واقعات ایک ہی ملاقات میں بتادیئے تھے ایسے لگا تھا جیسے وہ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر رہے ہوں اور میں تسلی کے سوا ان کے لیے کچھ نہیں کر سکی لیکن روز فون پر بہت باتیں ہوتی تھیں۔ اس میں سرگزشت کی باتیں بھی ہوتی تھیں۔ میں نے ان سے کہا تھا کہ میرے فیورٹ انڈین اداکار گووندہ پر لکھیں انہوں نے وعدہ بھی کیا تھا جو زندگی کے ہاتھوں پورا نہ ہو سکا۔ اللہ تعالیٰ ان کو سکون عطا کرے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے (آمین) باقی زندگی تو گزرتی ہے پتا نہیں ہم کب گزر جائیں اور آپ لوگوں کو پتا بھی نہ چلے گا۔ اس لیے دعاؤں میں ضرور یاد رکھیں۔ جولائی کی شخصیات میں میری فیورٹ شخصیت فاطمہ جناح (جنہوں نے میرے F.C.W کی بنیاد رکھی)، قدرت اللہ شہاب صاحب (شہاب نامہ میں نے تین بار پڑھا) منظر امام صاحب بھی تاریخ عالم کو سمیٹتے نظر آئے۔ انکل منظر صاحب سے گزارش ہے کہ ان تمام قسطوں کو کتابی شکل دے کر اگلی نسلوں پر احسان کریں۔ حسبِ عادت "سراب" شروع کی۔ شوبی گروپ وادی سے نکل کر اب برف کے گرداب میں پھنس گئے۔ شوبی کی زبان سے لفظ پختون خوا اچھا بلکہ بہت اچھا لگا۔ لو جی شوبی اینڈ گروپ حسبِ عادت پھر پھنسے، وہی انڈیا کی گندی سوچ۔ شوبی نے پٹھانوں کی بہادری بیان کر کے دل خوش کر دیا۔ شوبی اور ریاست خان معصوم چہرہ امداد شاہ کے ہاتھوں ایک بار پھر مشکل میں پھنس گیا۔ بہت ہی زبردست قسط تھی ویلڈن جو بھی اب رائٹر ہیں بہت اچھا لکھ رہے ہیں۔ معراج انکل نے کوئی کہانی نہیں بلکہ 1947ء سے لے کر اب تک کی وہ گندگی بیان کی ہے جو بدقسمتی سے پاکستان بننے کے بعد پھیلائی گئی اس کرپشن، سود خوری کی پہلی اینٹ اس وقت کے بڑوں نے رکھی جو اب ایک مکمل مضبوط عمارت بن گئی ہے۔ جو عوام سے ہی ٹوٹ سکتی ہے لیکن ہمت کون کرے؟ یک صفحی پر شاعر جذبات جناب محترم تلوک چند کے بارے میں پڑھا۔ میری بدنصیبی کہ اب جاب کی اور گھریلو ذمہ داریوں کی وجہ سے میری پڑھائی کی رفتار بہت کم رہ گئی ہے۔ اتنے مہینے گزر جانے پر بھی دل و دماغ کو یقین نہیں ہو رہا کہ کاشف زبیر بھائی اب ہم میں نہیں رہے۔ اویس شیخ میری اللہ سے دعا ہے کہ آپ بہت اچھے مارکس سے پاس ہوں۔ ٹھیک کہتی ہو سدرہ بانو کہ ہمارے ملک کے اتنے برے حالات کے ساتھ بھی ہم اچھے کی اُمید رکھیں۔ سدرہ مجھے آپ نے یاد رکھا خوشی ہوئی جب کہ میں تبصرہ ہر مہینے بھیج رہی ہوں۔ سدرہ اس بار تو آپ نے خوب تر کو بھی پیچھے چھوڑ دیا۔ محفل بھی جواں تھی حسین تھی۔ سیف اللہ ملک وال کا تبصرہ بہت ہی لاجواب اور جامع رہا۔ چاند سے بھائی سعید احمد چاند اب شاہد جہانگیر شاہد صاحب ہم میں نہیں رہے۔ کیا بات ہے اب آپ اس دل سے تبصرہ نہیں کرتے جو آپ کا مخصوص انداز ہے۔ انور عباس اپنا درد دل عوام کے ساتھ شیئر کرتے نظر آئے۔ بھائی میری غیر حاضری کو نوٹ کرنے کا شکریہ۔ تبصرہ بہت ہی شاندار ہے۔ ٹھیک کہتے ہو بھائی شمسہ نے ایک بزدل کی خاطر خودکشی کی جو بالکل بھی ٹھیک نہیں کیا۔ محمد سلیم قیصر اللہ آپ کی حالت پر رحم کرے۔ پہلی سچ بیانی "فلرٹ" مائی ڈیئر مہناز یہ مرد کتے کی دم ہیں بیوی کے لیے تو کبھی سیدھی ہو نہیں سکتی، تمہیں پاگل کتے نے کاٹا تھا کہ اپنی چیک بک بھی اس کے ہاتھ میں دے دی۔ شاہد جیسے مرد ہمدردی جتا کر صرف اپنی ہوس پوری کرتے ہیں۔ دوسری سچ بیانی "بے حسی" اختر شہاب صاحب لوگوں کی یہ بے حسی دیکھ کر تو کبھی کبھی

میرا دل کرتا ہے کہ انسانوں کے اس جنگل سے نکل کر جانوروں کے جنگل میں چلی جاؤں لیکن کیا کروں کہ ماں باپ کی عزت پاؤں پکڑ لیتی ہے۔ شہلا کی ماں نے ایسی دعا مانگ کر کوئی بے حسی نہیں دکھائی۔ دنیا والوں نے اسی پر مجبور کیا ہے۔ تیسری سچ بیانی ''سزا'' بہت ہی دردناک اور افسوس ناک کہانی ہے۔ بیٹا مانگنے کے لیے یہ شوہر حضرات بیوی کی زندگی اجیرن کر دیتے ہیں۔ سوکن لانے کی دھمکیاں دینے لگتے ہیں جب بیٹا ہو جائے تو لاڈ پیار میں آسمان پر پہنچا دیتے ہیں۔ جب وہ بیٹا بدتمیزی پر اتر آتا ہے تو پھر عقل آتی ہے کہ بیٹیاں رحمت ہوتی ہیں۔ چوتھی سچ بیانی ''صحیح راستہ'' تو اس ساری کہانی کا فائدہ کیا ہوا۔ صرف لڑکی کے ماں باپ کی عزت بچ گئی۔ قصور راحیلہ کے نصیب کا ہے کہ وہ حوا کی بیٹی ہے۔ بیوی ہے جس کی کوئی حیثیت نہیں۔ آگ لگے رضوانہ کو جو عورت ہو کر دوسری عورت کی اترن کو قبول کیا، آہ تھو۔ پانچویں کہانی ''پولیو زدہ محبت'' یہ کہانی پڑھ کے تو انسان سے نفرت اور زیادہ ہو گئی۔ اتنا خود غرض باپ اور بے غیرت بھائی ان سے تو ثریا اچھی تھی۔ چھٹی کہانی ''مظلوم ظالم'' کلثوم صاحبہ، قصور آپ کا نہیں آپ تو نرم دل واقع ہوئی ہیں۔ آج کل کے لوگوں کا کیا بھروسا واقعی شاہدہ ذہنی مریض ہے اس کا علاج ضروری ہے۔ ساتویں کہانی ''فریب نظر'' واصف کے الفاظ کہ عورت ماں بہن بھی ہوتی ہیں اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے کہانی بھی آپ نے بہت اچھی لکھی ہے۔ آٹھویں کہانی ''جڑواں'' کچھ غیر فطری کہانی لگی لیکن دعا ہے کہ اللہ ریاض کے لیے رحم کریں۔ آخری سچ بیانی ''کالا علم'' سائرہ بہن آپ نے آگ بجھا کے بہت بڑی غلطی کی ہے۔''

☆ محمد شفیق بھٹی ملتان سے لکھتے ہیں۔ ''گیارہ عدد واقعاتی حصوں میں لکھی گئی جناب ابن کبیر کی تحریر ''وقت کی جست'' نے ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ بے اختیار اللہ کے پیغمبر حضرت سلیمان علیہ السلام کے درباری آصف برخیال کا دعویٰ مع عملی ثبوت یاد آ گیا لیکن آصف برخیال کا یہ علمی اختیار و اظہار تھا جس نے ملکہ بلقیس کا تخت پلک جھپکنے سے پہلے سلیمان علیہ السلام کے دربار میں لا حاضر کیا مگر ''وقت کی جست'' میں یہی کارنامہ قدرت نے سرانجام دیا۔ ''قدرت'' کہ جسے قرآن پاک میں آیت الکرسی کے بیان میں کچھ اس طرح بتایا گیا۔ ''کوئی چیز اس کے علم کا احاطہ نہیں کر سکتی۔'' کچھ اسی قسم کی صورتِ حال انسانی ذہن میں ''وقت کی جست'' پڑھ کر پیدا ہو گئی۔ نتیجے میں صفحہ زیرِ نگاہ کی تحریر و الفاظ اپنے انداز کے ساتھ مجھ بندۂ ناچیز کی طرف سے آپ کے حضور میں ہیں۔ انسانی ذہن کی وسعتوں کو شکست دیتا ہوا ایک واقعہ ''واقعہ معراج'' بھی تو ہے۔ بہر حال گو کہ واقعہ معراج اپنے زمانہ وقت کے حساب سے سلیمان علیہ السلام کے زمانہ حکومت کی نسبت بعد میں رونما ہوا تھا۔ تاہم اپنی مسلمہ حقیقت کے وجود کے ساتھ اس کو اوّل درجہ جب کہ آصف برخیال کا تخت پیش کرنا وہ بھی قلیل سے قلیل وقت کے لمحے میں دوم حیثیت کا حامل ہسپانیہ کی فوجی رجمنٹ بارسلونا کا سپاہی گل پذیر بھی اپنے حیرت انگیز واقعہ کی وجہ سے قدرت کی ان دیکھی کارفرمائیوں کا حصہ بن کر تاریخ میں رہ گیا اس جیسے اور واقعات بھی تاریخ میں ہوں گے۔ دنیا کے مرکز میدرڈ کی سرائے میں گل پذیر کو ملنے اور اپنی نگاہوں میں رکھنے والا بوڑھا شخص بھی پُراسرار ہی رہا۔ یوں محسوس ہوا وقت کی جست میں بوڑھے کا کچھ نہ کچھ کردار عمل رہا ہوگا۔ ''قصیدہ گو'' کی صرف گیارہ برس عمر میں ناقابلِ فراموش یادداشت نے بھی ذہنی طور پر مسحور کر دیا کہ کتاب کے ایک مرتبہ مطالعہ کے بعد کتاب کا ازبر ہو جانا یہ بھی اللہ سبحانہ تعالیٰ کی عطا ہے۔''

☆ سید مسرت حسنین رضوی کا نامہ کراچی سے۔ ''کوئی بھول ہوئی ہے۔'' کہانی واقعی عبرت حاصل کرنے کے قابل ہے۔ ''شہرخیال'' سعید احمد چاند کا شکریہ جوان کو میرا خط پسند آیا۔ عبدالجبار رومی انصاری صاحب کا بھی خوش آمدید کرنے کا بہت بہت شکریہ۔ ایسے ہی نامہ و احوال سے سرگزشت کے شہرخیال کے صفحات مزین و شاد و آباد رہیں تاکہ دنیا میں غم دوراں کے ستائے انسانوں کو کوئی اظہارِ خیال کا ذریعہ ملتا رہے تاکہ غم کی شدت کم ہو سکے۔ ''لازوال'' میں روبن گھوش اور شبنم کی کہانی پڑھی۔ اچھی لگی مجھے نہیں معلوم تھا کہ ان دونوں کا مذہب کیا تھا، انور فرہاد کی تحریر سے علم ہوا، میں تو دونوں کو بنگالی مسلمان سمجھتا تھا۔ ''فخرِ انسانیت'' زویا اعجاز کی نایاب تحریر ہے۔ دینی جذبہ ہر ایک میں شدید نہیں ہوتا عقیلہ آصفی کا جذبہ تعلیم بہت پسند آیا، دعا ہے کہ اپنے وطن جا کر شاد کام رہے۔ ''شمشال سے ٹورنٹو'' سفرنامہ اس دفعہ بھی دلچسپ رہا۔ دیارِ غیر میں پاکستانی نوجوان مادر پدر آزاد ہو کر خوشیوں کو دوبالا کرنے کی کوشش کرتا ہے جو وہ سمجھتا ہے کہ اس کا حق ہے اور پھر اسی غلط فہمی میں عمیق گہرائیوں میں گرتا چلا جاتا ہے اور سب کچھ گنوانے کے بعد ہوش میں جب آتا ہے تو سوائے پچھتاوے کے کچھ حاصل نہیں ہوتا اس تحریر کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ ''جولائی کی شخصیات'' قابلِ قدر تحریر اور معلوماتی بھی معتبر شخصیات کی زندگی کے حالات جاننے کا بہترین موقع ہے۔ ''قابلِ فخر'' شکور پٹھان کے حافظہ کو داد دیتا ہوں کہ اس قدر معلوماتی یادداشت جمع کر رکھی ہیں جس سے ایک عام شخص ناواقف ہے۔ ''وقت کی جست'' حال سے ماضی میں سفر کی نئی روداد ہے۔ ''عیارِ حسینہ'' ہٹلر کے بارے میں بہت کچھ علم میں آیا ہے اور شاید آتا رہے گا۔ ''تاریخِ عالم'' ماضی کی روداد اہم شخصیات کے واقعات اور گزرتے سالوں کی بھولی ہوئی تاریخ اچھی جا رہی ہے۔ منظر امام کی اچھی کوشش ہے۔ ''بدنصیب'' کوئی خاص نہیں۔ ''فلرٹ'' سبق آموز کہانی ہے جو نوجوان نسل کے لیے نصیحت آموز ہے آئے دن اخبارات اور دیگر میڈیا پر عورت پر ظلم و ستم و جبر تشدد کے واقعات آتے رہتے ہیں

جن کو پڑھ کر بہت افسوس ہوتا ہے مرد ذات بدنام ہے۔ ایسی ہی کہانیاں اردگرد مختلف انداز میں موجود ہیں جن کو دیکھ اور سن کر مرد ذات پر حرف آتا ہے اور بہت سے ایسے بھی ہیں جن پر فخر محسوس ہوتا ہے جو دوسروں کے درد کو اپنا سمجھتے ہیں اسی طرح صنف نازک میں بھی مجبور و بے بس ہیں زمانے کی ستائی ہوئی لیکن بعض ایسی بھی ہیں جو مردوں کو پیچھے چھوڑ جاتی ہیں۔ کیا مرد جابر ہوگا جو ایک عورت جابر ہو جاتی ہے لیکن کہنے دیں کہ بابا آدم سے آج تک صنف نازک کو ہی نشانہ بنایا جاتا ہے اور ظلم کی چکی میں عورت ہی پستی ہے۔ مہناز نے جو کردار ادا کیا وہ اس وقت کے لحاظ میرے نزدیک صحیح تھا۔ جب شوہر ہی بے غیرت ہو تو عورت سو طرح سے مجبور ہو جاتی ہے مگر صنف نازک ہونے کی وجہ سے مہناز کو ایسا کرنا نہیں چاہیے تھا، غیرت ہی سرمایہ ہوتی۔ ''بے حسی'' اختر شہاب کی روداد کوئی خاص تاثر نہ دے سکی مانا کہ ان کا جذبہ احساس بہت خاص تھا۔ شہلا کی والدہ کا دعائیہ انداز گھر کی عزت کے لیے ایسا ہی ہوتا۔ ''سزا'' شہناز احمد کی لکھی تحریر بھی عبرت ناک تھی۔ باغی اولاد خصوصاً لڑکا اس کا انجام یہی ہونا تھا جو واقعی بیوی کے غلام کہلانے کے مستحق ہوتے ہیں۔ سچ ہے بندہ معاف کر دیتا ہے لیکن قدرت ضرور سزا دیتی ہے۔ ''صحیح راستہ'' اسلم فاروق کی تحریر نصیحت کے پرائے میں اچھی لگی۔ ''پولیو زدہ محبت'' محمد جمیل اختر نے جو حقیقت لکھی وہ دل کو لگی۔ ایک کسک سی محسوس ہوئی۔ ایسی کئی داستانیں ماضی میں پڑھ چکا ہوں۔ ایک سے ایک شقی القلب باپ اور بھائی اس دنیا میں موجود ہیں جو معاشرے کا ناسور ہوتے ہیں۔ ''فریب نظر'' اعجاز احمد راحیل کی تحریر اچھی ہے۔ آخر میں اچھا تاثر دیا۔ ''جڑواں'' طارق عزیز خان کی تحریر کے مطابق ایسے واقعات کہیں نہ کہیں سننے کو مل جاتے ہیں جہاں ایسے اثرات نظر آ جاتے ہیں۔ ''کالا علم'' سائرہ کراچی نے جو جعلی عاملوں نوسر باز پیروں کے مطابق ہے۔ صحیح لکھا ہے، ایسے بہت سے عامل ڈبہ پیر وغیرہ وغیرہ بھی اپنے کرتب دکھا جاتے ہیں اور غریب کی جمع پونجی لوٹ لیتے ہیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ان سب چالبازوں کے ساتھ ساتھ سو میں ایک ایسا بھی اللہ کا بندہ مل جاتا ہے جو بے لوث خدمت خلق پر ایمان رکھتا ہے۔ سائرہ کو آخر میں جو تعویذ دیے گئے تھے اور عمل بتایا تھا جس میں صرف تین دن باقی تھے اگر وہ بھی پورے ہو جاتے تو اس کا گھر نہ ٹوٹتا کیونکہ سائرہ کو معلوم... ہو گیا کہ جب آگ بجھا دی گئی تو عرفان جو بہت زیادہ بیمار تھا۔ بالکل ٹھیک ہو گیا۔ یہ صرف شاہ صاحب کے عمل دینے جو بگاڑ پیدا ہوا تھا اس کو ادھورا چھوڑنے سے ہوا ورنہ شاہ کا عمل کالا نہیں بلکہ نورانی تھا شاہ صاحب واقعی نورانی عمل میں ماہر تھے۔''

☆ انور عباس شاہ کا پیام دریا خان بھکر سے۔ ''پچھلے شمارے میں آپ نے اپنے اقتباس میں بجلی کی لوڈشیڈنگ کا مختصر ذکر کیا تھا۔ موجودہ حکومت نے عوام سے وعدہ کیا تھا کہ رمضان شریف میں بجلی کی لوڈشیڈنگ نہیں کی جائے گی اور ہوا بھی ایسے جب بجلی سرے سے موجود ہی نہیں ہوتی تھی تو پھر لوڈشیڈنگ کیسی؟ بجلی کی لوڈشیڈنگ کی وجہ سے ہمارے ہاں تو برف کے کارخانے بھی بند ہو گئے تھے گھروں میں فریج بھی بند پڑے تھے افطاری کے وقت لوگوں کو پینے کا ٹھنڈا پانی تک میسر نہ تھا ناچار لوگ ہینڈ پمپ والے تازہ پانی سے افطاری کرتے رہے اور اپنی قسمت کو کوس بھی رہے تھے کہ اچانک کراچی سے ایک دردناک خبر آ گئی کہ پینے کے چند بوند پانی کی خاطر دو افراد قتل کر دیے گئے۔''

☆ امجد شاہ نے العین یو اے ای سے لکھا ہے ''پاکستان کے احباب بروقت سرگزشت پڑھ لیتے ہیں لیکن ہم پردیسی پورے دس دن بعد رسالہ دیکھ پاتے ہیں، ہمیں دبئی جا کر خریدنا پڑتا ہے اس لیے بروقت تبصرہ نہیں کر پاتے (آپ ای میل کر دیا کریں، 15 تاریخ تک اگر ای میل مل جائے تو ہم شامل کر لیا کرتے ہیں) اداریہ کیا، ایک تازیانہ ہے۔ میں ہنس ہنس کر رو پڑا۔ ایسا اس لیے ہو رہا ہے کہ ہمارے وطن کو اس حال تک پہنچایا ہی ایسے لوگوں نے جن کے ذمے قانون پر عملدرآمد کرنا تھا وہی قانون شکنی پر اتر آئے۔ قصیدہ گو لاجواب ثابت ہوئی، المتنبی کے بارے میں پہلے بھی پڑھ چکا ہوں لیکن سرگزشت کا ایک مخصوص انداز ہے اس لیے پڑھنے میں لطف آیا۔ فخر انسانیت اور ملکہ مارجوری بھی اچھی لگی۔ شمشال سے ٹورنٹو نے بہت لطف دیا۔ یہ پہلی ایسی تحریر ہے جسے میں دو دو بار پڑھ رہا ہوں۔ پرچہ ہاتھ میں آتے ہی ایک بار پڑھتا ہوں اور دوسری بار تمام تحریریں پڑھ لینے کے بعد۔ یقین کریں دونوں بار الگ لطف آتا ہے۔ دراصل جملوں کی ادائیگی اتنی خوب صورت ہے کہ ہر بار نیا مزہ آتا ہے۔ جولائی کی شخصیت اور تاریخ عالم بھی مزے کی ہے۔ قابلِ فخر میں بھی جملے اچھے تھے۔ وقت کی جست پسند نہیں آئی۔ بدنصیب اخباری انداز کی تحریر تھی۔ سراب میں اب نیا لطف آ رہا ہے۔ فلرٹ بھی زبردست سچ بیانی ہے۔ بے حسی نے رلا دیا۔ واقعی معاشرہ انسان کو کہیں کا نہیں رکھتا۔ صحیح راستہ گزارے لائق کہانی تھی۔ پولیو زدہ محبت اچھی سچ بیانی تھی۔ جڑواں اور کالا علم صفحات بھرنے کی کوشش ہے۔''

☆ اسلم فاروق حیدرآباد سے رقم طراز ہیں۔ ''سب سے پہلے شکریہ کہ آپ نے میری کہانی کو جگہ دی۔ اب آتے ہیں شہر خیال کی طرف۔ سب سے پہلے آفتاب احمد نصیر اشرفی کو مبارک باد کہ وہ کرسی صدارت پر تھے۔ تبصرہ بھی بڑا پیارا لکھا ہے۔ اعجاز ستھار نے بھی بھرپور تبصرہ کیا ہے۔ محمد احمد رضا انصاری نے بھی اچھا تبصرہ کیا ہے۔ جن تحریروں کو میں نے پسند کیا انہی کو انہوں نے پسند کیا ہے۔ خاص کران کا یہ جملہ ''سراب کی یہ قسط بہت پسند آئی۔ ایسا لگا کہ مرحوم کاشف زبیر نے ہی لکھی ہو۔ کہانی بہت تیز رفتار ہو گئی ہے۔'' یہی جملہ

بالکل ہی جملہ میں نے بھی لکھا تھا۔ سراب میں اب پہلے سے زیادہ مزہ آرہا ہے۔ لگتا ہے ہمارا ذہن مل گیا ہے۔ سید مسرت حسین رضوی نے بھی بھرپور تبصرہ کیا ہے۔ قیصر خان، انور عباس شاہ، طاہرہ گلزار، سیدہ بانو ناگوری اور سعید احمد جان تو ہیں ہی منجھے ہوئے تبصرہ نگار۔ اب آتے ہیں سچ بیانیوں کی طرف فلرٹ جیسی کہانیاں معاشرے پر اچھا اثر نہیں چھوڑتیں لیکن پیغام مثبت تھا اس لیے پسند آئی۔ بے حسی دل دکھا گئی۔ فریب نظر کی تعریف نہ کرنا بہت بڑی زیادتی ہوگی۔ لاجواب سچ بیانی ہے۔ پولیوزدہ محبت بھی اچھی کہانی ہے۔ جڑواں کی روانی متاثر کن ہے لیکن کہانی پسند نہیں آئی۔ فخر انسانیت از زویا اعجاز اور ملکہ مارجوری از سلمٰی اعوان بہت زیادہ پسند آئی۔ کل ملا کر پورا پرچہ قابل تعریف ہے۔“

☆ عنایت بخاری کا مکتوب ملتان سے ”اس ماہ کا شمارہ اہمیت کا حامل تھا۔ اپنے پسندیدہ موسیقار روبن گھوش کی حالاتِ زندگی پر مفصل مضمون پڑھا۔ ایسی بہت سی باتوں کی جانکاری ملی کہ پیارے پیارے گیتوں کو سحر طاری کر دینے والی موسیقی سے سجانے والا موسیقار، پاکستان کی سپر اسٹار شبنم کا شوہر کیسی زندگی گزار چکا ہے۔ جولائی کی شخصیت نے بھی معلومات میں اضافہ کیا۔ ملکہ مارجوری کا احوال عشق بھی لاجواب تھا جس سے ثابت ہوا کہ وفا شعاری مشرق کی میراث ضرور ہے لیکن مغرب کی عورتیں بھی وفا پرستی میں پیچھے نہیں ہیں۔ شمشال سے ٹورنٹو کی کیا بات ہے۔ ہر پیرا چونکا دینے والا ہے۔ یورپ میں آباد ہونے کے شائقین اسے ضرور پڑھیں تاکہ وہاں پیش آنے والی پریشانیوں کا قبل از وقت ادراک ہو سکے۔ فلرٹ بہت پیاری سچ بیانی ہے۔ بے حسی نے سوچنے پر مجبور کر دیا کہ حالات ہمیں کس موڑ پر پہنچا چکے ہیں۔ پولیوزدہ محبت اور فریب نظر دل کی آنکھوں سے پڑھی جانے والی تحریریں ہیں۔“

☆ اشفاق میمن کا پیام کراچی سے ”تاریخ عالم اور جولائی کی شخصیت میں بہت دلچسپی سے پڑھتا ہوں۔ قابلِ فخر بھی غضب کی تحریر ہے۔ بدقسمتی کا دلچسپ انداز میں بیان ’بدنصیب‘ بھی پسند آئی۔ ’سراب‘ نے اپنے سحر میں اس ماہ بھی جکڑے رکھا۔ پہلے سے زیادہ تیزی سے کہانی آگے بڑھ رہی ہے۔ فریب نظر بہت، بہت پسند آئی۔ صحیح راستہ اور بے حسی بھی دلچسپ تھی۔“

☆ احمد توحید عطاری کی ملتان سے آمد ”یکم کو شمارہ موصول ہوا۔ عید کی چھٹیوں کو دوبالا کیا اور کہنے پر مجبور ہوا کہ اس بار کے شمارے پر خاصی محنت ہوئی ہے۔ زبردست کلیکشن ہے۔ ابتدائی حصے کی تحریریں بھی لاجواب ہیں اور سچ بیانیاں بھی زبردست ہیں یہ خط شائع ہو گیا تو آیندہ بھرپور تبصرہ کروں گا۔“

☆ محمد فیاض احمد قادری مظفر آباد آزاد کشمیر سے رقم طراز ہیں ”سرگزشت جولائی 2016ء کا خوب صورت شمارہ نظروں سے دادِ تحسین حاصل کر چکا ہے۔ ہر کہانی اپنے قلم کار کی خوش بیانی وخوش ذوقی کی عکاسی کرتی ہے۔ ساری کہانیاں خوب صورت تھیں مگر کالا علم، بے حسی اور پولیوزدہ محبت کا ایک اپنا ہی حسین بیان تھا۔ محبت کبھی ختم نہیں ہوتی۔ ہاں خاموش ضرور ہو جاتی ہے۔ یہ رنگ، نسل، قوم، غربت، امارت، مذہب کی محتاج نہیں ہوتی۔ یہ تو ایک احساس ہے جس سے ہو جائے بس وہی خاص ہے، ایک خوشبو ہے جو چہار دانگ عالم میں پھیلے گی اور پھیل رہی ہے۔ یہ محبت کی معراج عشق ہی تو تھا کہ سید الشہداء سیدنا امام حسینؑ سارا کنبہ راہ پروردگارِ عالمین میں قربان کر کے پھر بھی صابر تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسماعیل جیسے پیارے لختِ جگر کی قربانی کا ارادہ کیا۔ عظیم صوفی اور پنجابی کے عظیم شاعر حضرت سلطان باہوؒ نے کیا خوب کہا تھا ”جس منزل عشق پہنچاوے، ایمان نوں خبر نہ کوئی“ محبت کے حسین، جذبات کی موشگافیوں کو بیان کرتی ہوئی ایک تحریر آپ کو روانہ کر رہا ہوں اپنے شمارے میں ضرور لگایئے گا (اس شمارے سے فارغ ہو کر اسے دیکھ لوں گا) ماہنامہ سرگزشت میرے ادبی ذوق کی تسکین میں بہت اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے مزید بلندیاں عطا فرمائے۔ اس سے وابستہ قارئین اور معاون اسٹاف ہمیشہ خوش رہیں۔ اللہ تعالیٰ سب احباب کی خیر فرمائے، میری دعائیں ساتھ تیری عمر بھر کے لیے ہیں۔“

☆ احسان اللہ احسان کا خلوص نامہ شیخوپورہ سے۔ ”شمارہ جولائی میرے سامنے ہے۔ فخر انسانیت نے خط لکھنے پر اکسایا ہے۔ یہ ہماری اپنی کوتاہی ہے کہ ہم آنے والی نسل کو تعلیم کے زیور سے آراستہ نہیں کر رہے ہیں۔ عقیلہ ایک عورت، ایسی عورت جو بے سروسامانی میں ہو کر بھی تعلیم کو عام کرنے میں اپنا کردار ادا کرتی رہی، کیا ہم انفرادی طور پر ایسا نہیں کر سکتے؟ زویا اعجاز کو مبارک باد۔

☆ سدرہ بانو ناگوری کا اظہاریہ کراچی سے۔ ”عید کی خوشیوں سے فارغ ہی ہوئے تھے کہ ایدھی صاحب کی رخصتی کی اطلاع ملی، آہ سادگی، خلوص، محبت، امن کا پیکر ہم سے جدا ہوا وطن عزیز پر کیسا زوال آیا ہے کہ بڑے بڑے ناموں سے یہ دنیا تیزی سے

خالی ہوتی جارہی ہے۔ یوں لگ رہا ہے کہ جیسے کسی گھنے شجر کے سائے سے ہم محروم ہو گئے ہیں۔ عبدالستار ایدھی، خدا کا پیارا اور پاکستانیوں کی آنکھوں کا تارا شاید انہی کے لیے کہا گیا ہو کہ ''ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم'' خدا تعالیٰ اس نیک دل شخص کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آپا طاہرہ گلزار بدلی کی طرح آئیں اور مجھ پر برس پڑیں۔ اب ان کی باتوں کا کیا جواب دوں۔ جون ایلیا یاد آ گئے ''میں بھی کتنا عجیب اتنا عجیب کہ بس، خود کو تباہ کر لیا اور ملال بھی نہیں'' اور ایک مصرعہ یاد آیا کہ ''تنہا کر گیا مجھ کو منفرد رہنے کا شوق۔'' طاہر جاوید مغل ایک جگہ لکھتے ہیں ''لسی اور لڑائی کو جتنا بڑھاؤ اتنا بڑھتی ہے۔'' اور بلقیس ایدھی نے کیا خوب کہا تھا کہ ''گھر سے باہر نکل کر دس مردوں کے جوتے کھانے سے بہتر ہے کہ گھر میں رہ کر ایک ہی مرد کے جوتے کھالیں۔'' اور آپا دنیا بھر کی حوا کی بیٹیوں سے پوچھ لیں ان کی تباہی میں کسی عورت کا ہی ہاتھ ہوگا خواہ یہ عورت ساس ہو، نند ہو یا کوئی بھی دوسری عورت۔ عبدالجبار رومی بھائی شادی مبارک ہو۔ شاہد جہانگیر آپ کی صحت یابی کے لیے ڈھیر ساری دعائیں۔ (آہ دعا کا وقت گزر گیا) سرگزشت سے آپ کی محبت قابلِ دید ہے کہ اتنی شدید بیماری میں بھی آپ نے اس کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ سلمٰی اعوان نے ہمیشہ کی طرح دل جیت لیا۔ مار جوری کی داستان عشق کو بہت عمدگی سے پیش کیا کہ گھنٹوں اس عظیم محبت کا سحر طاری رہا۔ عظیم الشان عشق کی یہ کہانی بار بار پڑھنے کے قابل ہے، ویلڈن سلمٰی اعوان۔ ابن کبیر کی ''وقت کی جست'' نے پریشان کر ڈالا۔ یہ کیسا بھید تھا کیسا اسرار تھا کہ گل پریز کو چند لمحوں نے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ ''شمشال سے ٹورنٹو'' خوب صورتی سے جاری ہے لیکن ندیم اقبال اگر کچھ رنگین تصاویر بھی ساتھ ہوں تو آپ کے اس سفرنامے کو آٹھ چاند لگ جائیں (رنگین تصاویر کی وجہ سے ہر بار کئی لاکھ روپے پرنٹنگ پر اضافی لگ جایا کریں گے) ''بدنصیب'' پڑھ کر حیرت زدہ رہ گئے کہ تاریخ نے کیسے کیسے بھید چھپا رکھے ہیں۔ شکور پٹھان نے قابلِ فخر لوگوں سے ملایا۔ منظر امام ''تاریخ عالم'' کو سلیقے سے لے کر آگے بڑھ رہے ہیں اور پڑھنے والوں کے دلوں میں گھر کر رہے ہیں۔ انور فرہاد نے موسیقی کی دنیا کے بے تاج بادشاہ کی ''لازوال'' کتھا بھرپور انداز میں پیش کی۔ پہلی سچ بیانی ''فلرٹ'' میں مہناز صاحبہ نے خود کا تماشا بنا دیا۔ ''فریب نظر'' فضول سی لگی۔ ''مظلوم ظالم'' نے چکرا دیا۔ شاہدہ کی چالاکیوں سے سمجھ ہی نہ پائے کہ کیا وہ واقعی مظلوم تھی۔ ''کالاعلم'' میں سائرہ نے غلط راستے کا انتخاب کیا۔ معاشرے کی بے حسی، جہالت یا کم علمی کہیں کہ جگہ جگہ بیٹھے ان جعلی عاملوں نے لوگوں کے ایمان اور گھروں کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا ہے۔''

☆ عبدالجبار رومی انصاری کا مکتوب لاہور سے۔ ''روبن گھوش اور شبنم کا عہد فلمی دنیا میں یادگار ہے اور لوگوں کے دلوں میں ان کی محبت واقعی اعزاز کی بات ہے، ان کا کردار کبھی بھلایا نہیں جا سکتا۔ میں صاحب سیف و قلم ہوں، مجھے گھوڑے، رات اور جنگل خوب پہچانتے ہیں۔ جگہ جگہ صحرا نوردی اور محفلیں سجانے والا اپنی زندگی میں کامیاب شاعر ٹھہرا مگر حاسدین اور دشمنوں سے بچ نہ سکا۔ غیرت مند تھا۔ بھاگنے کی بجائے اپنے لفظوں کی لاج رکھی اور جان لڑا دی۔ قصیدہ گو اپنے انجام کو پہنچا۔ مہناز نے جس طرح اپنے شوہر کو آزمایا تھا اسی طرح شاہد کو بھی آزما لیتی تو شاید وہ اپنی نظروں میں نہ گرتی۔ بہر حال پھر بھی اس نے خود کو بچا لیا۔ شرمندگی تو ہوئی لیکن نوکری پر رہتے ہوئے حالات معمول پر آ گئے اور شاہد نے واقعی فلرٹ کیا تھا۔ شاہدہ کسی ذہنی مرض میں مبتلا تو نہیں ہو گی۔ البتہ اسے جھوٹ موٹ کی بات بنانا اور سنسنی پھیلانے کی عادت ہو گی، بس دیکھنے میں مظلوم نظر آتی ورنہ ظالم و مظلوم دونوں ہی لا حقے فٹ آتے۔ ''کالاعلم'' بھی برحق ہے۔ جب تک عمل کیا تو سائرہ کے شوہر پر کیفیت مرگ طاری رہی جیسے ہی ادھورا چھوڑا تو عرفان صاحب شائلہ کو لے کر بھاگ گئے۔ یہ تو شکر ہوا عمل سائرہ پر الٹا نہیں پڑا ورنہ ادھورا چھوڑنے پر وہ خود بھی زیر عتاب آ جاتی۔ ''ملکہ ماجوری'' نے بہت محظوظ کیا۔ تھی تو مختصر مگر اچھی رہی۔ ٹورنٹو اسٹار اخبار اور ایک کلو وزنی حیرت ہے (ہمارے ہاں بھی اتوار کا اخبار آدھا کلو کا ہوتا ہے) ایک سے ایک نئے واقعات کا سفر شمشال سے ٹورنٹو بے حد اچھا لگ رہا ہے۔ ندیم اقبال کے قلم کی تعریف ہے۔ جولائی کی شخصیات میں محترمہ فاطمہ جناح، عالم چنا اور ابن صفی کا تذکرہ عمدہ رہا۔ لگتا ہے سراب رواں ہو گئی ہے۔ بہت مزہ آ رہا ہے۔ شہباز بھی پُراسرار وادی سے نکل کر گلگت بلتستان میں داخل ہو گیا ہے۔ اب ذرا شہر خیال کا رخ کرتے ہیں جہاں آفتاب احمد اشرفی اپنے بہترین تبصرے کے ساتھ پہلے نمبر پر موجود تھے۔ اعجاز حسین سٹھار بھی اپنے بھرپور تبصرے کے ساتھ بھلے لگ رہے تھے۔ سید مسرت حسین، سعید احمد چاند اور انور عباس شاہ کے تبصرے کافی دلچسپ تھے۔ شاہدہ جہانگیر اللہ آپ پر رحم کرے اور جلد سے جلد بینائی عطا فرمائے۔ اس کے علاوہ قیصر خان اور محمد سلیم قیصر نے بھی عمدہ تبصرہ نگاری کی ہے۔ بیت بازی میں نجمی رحمان، رضیہ شاہین اور فرحت ندیم کا انتخاب بہترین تھا۔''

تاخیر سے موصول خطوط: امجد ساجد، ساہیوال۔ محمد ابوبکر ملتانی، ملتان۔ زاہد شیخ، چنیوٹ۔ سید ظفر زیدی، سائرہ مرجس، کوئٹہ۔ انعام اللہ، پشاور۔ شکیل اے شیخ، لاہور۔ فصاحت اللہ نیازی، میرپور۔ اے کے منظر ادریس، کوٹ ڈی جی۔ فہیم الدین، سکھر۔ مہناز صدیقی، حیدرآباد۔ اختر حسین اختر، مظفر گڑھ۔ اسلام دودانی، لاڑکانہ۔ اشفاق محمود، حب۔

اردو کے ایک بڑے محقق کا زندگی نامہ

فکر و فن

ڈاکٹر ساجد امجد

اردو ایک لشکری زبان کہلاتی ہے جو خود بخود پیدا ہوئی۔ اسے سنوارنے کا کام بہت بعد میں شروع ہوا۔ دہلی سے دکن اور پھر لکھنو میں اس کی نشوونما ہوئی۔ اس کے گیسو سنوار کر ترقی یافتہ زبانوں کے مقابل کھڑا کیا گیا۔ دبستان دہلی و لکھنو نے اس پر جو احسانات کیے وہ اپنی جگہ مگر انفرادی طور پر بھی بہت کام ہوا ہے۔ انفرادی طور پر اردو کو سنوارنے میں جلال لکھنوی نے جتنا کچھ کیا اسے بھلایا نہیں جاسکتا۔ دہلی و لکھنو کے درمیان مذکر و مونث کی جو گتھی تھی اسے سلجھایا۔ غلط العام الفاظ کو متروک قرار دیا مگر افسوس ایک ایسا محقق کس طرح معاشی پریشانیوں میں گھرا رہا یہ آپ بھی ملاحظہ کریں۔

لکھنو کے بازارِ سخن میں خریداروں کا شاعر ہونا ضروری نہیں تھا اور پھر وہ تو حکیم میر اصغر علی مشہور داستان گو ''طلسم ہوشربا'' کے شاگرد تھے۔ خواجہ اسد آفتاب الدولہ قلق کے مکان پر مشاعرہ منعقد ہو اور وہ نہ ہوں، ممکن ہی نہ تھا۔ گھر میں یہ رات بہت نازک تھی لیکن ان کا مشاعرے میں جانا بہت ضروری تھا۔

واہ واہ کے شور میں کب رات شروع ہوئی کب ختم ہو گئی خبر ہی نہ ہوئی۔ ابھی اجالے نے زمین پر اچھی طرح قدم نہیں رکھا تھا کہ وہ گھر میں داخل ہوئے۔ پاؤں رکھتے ہی قرائن نے سانس لی، ملازمہ نے جھولی پھیلا دی۔

''مبارک باد کا پیغام ہے۔ بندی انعام کی مستحق ہے۔''

میر صاحب نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اس وقت جو کچھ تھا اس کے سامنے رکھ دیا۔ مبارک باد کا مفہوم سمجھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ انہیں معلوم تھا کہ ان کی بیگم اُمید سے ہیں اور خوش خبری سننے کا وقت قریب ہے۔ ان کا گھر میں رہنا ضروری تھا لیکن وہ دوستوں کے اصرار پر مشاعرے میں چلے گئے تھے۔

وقت یہ آگیا تھا کہ ملازمہ سے اجازت لینے کی ضرورت پڑ رہی تھی۔ اجازت ملتے ہی وہ زنان خانے کی طرف بڑھ گئے۔ ان سے پہلے ان کے آنے کی خبر پہنچ گئی تھی جو دو چار عورتیں وہاں تھیں ان سے پہلے وہ وہاں سے ہٹ گئی تھیں۔ بیگم نے بھی ان کے استقبال کے لیے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی سرخی جمائی تھی۔

میر صاحب نے بیگم کی خیریت دریافت کی، اس وقت گھر پر نہ رہنے کی معذرت کی اور نومولود کو گود میں لینے کے لیے ہاتھ بڑھا دیے۔

''صاحبزادے آپ پر گئے ہیں۔ وہی ناک نقشہ۔''

''اللہ نصیب اچھے کرے۔'' انہوں نے نومولود کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کہہ تو آپ ٹھیک رہی ہیں۔ بالکل

میرے بچپن کی تصویر ہیں موصوف۔‘‘
’’میں یہ کہہ رہی تھی کہ آپ کوئی اچھا سا نام سوچ لیں۔ چھٹی سے پہلے پہلے نام رکھنا ضروری ہوتا ہے۔‘‘
’’نام تو ہم نے پہلے ہی طے کرلیا ہے۔‘‘
’’ہم بھی تو سنیں۔‘‘
’’میر ضامن علی۔‘‘
’’میر اصغر علی کا ہم قافیہ تو نہیں یہ نام۔‘‘
’’میں نے اس کے بڑے بھائی کے نام کو قافیہ بنایا ہے۔ وہ میر شامن علی ہے یہ میر ضامن علی۔ میں نے سوچ لیا ہے اسے اپنی طرح حکیم بناؤں گا۔‘‘
’’اپنی طرح داستان گو نہیں بنائیں گے؟‘‘
’’یہ بھی کر گزرتا لیکن بیگم اب لکھنو کے لوگوں میں وہ بات کہاں رہی۔ اب داستانیں کون سنتا ہے۔ حکیم بن جائے گا تو میرا نام بھی روشن کرے گا اور اچھی زندگی بھی گزارے گا۔‘‘
’’کیا باتیں لے کر بیٹھ گئے۔ رات بھر کے جاگے ہوئے آئے ہیں کچھ دیر کو آنکھ جھپک لیں۔‘‘
’’کچھ دیر کو مطب ہو آؤں پھر دوپہر کو قیلولے کے بہانے آرام کرلوں گا۔‘‘

☆......☆

یہ نصیرالدین حیدر کا زمانہ تھا۔ یہاں تک آتے آتے لکھنو نے آصف الدولہ اوران کے بعد سعادت علی خاں کی فیاضیوں کا منہ دیکھا تھا جس نے ہر خاص و عام کے لیے عیاشیوں کے دروازے کھول دیے تھے۔ بے فکری کی ہوا چل رہی تھی۔ لکھنو والوں نے شاید یہ سمجھ لیا تھا کہ اس باغ میں بہار کا موسم ہمیشہ رہے گا۔ دن رات اسی طرح دولت برستی رہے گی حالانکہ انگریزوں کے قدم جمنے لگے تھے۔ کمپنی کا تسلط بڑھنے لگا تھا اور صاف نظر آنے لگا تھا کہ کچھ دن نہیں گزریں گے کہ اودھ برائے نام آزاد رہ جائے گا۔ اس وقت بھی بقول عبدالحلیم شرر حال یہ تھا۔ ’’کسی کی تخت نشینی بغیر انگریزوں کی منظوری کے ہو ہی نہ سکتی تھی۔ انگریزی فوج ساری قلمرو میں جا بجا پھیلی ہوئی تھی۔ کوئی اہم معاملہ ریذیڈنٹ (انگریزی نمائندہ جو ریاست کی نگرانی کے لیے متعین تھا) کی دخل اندازی کے بغیر طے ہو ہی نہ سکتا تھا۔ شہریاری ایک اسٹیج تھا جس پر جو کچھ ہوتا بظاہر نظر آتا کہ ایکٹر کررہے ہیں مگر اصل میں وہ افعال کسی اور شخص کے قبضۂ قدرت میں تھے جو پردے کی آڑ میں تھا اور جو چاہتا تھا کرتا تھا۔‘‘

اس عیش پرستی کا سب سے بڑا اثر شاعری پر پڑا۔ جذبات کی پاکیزگی اور بیان کی متانت جو دہلوی شاعری کا طرۂ امتیاز تھی اس میں وہ پاکیزگی نہ رہی۔ اس کی جگہ ایک نئے فن نے لے لی جسے خارجیت کہتے ہیں۔ زندگی کے ہر شعبے میں تراش خراش نے نئے نئے انداز پیدا کردیے۔ اس تبدیلی نے شعر و ادب کو بھی متاثر کیا۔ رنگین جذبات کا بہترین ذریعہ شاعری تھا لہٰذا شاعری کا چرچا اتنا عام ہوا کہ اکیلے لکھنو میں اتنے شاعر موجود تھے کہ اگر سارے ہندوستان کے شعراء جمع کیے جاتے تو ان کی تعداد لکھنو کے شاعروں سے نہ بڑھ سکتی تھی۔ مشاعروں کی محفلیں ماہوار اور ہفتہ وار سے ترقی کرکے اکثر جگہ روزانہ ہونے لگیں۔ لکھنو کی پُرتکلف زندگی نے جب ’’شعر‘‘ میں جگہ بنائی تو شعراء نے تمام تر توجہ شعر کے حسن ظاہری اور رعایت لفظی اور صنائع بدائع پر صرف کردی۔ شکوہ الفاظ پر بلند خیالی اور جذبات کی مصوری ہی کو قربان کردیا۔ تکلف اور تصنع کی بھرمار ہوگئی۔ سادگی اور بے تکلفی جاتی رہی۔ ناسخ اوران کے شاگردوں نے ایسا غلغلہ بلند کیا کہ سب اسی رنگ میں رنگ گئے۔
جن شعرا نے شاعری کو ذریعہ معاش بنایا انہوں نے عربی مدرسوں اور علم و فضل کے زیر اثر درد اور کیف کی بجائے لفظی صناعی اور اندازِ بیان کو معیار بنا کر پیش کیا۔ درد و کیف کا سرمایہ جن کے ہاتھ آیا انہوں نے اسے داخلی سے زیادہ خارجی زندگی سے اخذ کیا اور مرثیوں میں ان جذبات کو موزوں کیا۔
یہ تھیں وہ روایات جن کے درمیان رہ کر میر ضامن علی کی پرورش ہورہی تھی۔
وہ پڑھنے کی عمر کو پہنچا تو باپ نے اردو، فارسی کی کتابیں اس کے سامنے رکھ دیں۔ چند روز ہی میں اندازہ ہو گیا کہ اس کا ذہن غیر معمولی ہے۔ حافظہ بھی شاندار ہے۔ اس نے تیزی سے اسباق ختم کیے تو اس کے مستقبل نے اسے آواز دی۔ میر اصغر علی نے نواب آصف الدولہ کے مدرسے میں بٹھا دیا۔ یہاں عربی پڑھنا شروع کی۔
گھر سے باہر نکلنا شروع کیا تو ’’شاعری‘‘ سے تعارف ہوا۔ باپ کے ساتھ مطب پر جا کر بیٹھتا تو وہاں بھی شعراء کو جمع دیکھتا۔ علمی مباحث چھڑ جاتے، آپس میں اشعار کا تبادلہ ہوتا۔ وہ بظاہر ایک کونے میں بیٹھا رہتا لیکن اس کے کان گفتگو پر لگے رہتے۔

لکھنو کی شاعری ناسخ و آتش اور ان کے شاگردوں کے گرد گھوم رہی تھی۔ ناسخ ایک مسلم الثبوت استاد تھے جنہیں اردو، فارسی پر قدرت حاصل تھی۔ الفاظ اپنی جگہ خوب سرف کرتے تھے۔ ان کے کلام میں یہ نقص ضرور تھا کہ انہوں نے الفاظ کی جستجو پر ضرورت سے زیادہ توجہ دی اور تعلق اور اوق الفاظ اس کثرت سے شامل کیے جو ہرگز غزل کے شایان شان نہیں تھے۔ لفظوں کے استعمال کے شوق نے کلام کو درد و اثر سے عاری کر دیا، ظاہری حسن تو قائم ہو گیا، شکوہ الفاظ کا دبدبہ تو فراہم ہو گیا لیکن داخلیت کے جذبات دم توڑ گئے۔ سادہ جذبات، تحقیق الفاظ اور رعایت لفظی میں گم ہو گئے۔ یہ شاعری پُراثر نہیں تھی لیکن اس سے علمیت کا رعب پڑتا تھا اس لیے اسے مقبولیت ملی۔ ناسخ کے شاگرد بڑی تعداد میں تھے۔ انہوں نے اس رنگ شاعری کو خوب پھیلایا۔ ناسخ نے تو متروک الفاظ کو ختم کیا تھا۔ ہندی الفاظ کی جگہ فارسی و عربی الفاظ کو مروج کیا تھا۔ شاگردوں نے اشعار کو لفظوں کا گورکھ دھندا بنا دیا۔ اشعار کی صورت یہ ہو گئی۔

آدمی مخمل میں دیکھے مورچے بادام میں
ٹوٹی دریا کی کلائی زلف الجھی دام میں

☆

بیٹھے ہیں عشاق ہو کر تیری آنکھوں پر فقیر
ورنہ کیوں بستر ہے تکیوں میں ہرن کی کھال کا

اس قسم کی نازک خیالیوں نے شاعری کو معما بنا کر رکھ دیا۔ جب اس طرز کو مقبولیت ملی تو شاعری کا معیار داخلیت اور جذبات کی بجائے زبان کے چٹخارے، لفظی گورکھ دھندے اور قافیہ پیمائی ٹھہرایا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ غزل میں ایسے سنگین و سخت الفاظ لائے جانے لگے جو غزل کے کاندھوں پر بار تھے۔

دوسری طرف آتش اور ان کے شاگردوں کی بھیڑ تھی۔ آتش کا رنگ بالکل جداگانہ تھا۔ وہ مصحفی کے شاگرد تھے اس لیے انہوں نے لکھنویت کے ساتھ ساتھ دہلویت کو بھی اختیار کیا اور یہ دونوں رنگ جب مل گئے تو ایک نیا رنگ ظہور میں آ گیا۔ خیالی ہندی، محاورات اور مضمون آفرینی کے لحاظ سے آتش کا مرتبہ ناسخ سے کم نہیں تھا۔ صنائع بدائع کے استعمال کے لحاظ سے بھی وہ ناسخ کے ہم پلہ ہیں البتہ انہوں نے ناسخ کی طرح صرف الفاظ سے کھیلنا مناسب نہ سمجھا۔ ناسخ کے کلام میں غزلیت کا فقدان تھا۔ آتش نے اس کمی کو دور کیا۔ ان کے کلام میں جذبات کا قحط نہیں۔ تصوف کی چاشنی بھی موجود ہے جو لکھنو کی شاعری سے اٹھ چکی تھی۔

فقر و تصوف اور رندی و سرمستی کی اس دہری شخصیت نے آتش کے شاعرانہ کمال کو یہ راہ دکھائی کہ انہوں نے واردات قلبیہ کو امور ذہنیہ سے اس طرح ملایا کہ ایک خاص کیفیت پیدا ہو گئی۔ اپنے تمام فقر و خلوت نشینی کے ساتھ ساتھ انہوں نے رندی و سرمستی کو اس طرح کھپایا کہ خاصے کی چیز بن گئی۔

میر ضامن علی نے ہوش سنبھالا تو آتش و ناسخ کے شاگردوں کا دور تھا۔ آتش کے شاگردوں نے اپنے استاد کے رنگ میں روانی و سلاست کا اور زیادہ امتزاج پیدا کیا۔ عربی فارسی نامانوس الفاظ ترک کیے۔ فارسی تراکیب سے حتی الامکان احتراز کیا اور کسی حالت میں انہیں مستحسن قرار نہیں دیا اور ان کی جگہ ہندی کے عام فہم اور رائج الوقت الفاظ داخل کیے۔

لسانی اور لفظی تبدیلیوں کے ساتھ ان لوگوں نے مضامین کے انتخاب میں بھی ایک خاص روش اختیار کی۔ خارجی اور مادی مضامین (گل و بلبل) کو ترک کر کے واردات قلبیہ اور داخلیت کی طرف توجہ کی۔ سوز و گداز کے عنصر پر خاطر خواہ زور دیا۔

اس کے مقابلے میں شاگردان ناسخ نے اپنی توجہ ظاہری اصلاحات ہی کی طرف مبذول رکھی۔ ان کے ہاں شاعر کی قادر الکلامی کا معیار یہی رہا کہ وہ کسی لفظ کے تمام قوافی کو باندھ سکے لہٰذا اکثر شعرا کے ہاں وہی بے نمکی اور بے رنگی دکھائی دیتی رہی جو ناسخ کا طرۂ امتیاز تھا۔ صحت الفاظ کا خیال اتنا بڑھا کہ معمولی معمولی باتوں میں بھی نوک پلک کا خیال رکھا جانے لگا۔

شاگردان ناسخ کی برکت سے یہی رنگ شاعری لکھنو کا رنگ شاعری بنا ہوا تھا۔ میر ضامن علی تک بندی سے شعر کہنے کی منزل تک پہنچا تو رواج کے مطابق کسی استاد کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس کے عہد میں ضروری تھا کہ جو شاعری کرے وہ کسی کی شاگردی بھی کرے۔ اس کی کم عمری نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ ہر طرف شاگردان ناسخ کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ ناسخ کے شاگردوں کے شاگرد بھی دنیائے شعر پر حکمرانی کر رہے تھے۔ امیر علی خان ہلال خاندان ناسخ کے ایک اہم شاعر تھے۔ وہ ناسخ کے براہِ راست شاگرد نہیں تھے بلکہ ناسخ کے شاگرد میر علی اوسط رشک کے شاگرد تھے۔ لکھنو میں ان کے بہت سے شاگرد تھے۔ وہ بھی ان کے در

دولت پر پہنچ گیا۔ چند شاعر اور بھی وہاں موجود تھے۔ وہ بھی ایک طرف بیٹھ گیا۔ شاعری کا دور چل رہا تھا لیکن وہ سب سے لاتعلق تھا۔ اسے تو ہلال سے کام تھا اور انہیں اس کی طرف دیکھنے کی فرصت نہیں تھی۔ جب بہت دیر ہوگئی تو ہلال نے اس کی طرف توجہ کی۔

''صاحبزادے اس سے پہلے ہم نے آپ کو اپنی محفل میں نہیں دیکھا۔''

''میں نے آپ کے قدموں میں آج ہی حاضری دی ہے۔''

''اس کا مطلب تو یہ ہے کہ آپ سے تعارف ضروری ہے۔''

''میرا تعارف صرف اتنا ہے کہ میں حکیم میر اصغر علی داستان گو کا بیٹا ہوں اور ابھی عربی فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھتا ہوں۔''

''بہت خوب! میر اصغر علی کے بیٹے ہو اسی لیے شعر فہمی تمہارے مزاج کا حصہ ہے۔''

''شعر فہمی کی تو سکت نہیں لیکن شعر کہنا خوب آتا ہے۔''

''ارے واہ! ہم بھی تو سنیں کیا کہتے ہو۔''

''حضرت ابھی میرا کہنا کیا، ہاں اگر آپ کی شاگردی نصیب ہو جائے تو شاید میرے شعر سنانے کے لائق ہو جائیں۔''

''ابھی کس سے اصلاح لیتے ہو؟''

''ابھی تو اپنے شعر خود دیکھ لیتا ہوں۔ آرزو ہے کہ آپ کی خدمت میں دن گزاروں۔''

''بھئی یہ فیصلہ تو ہم تمہارا کلام سن کر ہی کر سکیں گے۔''

اس نے تعمیل حکم کی اور جھجکتے ہوئے کچھ شعر ان کے سامنے رکھ دیے۔

طالب ہیں سبھی جس کے وہ محبوب ہے میرا
معشوق بھی عاشق ہیں وہ مطلوب ہے میرا
بڑ مار اٹھا حشر میں کچھ میں تو وہ بولے
بکنے دو یہ دیوانہ ہے مجذوب ہے میرا
اک بندہ نوازی کی ادھر بھی نگہ لطف
اُمید میں کب سے دلِ معتوب ہے میرا
رحمت تری بھولی ہوئی تھی دیکھ کے مجھ کو
یاد آ ہی گیا بندۂ مغضوب ہے میرا

☆

آیا تھا کیوں کہیں میں دلِ بے وفا کے ساتھ
کم بخت نے خراب کیا مجھ کو لا کے ساتھ
زخمِ جگر میں اپنے بھی ہوتی رہی چمک
شب کو کسی کے خندۂ دنداں نما کے ساتھ
ہم پر جو ہو ستم وہ کسی اور پر نہ ہو
اتنی رہے ضرور عنایت جفا کے ساتھ
راضی ہیں خاک کر دے جو اس رہ گزر کی چرخ
اچھا مٹیں گے بھی تو کسی نقشِ پا کے ساتھ

شعر ایسے تھے کہ قلم لگانے کی گنجائش نہیں تھی۔ استاد نے دعائیں دیں اور اسے شاگردی میں قبول کر لیا۔

''برخوردار، میں یہ تو پوچھنا ہی بھول گیا کہ آپ نے تخلص کیا اختیار کیا ہے۔''

''ابھی تک تو کوئی تخلص اختیار نہیں کیا۔ ہاں ابھی ابھی ایک خیال آیا ہے۔ آپ ہلال تخلص فرماتے ہیں۔ اس کا قافیہ ''جلال'' کیسا رہے گا۔''

''آپ کی سوچ تو اچھی ہے۔ میر ضامن علی جلال لکھنوی یا یوں کہیے جلال لکھنوی سننے میں بہت اچھا لگتا ہے۔''

اگلی ملاقات میں وہ استاد کی خدمت میں ایک ایسی غزل لے کر پہنچا جس میں ''جلال'' تخلص کے طور پر باندھا گیا تھا۔

پھرا دل اگر تیرِ مژگاں سے بچ کر
کہاں جائے گا تیرے پیکاں سے بچ کر
سوئے میکدہ آ کے بھی شیخ جی کیا
نکل جاؤ گے بزمِ رنداں سے بچ کر
کبھی یادِ قاتل میں ہنستا تو اے دل
ذرا او چھے زخموں کے احساس سے بچ کر
الگ دل کے داغوں سے ہیں دل کی پھانسیں
یہ نکلے ہیں کانٹے گلستاں سے بچ کر
کجا عشق میں دین و ایماں کا رہنا
جلال اک بتِ نا مسلماں سے بچ کر

وہ اپنے آپ کو ہلال لکھنوی کا شاگرد ہو جانے کو اپنی بڑی کامیابی قرار دے رہا تھا اور اس موقع سے پورا پورا فائدہ بھی اٹھانا چاہ رہا تھا۔ اس نے کثرت سے غزلیں کہیں۔ وہ شاعری کی دنیا میں ایسا گم ہوا کہ تعلیم کو خیر باد کہہ دیا۔ اب اس کے پاس اتنا وقت تھا ہی نہیں کہ کتب درسیہ کو

بھرپور وقت دے سکتا۔ گھر تھا اور ہلال لکھنوی کی ڈیوڑھی۔

وہ ہلال کی صحبت میں رہ کر ناسخ کے رنگ شاعری کی پوری طرح پیروی کرنے لگا۔ اس قسم کے اشعار اس کا رنگ خاص بن گئے۔

نہا کر تم نے دریا میں گلے کٹوا دیے لاکھوں
لڑی بازو کی نکیہ اک ایک ماہی سے
صید کرنا تھا جو دل مرغ نگاہ کو تیرے
باز پھر اس کو نہ بنتا تھا مولا ہوتا

☆

وہ پھر کے آپ تو آتا اگر جواب نہ تھا
پیامبر تو الٰہی مرا شباب نہ تھا

☆

آخر میں آدمی ہوں بادام کچھ نہیں ہوں
بک بک کے مغز میرا کہہ دو نہ کھائے واعظ

لیکن یہ بھی عجیب بات تھی کہ وہ ناسخ کے رنگ میں شعر کہتے کہتے ایسے اشعار بھی کہہ جاتے جن میں دہلی اسکول کا سوز و گداز نظر آتا تھا۔

کمی کس کی طرف سے پائی جاتی ہے محبت میں
ہم اپنے دل سے پوچھیں آپ اپنی کم نگاہی سے

☆

چھپتے نہیں گواہ جو سوز نہاں کے ہیں
چند اشک گرم ہیں کئی چھالے زباں کے ہیں

☆

اس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ایک جگہ رکنے والا نہیں۔ جیسے جیسے وقت گزرے گا وہ تبدیلیوں سے آشنا ہوتا رہے گا۔ اپنی شاعری کو اپنے اردگرد بکھرے ہوئے بہت سے رنگوں کا مجموعہ بنا لے گا۔ اسے یہ افسوس بھی تھا کہ وہ ناسخ سے استفادہ نہ کرسکا۔

کچھ مستفیض ان سے ہوئے ہم نہ اے جلال
جی لوٹتا ہے ناسخ مغفور کے لیے

اور یہ بھی کہتا ہے

کہنے کو جلال آپ بھی کہتے ہیں وہی طرز
لیکن سخن میر تقی میر کی کیا بات

یہ موقع اسے جلد ہی مل گیا۔ اس کی طبیعت میں ایک رنگ جداگانہ دیکھ کر اس کی اصلاح سے عاجز ہو گئے اور اسے اپنے استاد میر علی اوسط رشک لکھنوی کے پاس لے گئے۔

وہ رشک کا شاگرد ہو گیا۔

رشک ناسخ کے مشہور شاگرد تھے اور حقیقی طور سے ان کے جانشین کہلانے کے مستحق تھے۔ علم و تحقیق میں دور تک ان کا سکہ جما ہوا تھا اور شعر و ادب کے سارے مسائل میں ان کا فیصلہ اٹل سمجھا جاتا تھا۔ ناسخ کی شہرت اصلاح زبان کی وجہ سے تھی۔ رشک اسی کام کو آگے بڑھا رہے تھے۔ ان کا کلام فصاحت و بلاغت کے ان اصولوں پر پورا اترتا تھا جو ان کے استاد ناسخ نے مقرر کیے تھے۔

سید علی اوسط رشک نے اس کی تربیت اس طرح کی کہ حق استادی ادا کر دیا۔ انہوں نے جلال کی عنانِ خیال مشق شعر سے زیادہ تحصیل فن اور تحقیق مسائل کی طرف موڑ دی۔ جلال نے ان تمام روایات کو اپنا لیا جو متروکات، لفظی صنائع اور فصاحت و بلاغت کے اصولوں کی شکل میں ناسخ کے عہد سے اب تک لکھنو کے دبستان شاعری کا خاصا بن گئی تھیں۔

رشک سے وابستگی کو بہت عرصہ نہیں گزرا تھا کہ رشک کربلائے معلیٰ روانہ ہو گئے۔ جلال کے سر سے سایہ اٹھ گیا۔ جلال کو اب استاد کی شکل میں کسی سائبان کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کا کلام اب خود اساتذہ کو آنکھیں دکھا رہا تھا لیکن پھر بھی اس نے نواب فتح الدولہ برق کی شاگردی اختیار کر لی۔

فتح الدولہ برق بھی ناسخ کے دبستان شاعری سے تعلق رکھتے تھے اور علم عروض اور تحقیق الفاظ میں کاوش کرتے تھے۔ ان کے یہاں اپنے بہت سے ہم عصروں کے برخلاف نہایت صاف اور شستہ اشعار برجستگی اور بے ساختگی کے ساتھ ملتے تھے۔

برق کی شاگردی نے ان اثرات کو مزید مستحکم کر دیا جو رشک نے چھوڑے تھے۔

فارغ البالی اور آسودہ حالی عام تھی۔ شعر و شاعری کی محفلیں سج رہی تھیں۔ امرا کے دسترخوان کشادہ تھے۔ طوائفیں تھیں، عیش و نشاط سے بھرپور زندگی تھی۔ ایک نوجوان آدمی کے لیے جو شاعر بھی ہو یہ بستی جنت سے کم نہیں تھی۔ جلال اس فضا میں شاعری کے جوہر نکھار رہا تھا۔ اب اس کی غزلوں کی شان یہ تھی۔

دے صنم حکم تو در پر ترے حاضر ہو کر
پڑ رہے کوئی مسلمان بھی کافر ہو کر
چٹکیاں لینے کو بس رہ چکے پنہاں دل میں

کبھی پہلو میں بھی آ بیٹھے ظاہر ہو کر
جب سائی کا ارادہ تو ہو پہنچا دے گا
در تک اس بت کے خدا حافظ و ناصر ہو کر
غیر کیوں ہم کو اٹھاتا ہے تری محفل سے
آپ اٹھ جائیں گے برخاستہ خاطر ہو کر
ڈھونڈتے رہ گئے پہلو ہی تعجب ہے جلال
حال دل اس سے نہ تم کہہ سکے شاعر ہو کر

اس کی قسمت اسے عجیب عجیب رنگ دکھانے پر تلی ہوئی تھی۔ واجد علی شاہ تخت پر بیٹھے تو عیش ونشاط نے مزید پاؤں پھیلا دیے۔ لکھنو کی شاعری میں اس عیش و مستی کے عکس نظر آنے لگے۔ یہاں کی شاعری کنگھی چوٹی میں پھنس کر رہ گئی۔ وہ اسی انتہا پسندی میں گرفتار ہوئے بغیر اعتدال کی راہ چلتا رہا لیکن زمانہ یہ چال کب تک چلتا۔ انگریز برابر اس تاک میں لگے ہوئے تھے کہ کسی طرح اودھ کی سلطنت کو حدود انگلشیہ میں شامل کرلیں۔ انہوں نے واجد علی شاہ کی عیاشیوں کو بہانے بنا کر اودھ کی ریاست کو ضبط کرلیا اور واجد علی شاہ کو معزول کر کے مٹیا برج کلکتہ بھیج دیا۔ نظر تو آرہا تھا کہ انگریز لکھنو کے دروازے پر ہیں۔ اہلِ لکھنو کو ہوش تو اس وقت آیا جب ان کا محبوب حکمران گرفتار ہو کر کلکتہ چلا گیا۔

فتح الدولہ برق استاد جلال چونکہ واجد علی شاہ کے درباری شاعر تھے لہٰذا انہوں نے وفاداری کا مظاہرہ کیا۔ انہوں نے حق رفاقت ادا کیا اور لکھنو کو خیر باد کہہ کر ہمیشہ کے لیے مٹیا برج چلے گئے۔

جلال کو اب کسی کی شاگردی کی ضرورت نہ تھی۔ عشق سخن سے منجھ کر اب وہ خود استاد بن چکا تھا۔ دو محققوں (رشک و برق) کی تحقیقات کا خزانہ اب اس کے قبضہ اقتدار میں آچکا تھا۔ فنی مسائل میں بھی اجتہادی شان پیدا ہو چکی تھی۔

وہ تمدنی یک جہتی اور فارغ البالی جو واجد علی شاہی راج کا طرۂ امتیاز تھی غائب ہوتی جارہی تھی۔ نئی سرکار نے ان تمام لوگوں کو برطرف کردیا جو ان کے نزدیک غیر ضروری خدمات پر مستعد تھے۔ اس صورتِ حال پر سب سے زیادہ متاثر شاعر ہو رہے تھے۔

جلال اب شاگردی کی حدود سے آگے بڑھ کر اب خود استاد بن گیا تھا۔ مشاعروں میں اس کا طوطی بولتا اور

محفلوں میں اس کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔
خواجہ اسد اللہ قلق کے مکان پر ہر ہفتے مشاعرہ منعقد ہوتا تھا۔ جلال ان مشاعروں کا جزو اعظم تھا۔ اس بزم میں امان علی سحر، امداد علی بحر، منشی مظفر حسین اسیر اور امیر مینائی جیسے مشاہیر شرکت کرتے اور اپنا کلام پڑھتے۔ جہاں کسی سے لغزش ہوئی فوراً اعتراض ہوا۔ مشاعرہ ختم ہونے کے بعد اس پر بحث ہوتی۔ جلال ان بحثوں میں سب سے آگے رہتا۔ وہ ابھی پورے چوبیس سال کا بھی نہیں ہوا تھا۔ مگر اس کے علمی خزانے کا حال یہ تھا کہ ان بحثوں میں وہی سرخرو رہتا۔ اس کی دلیلوں کے سامنے بزرگوں کے دعوے دھرے کے دھرے رہ جاتے۔
ایسے ہی ایک مشاعرے میں اس کے پہلے استاد ہلال لکھنوی کے سامنے شمع محفل آئی تو انہوں نے غزل پڑھنے سے پیشتر جلال کو مخاطب کیا۔
''میں آپ کے سامنے کیا پڑھوں۔''
جلال نے کمال عاجزی سے جواب دیا۔ ''آپ مجھے کیوں شرمندہ کرتے ہیں میں وہی جلال ہوں جس نے آپ سے اصلاح لی ہے۔''
اس واقعے سے اس عزت وعظمت کا علم ہوتا ہے جو جلال کو حاصل تھی۔ اس سے بڑھ کر کسی شاگرد کی عظمت کی دلیل اور کیا ہوسکتی ہے کہ خود استاد اس سے غزل پڑھنے سے پہلے اجازت چاہے۔
وہ اجڑے لکھنو میں اپنی عظمت وشان کے ترانے گا رہا تھا کہ زمانے نے ایک اور کروٹ بدلی۔ واجد علی شاہ کے بعد بہادر شاہ ظفر بھی انگریزوں کا شکار بن گئے۔ ہندوستانی فوج نے انگریزوں کے خلاف بغاوت کردی اور جنگ آزادی کا آغاز ہوگیا۔ ابتداء میں مجاہدین کو فتح حاصل ہوئی لیکن پھر انگریزوں نے اس شورش کو دبا لیا۔ انگریزوں نے انتظام سنبھالتے ہی مسلمانوں پر ظلم کے پہاڑ توڑ دیے۔ لکھنو بھی دہلی سے کون سا دور تھا۔ چنگاریاں یہاں تک پہنچیں۔ لکھنو کے شرفاء دانے دانے کو محتاج ہوگئے۔ روزی کے تمام ذرائع ختم ہو جانے سے سراسیمگی عام ہوئی اور غدر فرو ہونے کے بعد بھی لکھنو دہلی کی طرح اس طرح تباہ ہوا کہ اپنے جوہروں کو سمیٹ نہ سکا اور مختلف اہل کمال مختلف سمتوں خصوصاً مسلمان ریاستوں کی طرف چلے گئے۔ ایک زمانہ وہ تھا جب اہمیت اس شاعر کو دی جاتی تھی جو دربار سے تعلق رکھتا تھا۔ یہ دربار شاہی دربار بھی ہوسکتا تھا اور امراء کے دسترخوان بھی۔ ایک فیشن سا بن گیا تھا کہ شعراء کسی نہ کسی امیر کے وظیفہ خوار ہوا کرتے تھے۔ جب دربار ہی نہ رہا تو کہاں کے امیر کہاں کے رئیس۔ کبھی میر تقی نے کہا تھا۔

ممکن نہیں کہ خاک مذلت سے ہی اٹھوں
افتادہ تر جو مجھ سے مرا دستگیر ہو

یہی حال اب لکھنو والوں کا تھا۔ مدد کرنے والے خود مدد کے محتاج تھے۔ بے روزگاری سے تنگ آکر بہت سے اہم شعرا مسلم ریاستوں کی طرف چلے گئے تھے۔ ان میں ریاست رام پور اور ریاست حیدرآباد خصوصیت رکھتی تھیں۔ اہمیت تو جلال بھی رکھتا تھا۔ اتنا گم نام نہیں تھا کہ کہیں جاتا تو تعارف کی منزل سے گزرنا پڑتا۔ امیر مینائی آخر لکھنو کے ہی تھے۔ جواب روم پور میں تھے اور عیش کر رہے تھے۔ لکھنو کے دوسرے شعراء بھی رام پور پہنچ چکے تھے۔
شعروادب کی ترقی کے لیے جس سرپرستی اور امن کی ضرورت ہوتی ہے وہ ان دنوں رام پور میں تھا۔ تمام ہندوستان کے اقابل لوگ ہر شعبہ فن سے تعلق رکھنے والے لوگ یہاں کھنچ کھنچ کر آرہے تھے۔ جو یہاں پہنچتا تھا اسے لکھنو یاد آجاتا تھا۔ شاعروں کی وہی کیفیت تھی، بخشش و انعام کی وہی گرم بازاری تھی۔ دہلی اور لکھنو کے شعرا یہاں جمع ہوگئے تھے۔ دونوں کے اتصال سے ایک نیا دبستان شعر جنم لے رہا تھا۔
وہ بھی چاہتا تو کسی ریاست کا رخ کر لیتا لیکن لکھنو کی زنجیر نے اس کے پیروں کو آزاد کرنے سے انکار کردیا۔ وہ لکھنو ہی میں جما رہا۔ کبھی اچھے وقتوں میں اپنے آبائی پیشے فن طب میں خاطر خواہ دسترس حاصل کرلی تھی۔ اس وقت وہی فن کام آیا۔ وہ مطب کھول کر بیٹھ گیا۔ یہاں بھی مریضوں سے زیادہ شعرا کی بھیڑ جمع رہتی تھی۔
وہ اس دور ابتلا میں سنبھل سنبھل کر قدم رکھ رہا تھا۔ شاعری سے پیٹ نہیں بھرتا چولہا نہیں جلتا۔ مطب سے ہونے والی آمدنی میں جیسے تیسے گزارا کر رہا تھا۔
رام پور کے نواب یوسف علی خان نہایت علم دوست، ہنر پرور اور شعرا کے مربی تھے۔ خود بھی شاعر تھے، ''ناظم'' تخلص کرتے تھے اور غالب کے شاگرد تھے۔ یہ تخلص انہیں غالب ہی نے عطا کیا تھا۔ ان کی سخن نوازی نے رام پور کو سخن کدہ بنا دیا تھا۔ جو وہاں گیا گویا فکر دنیا سے آزاد ہوگیا۔ اس دور کا رام پور گویا دوسرا لکھنو تھا، دن رات شعرو شاعری کے چرچے اور علم وفن کی باتیں ہوتیں۔ آپس میں حریفانہ معرکے

ہوتے۔ ان بحثوں سے دربار گونجتا رہتا۔ غرض یہ معلوم ہوتا تھا کہ رام پور لکھنو کی تجدید کررہا ہے۔

نواب یوسف علی خان کسی کام سے الہ آباد آئے ہوئے تھے۔ واپسی میں لکھنو میں بھی ٹھہرے۔ یہاں ان کی ملاقات جلال کے والد میر اصغر علی سے بھی ہوئی۔ انہیں جب یہ معلوم ہوا کہ میر اصغر علی، مصنف، طلسم ہوشربا، میر احمد حسن قمر کے شاگرد ہیں تو بہت خوش ہوئے۔

اس وقت تو کوئی تحریک نہیں ہوئی لیکن رام پور پہنچتے ہی انہیں میر اصغر علی کا خیال آیا۔ انہوں نے زادِ سفر بھیج کر انہیں رام پور طلب کرلیا اور انہیں ازراہ قدردانی داستان گوئی کے عہدے پر مامور کیا۔

ایک روز داستان سنانے کے دوران میر اصغر علی نے یہ غزل پڑھی۔

وہ گوندھی یار کی مشاطہ نے پری چوٹی
کہ صدقے کرتی ہے جس پر ہر اک پری چوٹی
نہ بھٹکے پھر دل سودا زدہ کبھی اتنا
کرے جو کوچۂ کاکل میں رہبری چوٹی
لگائے میرے دل مبتلا کو اک کوڑا
ضرور دے اسے تعزیر خود سری چوٹی
جو پرورش اسے عشاق کی ہے مدنظر
تو ہو دراز پے سایہ گستری چوٹی
جو بال کھلتے ہیں ان کے مہکتی ہیں گلیاں
کہ مشک نافہ ہے جوڑا تو عنبری چوٹی
جلال دیکھے کبھی شانہ دل صد چاک
نکل کے ایک کی چوٹی سے دوسری چوٹی

یہ اشعار نواب صاحب کو ایسے پسند آئے کہ بے اختیار ہوگئے۔ ”میر صاحب یہ اشعار کس باکمال شاعر کے ہیں۔“

”حضور یہ اشعار آپ کے خانہ زاد میرے بیٹے جلال لکھنوی کے ہیں۔“

”کیا ہی اچھا ہو اگر جلال ہمارے دربار میں ہو۔“

”حضور سے کیا پوشیدہ لکھنو کی جو حالت ہے آپ کے روبرو ہے۔ جلال بھی دوسروں کی طرح نکلنے کو تیار بیٹھا ہے۔ آپ حکم فرمائیں تو یہاں حاضر ہوجائے۔“

جلال طلب ہوا اور فوراً پچاس روپے ماہوار وظیفے پر ملازم رکھ لیا گیا۔

جلال کے لیے یہ پیشکش نعمت غیر مترقبہ تھی۔ پہلی بار معاش کا ذریعہ اور دل کا شوق ایک ساتھ میسر آگئے۔

شعروادب کی ترقی کے لیے جب سرپرستی اور امن کی ضرورت تھی وہ رام پور میں عام تھا۔ یہاں پہنچ کر جلال کو اس نئے ماحول سے مطابقت پیدا کرنے میں کوئی کوشش نہیں کرنی پڑی۔ بعض وہی شناسا صورتیں یہاں موجود تھیں جو کچھ عرصہ قبل لکھنو کی رونق بنی ہوئی تھیں۔

رام پور پہنچ کر ایک نیا مرحلہ پیش آیا اور وہ تھے حضرت داغ۔ انہوں نے کیف ونشاط، سادگی بیان اور سرمستی کو ایسے شوخ انداز میں باندھا کہ ان کا طوطی بولنے لگا۔ داغ کے کلام اور دہلی کے روایتی رنگ میں بہت کم چیزیں مشترک تھیں۔ ان کے ہاں نہ وہ مایوسی تھی نہ وہ سوز وگداز۔ انہوں نے شاعری کے ہلکے پھلکے پہلوؤں کو لیا اور ایسی چابکدستی اور فن کاری سے ان سبک پہلوؤں کی تصویر کھینچی کہ لوگ تڑپ اٹھے۔ جلال جب رام پور پہنچا تو ہر طرف داغ کا طوطی بول رہا تھا۔ امیر مینائی جیسا شاعر مقبولیت کے لیے داغ کے رنگ کو اپنانے کی کوشش کررہا تھا۔ وہ لکھنو کے دبستان کے لیے اپنی طبیعت کو دوسری طرف لگانے کی کوشش کی۔ یہ ایک شاعرانہ اسلوب کی تبدیلی سے کہیں زیادہ ایک زاویہ نظر کی تبدیلی چاہتا تھا اور زاویہ نظر کی تبدیلی اس وقت تک ممکن نہیں جب تک انسان کا دل و دماغ اس چیز کو قبول نہ کرلے۔ امیر کی زندگی ان کا مزاج ان کا اسلوب فکر بھی اس زاویہ نظر سے مختلف تھے۔ پھر یہ نیا رنگ ان پر کیسے چڑھتا۔ اس کے برخلاف جلال لکھنو میں رہتے ہوئے بھی ناسخ کے طرز شاعری کے ساتھ ساتھ شاگردان آتش کے نظریہ شعر سے بھی قریب تھا۔ آتش کی غزلیت اور سادگی زبان اس کے کلام میں سرائیت کرنے لگی تھی گو اس کا اظہار پوری طرح نہیں ہوا تھا لیکن لکھنو میں رہتے ہوئے بھی ایسے اشعار اس کے قلم سے نکلنے لگے تھے۔

اب تک ہے یاد آ کے وہ رہنا نگاہ میں
آنکھوں کو بھولتے ہی نہیں تم وہ خواب ہو

☆

ہنسی روکی گئی ان سے نہ ہم سے تھم سکے آنسو
برابر ایک سی دونوں طرف بے اختیاری تھی

☆

تغافل کے گلے سن کر جھکا لیں تم نے کیوں آنکھیں
مرے شرمندہ کرنے کو ذرا بے باک ہونا تھا

بے ساختگی جذبات اور واردات قلبیہ کے جو سبق

اسے شاگردانِ آتش کے اثر سے ملے تھے ان میں رام پور کے اثر نے مزید اضافہ کیا۔ اسے اس تبدیلی کے لیے زیادہ کاوش نہیں کرنی پڑی۔ صنعائی بیان، ندرت بیان، جذباتی رنگ، حلاوت و فصاحت سب کچھ اس کے یہاں نظر آنے لگی۔

اب جو وہ اس رنگ شاعری کے بعد داغ کے مقابلے پر آیا تو اس کے خلاف سازشوں کا بازار گرم ہو گیا۔ شاگردانِ داغ نے اسے نیچا دکھانے کے لیے حربے استعمال کرنے شروع کیے۔ ہر مشاعرے میں نوک جھوک ہونے لگی۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ ایک مشاعرے میں داغ کے شاگردوں نے طے کر لیا کہ جلال کی غزل پر کوئی داد نہیں دے گا۔ جلال کے پرستاروں نے اسے اطلاع دے دی کہ کیا سازش تیار ہوئی ہے۔ جلال نے کسی تنازع سے بچنے کے لیے مشاعرے میں جانے کا ارادہ فسخ کر دیا۔

''جب لوگوں کو میرا وجود برداشت نہیں تو میں مشاعرے میں کیوں جاؤں۔''

''آپ کا جانا اس لیے ضروری ہے کہ اگر آپ نہ گئے تو داغ کے شاگردوں کو ہنسنے کا موقع ملے گا۔ ان کی ہمتیں بڑھ جائیں گی اور انہیں اس سے بھی زیادہ گھناؤنی سازش تیار کرنے کا موقع ملے گا۔'' جلال کے پرستاروں نے کہا۔

''ایک شرط پر جاؤں گا۔'' جلال نے کہا۔ ''داغ کی غزل پر آپ لوگ خاموش نہیں رہیں گے جو شعر قابل ہوگا اس پر داد ضرور دیں گے۔''

جلال مشاعرے میں پہنچ گئے۔ داغ کے شاگردوں کے چہروں پر دبی دبی مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

مشاعرہ شروع ہوا اور شباب سے ہمکنار ہوا۔ داغ نے غزل پڑھی۔ داد و تحسین سے محفل گونج اٹھی۔ جب شمع جلال کے سامنے آئی تو محفل پر خاموشی چھا گئی۔ چار پانچ اشعار پڑھے گئے۔ محفل پر سکون کا عالم طاری تھا۔

طرحی مشاعرہ تھا لہٰذا جلال بھی انہی ردیف و قوافی میں غزل پڑھ رہے تھے جن میں داغ پڑھ چکے تھے۔ چار پانچ اشعار کے بعد جلال نے داغ کو مخاطب کیا۔

''میرا ایک مصرعہ آپ سے لڑ گیا ہے لہٰذا میں اس شعر کو ترک کرتا ہوں۔''

داغ نے اصرار کیا کہ شعر ضرور پڑھا جائے۔ داغ کے شاگردوں نے بھی اصرار کیا کہ شعر ضرور پڑھا جائے وہ شاید یہی سمجھ رہے تھے کہ داغ سے اچھا کیا ہوگا۔ ابھی پول کھل جاتی ہے۔

داغ کا شعر تھا۔

یہ تری چشم فسوں گر میں کمال اچھا ہے
ایک کا حال برا ایک کا حال اچھا ہے

جلال نے اپنا شعر پڑھا۔ دوسرا مصرعہ داغ کے مصرع سے لڑ گیا تھا لیکن پہلے مصرعے نے کمال کر دیا۔

دل مرا آنکھ تری دونوں ہیں بیمار مگر
ایک کا حال برا ایک کا حال اچھا ہے

سارے دعوے باطل ہو گئے۔ لوگ داد دینے پر مجبور ہو گئے۔ داد کے وہ ڈونگرے برسے کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔

داغ کے شعر میں جو ابہام رہ گیا تھا جلال کے شعر میں اس کی وضاحت ہو گئی تھی۔

اس قسم کی چشمکیں برابر جاری تھیں اور جلال ان سب میں سرخرو ہو رہا تھا۔ یہ خبریں نواب یوسف علی خان تک بھی پہنچ رہی تھیں۔ ان کی نظروں میں جلال کی قدر و منزلت بڑھتی جا رہی تھی۔ جلال ان کی ناک کا بال بنا ہوا تھا۔ دربار میں اکثر حاضر رہتا۔ نواب نئی نئی فرمائشیں کرتے اور وہ انعامات اور خلعتیں پاتا۔ ایک مرتبہ نواب نے ایک ایسے قصیدے کی فرمائش کی جس میں کوئی ایسا حرف بھی گرنے نہ پائے جس کا گرنا شعرا نے جائز سمجھا ہے۔ جلال نے قصیدہ لکھ کر خدمت میں گزارا۔

ہے شگفتہ ہر چمن وہ رنگ لائی ہے بہار
خوشی گل بے انتہا، مرغانِ گلشن بے شمار
جو شجر ہے باغ کا وہ کر رہا ہے شکرِ حق
خاک پر ہر شاخ سجدے کر رہی ہے بار بار
ہو چکی ہے جمع گو سب انجمن گلزار کی
چشم نرگس پر کسی کا کر رہی ہے انتظار

نواب ان دنوں بیمار تھے۔ قصیدہ سن کر بہت خوش ہوئے۔ جلال کو شاباش دی اور کہا کہ اس قصیدے کو جواہرات میں تلواؤں گا لیکن ان کا یہ وعدہ پورا نہ ہو سکا۔ علالت نے طول کھینچا اور جلال کو انعام نہ مل سکا اسی علالت میں نواب نے انتقال کیا۔ جلال انعام وصول کرنے کے بجائے قطعہ تاریخ وفات کہہ سکا۔

آں مغفرت مآب رہتی نمود کوچ
روئے بہ کاروان عدم دادہ یوسفے
گفتہ جلال مصرعہ تاریخ رحلتش

ورچاہ قبر حیف نبشادہ یوسفے
(۱۲۸۱ھ)

دھوپ اچانک سائبان سے نکل کر اس کے سر پر آگئی۔ نواب یوسف علی خان دنیا سے کیا اٹھے اس کا تو جیسے رزق ہی اٹھ گیا۔

نواب کلب علی خان تخت نشیں ہوئے تو جلال کی قدر و منزلت میں کمی آگئی۔ انہوں نے منشی مظفر علی اسیر کو اپنا استاد مقرر کیا۔ امیر مینائی کو عہدۂ قضا پر مامور کیا (اسیر کے انتقال کے بعد انہیں اپنا استاد مقرر کرلیا)۔ علاوہ بریں بحر، عروج، قلق وغیرہ بھی ان کے سایہ عاطفت میں جمع ہو گئے۔ جلال جیسے باکمال کو یہ شکوہ ہمیشہ رہا کہ اس کی قدر نہیں کی جارہی۔

نواب کلب علی خان کے دور میں شعر و سخن کا بازار مزید گرم ہوا۔ نواب صاحب خود بھی شاعر تھے۔ مزید یہ کہ علمی مباحث کا شوق بے انتہا تھا۔ صبح سویرے ریاست کا کام کیا کرتے تھے۔ سہ پہر کا وقت علمی مشاغل کے لیے وقف تھا۔ شعرا ''مصاحب منزل'' میں جمع ہوتے۔ یہاں علمی مباحث ہوتے ہر جمعہ کو محفل مشاعرہ برپا ہوتی جس میں قرب و جوار کے سب شاعر شریک ہوتے۔

علماء، فضلا، شعرا اور دیگر باکمال اصحاب کا جس قدر مجمع یہاں جمع ہو گیا تھا اس کی مثال شاہان مغلیہ اور شاہان اودھ کے درباروں میں ہو تو ہو دوسری جگہ نظر نہیں آئی۔

نواب کلب علی خاں کے زمانے میں شاعروں کے ساتھ ساتھ میلوں ٹھیلوں کی بھی دھوم مچی۔ نواب صاحب کثیر الاشغال نواب تھے۔ ایک طرف ان کا سینہ مذہبی تقدس سے آباد تھا۔ دوسری جانب موسیقی اور شاعری سے جنون کی حد تک لگاؤ تھا۔ اپنے اسی شوق کو انتہا سے ہمکنار کرنے کے لیے ایک میلے کی طرح ڈالی۔ شہر سے تین میل مشرق کی جانب بے نظیر کوٹھی تھی جو اپنے نام کی طرح بے نظیر تھی۔ یہ میلہ، جشن بے نظیر کے نام سے اسی کوٹھی کے باغ میں منعقد ہوتا تھا۔

میلے کے دنوں میں کوٹھی کو دلہن کی طرح سجایا جاتا تھا۔ روش روش پر چراغاں ہوتا تھا جیسے دلہن کی مانگ میں افشاں چنی ہو۔ ایک وسیع مہتابی تھی جس کے نیچے سے نہر نکلتی تھی۔ نہر کے دونوں جانب قندیلیں اور فانوس روشن کیے جاتے تھے۔ مہتابی پر رقص و سرور کی محفلیں اور مشاعرے آراستہ کیے جاتے تھے۔ رات کو نواب صاحب اپنے شاندار بجرے پر سوار ہو کر آہستہ آہستہ نہر میں سیر کو نکلتے تو بھانت بھانت کے سازندے اور موسیقار نہر کے دونوں کناروں پر کھڑے ہو کر اپنے فن کا مظاہرہ کرتے۔ مشاعرہ ہوتا تو شعرا اس جشن کی مناسبت سے قصیدے پیش کرتے۔ جلال کی طبیعت کو اس صنف سے نسبت نہیں تھی۔ کیونکہ لکھنو میں اس صنف کو ترقی نہ مل سکی لیکن اسے بھی خسرو باغ میں ہونے والے اس میلے کی توصیف میں ایک نہیں کئی مرتبہ لب کشا ہونا پڑا۔ حالانکہ اپنے کمالوں کے باوجود ان میلوں کی رونق وہ تھیں ہمیشہ داغ ہوا کرتا تھا لیکن ملازمت میں تو وہ بھی تھا۔ اپنا حصہ تو اسے بھی ڈالنا تھا۔ اس نے ایک سے زیادہ مرتبہ اس میلے کی تفصیلات بیان کیں۔

ایسا سرسبز گلستاں نہ کبھی دیکھا تھا
کشت اُمید رہے فیض سے جس کے شاداب
جن پر لہرائے طبیعت وہ روش لہروں کی
جن کا دم بھرنے لگے چشم تماشا وہ جناب
بیچ میں باغ کے اک جلوہ نما ہے کوٹھی
فرش اس کا شرف چادر عکسی مہتاب
جشن کی انجمن آراستہ اس کوٹھی میں
جلوہ گر تخت پر اک خسرو جمشید خطاب
زہرہ وش نغمہ سرا رقص کا ہنگامہ بپا
دم کش چنگ ہے کوئی کوئی دمساز رباب

کوئی شاعر کسی دربار سے وابستہ ہو اور وہ قصیدہ نگار نہ ہو یہ ممکن ہی نہیں۔ جلال کو مختلف تقریبات میں قصیدے پیش کرنا پڑے۔ وہ قصیدہ گو تو نہیں تھا لیکن شاعر تو تھا۔ بلند تخیل تو تھا۔ لہٰذا اس نے اس صنف میں بھی چابکدستی کا مظاہرہ کیا۔ وہ روایات کے پابند تھے اور اس عہد تک اردو قصائد کی روایات بہرحال مستحکم ہو چکی تھیں۔ سودا کے قصیدے کو اب کسی اور فنی اور اصطلاحی کانٹ چھانٹ کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔ جلال نے انہی قواعد و ضوابط پر اپنے قصیدوں کی ترتیب کی لیکن اس کے باوجود وہ دوسرے قصیدہ نگاروں کے ساتھ نہ چل سکا۔ ''تشبیب'' اور ''گریز'' کے مراحل سے تو وہ بخوبی گزر جاتا ہے لیکن جب وہ ممدوح کی تعریف رقم کرتا ہے تو اس کا قلم تھکا تھکا نظر آتا ہے۔ اس کی مدح اکثر بے جان اور پھیکی ہو جاتی ہے۔ اس کی انا پرست طبیعت کسی کی حد سے زیادہ تعریف کرتے ہوئے ہچکچاتی تھی اور ظاہر ہے نواب اور امراء اپنی حد سے بڑھی ہوئی تعریف چاہتے تھے۔ ان کے نزدیک وہ شعرا زیادہ قابل قبول تھے جو ان کی تعریف کرتے ہوئے زمین آسمان

ایک کردیں لہٰذا جلال کو وہ مقام حاصل نہیں ہوسکتا تھا جو دوسرے شعراء کو حاصل تھا۔

حسن طلب اور خاتمہ سخن اس کے ہاں عموماً دعائیہ شکل اختیار کرلیتا تھا۔ وہ اظہار مدعا صاف لفظوں میں کرنے کا عادی نہیں۔ اس کا قلم مانگنے کے لفظ سے عاری تھا۔ یہی اس کی کمزوری بھی تھی یہی خوبی بھی۔

☆......☆

رام پور میں دہلی اور لکھنو کے شعرا جمع ہوئے تو دونوں دبستانوں کے شعرا نے زبان دانی کا دعویٰ کیا اور اپنے محاورات و اصطلاحات رائج کرنے کے لیے کوششیں کرنے لگا۔ ان جھگڑوں نے یہ شکل اختیار کرلی کہ ہر استاد کو زبان کے بارے میں متروکات اور نکات کی وضاحت کرنے کی ضرورت پیش آئی۔

اس نے زبان کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا اور ایسے الفاظ ترک کردیے جو غیر مانوس اور غیر فصیح تھے اور یا لغوی حیثیت سے غلط یا سقیم تھے۔ اپنے شاگردوں کو مجبور کیا کہ وہ اس پر سختی سے کاربند رہیں۔ ایک رسالہ نیرنگ رام پور سے نکلتا تھا اس نے ایسے الفاظ کی فہرست اس رسالے میں شائع کیے۔ ایک رسالہ شروکات بھی ترتیب دیا۔ وہ ناسخ کے شاگردوں کا شاگرد تھا لہٰذا اس نے ناسخ کے اصولوں کو بھی پیش نظر رکھا لیکن آتش نے زبان میں جو تبدیلیاں کی تھیں انہیں بھی درخور اعتنا سمجھا گویا وہ آتش و ناسخ کو قریب لانے میں معاون ثابت ہوا۔ ان میں وہ الفاظ بھی شامل تھے جو اس کے ہم عصروں نے ترک کردیے تھے لیکن جلال نے ان کا استعمال جائز قرار دیا مثلاً ''لکھا'' جلال نے تشدید و تخفیف دونوں طرح جائز قرار دیا۔ ''واں'' اسم اشارہ ہے جسے بحر اور منیر دونوں نے ترک کردیا تھا۔ جلال نے جائز قرار دیا اور آج تک چلا آتا ہے۔ اوتھا، انہوں کا (بجائے انہوں نے) تم سوا، حورا بجائے حور اور اس جیسے سیکڑوں رائج الفاظ متروک کردیے۔ یہ الفاظ آج بھی متروک سمجھے جاتے ہیں۔ اب اوس سوا کوئی نہیں لکھتا بلکہ اس کے سوا لکھتے اور بولتے ہیں۔ اس نے دیکھو، لیجو، کیجو سب متروک قرار دیے اور آج تک متروک چلے آتے ہیں۔

زبان کو صاف اور رواں بنانے میں جلال کی خدمات فراموش نہیں کی جاسکتیں۔

متروکات کے بعد لکھنو اور دہلی کے درمیان تذکرو تانیث کے مسئلے پر جھگڑے ہوتے چلے آئے تھے۔ جب رام پور میں..... دونوں دبستانوں کے اساتذہ ایک جگہ جمع ہوئے تو یہ مسئلہ اور بھی شدومد سے اٹھا۔ ایک لفظ جو دہلی میں مذکر بولا جاتا تھا لکھنو میں وہی مونث بولا جاتا۔ ایک غیر جانب دار دربار (رام پور) میں جو دونوں دبستانوں کے لیے اجنبی تھا وہاں کا حکمراں جذباتی وابستگی سے نہیں عقلی دلائل سے اور مستند مثالوں سے بات مان سکتا تھا۔ ہر دبستان کا شاعر اپنے دبستان کو رواج دینے پر بضد تھا۔ نواب رام پور چاہتے تھے کہ یہ دورنگی ختم ہو۔ کوئی لفظ اگر مونث ہے تو ہر جگہ مونث ہی بولا جائے۔ جلال نے اس ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے ''مفید الشعرا'' کے نام سے تذکیر و تانیث پر ایک رسالہ لکھا۔ مثالوں کے لیے اس نے معتبر زبان دانوں کے اشعار کا چناؤ کیا تھا۔ اس کی بالانصاف طبیعت کا اظہار اس بات سے لگایا جاسکتا تھا کہ اس نے اساتذہ لکھنو کے اشعار سے بھی سند لی تھی اور اساتذہ دہلی کے کلام سے بھی بلکہ بعض اوقات تو اس نے ''ناسخ'' سے بھی اختلاف کیا تھا۔ ''نشوونما'' کو ناسخ نے مذکر باندھا تھا۔

خط کو روئے یار پر نشوونما ہوتا نہیں
سبزۂ بے گانہ گل سے آشنا ہوتا نہیں

جلال نے اسے مونث قرار دیا اور اپنے شعر میں باندھا بھی۔

طول امل سے ہوتی ہے نشوونما کے

ناسخ کے مقابلے میں بحر کا یہ مصرعہ بطور سند پیش کیا۔

گل کھلاتی ہے عجب نشوونما ساون کی

''گزند'' کو آتش نے مذکر باندھا تھا۔

ظالم سے اہلِ فیض کو ہوتا نہیں گزند

جلال نے اپنے دبستان شاعری کے محترم استاد ناسخ کے مقابلے میں آتش کے شاگرد صبا کی پیروی میں اسے مونث قرار دیا۔

صبا نے کہا تھا۔

گیسوئے یار سے کس کس کو گزندیں پہنچیں

بات یہ تھی کہ جلال، اختلاف اور اتفاق جذباتی ہونے کے بجائے تحقیق کرنے کے بعد کرتا تھا اگر اس کی رائے شاگردان آتش کی رائے کے موافق ہوئی تو وہ بلالحاظ اس کے کہ اس رائے کے خلاف ناسخ اور رشک جیسے اساتذہ کی شہادتیں موجود ہیں اس نے شاگردان آتش کی رائے سے اتفاق کیا۔ کسی تعصب سے کام لیے بغیر جو بات اس کی عقل نے صحیح سمجھی اس نے وہ لکھی۔ بلبل کو اساتذہ نے

دونوں طرح باندھا تھا یعنی مذکر بھی اور مونث بھی۔
''بلبل گلوں کو دیکھ کے تجھ سے بگڑ گیا'' (آتش)
''کیا کی گل سے بلبل حیلہ در دگلو برسوں'' (رشک)
جلال نے صرف اس لیے ''بلبل'' مونث کے طور پر قبول نہیں کیا کہ اس کے استاد رشک نے اسے مونث باندھا یا اس لیے مذکر تسلیم نہیں کیا کہ آتش نے اسے مذکر باندھا تھا بلکہ اس کی عقلی توجیہہ بھی کی۔
''مولف (جلال) بلبل کی تانیث ہی کا قائل ہے اور ایک دلیل قیاسی بھی اس کی تانیث پر رکھتا ہے کہ اس قبیل کے اکثر جانور مانند مینا، کوکلا، شاما...... مونث بولے جاتے ہیں پس بلبل کا استعمال بھی مونث کے طور پر اچھا معلوم ہوتا ہے۔'' (مفید الشعراء)
تذکیروتانیث کے الجھے ہوئے مسائل کو پہلی بار اس قدر صاف طور پر جلال ہی نے سوچا تھا اور جس طرح رسالہ مرتب کر کے تمام اسما کا احاطہ کیا تھا اور استدلال کے ساتھ شبہات کو دور کیا تھا لکھنو اور دہلی کے تذکیروتانیث کے اکثر جھگڑوں کا عقلی حل پیش کیا تھا۔ اس کی یہ کوشش قابلِ داد تھی لیکن اس کی اس کوشش پر نہ صرف دہلی کے لوگوں نے شور مچایا بلکہ خود لکھنو کے اہلِ زبان حضرات نے بھی ایک طومار باندھ دیا۔ ہر طرف سے اعتراضات کی بوچھاڑ ہونے لگی۔ اخبارات ورسائل کے صفحات ان جھگڑوں کے لیے وقف ہو گئے اور ہر طرف ایک ہلچل مچ گئی لیکن اس نے اپنی رائے کو تبدیل نہیں کیا۔
اس وقت تک کوئی قابلِ ذکر لغت اردو موجود نہیں تھی۔ فورٹ ولیم کالج کے کچھ اساتذہ نے یہ سوچا ضرور تھا کہ کوئی مفید مطلب لغت تیار ہو سکے اور ایسی کئی لغت تیار بھی ہوئیں۔
اس تحریک کے پہلو بہ پہلو لکھنو میں ناسخ کی اصلاح زبان کی تحریک نے لغت کی ضرورت کا احساس بڑھتا جا رہا تھا۔ اس سلسلے میں کچھ کوششیں بحر اور رشک جیسے شعرا نے کی بھی تھیں۔ ان کوششوں کو دیکھ کر جلال ان کی خامیوں پر غور کر رہا تھا اور اس نتیجے پر پہنچ رہا تھا۔
''جب سے اردو معلیٰ نے اپنے علم ایجاد کو میدان گاہ سخن میں بلند کیا کسی سخنور اردو زبان نے کوئی لغت ایسا کہ جامع ہو جملہ مفردات و مرکبات یعنی لغات محاورات و کنایات و مصطلحات و مثل ہائے زبان اردو کا اور بعضے ان لغات کا جن میں باہم فصحا میں اختلاف ہے یعنی کچھ فصیح کسی طرح ان لغات کو بولتے ہیں کچھ فصیح کسی طرح بولتے ہیں آج تک نہیں لکھا گیا۔''
اسی ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے اس نے ''سرمایۂ اردو'' کا ڈول ڈالا۔ اس نے اس لغت کی ترتیب میں زیادہ زور الفاظ کے معنی اور لغات کی تفصیل میں نہیں دیا گیا بلکہ محاورات وامثال بروقت صرف کیا۔
جلال کی اس تصنیف سے بھی اس کی قوت تحقیق کا علم ہوتا تھا۔ اسی تصنیف میں شامل اکثر محاورے صرف روزمرہ کی بات چیت میں آتے تھے۔ کسی استاد کے کلام سے سند پیش کرنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس نے یہ کمال کر دکھایا کہ نہایت جانکاہی سے یہ محاورے اساتذہ کے کلام میں تلاش کر ڈالے مثلاً ''پیٹ کا ہلکا'' اس محاورے کی تلاش میں اس نے دیوان کے دیوان کھنگال ڈالے اور بالآخر اس کی مثال ''بحر'' کے یہاں مل گئی۔

بڑ مار اٹھا چھپ نہ سکا راز محبت
ہر مست ہے، شیشے کی طرح پیٹ کا ہلکا

اسی طرح پیٹ لگ جانے کا محاورہ ناسخ کے ہاں ڈھونڈ نکالا۔

روٹی ہی کا رس کو ہے تصور دن رات
لگ جائے نہ کس طرح چپاتی سا پیٹ

پیٹ میں پانی نہ پچنا کی نظیر اس شعر میں پیش کی۔

شیشے کی طرح پیٹ میں پچتا نہیں پانی
پی ہے مے غم راز چھپایا نہیں جاتا

''سرمایہ اردو'' میں بہت سی خامیاں رہ گئی تھیں۔ سب سے بڑی خامی اور کمی تو یہی تھی اس نے لغت میں جن مصطلات اور محاورات کا تذکرہ کیا تھا وہ زیادہ تو وہی تھے جو لکھنو میں بولے جاتے تھے۔ دہلی کو بالکل نظرانداز کر دیا گیا تھا۔
اس کے باوجود اس کے دوررس اثرات مرتب ہوئے۔ اس کو بنیاد بناتے ہوئے امیر مینائی نے امیر اللغات تصنیف کی۔
چراغ سے چراغ اسی طرح جلتے ہیں۔

☆......☆

اس کی شاعری کی شگفتگی، شعریت اور گھلاوٹ سے قطع نظر زبان کے بارے میں اس کی خدمات کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس نے مختلف رسائل لکھ کر ان مسائل کے حل پیش کیے۔ شاعروں کے سامنے خصوصاً اور ایک عام

سخن فہم کے سامنے جو مسائل اس وقت درپیش تھے ان سب کا حل جلال نے پیش کیا۔ تذکیر و تانیث کے جھگڑے، لغات زبان کے اختلافات، قواعد زبان کے قصے، محاورات اور روزمرہ کے تنازع، ان تمام امور پر اس نے اپنے خیالات کا اظہار کیا اور اصلاح زبان کا حق ادا کیا۔ وہ ایسی تصنیفات پیش کر رہا تھا کہ اردو زبان ہمیشہ کے لیے اس کی احسان مند ہوتی۔

اس کے ہم عصروں نے اس کی شاعری کو نیچا دکھانے کے لیے اس کی اسی صلاحیت کا سہارا لیا اور اسے شاعر نہیں محض ''عروضی'' کہہ کر نظر انداز کرنے کی کوشش کی۔ عروضی سے مراد ایک ایسا شاعر ہوتا تھا جو فن پر تو عبور رکھتا ہو لیکن اس کا کلام مضامین کی لطافت، درد و اثر، جذبات آفرینی اور شیرینی گفتار سے خالی ہو۔ عروضی کہنا کسی شاعر کا مذاق اڑانا اور اس کی توہین کے مترادف تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ اس کا کلام ان تمام خصوصیات کا حامل تھا جن خصوصیات سے انکار کیا جا رہا تھا۔

جلال نے ناسخی رنگ کی خشکی، آورد، لفظی صناعی اور خیال بندی کو پس پشت ڈال کر اپنی غزل کی بنیاد غزلیت اور لطافت زبان پر رکھی تھی۔ کم از کم دوسرا دیوان مرتب کرتے وقت اس کی غزلیں سادگی، وقار اور درد و کیف کی حامل ہو گئی تھیں۔ اس کی ایک وجہ تو اجڑے ہوئے لکھنؤ کی یادیں تھیں اور کچھ رام پور میں اپنی ناقدری کے احساس نے اس کے کلام کو رنج و الم سے معمور کر دیا تھا۔ اس نے کتنی سچی بات کہی تھی۔

بے ساختہ کی تھام کے دل اس نے جلال آہ
جس نے مرے دیوان کے اشعار کو دیکھا

یہ محض اس کا دعویٰ نہیں تھا بلکہ ایک مرتبہ تو اس دعوے نے عملی صورت اختیار کر لی۔ رام پور میں اس کے دیوان ''کرشمہ گاہ سخن'' کی کتابت ہو رہی تھی۔ کاتب صاحب اتفاقاً صوفی تھے۔ جب اس شعر پر پہنچے۔

وہ آنکھ ہی نہیں ان کو ملی کہ حضرت شیخ
بتوں میں قدرت پروردگار دیکھیں گے

فوراً ایک چیخ ماری اور بے ہوش ہو گئے۔

اس کے باوجود اگر اسے محض عروضی کہا جا رہا تھا تو یہ پیشہ وارانہ رقابت کے سوا کچھ نہ تھا۔

یہ اس کا کوئی کم کمال نہیں تھا کہ لکھنؤ کا ایک مستند شاعر پہلی بار اپنے کلام کی بنیاد داخلیت اور واردات قلب کے ان عناصر پر رکھی جو قدما کی شاعری کی جان تھے۔ اس کے کلام میں ناسخ کی خصوصیات بھی تھیں اور وہ فطری مضامین بھی جن سے داخلیت کی کونپلیں پھوٹتی ہیں۔ اس پر مستزاد اس کا پختہ اور منجھا ہوا انداز بیان۔

کہہ دے ذرا اس خانہ بر انداز سے کوئی
روتا ہے کہیں درد کی آواز سے کوئی

☆

جس دل کو پوچھتا تھا وہ ہم نے بتا دیا
لے درد عشق تجھ کو ٹھکانے لگا دیا

☆

جب سے عیادت دل بیمار تم نے کی
اٹھ بیٹھتے ہیں آپ سے اتنا سنبھل گئے

اس کا مقابلہ داغ سے تھا اور داغ کی شبابیات اور بے باکی کے مقابلے میں جلال نے جس رنگ کو پیش کیا وہ قدما کی سنجیدگی لیے ہوئے تھا۔

اس نے داغ کے رنگ میں کہنے کی کوشش کرنے کی بجائے اس کے مقابلے میں ایک نئی راہ پیش کی اور یہ نئی راہ سفلی عشق کرنے کی بجائے معشوق کا ایک اعلیٰ اور پاکیزہ مفہوم برقرار رکھنا تھا جو قدما کی شاعری کا طرۂ امتیاز تھا۔

☆......☆

جلال نے جب آنکھیں کھولیں تو اس کے سامنے دو راستے تھے ایک ناسخ کا راستہ جس میں زلف و گیسو کی سیاہی نے ہر طرف تاریکی پھیلا رکھی تھی۔ دوسرا آتش اور تلامذہ آتش کا صراط مستقیم۔ اس نے قدم تو پہلے ہی راستے پر رکھا تھا لیکن اس نے آتش اور شاگردان آتش کے سوز و گداز کو اپنا لیا۔ اس میں کچھ حصہ لکھنؤ کی تباہی اور جلال کی درد آشنائی کی صورت میں آئی تھیں۔ انہی حادثات نے اسے پہلی بار لفظی گورکھ دھندے اور بے رنگ خیال بندی سے نکال کر اصل غزلیت کی طرف متوجہ کر دیا تھا۔ صرف اتنا ہوا کہ رام پور کے قیام اور اجتماع شعرا نے اسے اور بھی گہرا کر دیا اور وہ اس انداز کے شعر کہنے لگا۔

اللہ رے غمزے ترے اے موت شب ہجر
معشوق بھی آتا نہیں اس ناز سے کوئی

☆

کیا وحشت صیاد ہے مرغان چمن کو
روتا نہیں شبنم صنعت آواز سے کوئی

☆

تغافل کے گلے سن کر جھکا لیں تم نے کیوں آنکھیں
مجھے شرمندہ کرنے کو ذرا بے باک ہونا تھا
کسی نے اس کی غزلوں کا رنگ دیکھ کر کہا تھا۔
''اگر قدرت سرزمین اودھ سے جلال کو پیدا نہ کرتی تو دور ناسخ کے گناہوں کا کفارہ کسی طرح ممکن نہ تھا۔''

☆......☆

شاعرانہ کمال اور اپنی ناقدری کے احساس نے اس کے مزاج میں حد سے بڑھی ہوئی خودداری پیدا کردی تھی جو بادی النظر میں غرور و تکبر سے تعبیر کی جاسکتی تھی۔ جب وہ یہ دیکھتا تھا کہ اس کے معاصرین کی اس سے زیادہ قدر و منزلت کی جارہی ہے تو اس کے غصے میں مزید اضافہ ہوجاتا تھا۔ امیر مینائی دو سو روپے ماہوار کے حق دار ٹھہرے اور اسے پچاس روپے ماہوار مل رہا تھا۔ داغ تھے کہ نواب کے پہلو سے لگے بیٹھے تھے۔ مشاعروں میں بھی ان ہی کا طوطی بول رہا تھا۔ داغ کی رنگیں بیانی سے انکار نہیں لیکن ریاستوں میں کیا خواص کیا عوام سب کے سب نواب کی خوشنودی کو مدنظر رکھتے تھے۔ سب دیکھ رہے تھے کہ امیر مینائی، نواب کے استاد اور داغ ہر وقت کے ساتھی ہیں۔ انہیں خوش رکھو تا کہ نواب بھی خوش ہوں۔ ہر ایک کو کہاں عرفان کمال۔ جب نواب خود شاعر ہو تو اہم ترین شعرا بھی اس کی تعریف میں زمین آسمان ایک کردیتے ہیں اور اسے اس غلط فہمی میں مبتلا کردیتے ہیں کہ وہ عہد ساز شاعر ہے۔ حکمرانی کی غلطیوں کی نشاندہی کرنے کی ہمت کسی میں نہیں ہوتی۔

جلال اپنے نام کی طرح تھا۔ لگی لپٹی رکھنے کا قائل ہی نہیں تھا۔ وہ شاعر کیسا بھی ہو فن پر مکمل عبور رکھتا تھا۔ معمولی سی غلطی بھی اس کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوسکتی تھی۔ بھرے دربار میں غلطی پکڑ لیتا تھا۔ اس وجہ سے اکثر ناچاقیاں ہوجاتی تھیں۔ اس معاملے میں وہ نواب کی مروت بھی نہیں کرتا تھا۔ ایک مرتبہ نواب نے غزل پڑھی۔ بعض نے تعریف کی۔ ایک آدھ نے خاموشی اختیار کرلی۔ جلال خاموش نہ رہ سکا اس نے جھٹ اعتراض جڑ دیا۔ بھرے دربار میں غلطی پکڑی گئی تو نواب تلملا اٹھے لیکن جواب خود نواب کے پاس بھی نہیں تھا۔ آخر کار اعتراض تسلیم کرنا ہی پڑا۔

جب ایسے کئی واقعات ہوچکے تو ایک مرتبہ نواب نے تنگ آکر جلال کو ریاست سے نکل جانے کا حکم دے دیا۔

جلال کے لیے یہ حکم تکلیف دہ تھا لیکن تعمیل کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔

تعمیل حکم میں وہ رام پور سے نکلا۔ ابھی سرحد تک بھی نہیں پہنچا تھا کہ شاہی کارندے اسے روکنے کے لیے آگئے۔

''سرکار کا حکم ہے کہ آپ رام پور نہ چھوڑیں۔''

''ان کے حکم ہی سے جارہا ہوں۔''

''اب ان ہی کے حکم سے روکا جارہا ہے۔''

اسے واپس آنا پڑا لیکن غصہ ابھی تک فرو نہیں ہوا تھا۔ نواب کے روبرو پہنچے تو گلہ کیا۔ ''آپ مجھے نہ جانے دیتے ہیں نہ رہنے دیتے ہیں۔''

''اب ہمارے جیتے جی کہاں جاؤ گے۔ یہ شعر و شاعری کے جھگڑے تو ہوتے ہی رہتے ہیں اور انہی میں مزہ ہے۔''

''یہ جھگڑے پھر کبھی دل شکنی کا باعث بنیں گے۔''

''ہم کوشش کریں گے کہ یہ نوبت نہ آئے۔''

کچھ دن خاموشی رہی۔ مصاحب منزل میں جلسے روز ہی ہوتے تھے۔ جلال نے بھی طے کرلیا تھا کہ اب وہ کسی معاملے میں نہیں بولے گا لیکن جب کوئی معاملہ الجھتا، اس سے رجوع کیا جاتا اور اسے بولنا پڑتا۔ مصلحت اس کے نزدیک سے ہوکر نہیں گزری تھی۔ وہ بے باکی سے نواب کے کلام میں پوشیدہ غلطیاں پکڑتا رہتا اور درباری شعرا اس کی ان جسارتوں کو گستاخیوں سے تعبیر کرتے رہتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بدمزگیاں بڑھتی چلی گئیں۔

داغ تو یہ کہہ کر چپ ہوگیا تھا۔

ہر چند رام پور میں گھبرا رہا ہے داغ
کس طرح جائے کلب علی خاں کو چھوڑ کر

لیکن اس نے بے دلی کو بہانے میں چھپایا۔ بڑھاپے کا عذر کیا۔ خدا جانے اور کیا بہانے تراشے، نواب سے اجازت مانگی اور لکھنؤ کی طرف پلٹ گیا۔ کبوتر چھتری تک آتو گیا لیکن دانہ کب تھا کہ چونچ مارتا، نیچے جھانک کر دیکھا تو صرف چھتری کھڑی تھی دور تک کا علاقہ ویران تھا۔ کبھی وہ ڈالی گنج والے مکان میں مقیم تھا لیکن وہ تو غدر کے ہنگامے ہی میں منہدم ہوگیا تھا۔ وہ علاقہ بھی ابھی تک سنسان پڑا تھا۔ اس نے ایک دور افتادہ محلہ منصور نگر میں مکان لیا اور گمنامی بلکہ روپوشی کے دن کاٹنے لگا۔

وفاداری کا اتنا ثبوت دیا کہ نواب کلب علی خان کو اپنی خیریت کا خط لکھ دیا۔ فائدہ یہ ہوا کہ گھر بیٹھے وظیفہ آنے

لگا۔ خفگی نے چہرے پر مسکراہٹ طاری کی۔ دو چار خطوں کے بعد بے تکلفی بڑھی تو چھیڑ چھاڑ پھر شروع ہوگئی۔ کبھی ایک دوسرے کی غزلوں میں مین میخ نکالتے۔ کبھی ایک دوسرے کو چیلنج دیتے کہ اس طرح پر غزل کہہ دو تو ہم جانیں۔ وظیفہ ملتا رہا رام پور سے تعلق قائم رہا۔

ایک مرتبہ پھر نواب سے بگڑ گئی۔ وظیفہ آنا بند ہوگیا۔ مصارف وہی تھے آمدنی بند ہوگئی۔ اسے پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ وہ لکھنو آگیا ہے رام پور بہت پیچھے رہ گیا۔

"میں کہتی ہوں کسی ریاست سے تعلق کے لیے کوشش کیوں نہیں کرتے۔ کچھ ہی دن میں زندگی بیمار کی رات بن کر رہ جائے گی۔ بیٹے کی شادی الگ سر پر کھڑی ہے۔"

"ریاستوں میں اب رہ ہی کیا گیا ہے۔ پھر جاؤں تو کیسے جاؤں۔ بن بلائے مہمان کو پوچھتا کون ہے۔"

"پھر کیا سوچا ہے آپ نے۔"

"میں بھی تو پاؤں توڑ کر بیٹھ گیا ہوں۔ گھر سے نکلتا ہوں۔ سیکڑوں شاگرد ہیں کوئی نہ کوئی سبیل نکل ہی آئے گی۔"

وہ گھر سے نکلا ضرور شاگردوں کو اپنے حال سے آگاہ بھی کیا لیکن روزگار کی کوئی سبیل نہ نکل سکی بلکہ اس کی بد دماغی سے شاگردوں تک کو شکایت پیدا ہوگئی۔

علمی مسائل میں اس کی صاف گوئی اسے لکھنو میں بدنام کیے ہوئے تھی۔ وہ نواب کلب علی خان کو رعایت نہ دے سکا تھا۔ شاگردی اور ہم عصروں کے ساتھ کیا رعایت برتتا۔

نواب مہدی حسن خان رفعت جلال کے شاگرد تھے۔ انہوں نے ایک مشاعرے میں یہ شعر پڑھا۔

اس قدر طول یہ بڑھنا یہ درازی توبہ
حشر میں تجھ سے خدا اے شب ماتم سمجھے

جلال کے ایک شاگرد نے ان کے اس شعر پر اعتراض کردیا اور شب ماتم کو مہمل بتایا۔ نواب صاحب ذی وقار آدمی تھے۔ جلال کی مدد کرنے والوں میں بھی سب سے آگے تھے۔ انہوں نے اس خیال سے کہ جلال ان کے احسانات کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کی حمایت میں فیصلہ دیں گے۔ جلال سے رجوع کیا۔ جلال نے اعتراض سے اتفاق کیا۔ نواب صاحب اتنے ناراض ہوئے کہ اس کی شاگردی سے ہی انکار کردیا۔

وہ نواب صاحب کی طرف سے ملنے والی امداد سے محروم ہوگیا لیکن اس نے حق بات کہنے سے گریز نہیں کیا۔

اس سے ناراضی کے باوجود لوگوں کو اس کی استادی میں کوئی کلام نہیں تھا۔ عروض و فن کے مسائل کے لیے لوگ جلال ہی سے رجوع کرتے۔ اس کے دلائل سند سمجھے جاتے تھے لیکن اس قدر و منزلت کے باوجود اس کی اقتصادی حالت بے اطمینان تھی۔

وہ غربت کی چادر میں بھی کسی نہ کسی طرح پاؤں پھیلائے رہتا لیکن اپنی شاعرانہ عظمت کی ناقدری دیکھ کر افسردہ ہو جاتا تھا۔ اس کے ہم عصر امیر مینائی کو نواب رام پور کی استادی نے "امیر الشعرا" بنا دیا تھا۔ داغ کو دربار

جاوید میاں داد

1957ء میں پیدا ہوئے۔ پاکستان کے عظیم بلے باز اور سابق کپتان رہے۔ وہ کراچی میں میاں داد کے ہاں پیدا ہوئے۔ انہوں نے فرسٹ کلاس کرکٹ کا آغاز 1973-1974ء میں کراچی ٹیم کی طرف سے کھیل کر کیا۔ پہلا ٹیسٹ نیوزی لینڈ کے خلاف 77-1976ء میں کراچی میں کھیلا اور اپنے پہلے ٹیسٹ کی پہلی اننگز میں سنچری بنا کر خالد عباداللہ کے بعد دوسرے پاکستانی کھلاڑی ہونے کا اعزاز حاصل کیا۔ وہ دنیا کے واحد کھلاڑی ہیں جنہوں نے چھ کے چھ ورلڈ کپ مقابلوں میں حصہ لے کر عالمی ریکارڈ قائم کیا۔ اپنے کیریئر میں 124 ٹیسٹ کھیلے اور 8332 رنز 52.57 کی اوسط سے اسکور کیے۔ جن میں 23 سنچریاں شامل ہیں۔ جب کہ ان کا بہترین اسکور 280 رنز تھا جو کہ انہوں نے حیدرآباد میں بھارت کے خلاف 1982-83ء میں کیا۔ انہوں نے 34 ٹیسٹ میچوں میں کپتانی کے فرائض سرانجام دیے۔ ان میں سے 14 جیتے، 6 ہارے اور 14 برابر رہے۔ انہوں نے 233 ون ڈے انٹرنیشنل میچوں میں پاکستان کی نمائندگی کی اور 7381 رنز 8 سنچریوں کی مدد سے بنائے۔ 62 میچوں میں کپتانی کی، 27 جیتے، 32 ہارے اور 2 میچوں کا فیصلہ نہ ہو سکا جب کہ ایک میچ ٹائی رہا۔ پرائیڈ آف پرفارمنس بھی حاصل کیا۔ ورلڈ کپ 1996ء کے بعد ریٹائرمنٹ کا اعلان کردیا۔ انہیں 1992ء میں حکومت پاکستان نے ستارۂ امتیاز سے نوازا۔

نظام حیدرآباد کی استادی نے ''فصیح الملک'' اور بلبل ہندوستان بنا دیا تھا اور وہ نواب زادوں اور رئیسوں کو قیمتاً غزلیں لکھ لکھ کر دے رہا تھا۔

وہ کسی خطاب اور قدر دانی کے بغیر ناکامی کی زندگی گزار رہا تھا۔ حالانکہ وہ اپنے ہم عصروں کے مقابلے میں شہرت وعظمت کا زیادہ مستحق تھا۔ داغ کی ہلکی پھلکی شاعری قبول عام تھی۔ داغ کی شاعری کے سطحی مضامین نے اردو شاعری میں ایک نئے لہجے کی بنیاد ڈال دی تھی۔ امیر مینائی جیسے ثقہ شاعر نے بھی داغ کی پیروی ہی میں عافیت ڈھونڈی تھی۔ جلال اپنا رنگ شاعری آخر تک تبدیل نہ کر سکا۔ اسے زبان دانی کا دعویٰ تھا۔ اسے تو بس یہ ناز تھا کہ وہ محاورے کو صحیح طور پر ادا کرتا ہے۔ اس معاملے میں کوئی اس کا مدمقابل نہیں تھا۔ یہ اس کا وہ جوہر تھا جسے عوام پوری طرح سمجھ نہیں سکتے تھے لہٰذا اس کی ناکامی یقینی تھی۔ اپنی اسی توہین نے اسے نازک دماغ بنا دیا تھا۔ جتنی جتنی اس کی توہین ہوتی گئی اتنا ہی وہ غرور میں مبتلا ہوتا گیا۔

وہ لکھنو کے دبستان شاعری کی تنہا آواز تھا جسے کوئی سننے کو تیار نہیں تھا۔

وہ گونگا بنا اپنے آشیانے میں بیٹھا تھا کہ آنکھوں میں خواب کی طرح اسے ایک خط ملا۔ یہ خط ریاست منگرول واقع کاٹھیاواڑ کے علم پرور حکمراں نواب شیخ حسین میاں کی جانب سے لکھا گیا تھا اور اسے کاٹھیاواڑ آنے کی دعوت دی گئی تھی۔

نواب شیخ حسین میاں نے ایک تذکرے میں اس کے حالات پڑھے تھے اور نمونہ کلام ان کی نظروں سے گزرا تھا۔ یہ خبر بھی ان تک پہنچ چکی تھی کہ جلال کا تعلق دربار رام پور سے منقطع ہو گیا ہے لہٰذا انہوں نے اسے منگرول (کاٹھیاواڑ) طلب کرنے کے لیے خط لکھ دیا۔ اس خط میں اسے یقین دلایا گیا تھا کہ اس کی ضرورتوں کا ہر طرح خیال رکھا جائے گا۔

دعوت نامے کے جواب میں وہ خود منگرول پہنچ گیا۔ نواب صاحب کے پرائیویٹ سیکریٹری محمد عمر جنون نے خیر مقدم کیا اور نہایت عالی شان مکان میں قیام کا بندوبست کیا۔

چند روز کے آرام کے بعد وہ نواب صاحب سے ملاقات کے لیے گیا۔ ان کی شان میں قصیدہ گزارا۔

بلند شان و معلیٰ نشاں حسین میاں
خدیو ہم حشم آقا و قدردان جلال

نواب تو قدر دانی کے لیے تیار بیٹھے تھے۔ وہ مرید نہیں مراد تھا۔ خط بھیج کر بلوایا گیا تھا۔ قصیدے کے جواب میں خلعت عطا ہوا اور ایک سو پچیس روپے ماہوار وظیفہ مقرر ہوا۔

بعد میں نواب نے انہیں اپنا استاد مقرر کیا اور کلام پر اصلاح لینے لگے۔

یہ قربت وقت کے ساتھ ساتھ اتنی بڑھی کہ ہر شام نواب صاحب جب تفریح کو جاتے تو جلال کو بھی اپنے ساتھ بٹھا لیتے اور راستے بھر علم وادب پر گفتگو ہوتی جاتی۔

ایک مرتبہ نواب شیخ حسین میاں اپنے ہاں کی مجلس میں اپنا لکھا ہوا مرثیہ پڑھ رہے تھے۔ اس مرثیے میں گھوڑے کی تعریف والے ایک بند میں چار مصرعے تو رہ گئے تھے مگر بیت جس کاغذ پر لکھی تھی وہ کاغذ پھٹ گیا تھا۔ چند بند پڑھنے کے بعد انہیں اس بیت پر آنا تھا۔ وہ سٹپٹا گئے۔ ان کے لیے فی البدیہہ بیت موزوں کرنا سخت مشکل تھا۔ انہوں نے اشارے سے جلال کے داماد میر محمد نظیر مقال کو اپنے پاس بلایا۔

''ذرا استاد سے بیت کہلوا لاؤ۔''

''وہ تو مرثیہ نہیں کہتے۔ پھر بیت فی البدیہہ کیسے موزوں کر سکیں گے۔''

''وہ سب کچھ کہہ سکتے ہیں تم جاؤ تو سہی۔''

مقال بھاگے ہوئے گئے اور بیت کہلوا لائے۔

طاؤس کی ہے چال چلن کبک دری کا
آہو کا چھلاوا ہے جھمکڑا ہے پری کا

اس ریاست میں جلال کی زندگی عیش میں گزر رہی تھی۔ مالی اعتبار سے بھی خوش حال تھا۔ قیام منگرول ہی میں اس نے اپنے بڑے بیٹے میر محمد مہدی کمال کی شادی رچائی۔

اس عیش وعشرت اور قدر دانی کے باوجود اسے لکھنو یاد آ رہا تھا۔ یہاں کی آب وہوا بھی اسے راس نہیں آ رہی تھی۔ کمال کی شادی کے کچھ دنوں بعد ہی اس نے پیرانہ سالی کا عذر پیش کرتے ہوئے نواب سے رخصت چاہی اور یہ خواہش ظاہر کی کہ انہیں لکھنو میں قیام رکھنے کی اجازت فرمائی جائے اور حاضری کی خدمت سے معذور رکھا جائے۔ نواب نے ازراہ ہمدردی اس کی یہ درخواست قبول کر لی۔

وہ ایک مرتبہ پھر لکھنو لوٹ آیا۔ منصور نگر والا مکان پھر

آباد ہو گیا۔ نواب نے پچاس روپے ماہوار گھر بیٹھے مقرر کر دیے۔

بدنصیبی ساتھ ساتھ سفر کر رہی تھی۔ وظیفہ آتے چند ماہ ہی گزرے تھے کہ نواب شیخ حسین میاں کا انتقال ہو گیا اور وظیفہ بند ہو گیا۔

خدا ایک در بند کرتا ہے تو ستر کھول دیتا ہے۔ حسن اتفاق یہ ہوا کہ رام پور کے نئے نواب حامد علی خان انہی دنوں لکھنو تشریف لائے۔ انہیں جب معلوم ہوا کہ جلال ریاست منگرول سے لوٹ آئے ہیں اور لکھنو میں ہیں تو انہیں اپنا لڑکپن یاد آ گیا جب انہوں نے جلال کو رام پور میں دیکھا تھا تو دادا نواب کلب علی خان کی یاد آ گئی جن سے جلال کی شاعرانہ چشمکیں چلتی رہتی تھیں۔

جلال کا خیال آتے ہی انہیں گزشتہ رام پور کا پورا نقشہ آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔ وہ خود بھی شاعر تھے اور ''رشک'' تخلص کرتے تھے۔ شاعر ہونے کے ناتے جلال کی شاعری اور زبان دانی سے واقف بھی تھے اور قائل بھی۔ انہوں نے آدمی دوڑایا اور جلال کو طلب کر لیا۔

بڑی دیر تک ماضی کے رام پور کی باتیں ہوتی رہیں۔ کئی ایسے شاعرانہ جھگڑوں کا ذکر درمیان میں آیا۔ جلال آہیں بھرتے رہے اور ان قصوں کو دہراتے رہے۔

''کہیے حکیم صاحب اب کن شعرا سے ہنگامہ آرائی رہتی ہے۔'' نواب حامد علی خان نے ازراہ تفنن پوچھا۔

''حضور وہ دور گزر گیا۔ نواب خلد آشیاں (نواب کلب علی خان) کے دور تک ہی اس کا لطف تھا۔'' حامد علی خان کو دادا محترم کی یاد آ گئی۔ پچھلے دور کی یاد تازہ کرنے کے لیے جلال کو رام پور طلب کر لیا۔ اصرار بڑھا تو جلال بھی تیار ہو گئے۔ ساٹھ روپے ماہوار مشاہرہ طے ہوا۔

رام پور بھی وہی تھا۔ گلیاں بھی وہی تھیں۔ مصاحب منزل بھی وہی تھی لیکن عروج، بحر، اسیر اور داغ میں سے کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ ایک ایسے کمرے میں آ گیا تھا جس میں فرنیچر ہی نہیں تھا۔ اس کا جی لگتا تو کیسے لگتا۔ اب کوئی نہیں تھا جسے وہ ٹوکتا، کوئی نہیں تھا جو اسے روکتا۔ کسی کی غزل کے جواب میں کون سی غزل کہتا۔ کون سا لفظ پکڑتا، کس سے جھگڑا کرتا۔ اب نہ روٹھنے کا مزہ تھا نہ منانے کا۔ چند روز ہی میں اکتا گیا۔ اپنی جگہ اپنے بیٹے میر مہدی کمال کو ملازم رکھوایا اور خود واپس چلا آیا۔

لکھنو میں گھر بیٹھے نواب رام پور پچاس روپے مشاہرہ بھیجتے رہے لیکن یہ سلسلہ ماہ بہ ماہ جاری نہ رہ سکا۔ کبھی ناغہ ہو جاتا کبھی بے ترتیبی سے پہنچتا۔

وہ اب بوڑھا ہو چکا تھا۔ مالی پریشانیاں الگ۔ ان سب نے مل کر اسے چڑچڑا بنا دیا۔ جس مشاعرے میں جاتا کسی نہ کسی سے الجھ پڑتا۔ نئی نسل اس کی بات سننے کو تیار نہیں تھی اور وہ کہنے سے باز نہیں آتا تھا۔ رفتہ رفتہ مشاعروں میں جانا چھوڑ دیا۔

نواب نصیرالدین حیدر کی بیگم نواب تاج محل بیگم کے دو عزیز مولوی میر مہدی حسین ماہر اور مولوی اصغر حسین فاخر کربلائے معلی سے لوٹ کر لکھنو آئے تو ان کے دم سے ہر روز مشاعرے منعقد ہوتے اور مشاعرے کے بعد پُرتکلف دسترخوان چنا جاتا۔ فاخر نے تو ایک نیا مشغلہ نکالا۔ جو کوئی فاخر کی شاگردی اختیار کرتا دس روپے ماہوار مشاہرہ پاتا۔ اس فیاضی نے بے روزگاروں کے لیے آمدنی کا ایک ذریعہ پیدا کر دیا۔ کون تھا جو اس بہتی گنگا میں ہاتھ نہ دھوتا جو شاعر نہیں بھی تھا اس بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے لگا۔ کرائے کے یہ شاعر ماہر و فاخر کے کلام پر داد و تحسین کے وہ ڈونگرے برساتے وہ شور بلند کرتے کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی۔ معلوم ہوتا تھا نگر میں وہی دو شاعر ہیں۔ ایسے مشاعروں میں جلال کیسے زینت مشاعرہ بنتا۔ اس نے پاؤں سمیٹ لیے اور بالکل خلوت نشیں ہو گیا لیکن وہ ایسا ماہر فن تھا کہ اس کی گواہی کے بغیر کوئی شاعر آگے نہیں چل سکتا تھا۔ جو نکات لوگوں کی سمجھ نہ آتے تھے ان سے پوچھنے آتے تھے۔

ماہر و فاخر نے جب دیکھا کہ جلال نے مشاعروں میں آنا چھوڑ دیا ہے تو وہ اپنی طولانی غزلیں سنانے اس کے گھر آنے لگے۔ جلال صاف گو تھا بداخلاق نہیں تھا اسے اخلاقاً یہ غزلیں سننی بھی پڑتیں اور جھوٹی تعریف بھی کرنی پڑتی۔ جب وہ چلے جاتے اور کوئی ملنے آ جاتا تو اس سے ان دونوں کی شکایت ضرور کرتے۔

''بھائی کس نے کہا ہے کہ وہ شاعری کریں اور کرتے ہی ہیں تو مجھے سنانے بھی آئیں۔ وہ سناتے رہتے ہیں اور میں سنتا رہتا ہوں۔ ٹوکنے کا بھی کیا فائدہ۔''

یہی لوگ ان باتوں کو ماہر و فاخر تک پہنچا دیتے۔ ان کے دل میں بھی برائی آ گئی اور بہت دن تک تو جلال سے ملنے نہ آئے۔ جلال کو ندامت ہوئی اور ان سے ملنے کے لیے خود چلے گئے۔ اس کی تعظیم تو ہوئی لیکن دیر تک سکوت طاری رہا۔ وہاں کئی لوگ اور بھی موجود تھے کسی نے

خیریت تک نہیں پوچھی۔ اسے جب اپنی بے عزتی محسوس ہوئی تو اس نے سب کو مخاطب کرکے پوچھ ہی لیا۔

''کیا بات ہے۔ مجھ سے ایسا کیا سرزد ہوگیا کہ آپ لوگ مجھے بات کرنے کے لائق ہی نہیں سمجھتے۔''

''آپ کا حال بھی تو یہی ہے۔''

''میں نے ایسا سلوک کب کسی کے ساتھ کیا ہے۔''

''آپ تو اپنے آگے کسی کو موجود نہیں جانتے۔''

''یہ آپ نے کیونکر جانا۔''

ماہر نے سب روئیداد بیان کردی۔ ''آپ کو تو یہ بھی گوارا نہیں ہوتا کہ کوئی آپ کو غزل سنائے اور آپ اسے داد دینے پر مجبور ہوجائیں۔ آپ تو اپنے سوا کسی کو شاعر ہی نہیں مانتے۔''

اس پر بحث ہوگئی۔ جلال کو بھی غصہ آگیا۔ ''اگر درحقیقت میں اپنے آگے کسی کو موجود نہ جانوں تو بے جا کیا ہے۔'' جلال نے کہا اور وہاں سے اٹھ آیا۔ اس کی بد دماغی کی شہرت دور دور تک پھیل گئی جو اسے نہیں جانتے تھے وہ بھی اس سے الجھنے کے بناوٹی قصے مزے لے لے کر بیان کرتے تھے اور لوگ یقین بھی کرلیتے تھے کیونکہ وہ بدنام ہوچکا تھا۔

ایک شاعر میاں عصمت ریختی گو تھے ان سے اور جلال سے ایک روز مڈبھیڑ ہوگئی۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ یہ جلال ہیں۔ آمنا سامنا ہوا تو کہنے لگے۔

''حضور، مجھ سے اور جلال سے نہیں بنتی۔''

جلال ان کی اس ناواقفیت سے لطف اندوز ہوئے۔ ''آپ جلال کو پہچانتے بھی ہیں۔''

''یہ بھی آپ نے خوب کہی۔ میری ان کی خوب خوب بحثیں ہوچکی ہیں۔''

میاں عصمت کی حیرت اور شرمندگی کی انتہا نہ رہی۔ جب جلال نے انہیں بتایا کہ ''حضرت جلال تو میں ہی ہوں۔'' جلال نے کہا۔ ''دیکھیے صاحب لوگوں نے مجھے اس طرح بدنام کیا ہے۔''

عصمت اتنے خفت ہوئے کہ گڑگڑا کر معافی مانگنے لگے۔ جلال مسکرائے پھر بولے۔ ''نہیں بھئی اگر مجھے برا کہنے میں تمہارا کوئی فائدہ ہوتا ہے تو میں آیندہ کے لیے بھی معاف کرتا ہوں۔''

مالی پریشانیوں کا ہجوم بڑھتا جارہا تھا۔ ناقدری کے احساس نے پژمردہ کردیا تھا۔ اس کا حال بقول میر تقی میر یہ تھا۔

شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے
دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

بڑھاپا خود ایک مرض اس پر متعدد امراض، بھرپور زندگی گزارنے کے بعد تاریک تنہائی مارے ڈالتی تھی۔ منصور نگر والے مکان میں پاؤں سمیٹے پڑا تھا۔ ملنے جلنے والوں نے بھی پاؤں کھینچ لیے تھے۔ نیاز مانہ تھا نئی دلچسپیاں تھیں۔ اسے کون پوچھتا۔

اس پر غضب یہ ہوا کہ آنکھوں میں ناسور پڑ گئے۔ بہت علاج کیا کوئی فائدہ نہ ہوا۔ بینائی قریب قریب ختم ہوکر رہ گئی۔

اسی حالتِ معذوری میں 20 اکتوبر 1909ء کو تقریباً 76 سال کی عمر میں انتقال کیا۔

لکھنو کے ایک خاموش گوشے میں ایک ایسا شاعر ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگیا جس کے خداداد جوہروں کی زمانہ قدر نہ کرسکا۔

داغ کے بعد رہ گئے تھے جلال
نہ رہا کوئی بھی جلال کے بعد
(ریاض خیرآبادی)

☆......☆

جلال کی عظمت اس میں تھی کہ اس نے اردو شاعری کو لفظی صنائع کے خارزار سے نکال کر کنگھی چوٹی اور انگیا کرتی کے سطحی مضامین سے نکال کر اس میں شعریت کی روح کو شعر وادب پھر سے جگا دیا۔ اس نے ایک طرف لکھنو کے انداز بیان کی سحر طرازی کو قائم رکھا۔ دوسری جانب دہلی کے سوز و گداز کو اختیار کیا۔ لکھنو اور دہلی کے دو رنگوں کو تناسب، توازن اور حسن کے ساتھ ملا دیا۔

اسلوبِ بیان کے اعتبار سے عربی، فارسی کی غیر مانوس اصطلاحات اور الفاظ کی جگہ عام اور مقبول ہندوستانی الفاظ کو جگہ دی۔

زباں داں کی حیثیت سے اور زبان کی بنیادی ضرورتوں کا احساس کیا اور تمام بنیادی ضرورتوں کا جائزہ لینے کی کوشش کی۔ جلال کی یہ خدمات ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔

ماخذات

جلال لکھنوی لکھنو کا دبستان شاعری

ڈاکٹر محمد حسن ڈاکٹر ابواللیث صدیقی

اپنی اپنی دنیا

کاشف زبیر

خداوند قدوس نے انسان کو شعور کی دولت ودیعت کی تاکہ وہ حق و باطل میں تمیز کر سکے۔ وہ نوجوان بھی عقل و شعور رکھتا تھا لیکن یقین کامل سے محروم تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ یقین و ایمان کی اس منزل تک پہنچ نہیں پایا جس کی جستجو میں وہ صوفیانہ زندگی کے خارزار میں اترا تھا۔

صوبہ بنگال کی ایمان افروز کتھا

مشتاق نے بے زاری سے شاہ بابا کو دیکھا۔ وہ اس وقت وسطی بنگال کے ایک علاقے میں سفر کر رہے تھے۔ اس دشوار اور خشک پتھریلے علاقے میں سفر کرنا آسان نہیں تھا۔ خاص طور سے جب وہ پیدل ہوں۔ ان کے پاس ایک ہی خچر تھا جس پر ان کا سامان لدا ہوا تھا اور سامان اتنا تھا کہ اس کے ساتھ وہ خچر پر اپنا بوجھ نہیں ڈال سکتے تھے۔ اگر مشتاق اکیلا ہوتا تو خچر پر سوار ہونے سے گریز نہیں کرتا لیکن شاہ بابا کے ہوتے ہوئے ایسا کرنا ممکن نہیں تھا۔ وہ اسے خچر کے ساتھ اس زیادتی کی اجازت نہیں دے سکتے تھے۔ دو سال پہلے جب مشتاق شاہ بابا کے ساتھ شامل ہوا تھا تو اس وقت وہ بڑا خوش تھا، بہت جوش اور سنسنی محسوس کرتا تھا لیکن اب اس کا سارا جوش و ولولہ ختم ہو گیا تھا۔

گرم خشک موسم اور اوپر سے قہر برساتا سورج عین ان کے سر پر تھا۔ مشتاق سے اس وقت اگر اس کی سب سے بڑی خواہش پوچھی جاتی تو وہ یقیناً کسی سایہ دار جگہ پر آرام کی خواہش کا اظہار کرتا۔ شاہ بابا کے ہوتے ہوئے دونوں خواہشیں مشکل سے ہی پوری ہو سکتی تھیں۔ وہ سارا دن سفر کرتے اور اس وقت کہیں قیام کرتے جب تاریکی کی وجہ سے سفر ممکن نہ رہتا۔ صبح روشنی ہونے سے پہلے وہ ہر طرح سے تیار ہو جاتے تھے اور جیسے ہی ذرا روشنی ہوتی وہ سفر پر

روانہ ہوجاتے۔

1390 میں بنگال ایک دور دراز اور بہت کم آبادی والا ملک تھا۔ جگہ جگہ ندی نالے اور جھیلیں تھیں۔ یہاں بڑے شہر چند ایک تھے اور اکثر آبادی دور دراز خطوں میں تھی اور سفر کے لیے راستے نہ ہونے کے برابر تھے۔ یہی وجہ تھی کہ لوگ پسماندہ تھے اور دوسرے علاقوں میں سفر کم ہی کرتے تھے۔ شاہ بابا نے بچپن ہی میں مبلغ بننے کا فیصلہ کرلیا تھا اور حمید الدین ناگوری کے سلسلہ چشت سے بعیت یافتہ ہونے کے بعد انہوں نے تبلیغ کے لیے بنگال کو منتخب کرلیا جہاں کی تہذیب اور زبان یکسر مختلف تھی۔ انہوں نے فیصلہ کیا تھا کہ دہلی میں بیٹھ کر تبلیغ کرنے کی بجائے سفر کرکے لوگوں کو دین کی طرف راغب کریں گے اور ان کے مذہبی مسائل حل کریں گے کیونکہ جنوب میں بنگال کے بے شمار دیہات ایسے تھے جہاں کوئی دین کا صحیح علم رکھنے والا نہیں تھا اور وہاں لوگوں کی دین سے واقفیت نہ ہونے کے برابر تھی۔ یوں بھی ہر طرف غیر مسلموں کی آبادی تھی۔ شاہ بابا ان لوگوں کو دین کی طرف راغب رکھنا چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر انسان کو رہنمائی نہ ملے تو اس کے بھٹک جانے کا زیادہ امکان ہوتا ہے۔ وہ لوگوں کو گمراہی سے بچانا چاہتے تھے۔

نوجوان شاہ بابا نے ایک عدد خچر لیا اور گاؤں گاؤں جاکر لوگوں کو دین کے اسباق پڑھانے لگے۔ شروع میں انہیں بہت مشکل پیش آئی تھی کیونکہ ان کا کوئی ذریعہ معاش نہیں تھا اور جوانی کی بہت ساری راتیں انہوں نے بھوک سے کروٹیں بدلتے ہوئے گزاری تھیں۔ پھر رفتہ رفتہ ان کے حالات بہتر ہوئے۔ وہ جس گاؤں میں جاتے تھے۔ وہاں لوگ ان کو خوراک اور کچھ رقم کی صورت میں زادِ راہ مہیا کردیتے۔ جب ان کے کپڑے خراب ہونے لگتے تو خدا کا کوئی نہ کوئی نیک بندہ ان کو نئے کپڑے بنوا دیتا تھا۔ گزشتہ بیس سالوں میں ان کے دو خچر اپنی طبعی عمر پوری کرکے وفات پاچکے تھے اور اب یہ تیسرا خچر تھا۔ جب ان کا ایک خچر مرجاتا تو کوئی مخیر شخص ان کو دوسرا خچر مہیا کردیتا تھا۔ خچر اس وجہ سے ان کا پسندیدہ جانور تھا کیونکہ اصحابؓ کرام اس پر سفر کرتے تھے۔

شاہ بابا نے فیصلہ کیا تھا وہ کبھی کوئی گھر نہیں بنائیں گے، کوئی تیسرا لباس نہیں بنائیں گے، کبھی تین دن سے زیادہ کی خوراک اپنے پاس نہیں رکھیں گے اور کبھی اپنے پاس دس اشرفی سے زیادہ کی رقم نہیں رکھیں گے اور سب سے اہم اصول جو شاہ بابا نے اپنایا تھا کہ وہ کسی سے کچھ نہیں مانگیں گے۔ وہ رات کو ہمیشہ کھلے آسمان تلے سوتے تھے اور گزشتہ بیس سال میں انہوں نے ایک رات بھی کسی چھت تلے نہیں گزاری تھی۔ جب سردیوں کا موسم آتا اور جنوب سے لے کر وسطی علاقہ بارش سے بھیگنے لگتا تو وہ صوبہ بہار کی طرف چلے جاتے۔ جب وہاں بے پناہ سردی ہوتی تو مشرق میں موسم معتدل ہوتا ہے اور وہ یہاں آجاتے۔

رفتہ رفتہ شاہ بابا بنگال کے دیہات میں مقبول ہوتے گئے یہاں کا ہر فرد اگر شکل سے نہیں تو نام سے ان کو پہچانتا تھا۔ اس لیے وہ کسی بھی گاؤں میں جاتے تو ان کا والہانہ استقبال ہوتا تھا۔ اب تک شاہ بابا اکیلے ہی تھے۔ دو سال پہلے وہ مغربی بنگال کے ایک چھوٹے سے گاؤں پہنچے جو انتہائی شمال میں ہونے کی وجہ سے وہاں بارش کی بہتات تھی۔ یہاں سال کے چھ مہینے بادل چھائے رہتے تھے اور صرف مارچ سے اکتوبر تک موسم بہتر ہوتا تھا۔ زمین کی حالت اچھی نہیں تھی اوپر سے موسم کی شدت تھی اس لیے لوگوں کی مالی حالت خراب تھی۔ اپنے سفر کے دوران شاہ بابا سال میں ایک بار اس علاقے میں ضرور آتے تھے۔ لیکن اس گاؤں میں وہ پہلی بار آئے تھے اور یہیں مشتاق نے پہلی بار ان کو دیکھا اور وہ ان سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے ان کے ساتھ رہنے کی خواہش ظاہر کردی۔

مشتاق اس وقت چودہ سال کا تھا لیکن کمزور صحت کی وجہ سے وہ بارہ سے زیادہ کا نہیں لگتا تھا۔ مشتاق کے ماں باپ سیلابی حادثے میں چند سال پہلے ہلاک ہوچکے تھے اور اس کا کوئی قریبی رشتے دار نہیں تھا۔ وہ گاؤں والوں کے رحم وکرم پر پل رہا تھا۔ اس لیے جب اس نے شاہ بابا سے التجا کی کہ وہ اسے اپنے ساتھ رکھ لیں تو وہ سوچ میں پڑ گئے تھے۔ انہوں نے صوفی بنتے وقت خود سے جو عہد کیے تھے، ان میں یہ عہد نہیں تھا کہ وہ ساری عمر اکیلے رہیں گے۔ اس لیے انہوں نے مشتاق کو ساتھ رکھنے کا فیصلہ کیا لیکن اس سے پہلے انہوں نے گاؤں کے اہم مردوں کو جمع کرکے ان کے سامنے مشتاق کی خواہش بیان کی اور پھر ان کی اجازت طلب کی کہ وہ اسے اپنے ساتھ رکھ سکتے ہیں؟

گاؤں والوں نے بہ خوشی اجازت دے دی۔ ان کے نزدیک شاہ بابا ایک قابلِ احترام شخص تھے اور ان کے ساتھ رہنے والے کی دنیا کے ساتھ عاقبت سنورنے کا بھی

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

امکان تھا۔ دوسرے مشتاق کا کوئی نہیں تھا اور وہ ایک طرح سے گاؤں والوں پر بوجھ تھا اس لیے وہ شاہ بابا کے ساتھ چلا جاتا تو ان کا بوجھ ہلکا ہو جاتا۔ مشتاق کے پاس کچھ نہیں تھا سوائے چند جوڑے کپڑوں اور ایک تھیلے کے جس میں اس کا کچھ سامان تھا۔ اس نے مدرسے میں پڑھا تھا۔ اس لیے شاہ بابا کو اطمینان تھا کہ اسے قرآن پڑھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔ خود شاہ بابا نے صوفیانہ راہ اختیار کرنے سے پہلے مدرسے میں تعلیم حاصل کی تھی اور وہ مشتاق کو آگے پڑھا سکتے تھے۔ جب وہ اس قابل ہو جاتا کہ مدرسے کا امتحان دے سکے تو وہ اسے کہیں سے امتحان دلوا دیتے۔

جب شاہ بابا اسے لے کر گاؤں سے روانہ ہونے لگے تو انہوں نے مشتاق سے کہا۔ ”ایک بات یاد رکھنا.... ہمارے ساتھ جو ہوتا ہے وہ خدا کی طرف سے ہوتا ہے اور خدا جو کرتا ہے بہتر ہی کرتا ہے اس لیے کسی مصیبت یا پریشانی میں بے صبری مت دکھانا۔“

”میں آپ کی ہدایت پر پورا عمل کروں گا۔“ مشتاق نے فرماں برداری سے کہا۔

اس سے پہلے شاہ بابا اپنا سفر خچر پر کرتے تھے کیونکہ ان کا سامان اور راشن بہت کم ہوتا تھا۔ اس لیے خچر ان کا وزن بھی با آسانی برداشت کر لیتا تھا لیکن مشتاق کے آنے کے بعد یہ ممکن نہیں رہا تھا۔ اس کا سامان خاصا تھا۔ کپڑوں کے کئی جوڑے اور دوسرا سامان تھا۔ پھر اس کی خوراک کا اضافی وزن بھی خچر پر بار کیا جاتا تھا۔ خود خچر کی خوراک بھی اس پر ہوتی تھی۔ اس کے بعد خچر پر سواری کی گنجائش نہیں رہتی تھی۔ اس لیے شاہ بابا نے طے کر لیا کہ وہ پیدل سفر کریں گے اور خچر صرف سامان اٹھائے گا۔

مشتاق، شاہ بابا کی شخصیت سے متاثر تھا۔ اس کے لیے اس طرح بنا گھر کے رہنا اور پورے ملک میں پھرتے رہنا بہت کشش انگیز تھا جب کہ وہ چودہ سال کی عمر تک اپنے گاؤں سے باہر نہیں آیا تھا۔ اس لیے سفر کے آغاز میں وہ بہت پُر جوش تھا۔ لیکن جب اسے عملی طور پر سفر کی صعوبتوں سے واسطہ پڑا تو اسے اندازہ ہوا کہ یہ زندگی کشش انگیز تو ضرور تھی لیکن آسان ہرگز نہیں تھی۔ انہیں روزانہ کوئی تیس میل پیدل چلنا پڑتا تھا۔ اگرچہ شاہ بابا نے مشتاق کے خیال سے پہلے دن صرف بیس میل کا سفر کیا تھا لیکن مشتاق کے پیروں میں چھالے پڑ گئے تھے اور اس کے جوتے کی ایڑی نکل گئی تھی۔

شام کو جب وہ ایک جگہ رکے تو شاہ بابا نے اس کے چھالوں پر ایک مرہم لگایا جس سے اسے بہت آرام ملا تھا۔ پھر شاہ بابا نے اس کے جوتے کی ایڑی کی سلائی کی۔ ان کے پاس سلائی کا سامان اور چمڑے کے فالتو ٹکڑے تھے کیونکہ ان کو سفر میں ان کی مستقل ضرورت رہتی تھی۔ وہ اپنے جوتے کی مرمت خود کرتے تھے اور اسے اس وقت تک چلاتے تھے جب تک اس میں چلنے کا دم رہتا تھا۔ اس کے بعد خدا کا کوئی نہ کوئی بندہ ان کو نیا یا کچھ پرانا جوتا دلا دیتا تھا۔ البتہ کبھی کبھی ان کو کچھ عرصے جوتے کے بغیر بھی گزارا کرنا پڑتا تھا۔ ایک بار وہ پورے دو ہفتے تک بغیر جوتے کے سفر کرتے رہے تھے اور اس دوران میں انہوں نے پیروں کو زخمی ہونے سے بچانے کے لیے ایک قسم کی گھاس پیروں پر باندھ لی تھی لیکن اپنے اصول کے مطابق کسی کے سامنے دست سوال دراز نہیں کیا۔ ہاں کوئی اپنی خوشی سے ان کو کچھ دیتا تو وہ قبول کر لیا کرتے تھے۔

جب انہوں نے مشتاق کو اپنے ساتھ رکھنے پر آمادگی ظاہر کی اور اس کے گاؤں کے لوگوں نے بھی مشتاق کو ان کے ساتھ جانے کی اجازت دے دی تب انہوں نے مشتاق کے سامنے اپنے اصول رکھے تھے اور اس سے کہا۔ ”اگر تم ان کی پاسداری کا وعدہ کرتے ہو تو میں تم کو ساتھ رکھ سکتا ہوں ورنہ نہیں۔“

”میں آپ کے بنائے تمام اصولوں کی پاسداری کروں گا۔“ مشتاق نے ان کو یقین دلایا تھا۔

”اگر تم نے کبھی ان اصولوں کی خلاف ورزی کی تو میرے اور تمہارے راستے الگ ہوں گے۔“ شاہ بابا نے اسے خبردار کیا۔ ”ساتھ ہی کبھی تم محسوس کرو کہ تم میرے ساتھ نہیں چل سکتے تو تمہیں واپس جانے کی بھی مکمل آزادی ہوگی۔“

لیکن اس وقت مشتاق بہر صورت گاؤں کی بے رنگ ترستی ہوئی زندگی سے نکل جانا چاہتا تھا جہاں اس کا کوئی بھی اپنا نہیں تھا۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ وہ شاہ بابا کی زندگی اور کردار سے متاثر ہوا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ ان جیسا بنے۔ پہلے دن جب شام کو انہوں نے ایک درخت تلے پڑاؤ ڈالا اور شاہ بابا نے سب سے پہلے لکڑیاں جمع کیں تاکہ رات سکون سے گزرے کیونکہ دسمبر کے مہینے میں اس علاقے میں رات نہایت سرد ہو جاتی تھی۔

”آپ اتنا پیدل کیسے چل لیتے ہیں؟“ مشتاق نے

معصومیت بھرا سوال کیا۔

''میں اس کا عادی ہوں اور آج میں نے اتنا سفر نہیں کیا جتنا کہ میں روز کرتا ہوں۔ تمہارے لیے کم رفتار رکھی تھی اور فاصلہ بھی کم کر دیا ہے۔''

مشتاق کے ہوش اڑ گئے تھے کہ یہ فاصلہ جسے طے کرتے کرتے وہ ادھ مرا ہو گیا تھا، ابھی کم تھا اور امکان یہ تھا کہ چند دن میں شاہ بابا اپنی رفتار پر آجائیں گے اور ایسا ہی ہوا۔ ایک ہفتے بعد شاہ بابا نے زیادہ رفتار سے اور دن میں زیادہ فاصلہ طے کرنا شروع کر دیا تھا۔ جب وہ رات کو کہیں پڑاؤ ڈالتے تھے تو مشتاق بستر بچھا کر اس پر ڈھیر ہو جاتا تھا۔ جب کہ شاہ بابا سارے کام نمٹا کر الاؤ کی روشنی میں تلاوت اور دعائیں بھی پڑھتے تھے۔ وہ مشکل سے پانچ گھنٹے سوتے تھے کیونکہ جب صبح نماز کے لیے وہ مشتاق کو باقاعدہ جھنجوڑ کر بیدار کرتے تھے تو ان کو بیدار ہوئے کوئی ایک گھنٹا گزر چکا ہوتا تھا۔ جب کہ مشتاق رات میں صرف کھانے اور رفع حاجت کے لیے اٹھتا تھا۔ وہ کم سے کم دس گھنٹے سوتا تھا۔

دو ہفتے بعد جب وہ ایک بستی میں ایک دن رکنے کے بعد روانہ ہوئے تو شام کو پڑاؤ ڈالتے ہی شاہ بابا نے مشتاق سے کہا۔ ''آج خچر سے سامان تم اتارو گے اور لکڑی جمع کر کے لاؤ گے۔''

مشتاق کا تھکن سے برا حال تھا لیکن اسے حکم کی تعمیل تو کرنا ہی تھی۔ مجبوراً وہ ان کاموں میں لگ گیا اور اس دن کے بعد یہ اس کی ذمے داری بن گئی۔ رفتہ رفتہ مشتاق کی تھکن کم ہونے لگی اور اسے کام میں مزہ آنے لگا۔ اب وہ سارا دن سفر کر کے بھی تازہ دم رہتا تھا۔ البتہ رات اسے نیند ویسی ہی آتی تھی۔ وہ کھانا کھا کر لیٹتے ہی سو جاتا اور صبح اس وقت اٹھتا جب شاہ بابا اسے ناشتے اور اس کے بعد روانگی کے لیے تیار کرتے تھے۔

آنے والے دو برسوں میں مشتاق نے شاہ بابا کے ہمراہ پورے بنگال کے کئی چکر لگائے۔ اس دوران میں اس نے کئی بڑے شہر اور بے شمار گاؤں دیکھے۔ شاہ بابا کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ ہر بار نئے راستے سے سفر کریں جہاں نئی آبادیاں آئیں اور وہ نئے لوگوں تک خدا کا پیغام ... پہنچائیں۔ اس لیے مشتاق نے دو سال میں بہت کچھ دیکھ لیا۔ وہ شاہ بابا کے ساتھ اس سخت کوش زندگی کا عادی بھی ہو گیا تھا۔ اس نے ان سے بہت کچھ سیکھا تھا اس نے قرآن ختم نہیں کیا تھا، شاہ بابا نے ختم کرایا اور چیدہ چیدہ آیات اسے یاد بھی کرا دیں۔ ان کے ساتھ رہ کر مشتاق کی معلومات میں خاصا اضافہ ہوا تھا۔ اسے دنیا کے بارے میں پتا چلا جس کے بارے میں وہ بہت کم جانتا تھا۔

لیکن کبھی کبھی اسے شدت سے خواہش ہوتی کہ کاش اسے آرام کرنے کے لیے ایک چھت مل جائے اور اس کے تلے وہ جی بھر کر آرام کر سکے۔ اس کے پاس کئی اچھے لباس اور اچھے جوتے ہوں اور وہ لذیذ کھانے پیٹ بھر کر کھا سکے لیکن فی الحال اس کی خواہش پوری ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ کم سے کم شاہ بابا کے ساتھ رہتے ہوئے تو بالکل بھی امکان نہیں تھا۔ دو سال میں اس کا کمزور جسم بھر گیا تھا۔ قد طویل اور پٹھے مضبوط ہو گئے تھے۔ اب وہ سخت اور مسلسل کام کر کے بھی نہیں تھکتا تھا۔ البتہ وہ مسلسل ایک ہی روٹین سے بیزار ہو چلا تھا۔

اس وقت وہ وسطی بنگال سے ذرا آگے ٹنگائل نامی شہر کے جنوب مشرق میں تھے۔ یہ ایک چھوٹی سی آبادی تھی اور اکتوبر کی آخر میں بھی یہاں موسم سرد تھا۔ رات ان کو بڑا الاؤ روشن کرنا پڑا تھا۔ مشتاق نے سامان اتارتے وقت شاہ بابا سے کہا۔ ''کیا اس بار ہم جنوب کی طرف جلدی نہیں جا رہے ہیں شاہ بابا؟''

''ہاں میرے بچے۔'' شاہ بابا نے جواب دیا۔

''اس وقت وہاں سردی زیادہ نہیں ہوتی ہے۔''

''ہمیں موسم سے نہیں ڈرنا چاہیے کیونکہ موسم شیطان سے زیادہ خطرناک اور تکلیف دہ نہیں ہوتا ہے۔''

''شیطان انسان کے لیے کس طرح خطرناک ہوتا ہے۔''

''شیطان کا سب سے موثر ہتھیار لالچ ہے، جب وہ کسی انسان کے دل میں لالچ ڈالنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو وہ شخص زیادہ دیر اس کی غلامی سے نہیں بچ سکتا ہے۔''

''شیطان لالچ کیسے ڈالتا ہے؟''

''کسی دوسرے کی مثال سے.... اگر مجھے معلوم ہو گا کہ فلاں شخص کے پاس دولت ہے اور وہ اس کی مدد سے پُرتعیش زندگی گزارتا ہے تو مجھے خود بہ خود لالچ گھیر لے گی کہ کاش میرے پاس بھی اتنی ہی دولت ہو اور میں بھی پُرتعیش زندگی گزار سکوں۔'' شاہ بابا نے آسان الفاظ میں سمجھایا۔

''دولت ہونا یا پُرتعیش زندگی بسر کرنا بری بات ہے؟''

''نہیں میرے بچے لیکن دولت کے حصول اور اس کے خرچ میں توازن ضروری ہے۔ ایک تو یہ کہ کسی کا حق مت

مارو اور دوسرے اپنے زور بازو سے جو کماؤ اسے خود تک محدود مت رکھو بلکہ دوسروں کو بھی دو۔''

''جیسے لوگ ہمیں دیتے ہیں۔'' مشتاق کا لہجہ بجھ گیا تھا۔ جب اسے دوسرے کچھ دیتے تھے تو اسے اچھا نہیں لگتا تھا۔ اسے محسوس ہوتا جیسے وہ بھکاری ہے۔

''ہاں جیسے لوگ ہمیں دیتے ہیں۔'' شاہ بابا نے رسانیت سے کہا۔ ''کیونکہ ان کے پاس زیادہ ہوتا ہے۔ وہ ہمیں دے دیتے ہیں اور یہ حکم قرآن ہے اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں میں اچھائی اور نیکی کا جذبہ باقی ہے۔''

مشتاق سوچنے لگا کہ اس دنیا میں ایسے برے لوگ بھی ہیں جو دوسروں کے حق پر ڈاکا مارتے ہیں۔ جس وقت وہ یہ سوچ رہا تھا اس کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ جلد اسے ان لوگوں سے واسطہ پڑے گا۔ اس جگہ سے کوئی دس میل مشرق میں لٹیروں کا ایک گروہ سفر کر رہا تھا۔ انہوں نے ایک بڑے زمیندار کی حویلی پر حملہ کر کے سب کچھ لوٹ لیا تھا۔ کم سے کم دس سیر خالص سونا حاصل کیا تھا جس کی مالیت یقیناً ہزاروں اشرفی تھی۔ یہ چار افراد تھے اور سنگھ ان کا سربراہ تھا۔ سنگھ ایک پرانا مجرم تھا۔ اس نے کئی افراد کو قتل کیا تھا اور بے شمار لوگوں کو لوٹا تھا۔ اس کے چہرے پر زخموں کے نشانات بتاتے تھے کہ اس نے مار دھاڑ سے بھرپور زندگی گزاری ہے۔ اس کے تینوں ساتھی بھی مار دھاڑ میں اس سے کم نہیں تھے۔

لیکن اس وقت یہ لٹیرے ایک مسئلے سے دوچار تھے۔ انہوں نے چار عدد خچر بھی ہتھیا لیے تھے اور ان پر زیورات اور قیمتی سامان بار کر کے لے جا رہے تھے۔ خود وہ گھوڑوں پر سوار تھے۔ خچروں کی رفتار بڑھانے کے لیے انہوں نے برابر وزن کے اسباب تقسیم کر کے اپنے گھوڑوں پر بار کر لی تھی۔ مگر دوران سفر ان کا ایک خچر اپنا پاؤں تڑوا بیٹھا تھا اور اب چلنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ اس کا سامان وہ کہاں بار کرتے۔ باقی خچروں اور گھوڑوں پر پہلے ہی خاصا وزن تھا اور وہ جلد از جلد اس علاقے سے نکل جانا چاہتے تھے کیونکہ اس کا پورا امکان تھا کہ زمیندار مسلح ہو کر ان کے پیچھے آئیں گے۔

سنگھ نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ''تم لوگ آس پاس جاؤ اور کوئی سواری کا جانور ملے تو اسے لے آؤ۔''

''اور اگر کوئی مداخلت کرے تو؟'' سنگھ کے ایک ساتھی زرل نے پوچھا۔

''اسے ختم کر دو۔'' سنگھ نے سفاکی سے کہا۔ ''مجھے بہرصورت ایک جانور چاہیے۔''

سنگھ کے تینوں ساتھی کسی جانور کی تلاش میں روانہ ہو گئے اور خود سنگھ باقی سامان اور جانوروں کی حفاظت کے لیے اسی جگہ موجود رہا۔ اتفاق سے وہ سطح مرتفع کی طرف آئے تھے اور ان کو دور سے شاہ بابا کے پڑاؤ کی روشنی نظر آ گئی اور جب وہ قریب آئے تو یہ دیکھ کر ان کی باچھیں کھل گئیں کہ پڑاؤ میں ایک بہت صحت مند خچر بھی ہے۔ انہوں نے شاہ بابا کو گھیر لیا اور ان پر تلواریں تان لیں۔ شاہ بابا اس وقت تلاوت کر رہے تھے اور مشتاق گہری نیند میں تھا۔ اسے زرل نے ٹھوکر مار کر بیدار کیا۔ شاہ بابا ان کو دیکھ کر ہراساں نہیں ہوئے تھے۔

''کیا چاہتے ہو تم لوگ؟''

''ہمیں یہ خچر چاہیے۔'' زرل نے خچر کی طرف اشارہ کیا۔ ''ہمیں تم سے کوئی مطلب نہیں ہے لیکن اگر تم نے ہمیں روکنے کی کوشش کی تو ہمارے پاس تلواریں ہیں۔'' اس کا لہجہ دھمکی آمیز ہو گیا۔

مشتاق جو اب تک خاموش کھڑا تھا اسے غصہ آ گیا۔ ''تم ہمارا خچر نہیں لے جا سکتے۔ اس کے بغیر ہمارا سامان کون اٹھائے گا۔''

کاشف زبیر مرحوم کی بعض تخلیقات ادارے میں زیر التوا تھیں جن پر نظرثانی کی ضرورت تھی لیکن قضا کے ہاتھوں سب بے بس ہوتے ہیں ان میں سے ایک مضمون ناگزیر ایڈیٹنگ کے بعد پیش خدمت ہے۔ مضامین اور کہانیوں کے علاوہ مرحوم کا ایک نامکمل سلسلہ بھی ادارے کے پاس محفوظ ہے جو مناسب وقت پر پیش کیا جائے گا۔ چند دیگر تخلیقات بھی وقتاً فوقتاً شائع کی جائیں گی۔ یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ ادارہ مرحوم کو ان کی خواہش پر مضامین وغیرہ موصول ہوتے ہی قبل از اشاعت ماہانہ ادائیگی کر دیتا تھا۔ ادارہ اپنی مطبوعات میں شائع ہونے والی ہر سطر کا بروقت اعزازیہ ادا کرنے کی صحت مند روایت پر روز اوّل سے کاربند ہے۔

زنل اور اس کے ساتھی شاہ بابا کے حلیے سے بھانپ گئے تھے کہ وہ درویش ہے۔ زنل نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔ ''تمہارا سامان اٹھانے کے لیے یہ دو پیروں والا خچر ہے اس سے کام لینا۔'' اس کا اشارہ شاہ بابا کی طرف تھا۔

''تم ہمارا خچر نہیں لے جا سکتے۔'' مشتاق چلّایا۔

لیکن انہوں نے اس کی بات پر توجہ دیئے بغیر خچر کھولنا شروع کر دیا۔ اس پر مشتاق غصے سے بے قابو ہو کر خچر کھولنے والے پر جھپٹا تھا۔ زنل نے اس کے سر پر تلوار کا دستہ مارا اور مشتاق بے ہوش ہو کر نیچے گر گیا۔ شاہ بابا نے زنل کی طرف دیکھا۔ ''تم نے اسے بے وجہ مارا ہے، یہ ایک چھوٹا لڑکا ہی تو ہے۔''

''شکر کرو میں نے اسے قتل نہیں کیا۔'' زنل نے سرد لہجے میں کہا۔ اس دوران میں اس کے ساتھی خچر کھول کر اس کی لگام ایک گھوڑے سے باندھ چکے تھے۔ وہ سب گھوڑوں پر سوار ہوئے اور وہاں سے روانہ ہو گئے۔ ذرا سی دیر میں وہ تاریکی میں گم ہو چکے تھے۔ شاہ بابا نے اس دوران میں کوئی حرکت نہیں کی تھی۔ ان لوگوں کے جانے کے بعد وہ مشتاق کی طرف متوجہ ہوئے۔ ضرب کی شدت سے اس کا سر پھٹ گیا تھا اور کچھ خون نکلا تھا لیکن اس کی نبض ٹھیک تھی اور ایسا لگ رہا تھا کہ وہ ایک آدھ گھنٹے میں ہوش میں آ جائے گا۔ شاہ بابا نے اس کے زخم پر مرہم لگایا اور اسے الاؤ کے قریب لٹا دیا۔ مشتاق کو کوئی ایک گھنٹے بعد ہوش آ گیا تھا۔

''وہ لوگ کہاں ہیں؟'' وہ اچھل کر اٹھ بیٹھا تھا اور چاروں طرف دیکھنے لگا۔ شاہ بابا نے اسے دوبارہ لٹا دیا۔

''وہ لوگ جا چکے ہیں اور ابھی تم آرام سے لیٹو۔''

''ہمارا خچر.....'' مشتاق بولا۔

''وہ لے جا چکے ہیں۔'' شاہ بابا نے اسے مطلع کیا تو مشتاق کراہ کر رہ گیا تھا۔

''اب ہم سفر کیسے کریں گے؟''

''خچر کے بغیر کریں گے۔''

''کیا ہمیں کوئی دوسرا خچر نہیں مل سکتا ہے۔''

''مل سکتا ہے اگر کوئی مخیّر شخص ہمیں خچر فراہم کر دے۔'' شاہ بابا نے صاف گوئی سے کہا۔ ''کیونکہ خچر پانچ اشرفی سے کم میں نہیں آتا ہے اور ہمارے پاس اتنی رقم نہیں ہے۔''

مشتاق مایوس ہو گیا۔ خچر کے بغیر سفر کرنا بہت مشکل کام تھا۔ لیکن ان کو سفر تو کرنا ہی تھا۔ مشتاق نے گزشتہ ایک سال کے دوران شاہ بابا سے چھپ کر کچھ رقم جمع کی تھی اور یہ رقم پانچ اشرفی کے مساوی تھی۔ جب وہ کسی آبادی میں جاتے تھے تو مشتاق کوئی کام تلاش کرتا تھا اور اسے کام مل جاتا تو وہ اس سے حاصل ہونے والا معاوضہ جمع کر لیتا تھا۔ ان کے اخراجات ویسے ہی پورے ہو جاتے تھے۔ اسے شاہ بابا کا اصول معلوم تھا کہ ایک وقت میں ایک اشرفی سے زیادہ رقم پاس نہیں رکھنی ہے۔ اکثر ایسا بھی ہوتا کہ کسی بستی سے ان کو ایک اشرفی سے زیادہ کی رقم مل جاتی تو شاہ بابا اسی وقت اضافی رقم بستی کے ناداروں میں بانٹ دیتے۔ اگر ان کو علم ہو جاتا کہ مشتاق کے پاس رقم ہے تو وہ اسے خود سے الگ کر دیتے۔ اگرچہ مشتاق کو یقین تھا کہ اب شاہ بابا اسے خود سے الگ نہیں کر سکتے ہیں۔

مشتاق کا زخم سرد ہو کر تکلیف دے رہا تھا لیکن اسے کسی نہ کسی طرح نیند آ گئی تھی۔ صبح شاہ بابا نے جلدی سفر نہیں شروع کیا تھا۔ وہ مشتاق کے از خود جاگنے کا انتظار کرتے رہے تھے اور پھر انہوں نے اسے ناشتا دیا۔ اس سے پہلے ہی وہ سارا سامان دو حصوں میں تقسیم کر کے باندھ چکے تھے۔ ان دونوں کو مجموعی طور پر کوئی تین سیر وزن اٹھانا تھا۔ کیونکہ خچر کا چارا اس کے ساتھ جا چکا تھا اور باقی رہ جانے والے سامان کا وزن اتنا نہیں تھا۔ اس میں سے بھی بڑا حصہ انہوں نے اپنے لیے رکھا اور کم حصہ مشتاق کو دے دیا۔ اس کے باوجود جب مشتاق نے وزن اٹھایا تو اس کے ہوش ٹھکانے آ گئے تھے۔ اسے تو خالی ہاتھ بے فکری سے سفر کرنے کی عادت تھی۔ اس نے فریادی لہجے میں پوچھا۔ ''بابا اب ہم کہاں جائیں گے؟''

''اس ٹیلے کے بعد ایک چھوٹی بستی ہے۔'' شاہ بابا نے ہاتھ سے جنوب مشرق کی طرف اشارہ کیا۔ ''کوئی پندرہ میل دور ہو گی۔ ہم شام سے پہلے وہاں پہنچ سکتے ہیں۔ ممکن ہے وہاں سے ہمیں کوئی مدد مل جائے۔''

مشتاق کو ایک مہینا پہلے ہی ایک بستی میں موچی نے چمڑے سے بنے شاندار اور مضبوط جوتے تحفے میں دیئے تھے اور ان کی وجہ سے اس کا سفر مزے کا ہو گیا تھا۔ موچی نے شاہ بابا کو بھی جوتے دینے کی پیش کش کی تھی لیکن فی الحال وہ اپنے پرانے جوتوں کے ساتھ خوش تھے۔ انہوں نے موچی سے کہا۔ ''ان جوتوں میں ایسی کوئی خرابی نہیں ہے کہ میں ان کو خود سے جدا کروں۔''

رات بھر سونے کے بعد مشتاق کے سر کا زخم خاصا بہتر ہو گیا تھا۔ وہ اب آرام سے سفر کر سکتا تھا۔ اس نے شاہ بابا

سے کہا۔ ''ہمارا خچر ہم سے چھن گیا اور ہم اب پیدل سفر کر رہے ہیں کیا آپ کے خیال میں اس میں بھی ہمارے لیے کوئی بہتری ہے؟''

''یقیناً'' شاہ بابا نے پُریقین لہجے میں کہا۔ ''مجھے اس پر پورا یقین ہے۔''

مشتاق گہری سانس لے کر رہ گیا تھا کیونکہ اسے اس بات پر بالکل یقین نہیں آیا تھا اور اس کے خیال میں ان کے لیے مشکل دور شروع ہو گیا تھا جس میں ان کو خچر کے بغیر سفر کرنا تھا۔

☆☆☆

جب سنگھ کے ساتھی خچر کے ساتھ واپس آئے تو وہ خوش ہو گیا تھا کیونکہ یہ صحت مند خچر یقیناً ان کے معذور ہو جانے والے خچر کا تمام بوجھ باآسانی اٹھا سکتا تھا۔ اس نے نرل سے پوچھا۔ ''خچر کہاں سے ملا؟''

''ادھر ایک مسلمانوں کا درویش اپنے خدمت گار کے ساتھ سفر کر رہا تھا، یہ خچر اس کا ہے۔''

سنگھ طنزیہ انداز میں مسکرایا۔ ''کوئی بات نہیں وہ پیدل بھی سفر کر سکتے ہیں ہمیں اس خچر کی ضرورت زیادہ ہے۔''

''درویش تو فوراً سمجھ گیا تھا لیکن اس کے خدمت گار نے مزاحمت کی تو اسے دوسرے طریقے سے سمجھانا پڑا تھا۔'' نرل نے کہا۔

سنگھ ہنس دیا۔ ''تم نے یقیناً اسے قتل کر دیا ہوگا؟''

''نہیں وہ لڑکا سا ہے، اس لیے مجھے اس پر ترس آ گیا۔''

انہوں نے معذور خچر کے تھیلے اس خچر پر منتقل کیے اور وہاں سے روانہ ہو گئے۔ ان کو تعاقب کا اتنا خوف تھا کہ وہ رات میں بھی سفر کر رہے تھے۔ اگرچہ رفتار کم تھی۔ صبح کے قریب وہ سب تھکن سے چور ہو چکے تھے۔ جب روشنی ہوئی تو انہوں نے خود کو ایک بستی کے پاس پایا تھا۔ ایک بلند ٹیلے سے سنگھ نے بستی کا معائنہ کیا۔ یہ خاصی بڑی اور منظم طریقے سے آباد کی ہوئی بستی تھی۔ کیونکہ وہ پہلی بار اس طرف آئے تھے اس لیے انہیں اس کے بارے میں معلوم نہیں تھا۔ بستی کے چاروں طرف پان کے باغات اور دھان کے کھیت تھے۔

''میرا خیال ہے ہمیں بستی سے دور رہنا چاہیے۔'' سنگھ نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ وہ خود بھی یہی چاہتے تھے کیونکہ ایسا لگ رہا تھا کہ اس بستی میں قانون کی عمل داری ہے اور وہ لوگ ایسی جگہوں سے دور رہنا پسند کرتے تھے

موپلے

ساحل مالابار پر آباد ایک مسلمان قوم جس کے بارے میں خیال ہے کہ وہ عرب تاجروں کی اولاد ہے۔ دوسری صدی ہجری میں عرب و عجم کے کچھ مسلمان درویش حضرت آدم علیہ السلام کے نقشِ قدم کی زیارت کے لیے سراندیپ (سری لنکا) جا رہے تھے کہ بادِ مخالف کی وجہ سے ان کا جہاز بھٹک گیا اور مالابار کے شہر کرنگار نور کے کنارے آ لگا۔ شہر کے راجا زیمورن (سامری) نے ان کی بہت خدمت و مدارت کی اور اثنائے گفتگو میں پوچھا کہ یہودیوں اور عیسائیوں سے تو میں تمہارے پیغمبر اسلام کا حال بہت سن چکا ہوں لیکن آج تم اپنی زبان سے اپنے دین اور نبیؐ کے حالات سناؤ چنانچہ انہوں نے تفصیل سے وہ تمام حالات سنائے جن کا راجا پر بہت اثر ہوا۔ راجا نے اپنے امراء اور وزراء سے کہا کہ میں بقیہ زندگی یادِ الٰہی میں بسر کرنا چاہتا ہوں۔ تم لوگ اب سلطنت کا کام سنبھالو۔ اس کے بعد اس نے اپنا ملک ان میں تقسیم کر دیا اور خود عرب چلا گیا اور مسلمان ہو گیا۔ وہاں سے امراء کو لکھا کہ ان عرب تاجروں کے ساتھ جب یہ تمہارے علاقے میں پہنچیں تو فیاضانہ سلوک کرنا اور انہیں ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچانا چنانچہ اس کے بعد سے عرب مسلمانوں کے قافلے کے قافلے اس علاقے اور آس پاس کے دوسرے علاقوں میں آ کر آباد ہونا شروع ہو گئے۔ موپلا مسلمان انہی عرب (مسلمان) تاجروں کی اولاد ہیں۔

مرسلہ: حیات خان۔ جہلم

جہاں قانون کی عمل داری ہو۔ انہوں نے راستے سے ہٹ کر ایک چھوٹی سی وادی میں پڑاؤ ڈال لیا جس میں بارش کے پانی سے بنا ایک جوہڑ بھی تھا اور اس کا پانی پینے کے لائق تھا۔ پھر یہ جگہ عام گزرگاہ سے دور تھی اور اس بات کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا کہ کوئی اتفاق سے اس طرف آ نکلے۔

وہ اس جگہ رک گئے۔ ان کے پاس کھانے کو چنے اور دلیہ تھا لیکن ان کا باقاعدہ کھانا کھانے کو دل چاہ رہا تھا اس لیے طے ہوا کہ ان میں سے دو جا کر گاؤں سے کھانا لائیں گے۔ اور دو یہیں رک کر سامان کی حفاظت کریں گے۔ سنگھ اور نرل رک کر جانوروں اور زیورات کی حفاظت کرتے جب کہ ان کے دونوں ساتھی کھانا لینے جاتے۔ کیونکہ وہ گھوڑے استعمال نہیں کرنا چاہتے تھے اور خچروں کی کھال پر زمیندار کا نام کھدا ہوا تھا اس لیے ان کو شاہ بابا والا خچر دے

دیا گیا کہ وہ اس پر جائیں اور کھانا اور جانوروں کے لیے چارا لے آئیں۔ وہ دونوں دوپہر کو روانہ ہوئے تھے اور ان کے جاتے ہی سنگھ نے معنی خیز انداز میں نرمل سے کہا۔

"لوٹنے کے لیے ان لوگوں کی ضرورت تھی لیکن اب ان کی ضرورت باقی نہیں رہی ہے۔"

نرمل کے ہونٹوں پر سفاک مسکراہٹ آگئی تھی۔ "تم ٹھیک کہہ رہے اب ان کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ کھانا لے کر آتے ہیں تو ان کا فیصلہ کر دیتے ہیں۔"

سنگھ زور سے ہنسا۔ "اس کے بعد یہ سونا صرف ہمارا ہوگا۔"

☆☆☆

شاہ بابا اور مشتاق خلاف توقع جلد اس بستی تک پہنچنے میں کامیاب رہے تھے۔ اب دن کا بڑا حصہ باقی تھا اور وہ زیادہ تھکے بھی نہیں تھے لیکن راستے میں کچھ کھایا نہیں تھا اس لیے دونوں کو شدت سے بھوک لگ رہی تھی۔ اس لیے بستی کو سامنے دیکھ کر دونوں کو بہت خوشی ہوئی تھی۔ پھر یہ ایک سرسبز اور آباد جگہ تھی۔ ورنہ جنوب میں بستیاں اجاڑ اور بہت کم آبادی والی ہوتی ہیں۔ زمین بھی زرخیز تھی۔ دھان کے کھیت نظر آرہے تھے۔ کھیتوں میں فصل تیار ہو رہی تھی۔ مشتاق اس بستی کو دیکھ کر اس تک پہنچنے کے لیے بے تاب ہوگیا اور جلدی جلدی نیچے اترنے لگا۔

"آرام سے تم ابھی زخمی ہو اور جلد بازی میں کوئی چوٹ مت لگا لینا۔" شاہ بابا نے اسے سمجھایا۔

"مجھے بھوک لگ رہی ہے۔" مشتاق نے بہانہ کیا۔

"بس کچھ ہی دور ہے۔" شاہ بابا نے کوئی میل بھر دور رہ جانے والی بستی کی طرف اشارہ کیا۔ "جلد بازی کی صورت میں تمہیں کوئی نقصان ہوسکتا ہے۔"

مجبوراً مشتاق سست روی سے چلنے لگا، ورنہ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اڑ کر اس بستی تک پہنچ جائے۔ یہاں پگڈنڈی مشکل تھی۔ اصل میں بستی کی طرف آنے کا معروف راستہ شمال مغرب سے آتا تھا اور جنوب مشرق میں سارا علاقہ انتہائی دشوار تھا۔ اگر ان کا خچر چوری نہ ہوتا اور وہ پیدل نہ ہو جاتے تو شاہ بابا بھی شمال مغرب والے راستے سے آنا پسند کرتے۔ سامان کے ساتھ دشوار پگڈنڈی پر چلنا آسان کام نہیں تھا۔ کسی نہ کسی طرح وہ نیچے تک آنے میں کامیاب رہے اور پھر کھیتوں کے درمیان سے ہوتے ہوئے بستی تک پہنچ گئے۔ راستے میں ان کو کئی جگہ بہتا ہوا پانی ملا جس سے انہوں نے اپنی پیاس بجھائی تھی۔ پانی سرد اور خوش ذائقہ تھا۔ یہاں زمین بھی نرم اور ہموار تھی اور اس میں کاشت کاری آسان تھی۔ ان کو راستے میں چند ایک لوگ ملے جنہوں نے شاہ بابا کو دیکھ کر احتراماً سلام کیے تھے۔ بعض طالب دعا ہوئے تھے اور شاہ بابا نے ان کو دعا دی تھی۔ ان سے پتا چلا کہ اس بستی کا نام ٹانگل ہے۔

وہ بستی میں وارد ہوئے تو اس کی صفائی ستھرائی اور نظم وضبط دیکھ کر متاثر ہوئے تھے۔ یہاں ضرورت کی ہر چیز تھی۔ وہ پیدل چلتے ہوئے ایک بھٹیار خانے تک آئے۔ وہ اپنے حلیے کی وجہ سے سب کی توجہ کا مرکز بن گئے۔ بھٹیار خانے کا مالک خود باہر آیا اور ان کو اندر لے گیا۔ شاہ بابا مچھلی نہیں کھاتے تھے لیکن انہوں نے مشتاق کے لیے مچھلی منگوا لی۔ وہ زخمی تھا اور اسے توانائی کی ضرورت تھی۔ کھانے کے بعد شاہ بابا نے بلند آواز سے اعلان کیا کہ وہ ایک مبلغ ہیں اور جسے ان کا وعظ سننا ہو وہ شام کو بستی کی مسجد کے سامنے آجائے۔ جہاں مسجد ہوتی تھی۔ وہاں وہ مسجد کے سامنے وعظ کرتے تھے اور جہاں مسجد نہیں ہوتی تھی وہاں یہ فریضہ بستی کے چوک میں انجام دیتے۔ انہوں نے بھٹیارے کو کھانے کی قیمت دینا چاہی لیکن اس نے لینے سے انکار کر دیا تھا۔

یہ اعلان کر کے وہ باہر نکل آئے اور بستی میں گھومنے لگے۔ جہاں چند افراد نظر آتے شاہ بابا وہاں شام کے وعظ کا ذکر ضرور کرتے تھے۔ دو گھنٹے میں وہ ساری بستی گھوم کر اور اعلان کر کے مسجد کے سامنے آگئے اور وہاں درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ مشتاق کو معلوم تھا کہ مسجد سے کوئی نہیں آئے گا کیونکہ صوفی مبلغوں کو یہ مسجد والے پسند نہیں کرتے تھے۔ ایسے لوگوں کی بستیوں میں شاہ بابا کو مخالفانہ ماحول کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ لیکن وہ کسی کی پرواہ کیے بغیر اپنا کام کرتے تھے اور اگر کوئی ان کے منہ لگنے کی کوشش کرتا تو وہ پیچھے ہٹ جاتے تھے۔

مشتاق، شاہ بابا کے ساتھ شامل ہوا تھا تو اس کے ذہن میں ان کے بارے میں کچھ ایسے خیالات تھے کہ وہ کوئی ماورائی ہستی ہیں اور وہ جو چاہیں وہ ہو جاتا ہے۔ وہ دو سال سے ان کے ساتھ گھوم پھر رہا تھا۔ رفتہ رفتہ اس کا یہ تاثر زائل ہوگیا تھا اور شاہ بابا اسے ایک عام سے آدمی نظر آنے لگے تھے جن کو وہ ساری مشکلات پیش آتی ہیں جو ایک عام آدمی کو پیش آتی ہیں بلکہ ان کو کچھ زیادہ ہی مشکلات پیش آتی

ہیں۔ اس بارے میں شاہ بابا کا کہنا تھا کہ مشکلات وہ نہیں ہوتی ہیں جو آدمی کو پیش آتی ہیں بلکہ مشکلات وہ ہوتی ہیں جن کی آدمی شکایت کرتا ہے اور مشتاق نے آج تک شاہ بابا کو کسی بھی مشکل کی شکایت کرتے نہیں سنا تھا۔ گویا ان کے نزدیک زندگی میں کوئی مشکل نہیں تھی۔

مشتاق ان کا احترام کرتا تھا اور ان سے کچھ کہتے ہوئے ڈرتا تھا لیکن گزشتہ رات پیش آنے والے واقعے نے اس کے خیالات کچھ بدل دیئے تھے اور وہ اس وقت اسی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ جب وہ درخت کے نیچے آکر بیٹھے اور ان کو ذرا تنہائی نصیب ہوئی تو اس نے موقع غنیمت جان کر شاہ بابا سے کہا۔ ''مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے؟''

''کہو میرے بچے۔'' شاہ بابا نرمی سے بولے۔ ان کی لمبی داڑھی ہوا میں لہرا رہی تھی۔

''آپ خدا کا اچھا بندہ بننے کی کوشش کر رہے ہیں یہ درست ہے؟''

''ہاں میں کوشش کر رہا ہوں۔ جہاں تک اچھا ہونے یا نہ ہونے کا تعلق ہے تو اس کے بارے میں خدا ہی بہتر جانتا ہے۔''

''آدمی کسی کی نظر میں اچھا بننے کی کوشش کرتا ہے تو وہ اس کا خیال رکھتا ہے اور اس سے اچھی طرح پیش آتا ہے؟''

''یہ بھی درست ہے۔'' شاہ بابا نے اعتراف کیا۔

''تب ہمارے ساتھ کیوں برا ہو رہا ہے۔'' مشتاق جیسے پھٹ پڑا تھا۔ ''ہم دو سال سے دربدر پھر رہے ہیں۔''

''دربدر نہیں ہم خدا کا پیغام دوسروں تک پہنچانے کے لیے پھر رہے ہیں اور یہ بھی عبادت ہے۔ اب کتنے غیر مسلموں نے راہ حق کا انتخاب کیا، یہ بھی تو دیکھو؟'' شاہ بابا نے تصحیح کی۔

''چلیے خدا کا پیغام پہنچانے کے لیے پھر رہے ہیں تو وہ اس کا صلہ کیوں نہیں دیتا ہے۔ ہم فقیروں کی طرح دوسروں کی مدد کے محتاج ہیں۔ ہمارے پاس نہ کھانے کو اچھا ہے اور پہننے کو اور نہ ہی سواری ہے۔ ایک خچر تھا اب وہ بھی نہیں رہا ہے۔''

''لیکن ہمارے پاس کھانے کو بھی ہے اور پہننے کو بھی ہے۔ بے شک ویسا نہیں ہے جیسا کہ تم چاہتے ہو اور کبھی کبھی میں بھی چاہتا ہوں لیکن ضرورت کے مطابق ہے تو۔'' شاہ بابا نے نرمی سے کہا۔ ''مشتاق کیا تم خدا پر شک کر رہے ہو حالانکہ وہ ہماری بہتری چاہتا ہے۔''

''خچر کے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟'' مشتاق کا لہجہ گستاخانہ ہو گیا۔ ''اس کے چھن جانے میں ہمارے لیے کون سی بہتری ہے؟''

''یہ بھی خدا ہی بہتر جانتا ہے۔''

''شاہ بابا آپ مان لیں اس میں ہمارے لیے کوئی بہتری نہیں ہے بلکہ ہم اپنے واحد اثاثے سے بھی محروم ہو چکے ہیں۔''

''ایسا نہیں ہے خدا نے چاہا تو ہمیں خچر مل جائے گا یا اس سے بھی بہتر ہو کر مل جائے گا۔''

''اس سے بہتر ہو کر۔'' مشتاق کا لہجہ استہزائیہ ہو گیا تھا۔ ''کیا اس پر سونا لدا ہو گا۔''

''خدا چاہے تو ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن میرے بچے میں نے ایسا کبھی نہیں سوچا۔''

''مجھے تو خیال آتا ہے ہم خدا کا کام کرنے والے انسان سب سے تنگ دست ہیں۔ اگر خچر نہ ملا تو کیا ہم اسی طرح اپنا سامان اٹھا کر پیدل سفر کرتے رہیں گے؟''

''اگر خچر نہ ملا تو ہم ایسا ہی کریں گے۔'' شاہ بابا نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''خچر ایک سہولت ہے، ہمارے لیے لازمی نہیں ہے۔''

''میرے لیے تو لازمی ہے۔'' مشتاق نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں اس طرح سامان اٹھا کر سفر نہیں کر سکتا جیسے آج ہم نے کیا ہے۔ میں اسی صورت میں آپ کے ساتھ آگے چلوں گا اگر خچر مل گیا ورنہ.....'' مشتاق کہتے کہتے رک گیا۔

''ورنہ کیا میرے بچے؟''

''ورنہ میں یہیں رہ جاؤں گا۔''

شاہ بابا دیکھ رہے تھے کہ اس قصبے کی ہری بھری زندگی نے مشتاق کو مسحور کر لیا تھا اور شاید اب وہ یہاں رک جانا چاہتا تھا۔ یہاں کام کی کمی نہیں تھی۔ چاروں طرف کھیت اور پان کے باغات تھے۔ ان میں یقیناً مزدوروں کی ضرورت رہتی ہوگی پھر قصبہ بھی خاصا بڑا تھا۔ شاہ بابا نے سر ہلایا۔ ''ٹھیک ہے میرے بچے اگر تمہارا یہی فیصلہ ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن تم اپنے یہاں رہنے کے فیصلے کو خچر سے مشروط مت کرو۔ ممکن ہے وہ مل جائے اور تمہیں میرے ساتھ جانا پڑے جب کہ تمہارا دل نہیں مان رہا ہو۔''

''اس خچر کے ملنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔'' مشتاق نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''لیکن وہ مل گیا تو میں آپ کے ساتھ جانا پسند کروں گا۔''

بات آگے نہیں بڑھ سکی تھی کیونکہ لوگ آنا شروع ہو گئے اور شاہ بابا وعظ کرنے کے لیے تیار تھے۔ وہ کھڑے ہو گئے۔شاہ بابا کا وعظ ایک گھنٹے جاری رہا۔ ان کی الفاظ کی تاثیر اور لہجے کے درد نے بہت سارے لوگوں کو رلا دیا تھا۔ خود مشتاق بھی متاثر ہوا تھا اسے ایسا لگا جیسے آج کا وعظ شاہ بابا نے خاص طور سے اس کے لیے دیا ہے۔ بہت سارے لوگوں نے وعظ کے بعد شاہ بابا سے وعدہ کیا کہ وہ اپنی زندگی مذہب کے اصولوں کے تحت گزارنے کی کوشش کریں گے۔اس کے بعد لوگ منتشر ہو گئے تھے۔ البتہ چند افراد وہاں موجود رہے تھے اور وہ شاہ بابا سے ان کے بارے میں جاننا چاہتے تھے۔ان میں ایک بارہ تیرہ سال کا لڑکا حمزہ بھی تھا جو بہت عقیدت سے شاہ بابا کو دیکھ رہا تھا۔شاہ بابا ان کے سوالوں کے جواب دیتے رہے۔ پھر رات گہری ہونے لگی۔ ایک گھر سے ان کو کھانے کی دعوت ملی تھی۔ وہ ان کے ہاں چلے گئے۔

وہ کھانا کھا کر واپس آئے اور مسجد کے سامنے گھاس پر بستر بچھا کر لیٹ گئے۔اس کے لیے انہوں نے مسجد انتظامیہ سے اجازت لے لی تھی۔ اگرچہ مسجد والوں نے شاہ بابا کی آمد کو پسند نہیں کیا تھا لیکن عوام میں ان کی مقبولیت دیکھ کر انہوں نے مسجد کی حد میں ان کے قیام پر اعتراض بھی نہیں کیا تھا۔ یہاں زیادہ سردی نہیں تھی اس لیے وہ آرام سے سوئے تھے۔

صبح اتفاق سے پہلے مشتاق کی آنکھ کھلی تھی۔ روشنی پھیل رہی تھی اور شاہ بابا ابھی سو رہے تھے۔نماز کے بعد وہ کچھ دیر تلاوت کرتے تھے پھر سورج نکلنے کے بعد سو جاتے تھے۔مشتاق نے انگڑائی لی اور پھر اس کی انگڑائی ادھوری رہ گئی تھی۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ اس کے سامنے ان کا خچر موجود تھا اور اس کی پشت پر دو بڑی بوریاں بندھی ہوئی تھیں۔ اس نے آنکھیں ملیں کہ وہ کہیں دھوکا تو نہیں کھا رہا تھا لیکن خچر اپنی جگہ موجود رہا۔ مشتاق جھپٹ کر اٹھا اور خچر کے پاس آیا اور پھر اس نے ایک بوری کو ذرا سا کھول کر دیکھا تو اسے سکتہ ہو گیا تھا کیونکہ بوری سونے کے زیورات سے بھری ہوئی تھی۔ اس نے کل طنز میں شاہ بابا سے کہا تھا کہ خچر سونے سے لدا واپس ملے گا۔ آج نہ صرف خچر آ گیا تھا بلکہ وہ سونے سے بھی لدا ہوا تھا۔ مشتاق نے بدحواس ہو کر شاہ بابا کو جگایا۔

''بابا.... خچر آ گیا ہے اس پر سونا بھی ہے۔''

بابا سمجھے کہ مشتاق خواب دیکھ کر جاگا ہے لیکن جب اس نے خچر کی طرف اشارہ کیا تو وہ اٹھ گئے تھے۔ انہوں نے بوری میں دیکھا۔ اس میں واقعی سونے کے زیورات تھے۔انہوں نے مشتاق سے پوچھا کہ خچر کہاں سے آیا تو اس نے قسم کھا کر بتایا کہ اسے نہیں معلوم، اس کی آنکھ کھلی تو خچر یہیں کھڑا ہوا تھا۔

شاہ بابا سوچ میں پڑ گئے تھے۔ اگر خچر یہاں آیا تھا تو اس کا مطلب تھا کہ اسے چھین کر لے جانے والے بھی آس پاس موجود تھے اور وہ بے خبر تھے اس لیے خچر ان کے پاس سے بھاگ کر یہاں آ گیا تھا۔

''لیکن اسے کیسے پتا چلا کہ ہم یہاں ہیں؟ شاید یہ آبادی دیکھ کر اس طرف آیا ہوگا اور یہاں اسے ہم مل گئے۔''

''اس کا مطلب ہے وہ لوگ خچر کو سونا لادنے کے لیے لے گئے تھے؟'' مشتاق نے کہا۔''اور یہ موقع پا کر ان کے پاس سے بھاگ آیا؟''

''ہاں میرے بچے لیکن یہ معاملہ اتنا آسان نہیں ہے۔اس پر زیورات کی بوری لدی ہوئی ہے اور اس کا یوں بھاگ آنا یقیناً آسان کام نہیں ہوگا۔ مجھے لگ رہا ہے ان لٹیروں کے ساتھ بھی کچھ ہوا ہے اور وہ یا تو اسے چھوڑ کر بھاگ گئے یا اس قابل نہیں رہے کہ خچر کو جانے سے روک سکتے۔'' شاہ بابا نے سوچ کر کہا۔''ہمیں اس کی اطلاع قصبے کے کوتوال کو دینی ہوگی۔''

''بابا اگر آپ نے کوتوال کو بتا دیا تو یہ سونا ان کے قبضے میں چلا جائے گا۔'' مشتاق نے جلدی سے کہا۔

''تو یہ سونا اور کس کے پاس ہونا چاہیے۔'' شاہ بابا نے اسے گھورا۔''کوتوال اسے اس کے اصل مالک تک پہنچا دے گا۔''

مشتاق کی خواہش تھی کہ وہ سونا اپنے پاس رکھ لے لیکن شاہ بابا کے سامنے وہ اپنی اس خواہش کا اظہار نہیں کر سکتا تھا مجبوراً اسے ان کے ساتھ جانا پڑا تھا۔ قصبے کا کوتوال گزشتہ دن خود وعظ میں شریک ہوا تھا، اس نے بابا کی شکایت پر فوری توجہ دی۔ اس نے بابا سے پوچھا۔''آپ کو کیا شبہ ہے؟''

''میرا خیال ہے یہ لٹیرے جنہوں نے ہم سے یہ خچر چھین لیا تھا اور میرے ساتھی کو زخمی کیا تھا کہیں آس پاس موجود ہیں اور شاید اس حالت میں نہیں ہیں کہ خچر کو فرار سے

روک سکیں۔‘‘

’’یہ آپ کس طرح کہہ سکتے ہیں۔‘‘ کوتوال نے پوچھا۔

’’ان کے پاس گھوڑے ہیں اور اگر خچر فرار ہوتا تو یہ اسے آسانی سے پکڑ سکتے تھے۔ مگر خچر آرام سے قصبے تک آ گیا۔‘‘

کوتوال نے فوری طور پر ایک پارٹی تشکیل دی اور خچر پر لدی بوری قبضے میں لے لی۔ اس کے بعد شاہ بابا نے خچر کو سہلایا اور چمکایا تو وہ ان کو لے کر ایک طرف روانہ ہو گیا۔ کوتوال اور قصبے کے کچھ مسلح رضا کار بھی ان کے ساتھ تھے کیونکہ لٹیرے مسلح تھے اور ان کے سامنے نہتے جانا حماقت ہوتی۔ رضا کاروں میں سے ایک نے شبہ ظاہر کیا کہ یہ وہی خچر ہے جو گزشتہ دوپہر دو افراد کے ساتھ تھا اور وہ قصبے سے کھانا لے کر میدانوں طرف گئے تھے۔ خچر اب آگے تھا اور ان کی رہنمائی کر رہا تھا۔ وہ پہاڑوں کی طرف ہی جا رہا تھا۔

کوئی دو گھنٹے کے سفر کے بعد خچر دو جھیل کے درمیانی راستے کی طرف مڑ گیا۔ کوتوال نے کہا۔

’’اس طرف ایک چھوٹی سی وادی ہے جو کسی کے چھپنے کے لیے بہترین جگہ ہے۔ ممکن ہے لٹیرے وہاں موجود ہوں۔‘‘

’’اس کا مطلب ہے ہمیں محتاط رہنا چاہیے۔‘‘ مشتاق بولا۔

کوتوال نے اپنے ساتھیوں کو ہوشیار کر دیا اور انہوں نے اپنے ہتھیار سنبھال لیے تھے۔ وہ دبے قدموں وادی تک پہنچے اور جب انہوں نے اندر جھانکا تو ان کو چار افراد مختلف جگہوں پر پڑے نظر آئے۔ وہ بالکل ساکت تھے جب کہ ان کے چار عدد گھوڑے اور تین خچر بندھے ہوئے تھے۔ وہ سب نزدیک پہنچے تو جلد معلوم ہو گیا کہ وہاں موجود چاروں لٹیرے مر چکے تھے۔ ان میں سے دو تو وہی تھے جو قصبے میں کھانا لینے آئے تھے اور ان کو تلوار مار کر ہلاک کیا گیا تھا لیکن دو کے جسم پر کوئی نشان نہیں تھا البتہ ان کے چہرے نیلے ہو رہے تھے اور ان کے منہ پر جھاگ سا جم گیا تھا.... دونوں آس پاس مرے پڑے تھے۔ جب کہ پاس ہی کھانا پڑا ہوا تھا۔ کوتوال نے ان کی لاشوں کا معائنہ کیا اور بولا۔

’’ایسا لگ رہا ہے جیسے ان دونوں نے۔‘‘ اس نے سنگھ اور زرل کی طرف اشارہ کیا۔ ’’ان دونوں کو قتل کر دیا ہو۔‘‘ اس نے کھانا لانے والوں کو دیکھا۔ ’’اور پھر کھانا کھا کر خود بھی مر گئے ہوں۔‘‘

’’لیکن ان کی موت کیسے واقع ہوئی؟‘‘ مشتاق حیران تھا۔

’’شاید کھانے میں زہر تھا۔‘‘ کوتوال نے ایک رکابی میں بچے ہوئے گوشت کو غور سے دیکھا۔ اس کا رنگ نیلگوں ہو گیا تھا۔ ’’انہوں نے ان دونوں کو قتل کرنے کے بعد کھانا کھایا اور خود بھی ہلاک ہو گئے۔‘‘

’’لیکن کھانے میں زہر کس نے ملایا تھا؟‘‘ مشتاق کے اس سوال پر سب کی نظریں کھانا لانے والوں پر مرکوز ہو گئیں۔

’’کھانے میں زہر انہوں نے ملایا ہوگا۔‘‘ کوتوال نے کہا۔

’’لیکن کیوں؟‘‘ یہ سوال بھی مشتاق نے کیا تھا۔

’’اس سونے کے لیے۔‘‘ بابا نے خچروں پر لدے زیورات کے تھیلوں کی طرف اشارہ کیا۔ ’’حضرت عیسیٰ کے دور میں بھی کچھ لوگوں نے ایسا ہی کیا تھا۔ ان کو کہیں سے سونا مل گیا تھا اور وہ اس کے لالچ میں آ گئے۔ وہ دوست تھے

منی پور

بھارت کی ایک ریاست۔ رقبہ 22356 مربع کلومیٹر یا 8629 مربع میل۔ صدر مقام امفل (Imphal) اس کے جنوب اور مشرق میں میانمر (برما) واقع ہے۔ زیادہ تر علاقہ جنگلات پر محیط ہے۔ یہاں کے باشندوں کا تعلق منگول نسل سے ہے اور یہ تبتی برمی زبانیں بولتے ہیں۔ اکثریت ہندو ہیں۔ اگا اور کوکی قابلِ ذکر قبیلے ہیں۔ 1762ء میں راجا منی پور نے برطانیہ سے معاہدہ کیا جس کے تحت برطانیہ نے منی پور پر حملہ آور برمی فوجوں کی پیش قدمی کو روکنے میں اہم کردار ادا کیا۔ 1947ء تک یہ علاقہ آسام کے زیر انتظام رہا۔ پھر یونین ٹیریٹری کی حیثیت دی گئی بالآخر 1972ء میں اسے ریاست کا درجہ دے دیا گیا۔ منی پوری اکثریت باشندوں کی زبان ہے۔ 66 فیصد لوگ زراعت پیشہ ہیں۔

مرسلہ: زویا احمد۔ کراچی

لیکن سونے کی طمع نے ان کی دوستی کو دشمنی میں بدل دیا تھا اور انہوں نے آپس میں ایک دوسرے کو اسی طرح ختم کر دیا تھا جیسے انہوں نے کیا ہے۔"

مشتاق گم صم سا زیورات کے تھیلوں کو دیکھ رہا تھا یقیناً اس میں ہزاروں کی مالیت کا سونا تھا لیکن یہ سونا کسی کو نہیں مل سکا۔ اسے لوٹ کر لانے والے آپس میں ایک دوسرے کو قتل کر کے لاشوں کی صورت میں پڑے ہوئے تھے۔ کوتوال نے بھی لاشوں سے زیادہ سونے کو اہمیت دی۔ وہ بوریوں سے لدے خچر اپنے ساتھ لے کر روانہ ہوا اور لاشوں کے بارے میں اپنے آدمیوں کو ہدایت کر دی کہ وہ ان کو لے آئیں۔ قصبے میں آنے کے بعد اس نے بابا کا خچر ان کے حوالے کر دیا۔ زیورات کے بارے میں اس نے کہا کہ وہ مالکوں کو اس بارے میں اطلاع کر دے گا اور وہ آ کر اپنا سونا واپس لے جائیں گے۔

جب وہ کوتوالی سے نکلے تو مشتاق شرمندہ تھا۔ اس نے بابا سے معذرت کی۔ "مجھے معاف کر دیں میں نے آپ پر شک کیا۔"

"نہیں میرے بچے تم نے وہی کیا جو ایک انسان کی فطرت کا تقاضہ ہوتا ہے۔" شاہ بابا نے تردید کی۔ "ہاں تم نے خدا پر ایمان میں کمزوری دکھائی اس کے لیے تم خدا سے معافی مانگو اور میرے بچے اب ہمارے جدا ہونے کا وقت آ گیا ہے۔"

"میں آپ کو کبھی نہیں چھوڑوں گا۔" مشتاق رونے لگا تھا۔ "میں نے غلطی کی جو آپ سے ایسا کہا۔"

"اس کے باوجود اب تمہارا اور میرا جدا ہو جانا بہتر ہے۔" شاہ بابا نے نرمی سے کہا۔ "ویسے بھی میرے بچے تم اس قابل ہو گئے ہو کہ اپنے طور پر زندگی گزار سکو۔"

"نہیں آپ کے ساتھ رہنا اور آپ جیسا بننا چاہتا ہوں۔" مشتاق نے التجا کی۔ وہ سچ مچ بہت شرمندہ تھا۔

"میں نے کبھی نہیں چاہا کہ کوئی میری طرح بنے، میں نے ہمیشہ یہ چاہا کہ لوگ اچھے اور نیک بنیں۔" شاہ بابا نے دھیمے لہجے میں کہا۔

مشتاق، شاہ بابا کے ساتھ رہنا چاہتا تھا لیکن انہوں نے اسے قائل کر لیا کہ وہ اب ان سے جدا ہو جائے اور اس قصبے میں رہائش اختیار کر لے کیونکہ یہ جگہ اسے اچھی لگی تھی۔ دوسرے وہ شاہ بابا سے مختلف انسان تھا جو کام شاہ بابا خوشی سے اور پورے دل کے ساتھ کرتے تھے وہی مشتاق بے دلی سے اور خود پر جبر کر کے کرتا اس لیے بہتر تھا وہ وہی کرے جو اس کی خوشی تھی۔ اس شام شاہ بابا نے اپنے وعظ کے بعد مقامی باشندوں سے اپیل کی کہ وہ مشتاق کو اپنے درمیان جگہ دیں اور اسے اس قصبے میں آباد ہونے کا موقع دیں۔ انہوں نے لوگوں کو یقین دلایا کہ مشتاق ایک اچھا اور نیک انسان ہے۔ اس وقت تک سنگھ اور اس کے ساتھیوں کے حشر کی کہانی پورے قصبے کے علم میں آ گئی تھی اور شاہ بابا ان لوگوں کے نزدیک ایک روحانی ہستی بن گئے تھے۔ ان کی اپیل رد ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ایک بڑھئی نے مشتاق کو اپنا شاگرد بنانے اور اسے اپنے ساتھ رکھنے کا اعلان کر دیا۔ شاہ بابا نے اسی وقت اسے اس کے سامان سمیت رخصت کر دیا تھا۔ وہ افسردہ تھے لیکن خوش بھی تھے کہ مشتاق اب خوش رہے گا۔

اگلے روز وہ روانگی کا سوچتے ہوئے درخت تلے آنکھیں بند کر کے بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ اداس تھے کہ اب ان کو مشتاق کے بغیر رہنا ہوگا لیکن مشتاق کی بہتری اسی میں تھی کہ وہ اب ان سے الگ ہو کر اپنی دنیا آپ بسا لے۔ اچانک ان کو اپنے پاس کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ انہوں نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو انہیں وہی لڑکا نظر آیا جو پہلے دن انہیں پُرشوق انداز میں دیکھ رہا تھا۔ انہوں نے شفقت سے کہا۔ "میرے بچے تم کون ہو؟"

"میں حمزہ ہوں اور میرا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے میں بالکل اکیلا ہوں۔"

"جن کا کوئی نہیں ہوتا ان کا خدا ہوتا ہے۔" انہوں نے پیار سے سمجھایا۔ "اور جس کا خدا ہوتا ہے وہ کبھی اکیلا نہیں ہوتا ہے۔"

لڑکا جھجکا اور پھر بولا۔ "کیا میں آپ کے ساتھ رہ سکتا ہوں میں آپ جیسا بننا چاہتا ہوں۔"

انہوں نے کہا۔ "کیوں نہیں میرے بچے تم میرے ساتھ رہ سکتے ہو لیکن اس کے لیے تمہیں میری کچھ شرائط ماننا ہوں گی؟"

"مجھے آپ کی ہر بات منظور ہے میں آپ کی ہر بات مانوں گا۔" حمزہ نے جوش سے کہا۔

شاہ بابا مسکرانے لگے ان کو لگا وہ اکیلے نہیں رہے تھے ان کو مشتاق پھر سے مل گیا تھا۔ "ٹھیک ہے تب تم میرے ساتھ رہ سکتے ہو۔"

عقیل عباس جعفری

قائداعظم نے قوم کو ایک نصب العین دیا تھا۔ ہمیں اسی نصب العین کے مطابق بڑھنا ہے لیکن اس کی ترتیب کیا ہے یہ ہم بھول چکے ہیں۔ حکومتی سطح پر بھی اس کی ترتیب الجھی ہوئی ہے۔ اسی گنجلگ گتھی کو سلجھانے کی سعی، بہت سارے تاریخی قرطاس وکتب کا نچوڑ۔ یقیناً سرگزشت کے قارئین کے لیے یہ ایک دستاویز ہے۔

اتحاد، یقین، تنظیم قائداعظم کے اس نصب العین کی صحیح ترتیب کیا ہے؟

''ایک طویل عرصے سے جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کو دیئے گئے قائداعظم کے مشہور نصب العین ''ایمان، اتحاد، نظم'' کے بارے میں یہ بحث چل رہی ہے کہ قائداعظم نے اپنے اس نصب العین کے الفاظ کس ترتیب سے بیان کیے تھے۔'' اس نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ ''ایک حلقہ کہتا ہے ان الفاظ کی درست ترتیب ایمان، اتحاد، نظم ہے اور دوسرے حصے کا اصرار ہے کہ قائداعظم کے اس نصب العین کے الفاظ کی درست ترتیب تھی اتحاد، ایمان، نظم، اس بارے میں آپ کا خیال کیا

1976ء جاری ہونے والا 500 روپے کا سکہ
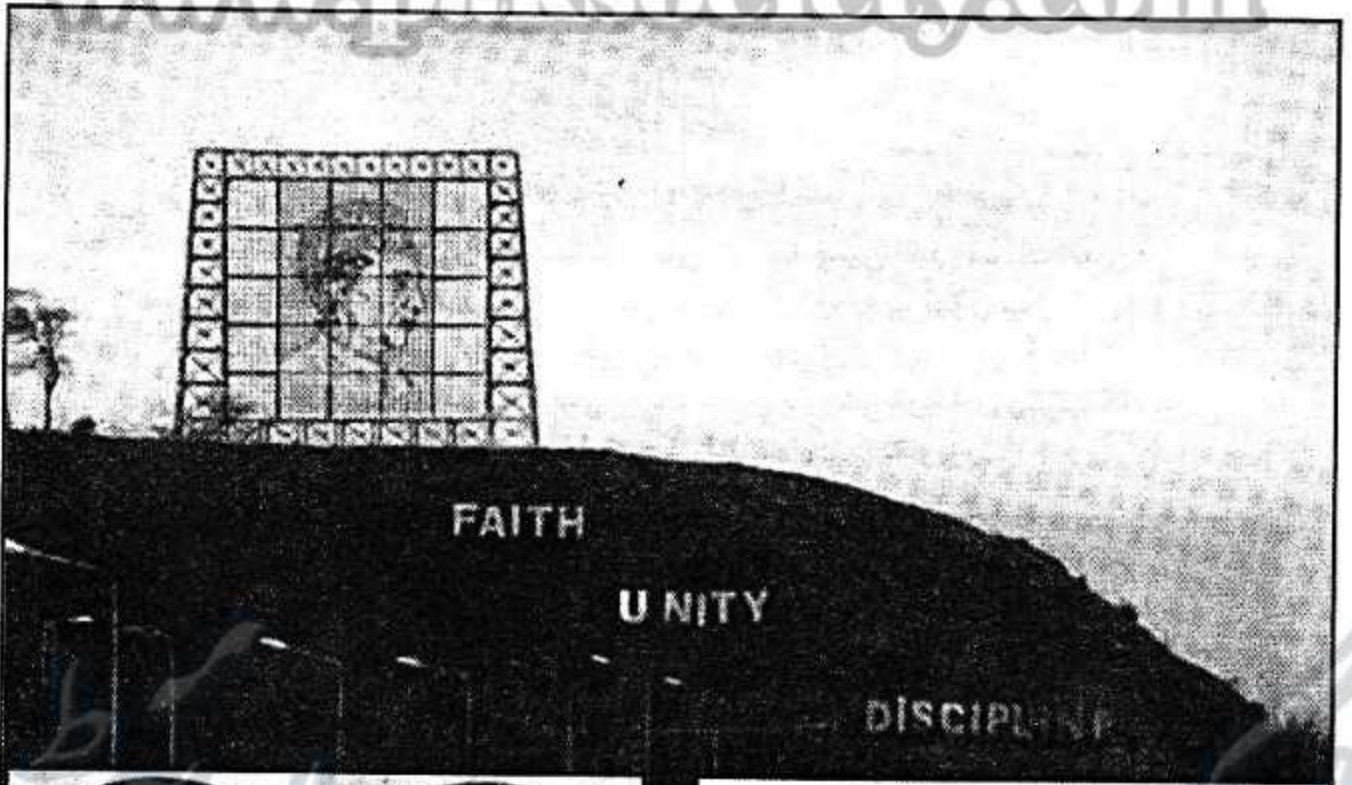
1976ء جاری ہونے والا 50 روپے کا سکہ

ہے۔“

اس کے سوال پر میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”دلچسپ بات یہ ہے کہ خود حکومت بھی اس مسئلے کو حل کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتی بلکہ وہ گاہے بگاہے بھی ایمان، اتحاد، تنظیم کو اپنا کر اور کبھی اتحاد، ایمان، تنظیم کو اختیار کر کے کنفیوژن کو مزید ہوا دیتی ہے۔“ میں نے رک کر گہری سانس لی پھر کہا۔ ”حکومتی سطح پر قائداعظم کے ان اقوال کا اولین استعمال ہمیں اس سرکاری طغرے میں نظر آتا ہے جو حکومت پاکستان نے 11 جنوری 1955ء کو منظور کیا۔ یہ فائل نیشنل ڈاکومینٹیشن سینٹر اسلام آباد میں محفوظ ہے اور اس کا نمبر 55 تا 24 ہے یہ خط حکومتِ پاکستان کے سیکریٹری این اے فاروقی نے جاری کیا اور اس خط میں پاکستان کے سرکاری طغرے کی حتمی منظوری دی گئی۔ این اے فاروقی نے اس خط میں تحریر کیا کہ حکومت پاکستان نے پاکستان کے سرکاری طغرے پر حسبِ ذیل تین الفاظ لکھے جانے کی منظوری دی ہے۔ ”ایمان، اتحاد، نظم“ اس فائل کے مطابق پاکستان کے اس سرکاری طغرے کی تیاری کا آغاز خاصے عرصے سے جاری تھا۔ ابتدا میں اس طغرے کے لیے قرآن پاک کی آیت حسبنا اللہ ونعم الوکیل کا انتخاب کیا گیا تھا۔ پھر اس آیت کی بجائے قائداعظم کے دیئے گئے نصب العین کو منتخب کیا گیا۔ ابتدا میں اس طغرے کے لیے قائداعظم کے دیئے گئے نصب العین کے الفاظ کی ترتیب **Unity, Faith, Discipline** اختیار کی گئی اور اس کا ترجمہ اتحاد، ایقان، نظم کیا گیا۔ پھر اس میں ردوبدل ہوئی اور یہ ترتیب اتحاد، نظم، ایقان ہوگئی اور آخر میں جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا یہ ترتیب ایمان، اتحاد، نظم ہوگئی اور اس کی حتمی منظوری دی گئی۔ اس طغرے کی مجوزہ فائل میں یہ تمام ڈیزائن محفوظ ہیں۔“

”اس بارے میں اگر مزید وضاحت ہو جائے تو بہتر ہے۔“

”1976ء میں قائداعظم کے سوویں یوم ولادت کا

1976ء جاری ہونے والا 100 روپے کا سکہ

جشن منایا گیا تو اس موقع پر وزارتِ تعلیم، حکومت پاکستان کی قائم کردہ قائداعظم محمد علی جناح کی صد سالہ تقریبات کی قومی کمیٹی نے جس لوگو کی منظوری دی اس پر بھی یہ الفاظ اسی ترتیب سے درج کیے گئے مگر حیرت انگیز طور پر اس موقع پر کراچی میں جو یادگار تعمیر کی گئی اس پر یہ الفاظ Unity, Faith, Discipline کی ترتیب سے کندہ کیے گئے اور ان کا ترجمہ اتحاد، یقین، محکم، تنظیم کیا گیا۔"

"ڈیزائن کس نے کیا تھا؟"

"یہ یادگار تین تلوار کے نام سے معروف ہے اور اسے مشہور آرکیٹکٹ مینو مستری نے ڈیزائن کیا۔ دراصل 1976ء میں ہی حکومت پاکستان نے قائداعظم کی صد سالہ تقریبات کے حوالے سے 50 پیسے، 100 روپے اور 500 روپے کے خصوصی سکے جاری کیے۔ دلچسپ بات یہ رہی کہ پچاس پیسے کے سکے پر اس نصب العین کے الفاظ کی ترتیب اردو میں ایمان، اتحاد، نظم کندہ کی گئی جب کہ 100 اور 500 روپے کے سکوں پر انہیں بدل کر انگریزی میں Unity, Faith, Discipline کر دیا گیا۔ 50 پیسے کے سکے کی حتمی تاریخ اجراء معلوم نہیں ہو سکی جب کہ 100 اور 500 روپے کے سکے 25 دسمبر 1976ء کو جاری کیے گئے۔"

محکمہ ڈاک نے 1949ء میں یہ ڈاک ٹکٹ جاری کیا

GOVERNMENT OF PAKISTAN

MINISTRY OF THE INTERIOR

From

N. A. Faruqui, Esqr., C.S.P.,
Secretary to the Government of Pakistan.

To

The Hon'ble the Agent to the Governor-General and the Chief Commissioner in Baluchistan, Sibi.
The Chief Commissioner, Karachi.
The Chief Secretary to the Government of East Bengal, Dacca.
The Chief Secretary to the Government of the Punjab, Lahore.
The Chief Secretary to the Government of N.-W.F.P., Peshawar.
The Chief Secretary to the Government of Sind, Karachi.

Karachi, the 11th January, 1955.

SUBJECT :—Crest of the Government of Pakistan.

Sir,

I am directed to refer to this Ministry's letter No. 24/7/54-Public, dated the 6th December 1954, on the above subject, and to say that on further consideration it has been decided that the arrangement of the words in the scroll below the wreath supporting the shield of the crest shall be as follows :—

ایمان—اتحاد—نظم

Your obedient servant,

N. A. FARUQUI,
Secretary to the Government of Pakistan.

No. 24/1/55-Public   Dated, the 11th January, 1955.

Copy forwarded to all Ministries and Divisions of the Government of Pakistan for information. (The Ministry of Industries are requested to inform the Controller of Printing and Stationery about the above amendment).

2. Copy to all Pakistan Missions abroad.

M. S. SIDDIQI,
Assistant Secretary to the Government of Pakistan.

"یہ تو واقعی دلچسپ انکشاف ہے۔"

"اب ایک اور دلچسپ واقعہ سنتے چلیں۔ اکیسویں صدی کی پہلی دہائی میں سی ڈی اے نے اسلام آباد ہائی وے کی پہاڑی کو قائداعظم کے اس نصب العین کے الفاظ سے مزین کرنے کا فیصلہ کیا۔ ابتدا میں اس پہاڑی پر قائداعظم کے نصب العین کے الفاظ اس ترتیب سے تحریر کیے گئے۔ Unity, Faith, Discipline (اتحاد، ایمان، نظم) اس کے بعد ممتاز محقق جناب رضوان احمد نے اس وقت کے وزیراعظم شوکت عزیز سے ملاقات کی اور ان سے درخواست کی کہ ان الفاظ کی ترتیب Faith, Unity, Discipline (ایمان، اتحاد، نظم) کر دیا جائے۔ شوکت عزیز نے ان کی درخواست کو پذیرائی بخشی اور الفاظ کی ترتیب Faith, Unity, Discipline (ایمان، اتحاد، نظم) کر دی گئی مگر ان کے رخصت ہوتے ہی سی ڈی اے کے حکام نے اس حکم کو بالائے طاق رکھتے ہوئے ان الفاظ کی ترتیب بدل کر پھر Unity, Faith, Drscipline (اتحاد، ایمان، نظم) کر دیا۔ ناطقہ سر بگر یباں ہے اسے کیا کہیے۔" اپنی باتوں کا ردِعمل ان کے چہرے پر دیکھتے ہوئے میں نے کہا۔ "ان الفاظ کی ان ادلتی بدلتی ترتیب کے بعد ہم نے کھوج لگانا چاہا کہ قائداعظم کے دیئے ہوئے نصب العین کے ان سنہرے الفاظ کی اصل ترتیب کیا تھی اور قائداعظم نے خود یہ الفاظ کب اور کس ترتیب سے استعمال

محکمہ ڈاک کی جانب سے 1949ء میں
جاری شدہ ڈاک ٹکٹ

پاکستان پوسٹل سروس کی جانب سے 1949ء میں
جاری کردہ ڈاک ٹکٹ

کیے تھے۔ ابتداء میں ہمارا خیال تھا کہ قائداعظم نے یہ الفاظ کسی ایک تقریر یا بیان میں استعمال کیے ہوں گے مگر جب ہم نے قائداعظم کی تقاریر اور بیانات کے مختلف مجموعے دیکھے تو معلوم ہوا کہ قائداعظم نے یہ الفاظ ایک سے زیادہ مواقع پر اور الگ الگ ترتیب سے استعمال کیے ہیں۔ قائداعظم کی تقاریر اور بیانات کے جو مستند مجموعے اشاعت پذیر ہوئے ہیں ان میں ڈاکٹر زوار حسین زیدی کا جناح پیپرز، ڈاکٹر وحید احمد کا The Nation`s Voice اور خورشید احمد خاں یوسفی کا مجموعہ Speeches, Statements and Messages of the Quaid-e-Azam سرفہرست ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد قائداعظم کی تقاریر اور بیانات کا ایک مجموعہ حکومت پاکستان کی وزارت اطلاعات نے شائع کیا جس کا نام تھا Quaid-e-Azam Mohammad Ali Jinnah Speeches and Statemenats 1947-48 جس کا ترجمہ اردو اور سندھی زبان میں بھی شائع ہو چکا ہے۔ ان تمام مجموعوں کے علاوہ ایک کتاب فضل حق قریشی نے بھی مرتب کی جس کا نام Every Day with the Quaid-e-Azam تھا۔" سلسلہ کلام کو روک کر میں نے سانس لیا پھر کہا۔ ان تمام مجموعوں کا مفصل مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قائداعظم نے یہ الفاظ کم از کم پانچ مواقع پر استعمال کیے۔

ان میں سے پہلا موقع 19 اکتوبر 1941ء کو عیدالفطر کا موقع تھا۔ جب قائداعظم نے قوم کے نام اپنے پیغام کو ان الفاظ پر ختم کیا:

Our watchwords should be Faith, Unity and Discipline.

قائداعظم کا یہ پیغام خورشید احمد خاں یوسفی کے مجموعے Speeches, Statements and Messages of the Quaid-e-Azam کی تیسری جلد کے صفحہ 454-55 پر موجود ہے۔ یہ پیغام ہفت روزہ ڈان نے 26 اکتوبر 1941ء کو شائع کیا۔ یہی وہ پیغام ہے جس کا حوالہ رضوان احمد دیتے ہیں۔ یہ پیغام ان کی مرتب کردہ مشہور کتاب Sayings of Quaid-e-Azam کے صفحہ نمبر 32 پر موجود ہے۔ اس کے دو ماہ بعد آل انڈیا مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا پانچواں سالانہ اجلاس 26 دسمبر 1941ء کو ناگ پور میں منعقد ہوا۔ اس موقع پر قائداعظم نے فی البدیہہ تقریر کی۔ اس تقریر میں بھی طلباء کے لیے قائداعظم کا دیا گیا یہ نصب العین الفاظ کی

1976ء میں وزارت تعلیم، حکومت پاکستان کی قائم کردہ قائداعظم محمد علی جناح کی صدسالہ تقریبات کی قومی کمیٹی کا منظور کردہ لوگو

پاکستان کے سرکاری طغرے کے نصب العین
کے الفاظ کی ابتدائی دو مجوزہ ترتیب

اسی ترتیب یعنی Faith, Unity, Discipline کے ساتھ موجود ہے، قائداعظم کا فقرہ تھا:

"Surrender yourselves to our Watchword-Faith, Unity and Discipline."

اس پیغام کا حوالہ ڈاکٹر صفدر محمود دیا کرتے ہیں اور اسے پہلا موقع بتاتے ہیں جب قائداعظم نے یہ الفاظ استعمال کیے۔ حالانکہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ دوسرا موقع تھا جب قائداعظم کے قلم یا زبان سے یہ الفاظ ادا ہوئے۔ قائداعظم کی یہ تقریر ڈاکٹر وحید احمد کے مرتب کردہ مجموعے The Nations`s Voice کی دوسری جلد کے صفحہ نمبر 338 پر موجود ہے۔ یہ تقریر روزنامہ سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور نے 28 دسمبر 1941ء کو اور ہفت روزہ ڈان دہلی نے 4 جنوری 1942ء کو شائع کی تھی۔

''یہ بات تو واقعی اہم ہے۔''

ہم اس بات کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے کہ 1943ء میں عیدالفطر کے موقع پر قائداعظم نے قوم کے نام اپنے پیغام میں ان الفاظ کو ایک مرتبہ پھر استعمال کیا۔ تاہم اس مرتبہ ان الفاظ کی ترتیب بدلی ہوئی تھی۔ اس مرتبہ قائداعظم کے الفاظ تھے۔

Our watchwords Should be unity, Faith and Discipline.

قائداعظم کا یہ پیغام فضل حق قریشی کی کتاب Day Everywith the Quaid-e-Azam کے صفحہ نمبر 312 موجود ہے۔

ایک سال بعد 18 ستمبر 1944ء کو قائداعظم نے عیدالفطر کے موقع پر جو پیغام جاری کیا اس میں بھی قائداعظم نے اپنا پیغام انہی الفاظ پر ختم کیا۔ قائداعظم کے الفاظ تھے۔

Let us lead the caravan of the Millat successfully to its destination with our motto "Unity, Faith and Discipline."

قائداعظم کا یہ پیغام خورشید احمد یوسفی کی کتاب Speeches Statements and Massages of the Quaid-e-Azam کی تیسری جلد کے صفحہ نمبر 41-1940ء پر موجود ہے۔ یہ تقریر ڈاکٹر وحید احمد کے مجموعے The Nation`s Voice کی تیسری جلد (جس کا ذیلی عنوان ہی Unity, Faith and Discipline ہے) کے صفحہ نمبر 605-604 پر موجود ہے جس کے مطابق یہ پیغام 19 ستمبر 1944ء کو

پاکستان کا سرکاری طغریٰ (Crest) جس پر قائداعظم کے نصب العین کے الفاظ کی ایمان، اتحاد، نظم درج ہے

لیڈر، اسٹار آف انڈیا اور مارننگ نیوز میں اور 20 ستمبر 1944ء کو ڈان اور سول اینڈ ملٹری گزٹ میں شائع ہوا۔

قیام پاکستان کے بعد ہمیں قائداعظم کی ایک نشری تقریر میں بھی یہی الفاظ نظر آتے ہیں مگر اب ان کی ترتیب بالکل بدلی ہوئی تھی۔ قائداعظم نے یہ تقریر 30 اکتوبر 1947ء کو ریڈیو پاکستان لاہور سے نشر کی تھی۔ قائداعظم کے الفاظ تھے۔

It is now upto you to work, work and work: and we are bound to succss. And never forget our motto "Unity, Discipline and Faith".

یہ تقریر حکومت پاکستان کی شائع کردہ کتاب **Quaid-e-Azam Mohammad Ali Jinnah Speeches and Statements 1947-48** کے صفحہ نمبر 98 پر موجود ہے تاہم جب 1989ء میں قائداعظم کی تقاریر اور بیانات کے اس مجموعے کا اردو ترجمہ محترمہ بے نظیر بھٹو کے پیش لفظ کے ساتھ شائع ہوا تو ان الفاظ کی ترتیب کو دانستہ یا نادانستہ طور پر تبدیل کرتے ہوئے اس جملے کا ترجمہ یوں کیا گیا: ”اب یہ آپ پر ہے کہ آپ کام، کام اور کام کریں اور ہم یقیناً کامیاب ہوں گے اور

پاکستان کے سرکاری طغرے کی پہلی مجوزہ شکل

اپنا نصب العین یعنی اتحاد، ایمان اور تنظیم کبھی فراموش نہ کیجیے۔“ (قائداعظم محمد علی جناح، تقاریر و بیانات 1947-48 صفحہ نمبر 123)

”ترتیب بدلنے پر کسی نے توجہ نہیں دی؟“

ہم نے آپ کے سامنے قائداعظم کی وہ تمام تقاریر اور بیانات پیش کردیے جن میں قائداعظم نے اپنے اس نصب العین کو استعمال کیا۔ پانچ مواقع میں سے ابتدائی دو مواقع پر ایمان کو، اتحاد اور نظم پر فوقیت دی گئی اور بعد کے تین مواقع پر اتحاد کو ایمان اور نظم پر ترجیح عطا کی گئی بلکہ آخری موقع پر تو اتحاد ہی نہیں نظم کو بھی ایمان پر فوقیت عطا کردی گئی۔ ان ادلتی بدلتی تبدیلیوں سے ہمارے محققین کو کھیلنے کا خوب موقع ملا اور انہوں نے قائداعظم کے نصب العین کو اپنی اپنی پسند اور ترجیحات کے مطابق استعمال کیا۔ یہی نہیں بلکہ وہ اس بات سے بھی منکر ہوگئے کہ قائداعظم نے ان الفظ کو ان کی پسندیدہ ترتیب کے علاوہ بھی کسی اور ترتیب سے استعمال کیا ہے۔

قائداعظم زبان کے زبردست پارکھ تھے وہ ہر لفظ کا محل استعمال بخوبی جانتے تھے۔ یہ درست ہے کہ وہ اپنے اس نصب العین کے الفاظ کی ترتیب بدلتے رہے مگر یہ بھی تو ممکن ہے کہ ان کا مطمع نظر بھی یہی ہو کہ کسی لفظ کو کسی لفظ پر فوقیت نہ دی جائے اور ہر لفظ کو یکساں اہمیت کا حامل سمجھا جائے۔ وما علینا الا البلاغ۔

ماموں بھانجا

راوی: الطاف شیخ/تحریر: ابراھیم جمالی

کئی دہائی قبل وطنِ عزیز کے سرکاری دفاتر کی لفظی تصویر کشی کی گئی ہے لیکن ایسا لگتا ہے کہ یہ حالیہ دنوں کا احوال ہے۔ یہی ایک خرابی ہے جس نے ترقی کے تمام راستوں پر روک لگا دی ہے۔ یہی وہ اسپیڈ بریکر ہے جس پر سے گاڑیاں گزر تو جاتی ہیں مگر رفتار سست ہو جاتی ہے۔ شاید یہ واقعہ چشم کشا ثابت ہو۔

ایک دلچسپ واقعہ کراچی کے سرکاری دفاتر سے

جب بچے بڑے ہونے لگے تو میں نے جہاز کی ملازمت کو خیرباد کہہ کر کنارے کی نوکری کرنے کا ارادہ کیا۔ ان ایام میں یعنی 1982ء تک جہاز چلانے والے سینئر افسران کو جہاز پر اپنی فیملی رکھنے کی اجازت ہوتی تھی۔ جب بچوں کی تعلیم کا مسئلہ درپیش ہوتا ہے تو ہر جہازی سمندر کی ملازمت کو چھوڑ کر کسی ملک کی بندرگاہ میں جاب کرنے کو ترجیح دیتا ہے۔ مجھ جیسے میرین چیف انجینئر کے لیے کنارے پر اس قسم کی ملازمتیں ہوتی ہیں۔ شپ یارڈ میں جہاں نئے

جہاز تیار ہوتے ہیں اور پرانوں کی مرمت کی جاتی ہے۔ بندرگاہ میں وہاں کے ٹگ جہازوں، ڈیزر اور پائلٹ لانچوں کی دیکھ بھال کی ذمہ داری۔ کسی جہاز کمپنی کے جہازوں کی ٹیکنیکل مینجمنٹ کے لیے، کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں یا آئل کمپنی اور کسی ملک کی میرین اکیڈمی میں ٹیچنگ۔

یاد رہے کہ دنیا کے مختلف ملکوں کے بڑے ہوٹلز کی دیکھ بھال میرین انجینئر کرتے ہیں۔

میں نے ٹیچنگ کو ترجیح دی۔ ملائیشیا کے شہر ملاکا میں نئی نئی میرین اکیڈمی کا قیام عمل میں آیا تھا۔ انہیں اسٹاف کی ضرورت تھی۔ اس لیے مجھے اور چند دیگر ممالک کے میرین چیف انجینئرز کو منتخب کیا گیا تاکہ ہم وہاں تدریس اور تربیت کا آغاز کرسکیں۔ وہ اکیڈمی ملاکا شہر سے چالیس کلومیٹر دور سمندر کے کنارے پر واقع ایک قصبے ''مسجد تاناج'' میں واقع تھی۔ آج 35 سال بعد ماضی کا یہ پسماندہ قصبہ یورپ کے شہر کا منظر پیش کرتا ہے۔ اس زمانے میں مسجد تاناج نامی یہ قصبہ ہمارے چھاچھرو، سیکھاٹ اور تلہار جیسا گوٹھ تھا ہم گھر کا راشن وغیرہ وہیں سے خریدتے تھے۔ وہاں ایک کلینک، بینک، اسکول، پوسٹ آفس، پولیس اسٹیشن اور ٹیلی فون آفس تھا۔ وہیں ایک چھوٹا سا ہوٹل اور ایک باربر شاپ تھی۔

ہمیں کراچی ہی میں کوالالمپور پہنچنے کے لیے ہوائی ٹکٹ موصول ہوا تھا اور ایک خط کے ذریعے مطلع کیا گیا تھا کہ اکیڈمی کے اخراجات پر ہم ایک دن کوالالمپور کے ہوٹل میں ٹھہر سکتے ہیں۔ یہ انتظام اس لیے کیا گیا تھا کہ ہم سفر کی تھکاوٹ دور کرکے تازہ دم ہوکر اگلے دن آفس کار کے ذریعے ملاکا پہنچیں۔ پھر وہاں سے فوراً اکیڈمی جانے کی بجائے ملاکا کے اس وقت کے بڑے ہوٹل ملاکا اسٹرائٹ ان میں تین روز آرام کریں۔ ہمیں بعد میں معلوم ہوا تھا کہ اکیڈمی کے منتظمین ہمارے آرام اور تھکاوٹ کی فکر اس لیے کررہے تھے کہ ان کے خیال میں ہم جہاز چلانے والے لندن، نیویارک، ٹوکیو، ہانگ کانگ جیسی خوب صورت اور ترقی یافتہ بندرگاہوں کے عادی ہوں گے۔ ملائیشیا کے دیہی علاقے میں پہنچ کر دہل نہ جائیں۔ جہاں اکیڈمی کی تین اطراف میں سمندر اور ایک جانب گھنا جنگل تھا۔ انتظامیہ کو خدشہ تھا کہ دیہی ماحول کو دیکھ کر ہم آغاز سے پہلے ہی نوکری چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوں گے لیکن سچی بات یہ ہے میرے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہوا۔ وہ ماحول میرے لیے بالکل اجنبی نہیں تھا۔ کیونکہ میں خود بھی بنیادی طور پر دیہاتی ہوں۔ وہ بھی سندھ کے دیہی علاقے سے تعلق رکھنے والا۔ جہاں میری پسندیدہ چیز سال میں بمشکل چند روز میسر ہوتی تھی، یعنی بارش۔ یہاں تو ہمہ وقت جھڑی لگی رہتی تھی۔ بادل چھائے رہتے اور ہر جانب سبزہ ہی سبزہ۔ سمندر کی قربت الگ تھی۔ دوسری بات یہ کہ ملائیشیا کے دیہی علاقے میرے لیے نئی چیز نہیں تھے۔ میں پچھلے دس برس کے دوران اپنے جہاز پر ملائیشیا اور تھائی لینڈ کی بندرگاہوں میں آتا رہا تھا۔ ہر دفعہ مجھے ملک کے اندرونی حصوں، دیہی علاقوں میں جانے کا موقع ملتا تھا۔

بہرحال ملاکا میں ہمیں آرام کرنے کے لیے تین دن مل گئے تھے۔ ہم نے بھی موقع سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ اس دوران پورے شہر کی سیر کرتے رہے۔ پہلے ہی دن ہوٹل میں ملاکا ریاست کے چیف منسٹر اپنے دوستوں کے ساتھ آئے تھے۔ مجھے معلوم ہوا تو میں ان سے ملنے جا پہنچا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ وہ بڑے تپاک سے ملے۔ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ وہ ریاست کے ہیڈ ہیں۔ ان سے دوستی آج تک قائم ہے۔ میں اگلے دن ان کے آفس بھی گیا۔ ان کے آفس تک پہنچنے کے لیے کسی سیکیورٹی یا پولیس کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ حتیٰ کہ کوئی پروٹوکول بھی نہ تھا۔ ان کے آفس کے سامنے ایک باکس نما دفتر میں سیکریٹری بیٹھی تھی۔ میں نے اس سے انگریزی میں کہا کہ وزیراعلیٰ سے ملنے آیا ہوں۔ سیکریٹری نے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ ''پلیز۔''

میں ان سے مل کر آیا اور پھر اکثر ان سے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ ان کی ملئی سیکریٹری کا نام زیتون تھا۔ کبھی کبھار وہ مجھے چائے کی دعوت دے کر اپنے پاس بٹھا لیتی اور پھر مختلف موضوعات پر باتیں ہوتی تھیں۔ میں نے ایک دن زیتون سے کہا۔ ''ہمارے وزیروں اور سیاسی لیڈروں کے پاس کسی سے ملنے کا وقت ہی نہیں ہوتا اور یہاں آپ کے چیف منسٹر ہیں کہ جب دیکھو فرصت سے بیٹھے ہیں۔ لوگوں کو نوکری دینا، پولیس افسران کا تبادلہ اور اس قسم کے دیگر امور کون انجام دیتا ہے؟''

میری بات سن کر میڈم زیتون پہلے تو حیرت سے مجھے دیکھتی رہی، پھر معصومیت سے بولی۔ ''ان کاموں کے لیے مختلف ادارے قائم ہیں اور متعلقہ افسران ان معاملات کو دیکھتے ہیں۔''

اس وقت مجھے اس کی بات سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ کچھ

عرصے کے بعد ہماری اکیڈمی میں مزید ایک لیکچرر کی ضرورت پیش آئی۔ آفس کی جانب سے اشتہار شائع ہوئے، انٹرویو کے لیے پیر کا دن منتخب کیا گیا تھا۔

اس دن میں جیسے ہی آفس پہنچا تو کمانڈنٹ نے مجھے طلب کیا۔ ''یہ دو چیف انجینئر ملازمت کے لیے آئے ہیں۔ آپ ان سے انٹرویو لیں۔ جسے بہتر سمجھیں اسے اپنے ڈیپارٹمنٹ میں رکھ لیں۔''

اُمیدواروں میں ایک ملائیشیا کا چینی اور دوسرا سنگاپور کا ملئی مسلمان تھا۔ میں نے کمانڈنٹ سے کہا۔ ''جو آپ کو بہتر معلوم ہو۔''

انہوں نے میری بات مکمل نہیں ہونے دی اور کہا۔ ''آپ ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ ہیں۔ کسی اُمیدوار کو منتخب کرنا آپ کا کام ہے۔ اسے آپ کے ماتحت کام کرنا ہے۔ اس لیے آپ ہی انتخاب کریں اور بعد میں اگر اس سے کوئی شکایت ہو۔ وہ ٹھیک سے کام نہ کرے تو آپ اسے ملازمت سے برخواست بھی کر سکتے ہیں۔''

دراصل دیگر ترقی یافتہ ملکوں میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ کسی زمانے میں ہمارے ہاں بھی یہی چلن تھا لیکن اب چپڑاسی اور داروغہ کی نوکری کے لیے بھی چیف منسٹر کی سفارش اور سلیکشن ضروری سمجھی جاتی ہے۔

تین دن ملاکا ریاست کے دارالحکومت میں رہنے کے بعد مجھے لینے کے لیے اکیڈمی کی سرکاری گاڑی آگئی۔ منزل کے قریب پہنچ کر ایک پیٹرول پمپ پر ہماری کار رکی تو سامنے ہی ٹیلی فون آفس نظر آیا۔ میں اندر چلا گیا۔

''میں یہاں کی میرین اکیڈمی میں تین سال تک کے لیے نوکری کرنے آیا ہوں۔ فون لگوانے کا کیا طریقہ کار ہے؟'' میں نے اپنے سامنے موجود کلرک سے پوچھا۔

''آپ کا ایڈریس یعنی اکیڈمی کیمپس یا اس سے باہر آپ کو جو گھر ملا ہے، اس کا نمبر بتائیے؟'' اس نے پوچھا۔

''یہ تو مجھے نہیں معلوم۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوگا۔'' میں نے جواب دیا۔

''او کے۔ آپ چلیے، ہم بھی پہنچتے ہیں۔'' کلرک نے کہا۔

ہم کار میں پیٹرول ڈلوا کر اکیڈمی پہنچے۔ مجھے رہائش کے لیے جو گھر الاٹ کیا گیا تھا۔ میں اور ڈرائیور مل کر اس مکان میں سامان سیٹ کر رہے تھے کہ اس دوران ٹیلی فون آفس کا کلرک بھی وہاں پہنچ گیا۔ میں سمجھا کہ وہ میری اس بات کی تصدیق کرنے آیا ہے کہ میں یہاں رہتا ہوں یا نہیں لیکن میرا اندازہ غلط نکلا۔ وہ تو ٹیلی فون پیس اور تاروں کے ساتھ آیا تھا۔ اس نے ٹیلی فون ٹی وی لاؤنج کی ٹیبل پر رکھا اور اس سے منسلک تار کو کھڑکی سے باہر لے جا کر پول سے ملانے لگا۔ اپنے کام سے فارغ ہو کر اس نے ایک فارم مجھے دیتے ہوئے کہا۔ ''سر! اس پر اپنا نام اور گھر کا نمبر لکھ کر آج ہی ایک سورنگٹ بینک میں جمع کرا دیں۔ ٹیلی فون کام کرنا شروع کر دے گا۔''

ملائیشیا پہنچتے ہی ہمیں ایک ماہ کی نصف تنخواہ ایڈوانس کے طور پر دے دی گئی تھی۔ میں نے اس رقم سے سورنگٹ ڈرائیور کے حوالے کر دیئے تاکہ وہ لنچ بریک میں بینک جا کر جمع کرا دے۔ شام تک ہم ٹیلی فون استعمال کرنے لگے تھے۔

یہاں میں چند باتیں تحریر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ ان لوگوں کے لیے جنہیں ولایت میں نوکری دلوانے کے بہانے ٹھگ قسم کے ایجنٹ ویزا اور ٹکٹ کے نام پر لوٹ کر غائب ہو جاتے ہیں۔ یاد رہے کہ کسی بھی ملک کی حکومت یا وہاں کی کمپنی جب دوسرے ملک کے لوگوں کو ملازمت پر رکھنا چاہتی ہے تو وہ آپ کی درخواست کو قبول کرنے کے بعد آپ کے لیے ویزا اور ٹکٹ کا انتظام خود ہی کرتی ہے۔ ان کے ملک میں پہنچنے کے بعد مقررہ تنخواہ کا کچھ حصہ ایڈوانس کے طور پر آپ کو دیا جائے گا تاکہ وہاں آپ اپنی ضروریات کی تکمیل کر سکیں اگر اس سلسلے میں کوئی ایجنٹ آپ سے رقم کا تقاضا کرے تو اس پر شک ضرور کریں۔ کوئی یہ کہتا ہے کہ دبئی، سعودی عرب یا ملائیشیا پہنچنے کے بعد آپ کی ملازمت کا انتظام کیا جائے گا تو اسے ضرور فراڈ سمجھئے۔ کیوں کہ ٹورسٹ ویزا پر دوسرے ملک پہنچ کر وہاں نوکری کرنا یا ملازمت تلاش کرنا جرم کے زمرے میں آتا ہے۔

ملائیشیا کی جیلوں میں قید ہمارے ملک کے کئی افراد وہی ہیں جو وہاں ٹورسٹ ویزا پر گئے اور وہاں انہوں نے کام کرنا شروع کر دیا۔ کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو ویزا کی مدت ختم ہونے کے بعد بھی ملک میں موجود رہتے ہیں۔

بہرحال اس قدر جلدی فون لگنے پر مجھے حیرت ہوئی تھی۔ ملائیشیا جیسے پس ماندہ ملک میں ٹیلی فون کا ادارہ اور بینکنگ سسٹم انتہائی پھرتیلا اور بہتر کارکردگی والا ثابت ہوا تھا۔ یاد رہے کہ یہ 1982ء کی بات ہے۔ اس وقت تک موبائل فون کا کہیں وجود نہیں تھا۔ ہر جگہ سرکاری ادارے

کے لینڈ لائن والے فون استعمال کرتے تھے۔ اصل حیرت تو مجھے دس سال بعد 1991ء میں ہوئی تھی جب میں ملائیشیا سے رخصت ہو رہا تھا۔ مجھے ٹیلی فون واپس کر کے بل کلیئر کرنا تھا۔ کیوں کہ اس وقت تک سنگاپور اور ملائیشیا میں بھی جاپانی سسٹم کا آغاز ہو چکا تھا۔ ایئرپورٹ پہنچ کر پاسپورٹ پر ایگزٹ کی مہر لگوانے کے دوران اگر کسی کا بجلی، گیس، پانی اور فون کا بل کلیئر نہ ہو تو الارم بجنے لگتا تھا۔ پھر جرمانے کے ساتھ وہاں بل ادا کرنا پڑتا تھا۔ میں اس خواری سے بچنا چاہتا تھا۔ اس لیے میں ایک ہفتے پہلے ہی ٹیلی فون کے آفس پہنچ گیا اور ان سے کہا کہ وہ میرا فون بند کر دیں۔ میرا بل کلیئر کر کے دو تین دن کے اندر مجھے اس کی رسید دے دیں تاکہ میں اس طرف سے بے فکر ہو جاؤں۔

آفس کے کلرک نے میری بات سن کر کہا۔ ”سر! آپ ایک ہفتے پہلے اپنا فون کیوں بند کروا رہے ہیں؟ آخری دن میں تو آپ کو اس کی بہت ضرورت پیش آئے گی۔ کوالالمپور ایئرپورٹ جانے کے لیے آپ کو اسی سڑک سے گزرنا ہوگا۔ آپ آخری دن ایئرپورٹ جاتے ہوئے یہاں دو منٹ کے لیے ٹیکسی رکوائیے گا۔ ٹیلی فون پیس ہمیں واپس دے کر کلیئرنس رسید وصول کر لیجیے گا۔“

”اگر ایسا ہو جائے تو یہ میرے لیے بہت اچھا ہوگا لیکن آپ لوگ دیر تو نہیں لگا دیں گے؟“ میں نے خدشہ ظاہر کیا۔

”آپ ایک کام کیجیے۔“ کلرک نے کہا۔ ”جب آپ گھر سے روانہ ہوں تو فون بند کرنے سے پہلے ہمیں آفس کے نمبر پر اطلاع کر دیجیے گا۔ ہم اپنے ایک آدمی کو سڑک کے کنارے کھڑا کر دیں گے۔ اس طرح آپ کو ٹیکسی سے اترنے کی زحمت بھی نہیں کرنی پڑے گی اور آپ کا وقت بھی ضائع نہیں ہوگا۔“

میں آخری دن انہیں فون کر کے گھر سے روانہ ہوا۔ اپنے ساتھ چھوٹے نوٹ اور سکے بھی لے لیے تاکہ آخری سات آٹھ دن کا بل کلیئر کرتا چلوں۔ مسجد تاناج کے ٹیلی فون آفس پہنچا تو کلرک میرے انتظار میں آفس سے باہر سڑک کے کنارے کھڑا ہوا ملا۔ میں نے ٹیلی فون پیس اس کے حوالے کیا اور دوسرے ہاتھ سے رقم اس کی طرف بڑھائی۔

”جو بل بنتا ہے وہ کاٹ لیں۔“ میں نے کہا۔

اس نے میرے ہاتھ کو نرمی سے پیچھے کرتے ہوئے اپنے ساتھ لائی ہوئی رسید اور کچھ نوٹ میرے حوالے کیے اور کہا۔ ”سر! آپ کی ڈپازٹ منی سے بل کی رقم منہا کر کے باقی امانت واپس کی جاتی ہے۔“

مجھے ملائیشیا کے ٹیلی فون ادارے کی کارکردگی اوّل تا آخر بہت پسند آئی تھی۔ دراصل ہم اپنے ملک کے ٹیلی فون سسٹم کے ستائے ہوئے تھے۔ آج کا نوجوان تصور بھی نہیں کر سکتا کہ ہمارے ہاں ستر کی دہائی میں ٹیلی فون کنکشن حاصل کرنا کس قدر مشکل تھا۔ لوگ فون کے لیے درخواست دے کر برسوں انتظار کرتے تھے۔ دوسرا طریقہ یہ تھا کہ اگر کسی کے پاس بے حساب دولت ہے اور وسیع کاروبار کا مالک ہے تو رشوت دے کر جلد کنکشن حاصل کیا جا سکتا تھا۔ ان ایام میں ٹیلی فون آفس کے ڈویژنل انجینئر (D.E) کو بہت اہمیت حاصل تھی۔ اس کی تو شان ہی نرالی تھی لیکن رشوت خور کلرک اور چپڑاسی بھی عیش کرتے تھے۔ اس زمانے میں رشوت کا نرخ دس سے پندرہ ہزار روپے فی کنکشن تھا۔ اسے ایک بڑی رقم سمجھنا چاہیے۔ یاد رہے کہ 1971ء میں سونے کی قیمت گیارہ سو روپے فی تولہ تھی۔ متذکرہ بالا رقم تقریباً دس تولہ سونے کا متبادل تھی۔ یعنی آج کے حساب سے چار پانچ لاکھ روپے سمجھیے۔ 1973ء میں جب میں نے کراچی کے اپنے گھر میں فون لگوایا تھا تو اس وقت میں جہاز پر تھرڈ انجینئر تھا اور تنخواہ 1400 روپے ماہوار تھی۔ یہ انتہائی معقول تنخواہ تھی۔ اس زمانے میں والد صاحب ڈپٹی کمشنر تھے اور 1600 روپے تنخواہ پاتے تھے۔

بہرحال اصل قصہ سنیے کہ مجھے ٹیلی فون کنکشن کس طرح نصیب ہوا۔ میرا جہاز کراچی آیا ہوا تھا۔ میں کسی کام کے سلسلے میں اپنے جہاز سے روانہ ہو کر ہیڈ آفس آیا تھا۔ لفٹ میں ممتاز بھٹو صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ وہ ان دنوں وزیر مواصلات تھے۔ یعنی جہاز، ریلوے اور ٹیلی فون وغیرہ ان کی وزارت میں شامل تھے۔ وہ 14 ویں فلور پر اپنے آفس جا رہے تھے۔ مجھے بارہویں منزل پر جانا تھا۔ ان سے پہلے بھی ملاقاتیں ہوتی رہی تھیں۔ وہ بڑے تپاک سے ملے اور خیر خیریت دریافت کرنے کے بعد انہوں نے مجھ سے پوچھا۔

”اب تو آپ چیف انجینئر بن چکے ہوں گے؟“

مجھے سیکنڈ انجینئر کا امتحان دیئے ابھی ایک سال بھی مکمل نہیں ہوا تھا۔ بین الاقوامی قانون کے مطابق مزید 9 ماہ جہاز پر Sail کرنے کے بعد چیف انجینئر کا امتحان دینا تھا۔

''نہیں جناب! ابھی کہاں۔'' میں نے جواب دیا۔
''کیوں نہ آپ کو ترقی دے کر چیف انجینئر بنا دیا جائے۔'' ممتاز صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا اور میں جواب میں ہنستا رہا۔ مجھے بارہویں فلور پر اترنا تھا۔ وہ اپنے آفس چلے گئے۔ میں نے دل میں سوچا کہ ممتاز صاحب کی محبت اپنی جگہ لیکن انہیں یہ نہیں معلوم کہ ہمارے پروفیشن میں پروموشن اسی صورت میں ممکن ہے کہ سمندر میں ایک مقررہ مدت گزاری جائے جسے سی ٹائم کہا جاتا ہے اور اس کے بعد دیئے جانے والے امتحان میں کامیابی حاصل کی جائے۔
اب بھی جب ممتاز صاحب سے ملاقات ہوتی ہے تو اس بات کو یاد کر کے بہت ہنستے ہیں۔
بہرحال ممتاز صاحب کے خلوص کو دیکھتے ہوئے میں اگلے ہی دن ٹیلی فون کی درخواست لے کر ان کے آفس پہنچا۔ (دو سال گزر جانے کے باوجود اس درخواست پر عمل درآمد نہیں ہو پایا تھا) ان دنوں ممتاز بھٹو صاحب کے سیکریٹری ہمارے ہم عمر دوست اشرف قاضی تھے۔ وہ مجھے ممتاز صاحب کے آفس میں لے گئے اور فون کنکشن کے لیے ان سے میری سفارش کی۔ ممتاز صاحب نے فوراً نوٹ لکھ کر دستخط کر دیئے کہ درخواست گزار کو ترجیحی بنیاد پر کنکشن فراہم کیا جائے۔
میں بہت خوش ہوا۔ ان ایام میں کراچی میں فون کنکشن کے آرڈرز جاری کرنے والے افسر آئی آئی چندریگر روڈ پر واقع آفس میں بیٹھتے تھے۔ اب ان کا نام میرے ذہن میں نہیں رہا۔ کیا رعب اور دبدبہ تھا اور کیا ٹھاٹ باٹ تھے ان کے۔ ان کے لیے مشہور تھا کہ وہ بغیر رشوت لیے کسی کا کام کرنا گناہ سمجھتے تھے۔ بعض اوقات آپے سے باہر ہو کر درخواست گزار کو گالیاں بھی دینے لگتے تھے۔ کسی عام اور ایسے ویسے افسر کو اعتنا کے قابل نہیں سمجھتے تھے۔ سب اس خیال سے متفق تھے کہ وہ وزیر مواصلات کے خاص آدمی ہیں۔ بہرحال میں بڑا اعتماد تھا کہ اب مجھے آسانی سے کنکشن مل جائے گا۔ سو میں درخواست فارم (جس پر وزیر صاحب کے دستخط تھے) لے کر ٹیلی فون آفس پہنچا۔ راستے میں ٹاور کے فٹ پاتھ سے ایک چھوٹا سا تالا بھی خرید لیا جو ان دنوں فون کو دوسروں سے محفوظ رکھنے کے لیے لگانے کا فیشن تھا۔
مجھے یاد ہے اس وقت میرے کولیگ مظہر زیدی میرے ساتھ تھے۔ وہ میری اس خریداری پر ہنستے اور میرا مذاق اڑاتے رہے کہ فون ملنے سے پہلے میں نے اس کے لیے تالا خرید لیا ہے۔ مظہر زیدی کئی سال تک یہ لطیفہ جہاز پر دوستوں کو سناتے رہے لیکن مجبوری تھی۔ فون کو تالا لگانے کا رواج عام تھا۔ اسے فیشن اور سیکیورٹی قرار دیا جاتا تھا۔ اب تو مجھے فون ملنے ہی والا تھا۔ کیوں کہ وزیر مواصلات نے اس کے لیے Recommend کیا تھا۔
میں خوش خوش درخواست لے کر ٹیلی فون ڈپارٹمنٹ کے ''سر پھرے'' افسر کے پاس جا پہنچا۔ انہوں نے درخواست کو غور سے دیکھا اور اسے میرے سامنے پھینکتے ہوئے بولے۔ ''اٹھاؤ اسے اور اپنی باری کا انتظار کرو۔''
''سر! وہ......'' میں نے انہیں وزیر صاحب کے دستخط کی طرف متوجہ کرنا چاہا۔
''جاؤ۔'' وہ تقریباً دہاڑے۔ ''میرا وقت ضائع نہ کرو۔''
میں ششدر رہ گیا تھا۔ میں نے سوچا کہ یہ کوئی ولایت کا ملک نہیں ہے جن کی سیر کر کے میں حال ہی میں وطن لوٹا تھا۔ ہمارے ہاں تو سب اسی طرح چل رہا ہے۔
میں مایوس اور دل گرفتہ جہاز پر جانے کی بجائے پاکستان چوک کی طرف چل دیا جہاں سائیں علی نواز وفائی کا پریس تھا۔ وہیں ان کا آفس بھی تھا۔ وہیں سے وہ ہر ہفتے ''آزاد'' اخبار نکالتے تھے۔ انہوں نے میرا ایک سفرنامہ بھی شائع کیا تھا۔ وہ میرے والد کے ہمعصر اور دوست تھے۔ ادیب کی حیثیت سے وہ میرا بھی لحاظ اور خیال رکھتے تھے۔ وہ دولت مند تو نہیں تھے لیکن اپنے والد مولانا دین محمد وفائی کی طرح صحافتی اور سماجی خدمات کے پیش نظر بیورو کریٹس اور سیاستدانوں میں ان کی ایک عزت تھی۔ یہاں ایک تاریخی واقعہ یاد آ رہا ہے۔ ذوالفقار علی بھٹو صاحب کا قافلہ پاکستان چوک سے گزر رہا تھا۔ انہوں نے یہاں پہنچ کر گاڑی رکوائی۔ پورا قافلہ تھم گیا تھا۔
''میں یہاں اپنے ایک دوست سے ملنا چاہتا ہوں۔'' انہوں نے کہا تھا۔
اگلے دن تمام اخبارات میں یہ خبر نمایاں طور پر شائع ہوئی تھی کہ ملک کے وزیراعظم اپنے ایک دیرینہ دوست سے ملنے کے لیے گاڑی سے اتر کر ان کی چھوٹی سی دکان (چھاپہ خانہ) میں جا بیٹھے تھے۔
مجھے اداس دیکھ کر وفائی صاحب نے پوچھا۔ ''خیر تو ہے؟ جہاز پر دل نہیں لگ رہا کیا؟''
آخر کار ان کے اصرار پر میں نے بتایا کہ فون نہیں

لگ رہا۔

”بس اتنی سی بات؟ تم ابھی اسی افسر کے پاس جاؤ۔ میں انہیں فون کرتا ہوں۔“

”انہوں نے تو میری درخواست میرے سامنے پھینک دی تھی۔ اس پر ممتاز بھٹو صاحب کے دستخط بھی ہیں۔ وہ تو گویا ممتاز صاحب کی بھی نہیں سنتے۔“ میں نے وفائی صاحب کو حقیقت سے آگاہ کیا۔

”بھئی بھٹو صاحب بڑے آدمی ہیں۔ وزیر مواصلات ہیں۔ میں ایک مسکین آدمی ہوں۔ تم اس چکر میں نہ پڑو۔ فوراً واپس جاؤ کہیں وہ افسر اپنے آفس سے اٹھ نہ جائے۔“

ان کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ میں یہی سوچتا رہا کہ اس مرتبہ ضرور گالیاں سننی پڑیں گی۔ راستے میں یہ خیال بھی آیا کہ ممکن ہے وہ وفائی صاحب کی بات کو مان جائیں۔ کیوں کہ وفائی صاحب نہ صرف غریب غرباء کے کام آتے رہتے تھے۔ بڑے بڑے پیر اور جاگیر دار ان کی عزت کرتے تھے۔ وفائی صاحب گو کہ کسی یونیورسٹی کے گریجویٹ نہیں تھے لیکن وہ مذہب، تاریخ، سیاست اور سماجیات پر وسیع معلومات رکھتے تھے۔

وہ اپنی تعلیم کے حوالے سے اکثر کہتے تھے۔ ”میں میٹرک فیل، بی اے پاس ہوں۔“

”وہ کیسے؟“ ہم حیرت کا اظہار کرتے تو وہ جواب میں کہتے۔

”وہ ایسے کہ میں نے میٹرک کا امتحان انگریزوں کے دورِ حکومت میں دیا تھا اور بی اے پاکستان بننے کے بعد کیا تھا۔“

وفائی صاحب ایک نڈر صحافی تھے۔ وہ اپنے اخبار میں بے خوف ہو کر لکھتے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ملک کے وزراء، سیاستدان اور سرکاری بیوروکریٹ ان کے قلم کی مار سے بہت گھبراتے تھے۔ بہر حال میں یہی تمام باتیں سوچتا ہوا اس بد دماغ ٹیلی فون افسر کے کمرے میں داخل ہوا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی ان کی تیوری پر بل پڑ گئے اور وہ خشمگیں نظروں سے مجھے گھورنے لگے۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتے میں نے جلدی سے کہا۔

”مجھے وفائی صاحب نے بھیجا ہے۔ انہوں نے فون پر آپ کو بتایا ہوگا۔“

”اوہ۔“ یکا یک ان کے تیور بدل گئے۔ وہ اٹھے اور دونوں ہاتھوں سے میری درخواست تھام لی اور بولے۔ ”آپ کوئی فکر ہی نہ کریں۔ آپ نے بتایا ہی نہیں تھا کہ وہ آپ کے ماموں ہیں۔“

عجلت، گھبراہٹ یا شاید Excitement میں ان سے درخواست کی کاؤنٹر سلپ لینا ہی بھول گیا۔ میں وہاں سے کیاڑی اپنے جہاز پر چلا گیا۔ شام پانچ بجے چھٹی ہونے پر اپنے گھر نارتھ ناظم آباد پہنچا تو دیکھا کہ ہمارے گیٹ کے سامنے ایک گدھا گاڑی کھڑی ہے اور اس پر تاروں کے گچھے اور ایک سیڑھی رکھی ہے۔ قریب ہی موٹر سائیکل پر بیٹھے ہوئے ایک شخص نے کالے رنگ کا ٹیلی فون پیش دیا اور ایک کاغذ پر میرے دستخط لیے۔ گویا ٹیلی فون لگ گیا۔ وہ پول پر

حکیم ابو نصر فارابی

عظیم مسلمان سائنسدان ابونصر فارابی تقریباً ساڑھے 11 سو سال قبل ترکستان کے علاقے فاراب میں پیدا ہوئے اسی لیے انہیں فارابی کہا جاتا ہے۔ ان کے والد فوج میں سپہ سالار تھے مگر ابونصر فوج میں تو نہ گئے بلکہ وہ قلم کے مجاہد بن گئے۔ وہ نہ صرف اعلیٰ دماغ سائنسدان تھے بلکہ عظیم فلسفی، ریاضی دان سمیت مختلف فنون کے ماہر تھے۔ انہیں کئی زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ حکماء میں فارابی پہلا شخص ہے جس نے حیوانات پر غور کیا اور بتایا کہ انسان اشرف المخلوقات کیوں ہے۔ انہوں نے حیاتیات کی مختلف اقسام پر سیر حاصل گفتگو کی اور اہلِ علم کے لیے تحقیق کا بہت بڑا خزانہ چھوڑا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ بیالوجی کے بانی تھے۔ علم اخلاق کے بھی موجد تھے۔ علم نفسیات پر انہیں خاص دسترس حاصل تھی۔ قانون کے علاوہ سائنس پر ان کی نادر تحقیق موجود ہے جس نے دنیا کو نئے سائنسی نظریات سے روشناس کرانے میں مدد دی۔ میوزک اور خاص طور پر حکمت و ادویات کے میدان میں ان کی کاوش سے آج تک فائدہ حاصل کیا جاتا ہے۔ اس عظیم سائنسدان نے 80 سال کی عمر میں وفات پائی۔

مرسلہ: عبدالجبار رومی انصاری۔ لاہور

پہلے ہی تار لگا چکا تھا۔ میں نے فون لے جا کر ڈرائنگ روم میں رکھا اور اس سے تار منسلک کر دیئے۔ سب سے پہلے میں نے اس پر تالا لگایا اور دل میں کہا۔ ''واہ وفائی صاحب! آپ جیسے ماموں ہمیشہ خوش رہیں۔''

وفائی صاحب کی وفات کو کئی برس گزر چکے ہیں۔ ان کے بچے مجھ سے بہت چھوٹے تھے۔ اس قدر کہ میں نے انہیں اپنی گود میں لے کر کھلایا۔ اب تو سب جوان ہو چکے ہیں۔ شادی شدہ اور بچوں والے ہیں۔ ایک کے علاوہ سب بیرونِ ملک رہتے ہیں جو کراچی میں رہائش پذیر ہیں۔ اتفاق سے میں نے ان کے پڑوس میں مکان لے لیا ہے۔ محلے کی مسجد میں ہر روز علیک سلیک ہوتی ہے۔ مجھے یہ داستان لکھنے کی کوئی خواہش نہیں تھی۔ میں ٹیلی فون والی بات بھی بھول چکا تھا لیکن حال ہی میں ایک ایسی بات ہو گئی کہ ماضی کے ''ماموں'' یاد آ گئے۔ اس بات کو چالیس، بیالیس سال ہو چکے ہیں۔ میں بھی دنیا کے چکر لگا کر اب اپنے ملک اپنے شہر کراچی میں رہنے لگا ہوں۔

میں پچھلے ہفتے اپنے علاقے کے ایک بینک میں اکاؤنٹ کھلوانے کے لیے گیا اور مینیجر صاحب سے لاکر کے بارے میں استفسار کیا۔ وہاں اس بینک کی وہ برانچ حال ہی میں قائم کی گئی تھی۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ فی الحال ان کے ہاں کئی لاکر خالی ہیں۔

جواب میں مینیجر صاحب ایسی باتیں کرنے لگے جیسے وہ ایک کمرشل بینک کے مینیجر نہیں بلکہ ضلع کے ڈپٹی کمشنر یا پولیس کے ڈی آئی جی ہوں۔ حالانکہ یہ افسران بھی دوسرے ملکوں میں خود کو عوام کا خادم سمجھتے ہیں کیونکہ عوام کے دیئے ہوئے ٹیکس سے ہی انہیں تنخواہ ملتی ہے۔ بہرحال مینیجر صاحب نے لاکر کے لیے تسلی بخش جواب نہیں دیا۔

''دیکھیے مجھے اس کے لیے وقت دیجیے۔ لاکر کا ملنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ ایک خالی ہوتا ہے تو کئی اُمیدوار اس کے انتظار میں ہوتے ہیں۔ آپ ایک دو دن کے بعد آیئے۔ میں آپ کو پوزیشن سے آگاہ کر دوں گا۔''

میں نے سوچا کہ اس کام کی اُمید رکھنا حماقت ہے۔ نئی صدی کے شروع ہونے کے باوجود ہمارے ملک کا یہ حال ہے آج سے تیس سال قبل سوئیڈن کی یونیورسٹی میں میرے ایک کلاس میٹ کیپٹن کبھی کبھی موڈ میں آ کر کہتے تھے۔ ''مسٹر الطاف! ہمارے ملک ترقی پذیر ہیں اور یہ ہمیشہ اسی حال میں رہیں گے۔ کبھی نہیں سدھریں گے۔''

ان کا تعلق تیونیشیا سے تھا اور ان کا کہنا ایک حد تک درست بھی تھا۔ ملائیشیا، تھائی لینڈ اور ویتنام جیسے ملک بھی کہیں سے کہیں جا پہنچے لیکن ہمارے ہاں کے معاملات ہی نرالے ہیں۔ یہاں جس کو موقع ملتا ہے وہ خود کو اہم سمجھنے لگتا ہے۔ کسی ادارے کا ملازم خود کو اس ادارے کا مالک تصور کرنے لگتا ہے۔ حتیٰ کہ قومی اداروں کے سربراہ خود کو ادارے کا وڈیرا سمجھنے لگتے ہیں۔ ہمارے ہاں وڈیرا شاہی ذہنیت ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی۔

اتفاق ایسا ہوا کہ اسی دن مغرب کی نماز میں میری نظر وفائی صاحب کے بیٹے پر پڑی۔ دفعتاً مجھے یاد آیا کہ وہ بھی بینکنگ سے تعلق رکھتے ہیں۔ میرے دریافت کرنے پر انہوں نے اسی بینک کا نام بتایا جس میں میرا کام اٹکا ہوا تھا جب میں نے ان کی پوزیشن معلوم کی تو خبر ہوئی کہ وہ ایک سینئر پوسٹ پر فائز ہیں۔ کراچی میں واقع اس بینک کے تمام مینیجران کی ماتحتی میں فرائض انجام دیتے ہیں۔ میں نے اپنا مسئلہ ان کے سامنے بیان کیا اور کہا کہ اگر ممکن ہو تو وہ اس سلسلے میں میری مدد کریں۔

''سائیں، یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔'' انہوں نے کہا۔ ''آپ کل ہی چلے جائیں۔ آپ کا کام ہو جائے گا۔''

میں اگلے دن بینک پہنچا۔ دل میں یہ خدشہ بھی تھا کہ معلوم نہیں انہوں نے یہاں فون کیا بھی ہو گا یا نہیں۔ ممکن ہے وہ فون کرنا بھول گئے ہوں لیکن میں جیسے ہی مرکزی دروازے سے اندر داخل ہوا۔ سامنے ہی کاؤنٹر پر موجود کلرک نے اٹھ کر بڑے تپاک سے میرا استقبال کیا اور کہا۔ ''آیئے سر! مینیجر صاحب کافی دیر سے آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔''

شیشے کے دروازے سے مینیجر صاحب بھی مجھے دیکھ چکے تھے۔ وہ میری پذیرائی کے لیے اپنے کمرے سے باہر آ گئے اور مجھے بڑے احترام کے ساتھ آفس میں بٹھایا اور میرے لیے چائے منگوائی۔ دوسرے ہی لمحے چپراسی کو بلا کر اسے میرا کام مکمل کرنے کی تاکید کی۔ مینیجر صاحب ہدایات جاری کر کے نہایت عاجزی اور نیاز مندی سے بولے۔ ''سر! آپ کل ہی بتا دیتے کہ صاحب آپ کے بھانجے ہیں۔''

میں سوچتا رہا کیا اس ملک سے کبھی ''ماموں بھانجا'' کلچر کا خاتمہ ہو سکے گا؟

اعضا کی شاعری

شیراز خان

اردو ادب میں شاعری کی مختلف اقسام ہیں۔ مثنوی، قصیدہ، غزل، نظم، قطعہ، رباعی، مرثیہ اور ان سب کا محور لفظی تصویر کشی ہے۔ دکھ درد، خوشی، جنگ، محبت کا بیان ہے۔ خیالات کے اظہار میں شاعر جب منظر کشی پر آتا ہے تو کتنی باریک بینی سے کام لیتا ہے کہ ذہن میں خاکہ پختہ ہو جاتا ہے۔ اردو شاعری میں محبوب کے اعضا پر بھی خوب طبع آزمائی ہوئی ہے۔ ایسے ہی چند اشعار۔

اردو شاعری سے دلچسپی رکھنے والوں کی مدارات
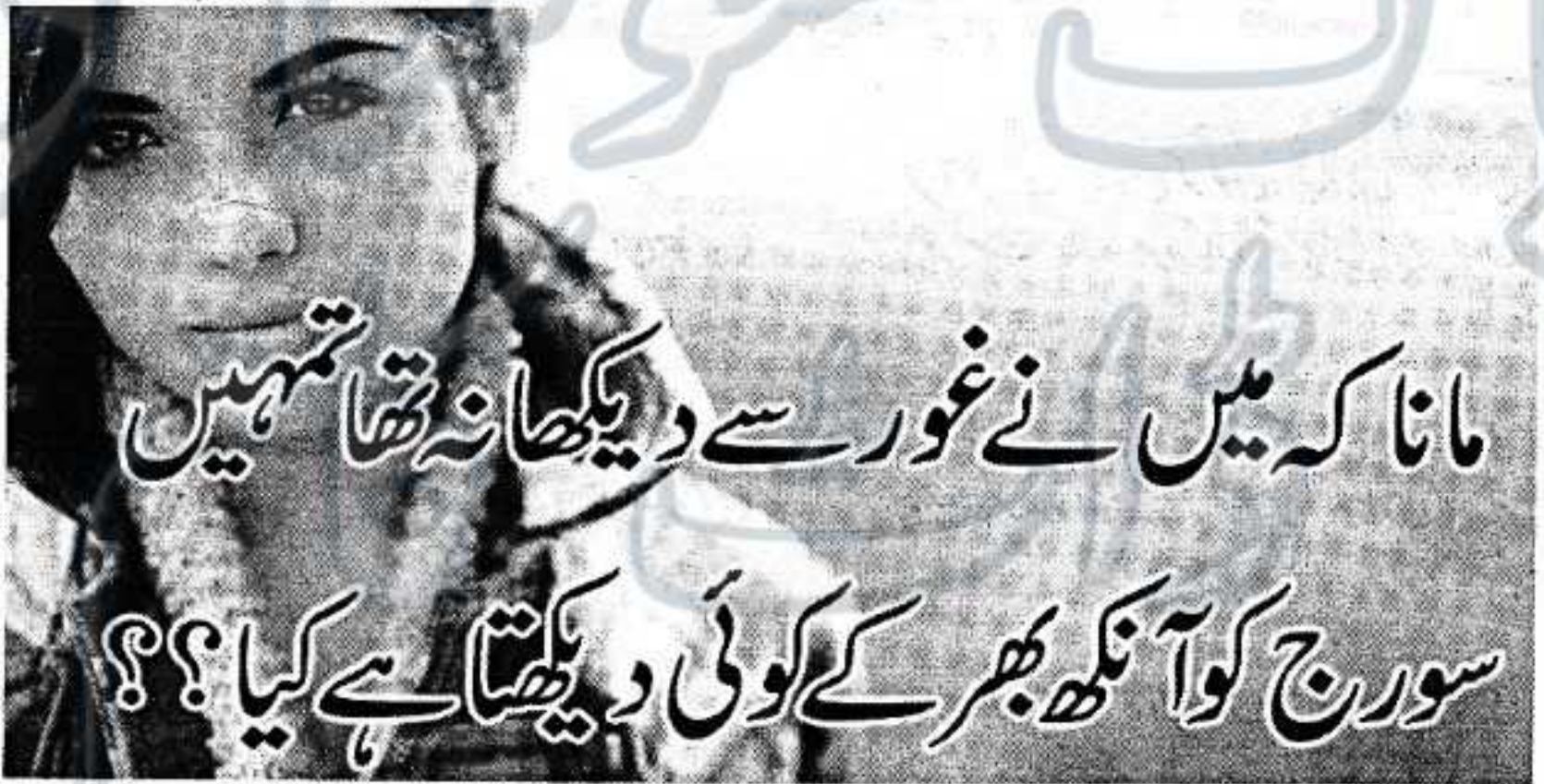
چلیں آج ذرا شاعری اور اعضا کے حوالے سے کچھ باتیں کرلیں۔

ویسے تو یہ کہا جاتا ہے کہ رقص اعضا کی شاعری ہے لیکن شاعری اور اعضا دو مختلف چیزیں ہیں۔ اعضا ایک سامنے کی حقیقت ہے جب کہ شاعری ایک جذبہ ہے۔ ایک کیفیت ہے۔ ایک احساس ہے۔

اردو شاعری کا دامن بہت وسیع ہے۔ اس دامن میں محبوب کے اعضا بھی سمٹ آئے ہیں، خاص طور پر آنکھیں

دل، بال، رخسار، چہرہ، ہونٹ وغیرہ۔

کیسے کیسے خوب صورت اشعار ان اعضا کے حوالے سے کہے گئے ہیں۔ اس مضمون میں میرا کمال بس یہی ہے کہ میں نے ایسے بہت سے اشعار جمع کر دیئے ہیں جن میں کسی نہ کسی عضو کا ذکر ہے۔

چلیں ابتدا کرتے ہیں۔ پاؤں، یعنی وہ پاؤں جن کی مدد سے آپ چلتے پھرتے ہیں۔ جو آپ کا بوجھ اٹھائے پھرتے ہیں۔

ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں
جی خوش ہوا ہے راہ کو پُرخار دیکھ کر

☆

غالب میرے کلام میں کیونکر اثر نہ ہو
پیتا ہوں دھو کے خسرو شیریں سخن کے پاؤں

☆

ہر پھر کے دائرے میں ہی رکھتا ہوں میں قدم
باندھی ہے کس نے گردشِ پرکار پاؤں میں

☆

کیا مرنے کے بعد پاؤں پھیلائے
ہے مقبرہ خواب گاہ میرا
(مومن خان مومن)

☆

دھیان کی سیڑھیوں پر پچھلے پہر
کوئی چپکے سے پاؤں دھرتا ہے
(ناصر کاظمی)

☆

پاؤں مارا تھا پہاڑوں پر تو پانی نکلا
یہ وہی جسم کا آہن ہے کہ مٹی نکلا
(ساقی فاروقی)

☆

بے سروپا آرزو کو پالنے سے فائدہ
بوجھ اٹھائے پھر رہا ہوں میں بھی کیا بے کار سا
(ریاض مجید)

گر جلوہ نما ہوتے تھے وہ خانہ زمیں پر
تو پاؤں لٹکتے ہوئے رہتے تھے زمیں پر
(میر انیس)

میرا مطلب ہے کہ اگر صرف پاؤں ہی کو لیا جائے تو بلا مبالغہ لاکھوں اشعار ہوں گے۔ جن میں جسم کے اس اعضا کے مختلف انداز کو بیان کیا گیا ہے۔ یہاں شاعری کا پورا دیوان تحریر کرنا مقصود نہیں ہے۔ بلکہ صرف یہ دیکھنا ہے کہ اردو شاعری میں انسانی اعضا کو کتنی اہمیت دی ہے۔

پاؤں کے بعد اب ہاتھوں کی طرف آتے ہیں۔ اس عضو کو بھی بڑی خوبی اور بڑی فیاضی کے ساتھ شاعری میں استعمال کیا گیا ہے۔ چلیں اب ہاتھوں کے حوالے سے کچھ اشعار سن لیں۔

ہم نے اقبال کا کہا مانا
اور فاقوں کے ہاتھوں مرتے رہے
جھکنے والوں نے رفعتیں پائی
ہم خودی کو بلند کرتے رہے
(راجا مہدی علی خان)

☆

انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اٹھا کے ہاتھ
دیکھا مجھے تو چھوڑ دیئے مسکرا کے ہاتھ
(قائم)

☆

عمر آخر ہے جنوں کرلوں، بہاراں پھر کہاں
ہاتھ مت پکڑو مرا یارو گریباں پھر کہاں
(یقین)

☆

یہ بزم مے ہے یا کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے
(شاد عظیم آبادی)

☆

یہاں کوتاہی ذوقِ عمل ہے خود گرفتاری
جہاں بازو سمٹتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے
(اصغر گونڈوی)

☆

کب لوٹا ہے بہتا پانی، بچھڑا ساجن، روٹھا دوست
ہم نے اس کو اپنا جانا جب تک ہاتھ میں داماں تھا
(ابن انشاء)

☆

لہو میں ہاتھ تر ہیں پتھروں کو چھوتا پھرتا ہوں
نہ جانے کب کہاں میں کھو چکا ہوں اعتبار اپنا
(زیب غوری)

☆

میں کس کے ہاتھ پہ اپنا لہو تلاش کروں
تمام شہر نے پہنے ہوئے ہیں دستانے
(مصطفیٰ زیدی)

☆

کچھ اور مانگنا میرے مشرب میں کفر ہے
لا اپنا ہاتھ دے میرے دستِ سوال میں
(نا معلوم)

☆

تم تکلف کو بھی اخلاص سمجھتے ہو فراز
دوست ہوتا نہیں ہر ہاتھ ملانے والا
(احمد فراز)

امجد حیدر آبادی کی ایک رباعی بھی پڑھ لیں۔
ہر چیز مسبب سے سبب سے مانگو
منت سے سماجت سے ادب سے مانگو
کیوں غیر کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہو
بندے ہو اگر رب کے تو رب سے مانگو

☆

آگے کس کے کیا کریں دستِ طلب دراز
یہ ہاتھ سو گیا ہے سرہانے دھرے دھرے
(میر)

ہاتھوں کے ذکر کے بعد اب ہم آنکھوں پر آجاتے ہیں۔ ہزاروں اسناد ہیں کیونکہ آنکھیں دل کا دروازہ ہوتی ہیں۔

آنکھیں، چشم، نگاہ وغیرہ۔ اردو کے تقریباً ہر شاعر نے آنکھوں کے حوالے سے خوب صورت اشعار کہے ہیں۔ ساحر لدھیانوی کی ایک خوب صورت مسلسل غزل ہے۔ اس کی ردیف ہی آنکھیں ہیں۔ لہٰذا کیوں نہ آپ پوری غزل ہی پڑھ لیں۔ اس کے بعد دوسرے شاعروں کی طرف آئیں گے۔

ہر طرح کے جذبات کا اعلان ہیں آنکھیں
شبنم کبھی شعلہ کبھی طوفان ہیں آنکھیں
آنکھوں سے بڑی کوئی ترازو نہیں ہوتی
تلتا ہے بشر جس میں وہ میزان ہیں آنکھیں
آنکھیں ہی ملاتی ہیں زمانے میں دلوں کو
انجان ہیں ہم تم اگر انجان ہیں آنکھیں
لب کچھ بھی کہیں اس سے حقیقت نہیں کھلتی
انسان کے سچ جھوٹ کی پہچان ہیں آنکھیں
آنکھیں نہ جھکیں تیری کسی غیر کے آگے
دنیا میں بڑی چیز مری جان ہیں آنکھیں

اب متفرق اشعار آنکھوں کے حوالے سے سن لیں۔
سوچا ہے کہ تحفے میں تمہیں بھیج دوں آنکھیں
درشن کا سبب و درشن نذرانہ کا نذرانہ
یہ ایک کمال کا شعر ہے۔
کیا بلا تھی نگہ ہوش ربا ساقی کی
اٹھ گئی آنکھ تو کوسوں کوئی ہشیار نہ تھا
(سودا)

☆

عیاں ہے ہر طرف عالم میں حسن بے حجاب اس کا
بغیر از دیدہ حیراں نین جگ میں نقاب اس کا
یہ شعر ولی دکنی کا ہے جو اردو کے ابتدائی عہد کے شاعر تھے۔ یہاں نین کا استعمال ہوا ہے۔
جب نام ترا لیجیے تو چشم بھر آوے
اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے
(میر تقی میر)

☆

کیفیت چشم اس کی مجھے یاد ہے سودا
ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں
(سودا)

☆

آنکھوں سے اس لیے مری لالی نہیں جاتی
یادوں سے کوئی رات جو خالی نہیں جاتی

☆

دیدۂ حیراں نے تماشا کیا
دیر تلک وہ مجھے دیکھا کیا
(مومن)

☆

دل میں کیا کیا ہوس دید بڑھائی نہ گئی
روبرو ان کے مگر آنکھ اٹھائی نہ گئی
(حسرت موہانی)

☆

سورج نے آ کے اور بھی ناسور دے دیے
آنکھیں جو کھل گئیں تو گیا خواب سے ہی وہ
(منظر امام)

☆

ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی
ہو دیکھنا تو دیدہ و دل وا کرے کوئی
(اقبال)

دیکھ لیا، انسانی جسم کے اس خوب صورت عضو پر بھی شاعروں نے کیسی معنی آفرینیں کی ہے۔ ویسے اگر صرف آنکھوں ہی کے حوالے سے آپ کو اشعار سناتا چلا جاؤں تو پوری ایک کتاب بن جائے۔

اب آجائیں انسانی جسم کے ایک اور عضو کی طرف۔

جی ہاں اس دلِ خانہ خراب نے کتنی آفتیں برپا کر رکھی ہیں۔

یہ وہ عضو ہے جس کے ذکر سے شاعروں کے ہزاروں دیوان بھرے ہوئے ہیں۔ عام انسان بھی اپنی روزمرہ گفتگو میں اس عضو کی بات کرتا ہے۔ مذہبی کتابوں نے بھی اس عضو کی طرف اشارہ کر کے کہا ہے کہ اگر یہ درست ہو جائے تو پھر سب کچھ درست ہو جاتا ہے۔

محبتوں کی ابتداء اس عضو کے حوالے سے ہوتی ہے۔ آپ تو سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ میرا اشارہ دل کی طرف ہے۔ چلیں دیکھتے ہیں ہمارے شعراء نے دل کو کس کس انداز سے یاد کیا ہے۔

☆

ہم کاہے کو دل کو جانے دیتے
اپنا اگر اختیار ہوتا
(مومن)

☆

دل کے لیے ہزار سود
ایک گناہ کا زیاں
(اقبال)

☆

عقل و دل و نگاہ کا مرشدِ اولیں ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دیں بت کدۂ تصورات
(اقبال)

☆

شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے
دل ہے گویا چراغ مفلس کا
(میر)

☆

دل کو وہ سوزِ لذتِ دردِ آشنائی دے
دھڑکن سے مجھ کو اسمِ محمد سنائی دے
(دل)

☆

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے
(غالب)

☆

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی
(غالب)

☆

دلِ طوفاں شکن تنہا جو پہلے تھا سو اب بھی ہے
بہت طوفان ٹھنڈے پڑ گئے ٹکرا کے ساحل سے
(یاس یگانہ چنگیزی)

☆

کعبہ نہیں کہ ساری خدائی کو دخل ہو
دل میں سوائے یار کسی کا گزر نہیں
(یاس یگانہ)

☆

تسخیر مہرہ ماہ مبارک تجھے مگر
دل میں نہیں اگر تو کہیں روشنی نہیں
(جگر مراد آبادی)

☆

پریشاں ہو کے میری خاک آخر دل نہ بن جائے
جو مشکل اب ہے یارب پھر وہی مشکل نہ بن جائے
(اقبال)

☆

شام بھی تھی دھواں دھواں حسن بھی تھا اداس اداس
دل کو کئی کہانیاں یاد سی آکر رہ گئیں
(فراق)

☆

راہِ طلب میں چھوڑ دیا دل کا ساتھ بھی
پھرتے لے کے یہ مصیبت کہاں کہاں
(فراق)

☆

اک صورت دل میں سمائی ہے اک شکل ہمیں پھر بھائی ہے
ہم آج بہت سرشار ہیں پر اگلا موڑ جدائی ہے
(اطہر نفیس)

☆

محبتوں میں عجب ہے دلوں کو دھڑکا سا
نہ جانے کون کہاں راستہ بدل جائے

(عبیداللہ علیم)

☆

دل پر بہت ہو گیا۔ اب دل سے ہٹ کر جسم کے دوسرے عضو پر آ جاتے ہیں۔

صورت (شکل۔ چہرہ وغیرہ)

انسانی جسم کا وہ حصہ جو خوب صورت اور بدصورتی کا معیار بناتا ہے۔ اچھی صورت بھی کیا بری شے ہے جس نے ڈالی بری نظر ڈالی۔

کیا ملیے ایسے لوگوں سے جن کی نیت چھپی رہے
اصلی صورت سامنے آئے نقلی صورت چھپی رہے

(ساحر لدھیانوی)

☆

اس رنگ میں صورت گلزار دیکھنا
پھولوں کے رنگ سونگھنا مہکار دیکھنا

(صورت)

☆

نگاہ شعلہ بنیں چہرہ آفتاب بنیں
وہ آدمی ہے مگر دیکھنے کی تاب نہیں

(چہرہ)

☆

خشک سیروں تنِ شاعر کا لہو ہوتا ہے
تب نظر آتی ہے اک مصرعہ تر کی صورت

(صورت)

☆

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی جو پنہاں ہو گئیں

(غالب)

☆

منہ نہ کھلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں
زلف سے بڑھ کر نقاب اس شوخ کے منہ پر کھلا

(منہ، غالب)

اب تک جو ذکر ہوا ہے۔ وہ ہے پاؤں، ہاتھ، آنکھیں، دل صورت (چہرہ) وغیرہ۔ اب ایک اور عضو کی طرف آ جاتے ہیں۔

گیسو (بال۔ زلف وغیرہ)

ایک خوب صورت شعر سے ابتدا کرتے ہیں یہ شعر ہے سراج الدین ظفر کا۔

ہمارے دوش پہ کھلتی تو تیری زلف سے ہم
نسیمِ صبح کے لہجے میں گفتگو کرتے
(زلف)

☆

قافلۂ حجاز میں ایک حسینؓ بھی نہیں
گرچہ ہے تابدار ابھی گیسوئے دجلہ و فرات
(اقبال)

زلف بر دوش اگر کوئی حسینہ آجائے
رقص کرتا ہوا ساون کا مہینا آجائے

☆

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تیری زلف کے سر ہونے تک
(غالب)

☆

ذرا شوق تو دیکھئے گا لیے زلف خم کدہ کو ہاتھ میں
میرے پیچھے آئے دبے دبے مجھے سانپ کہہ کر ڈرا دیا

☆

پوچھا جو میں نے چاند نکلتا ہے کس طرح
زلفوں کو رخ پہ ڈال کے جھٹکا دیا کہ یوں

☆

نینداس کی ہے دماغ اس کا ہے، راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے شانوں پر پریشاں ہوگئیں

☆

اب اے دل تباہ ترا کیا خیال ہے
ہم تو چلے تھے کاکلِ گیتی سنوارنے
(ساحر لدھیانوی)

☆

ہمارے گھر کی دیواروں پہ ناصر
اداسی بال کھولے سو رہی ہے
(ناصر کاظمی)

☆

یہ زلف اگر کھل کے بکھر جائے تو اچھا
اس رات کی تقدیر سنور جائے تو اچھا
(ساحر)

اب ایک اور خوب صورت عضو کی طرف آئیں۔

ہمارے شاعروں نے اس کی شان میں بھی بہت کچھ کہا ہے۔ پہلے میر صاحب کا مشہور شعر سن لیں۔

نازکی اس کے لب کی کیا کہیے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے
(میر)

جی ہاں، اب ذکر بے صبری کا۔ لب، ہونٹ وغیرہ اس زمرے میں آئے ہیں۔ بلکہ منہ بھی اس کیٹگری میں آتا ہے۔ جس کا ثبوت غالب کا یہ شعر ہے۔

غنچہ نا شگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں
بوسے کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ یوں
(غالب)

☆

کمال حسن خالق نے دیا ہے اس پری رو کو
چتون کج ہوئی اس کی نہ گانے میں دہن بگڑا

☆

ساقی بغیر شب جو پیا آب آتشیں
شعلہ وہ بن کے میرے دہن سے نکل گیا

☆

بے ذوق نظر بزم تماشا نہ رہے گی
منہ پھیر لیا ہم نے تو دنیا نہ رہے گی
(فانی بدایونی)

☆

بھوکوں کی نظر میں بجلی ہے توپوں کے دہانے ٹھنڈے ہیں
تقدیر کے لب کو جنبش ہے دم توڑ رہی ہیں تدبیریں
(جوش ملیح آبادی)

☆

لب پہ پابندی تو ہے احساس پہ پہرا تو ہے
پھر بھی اہل دل کو احوال بشر کہنا تو ہے
(ساحر)

☆

لب کچھ بھی کہیں اس سے حقیقت نہیں کھلتی
انسان کے سچ جھوٹ کی پہچان ہیں آنکھیں
(ساحر)

میں اس مضمون کو یہیں پر ختم کر رہا ہوں۔ ورنہ ابھی اور بہت سے اعضا ہیں جن کا ذکر ابھی نہیں ہوا ہے۔

صائمہ اقبال

شمسی کلینڈر کے آٹھویں مہینے سے جڑی ان اہم شخصیات کا مختصر مختصر تذکرہ جنھوں نے کارہائے نمایاں انجام دے کر اپنی اہمیت کا احساس دلایا، جنہیں ہم بھول نہیں سکتے۔ ان کا ذکر برابر کرتے رہنا چاہیے تاکہ معلومات حاصل کرنے کے شائقین اپنی پیاس بجھا سکیں۔

ایک ایسی تحریر جسے سب سے زیادہ پسند کیا جارہا ہے

نصرت فتح علی خان

عہد ساز فکشن نگار ٹالسٹائی نے کہا تھا۔ ”عظیم فن انتشار کے دور میں جنم لیتا ہے۔“

اگر پاکستان پر نظر ڈالی جائے تو یہ بات درست ہی معلوم ہوتی ہے۔ ایک عرصے سے یہ ملک بحرانوں کا شکار نہ تو معاشی استحکام، نہ ہی ادارے مضبوط، اوپر سے دہشت گردی کا آسیب۔ اس کے باوجود یہاں ایسے ایسے کلاکاروں نے جنم لیا جنھوں نے نہ صرف پاکستان میں خود کو منوایا، بلکہ بیرونی دنیا میں بھی ایک اساطیری داستان کی حیثیت اختیار کرلی۔ ان کی شہرت سرحدیں عبور کرگئیں، ان کی روشنی سے آنکھیں خیرہ ہوئیں۔

مصائب کے باوجود جہاں پاکستانیوں نے خود کو اسپورٹس کے میدانوں میں منوایا... اسکواش، ہاکی، کرکٹ اور اسنوکر میں کارہائے نمایاں انجام دیے، وہیں گائیکی کے میدان میں بھی ہم کسی سے کم نہیں۔ گو تقسیم کے بعد بھارت کے برعکس یہاں موسیقاروں کے لیے حالات بھی سازگار نہیں رہے، اس کے باوجود پاکستانی فن کاروں نے دنیا بھر میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا، لاکھوں کو گرویدہ بنایا۔ اس ضمن میں سب سے اہم نام قوالی کے شہنشاہ، نصرت فتح علی خان کا ہے جنہیں بیرونی دنیا میں پاکستانی موسیقی کی پہچان کہا جائے، تو غلط نہیں ہوگا۔

جب خان صاحب کی آواز ہندوستان پہنچی، تو بالی ووڈ ششدر رہ گیا۔ ایک دیوانگی تھی۔ پروڈیوسر دوڑے دوڑے آئے۔ کئی بڑی کمپنیوں نے اُن کے ساتھ کام کرنا اپنے لیے اعزاز ٹھہرایا۔ ان کا صوفیانہ کلام دلوں پر راج کرنے لگا۔ جاپان میں تو انہیں دیوتا کا درجہ حاصل تھا۔ اصل میں خان صاحب کا چہرہ مہرہ اور جسامت ”ہنستا ہوا بدھ“ یعنی Laughing Buddha سے ملتی تھی، اس لیے جاپانی، گو اُن کی زبان نہیں سمجھ سکتے تھے مگر انہیں دیکھ کر سرشار ہوجاتے۔ ایک معنوں میں نصرت فتح علی خان کو سننا ان کے لیے روحانی تجربہ تھا۔ ان کے فن نے مغرب کے آخری کونے تک رسائی حاصل کی۔ مغربی موسیقار نے ان کے ساتھ بخوشی کام کیا۔ جدید سازوں کو سہارا دینے والا جب ان کا فن یورپی سامعین کے سامنے آیا، تو انہیں حیرت کا جھٹکا لگا۔ ایسا جادو انہوں نے پہلے کہاں سنا تھا۔ ایک زمانے میں مائیکل جیکسن اور میڈونا بھی کہا کرتے تھے کہ وہ خان صاحب کے ساتھ کام کرنے کے خواہش مند ہیں۔ انہیں

صوفیانہ پیغام کا علمبردار قرار دیا جاتا۔ جب وہ اپنی مشہور قوالی ''اللہ ھو اللہ ھو'' پیش کرتے، تو مختلف مذاہب کے ماننے والے ہزاروں افراد ان کی آواز سے آواز ملا کر ''اللہ ھو'' کہتے۔ وہ منظر دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔

اگر ہم ان کی جیون کہانی کھنگالیں، اُن کی ابتدائی زندگی کا جائزہ لیں، تو کہیں یہ اشارہ نہیں ملتا کہ اُن میں کیسے گن چھپے تھے اور تقدیر انہیں کہاں لے جانے والی تھی۔ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ قسمت ان پر مہربان تھی۔ جب انہوں نے گائیکی کے میدان میں قدم رکھا تو اور بھی کئی کلاکار اپنی قسمت آزمانے اس سمت آئے۔ ایسا نہیں کہ ان میں صلاحیت کی کمی تھی، یا ان کا ریاض کم تھا، مگر قسمت کی دیوی کو فیصل آباد میں پیدا ہونے والے نصرت فتح علی خان سے پیار ہو گیا تھا۔

خان صاحب 13 اکتوبر 1948 کو پیدا ہوئے۔ تعلق موسیقی کے ایک روایتی گھرانے سے، جو صوفیانہ گائیکی کے لیے شہرت رکھتا تھا۔ ان کے والد فتح علی خان اور تایا مبارک علی خان کا جالندھر میں ڈنکا بجتا تھا۔ وہ اپنے علاقے کے بڑے قوال تھے۔ قیام پاکستان کے وقت اس خاندان نے جالندھر سے ہجرت کی اور فیصل آباد میں سکونت اختیار کی تھی۔

گو حالات اتنے سازگار نہیں تھے، مگر یہ کلاسیکی موسیقی تھی، جس کے سامعین کی تعداد تقسیم کے بعد کم ہوئی، قوالی کا تعلق تو روح سے تھا، محفل سماع خانقائی نظام اور روحانی سلسلوں کا جزو... اس لیے قوالی کا فن پھلتا پھولتا رہا۔ اس خاندان نے بھی جلد ہی فیصل آباد میں خود کو منوا لیا۔ اپنے بچوں کو بھی یہی فن سکھایا۔ یوں تو تمام بچوں میں صلاحیت تھی، مگر ننھے منے، گول مٹول سے نصرت کی آواز میں بڑی کشش تھی، اس کی نشست کا اندازہ بھی خوب تھا۔ جہاں اوروں کو ریاض کی ضرورت تھی، اس کا معاملہ دیگر تھا۔ لگتا تھا، اس میں یہ صلاحیت بہ درجہ اتم موجود ہے۔ ہارمونیم اور طبلے کی تربیت بھی حاصل کی، مگر اصل میدان تو گائیکی تھا۔ وہ کہتے ہیں نا، پوت کے پاؤں پالنے ہی میں نظر آجاتے ہیں۔ خاندان کے بڑوں کو اندازہ ہو گیا تھا کہ اس بچے میں بڑی صلاحیت ہے مگر اس وقت سب نے زیادہ سے زیادہ یہی سوچا ہوگا کہ اس کا نام فیصل آباد سے نکل کر پورے ملک میں پھیل جائے گا، ریڈیو اور ٹی وی سے اس کی آواز سنائی دے گی... یہ کسے خبر تھی کہ کچھ برس بعد وہ پوری دنیا میں چھانے والا ہے۔

شروع شروع میں انہوں نے اپنے خاندانی انداز کو آگے بڑھایا۔ نجی تقریبات، محفل سماع اور ریڈیو پر انہیں سن کر لوگ کہتے، یہ نوجوان اپنے باپ کا نام روشن کرے گا۔ یہ وہ زمانہ تھا، جب جدید رجحانات دھیرے دھیرے پاکستانی موسیقی میں وارد ہو رہے تھے۔ کلاسیکی گویے اور قوال برادری نے ان کی جانب زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔ عام خیال تھا، ان کی زندگی مختصر، یہ رجحانات بس پاپ آرٹسٹوں تک محدود رہیں گے، البتہ نوجوان نصرت فتح علی خان کو اندازہ ہو گیا تھا کہ ان نئے سازوں میں کچھ ایسا ضرور ہے، جو ان کے فن کو وسعت دے سکتا ہے۔ انہوں نے فن قوالی کو نئے ٹرینڈز سے ہم آہنگ کرنے کا فیصلہ کیا...نتیجہ اثر انگیز نکلا۔

ان کی قوالی ''علی مولا علی'' جب ریڈیو سے نشر ہوئی، تو سننے والوں کو سرشار کر گئی۔ یہی انہیں ٹی وی تک لے گئی۔ اور پھر یہی بیرونی دوروں کا سبب بنی۔ انہوں نے فقط جدید ساز نہیں برتے۔ وہ لوک گیتوں اور جدید شعرا کے کلام کو بھی اپنے ڈھب پر پیش کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ اور یہ فیصلہ انہیں پاکستان کا مستند ترین قوال بنانے والا تھا۔ جب انہوں نے ''سن چرخے دی مٹھی مٹھی کوک ماہی مینوں یاد آوندا'' اور ''سانسوں کی مالا پہ سمروں میں پی کا نام'' گایا، تو وہ طبقہ... جس کی دل چسپی جدید موسیقی تک محدود تھی، وہ بھی چونک اٹھا۔ جب ناصر کاظمی کے کلام ''غم ہے یا خوشی ہے تو'' کو اپنی آواز میں پرویا، تو جیسے جادو ہو گیا۔

اب تو استاد نصرت فتح علی خان ایک بین الاقوامی آواز بن گئے تھے۔ ہندوستان ان کا گرویدہ تھا۔ جاوید اختر اور گلزار جیسے گیت نگار خواہش مند تھے کہ یہ عظیم فن کار ان کے الفاظ کو اپنی آواز بخشے۔ اے آر رحمان سمیت کتنے ہی موسیقاروں کی خواہش کہ وہ ان کے لیے دھنیں ترتیب دیں۔ برطانوی موسیقار پیٹر گیبریئل، جو مشرقی سازوں میں اپنی دل چسپی کے لیے مشہور تھے، ان کی جانب متوجہ ہوئے۔ انہوں نے خان صاحب کے لیے

دھن ترتیب دی۔ ان کی موسیقی کے ساتھ جب خان صاحب نے ''دم مست قلندر مست مست'' گایا، تو مغرب نے سانس روک کر انہیں سنا۔ بروکلن اکیڈمی آف میوزک کے فیسٹیول سے دعوت نامہ آنا کون سی بڑی بات تھی... انہیں تو یونیورسٹی آف واشنگٹن میں موسیقی کی تدریس کی دعوت دے دی گئی تھی۔

لوگ ہندوستان جانے کے لیے خواب دیکھتے ہیں، ان کے لیے بالی ووڈ کے دروازے کھل چکے تھے۔ 1995 میں ریلیز ہونے والی فلم ''ڈیڈ مین واکنگ'' کا ساؤنڈ ٹریک ایک شاہکار تھا۔ انہیں ''دی لاسٹ ٹیمپٹیشن آف کرائسٹ'' کی موسیقی ترتیب دینے کی دعوت دی گئی۔ ممتاز ہندوستانی ہدایت کار شیکھر کپور نے ''بینڈٹ کوئین'' بنائی، تو سر جھکائے نصرت فتح علی خان کے دربار میں حاضری دی کہ جناب اس فلم کے لیے کچھ وقت نکالیں۔ یہ وہ زمانہ تھا، جب مشرق سے مغرب تک اس پاکستانی فن کار کے نام کا ڈنکا بج رہا تھا۔ انہوں نے جدید مغربی موسیقی اور مشرقی کلاسیکی موسیقی کے ملاپ سے ایک نیا آہنگ پیدا کیا۔ فیوژن کے وہ بادشاہ تھے۔ نئی نسل ان کی گرویدہ ہوگئی۔ ''میرا پیا گھر آیا''، ''یہ جو ہلکا ہلکا سرور ہے''، ''چل میرے دل کھلا ہے مے خانہ''، ''آفرین آفرین'' بھلا کسے یاد نہیں۔

وہ شہرت کے عروج پر تھے، مگر صحت بگڑنے لگی۔ اب وہ بیمار رہنے لگے۔ بڑھتے وزن کی وجہ سے مرض سنبھل نہیں سکا۔ ادھر اعزازات کا اعلان ہو رہا تھا، ادھر وہ شوگر لیول بڑھ رہا تھا۔ 16 اگست 1997 کو اس خبر نے پوری دنیا کو سوگ وار کردیا کہ قوالی کے شہنشاہ نصرت فتح علی خان کا انتقال ہوگیا ہے۔ اس وقت عمر کیا تھی... فقط 48 سال۔ کچھ اور جیتے تو میلینیم کے سب سے بڑے فن کار کا اعزاز بھی اپنے نام کر لیتے۔

کہتے ہیں، شہرت حاسدین پیدا کرتی ہے، غیر ضروری تنقید شروع ہوجاتی ہے۔ نصرت فتح علی خان کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا گیا مگر ان کے ناقدین کے دو اعتراضات میں وزن تھا۔ ایک تو یہ کہ ان کے فیوژن نے قوالی کے ''فیبرک'' کو نقصان پہنچایا۔ دوسرا نکتہ یہ تھا کہ کچھ پست قد لوگوں نے ان کے قد سے فائدہ اٹھایا۔ پیٹر گیبریئل کا نام بھی اسی ضمن میں لیا جاتا ہے۔

خیر، یہ بات طے ہے کہ نصرت فتح علی خان پاکستانی فن موسیقی کے درخشاں ستارے تھے، جن کا خلا پر ہونا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔

ضیاء الحق

قیام پاکستان کے بعد بارہ شخصیات وزیر اعظم کے عہدے پر فائز ہوئیں، اتنے ہی افراد نے صدر پاکستان کا عہدہ سنبھالا، البتہ ان میں سے شاید ہی کسی نے اس ملک پر اتنے گہرے اثرات مرتب کیے ہوں، جتنے جنرل ضیا الحق نے کیے۔ جن دس برسوں میں ملک کی باگ دوڑ ان کے ہاتھ میں تھی، پاکستان کی تاریخ ہی بدل گئی۔ مارشل لا تو اور بھی لگے، مگر ضیا الحق کے مارشل لا کا پہلا تحفہ وہ سخت گیر قوانین تھے، جن کے خلاف صحافی اور طلبا تنظیمیں اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ادھر ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف چلنے والا مقدمہ اور پھر ان کی پھانسی... اس کے بعد تو بحالی جمہوریت کی تحریک کو پر لگ گئے، ملک بھر میں احتجاج زور پکڑنے لگا۔ اس احتجاج کو کچلنے کے لیے گرفتاریوں کا نہ رکنے والا سلسلہ شروع ہوا جس میں کوڑوں کی سزا بھی شامل تھی۔ یوں ضیاء الحق کے دور نے ایک نیا رنگ اختیار کر لیا۔

ضیاء الحق اپنی سخت گیری اور بھٹو کی پھانسی کی وجہ سے امریکا اور دیگر مغربی ممالک کے لیے قابل قبول نہیں تھے، مگر اسی زمانے میں افغان وار چھڑ گئی۔ سوویت یونین افغانستان میں داخل ہوا، تو امریکی سینیٹر چارلس ولسن نے اس سے نبرد آزما ہونے کی ذمے داری اٹھائی۔ امریکا اپنے ہتھیار اور وسائل لیے افغانیوں کے ساتھ آن کھڑا ہوا۔ مزید افرادی قوت اور تربیت کے لیے صدر پاکستان ضیاء الحق معاون ثابت ہوسکتے تھے۔ افغان وار کو جہاد کی صورت دی گئی۔ اس ضمن میں رائے عامہ کے نمائندوں کو برتا گیا۔ پاکستان میں مجاہدین تیار ہوئے جنہوں نے افغانستان جا کر سوویت یونین کے خلاف ایک بڑی جنگ لڑی اور سوویت یونین کو نہ صرف گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا بلکہ وہ ٹوٹ کر بکھر گیا۔ امریکا تو اپنے حریف کو شکست دے کر فتح کے نشے میں جھومتا ہوا لوٹ گیا... مگر اس خطے میں بارود اور انتشار کے ایسے بیج گر چکے تھے، جن کی ہولناک فصل آج ہمارے سامنے ہے۔

افغانستان میں تو جو ہوا، سو ہوا۔ پاکستان میں ہیروئین اور کلاشنکوف کلچر آیا۔ اس کی معیشت پر لاکھوں مہاجرین کا بوجھ آن پڑا۔ پھر عسکریت پسندی کی جو فیکٹریاں اس دور میں لگائی گئی تھیں، کچھ برس بعد ان کی مصنوعات گلی گلی بکنے لگیں۔ البتہ اس پورے معاملے کا دوسرا رخ بھی ہے۔ محمد ضیاء الحق کے چاہنے والوں کا حلقہ بھی وسیع ہے۔ ایسے کئی طبقات اور گروہ

موجود، جو انہیں ایک عظیم مجاہد کے روپ میں دیکھتے ہیں اور ان کی خدمات کو قابلِ فخر ٹھہراتے ہیں۔

چلیے، سابق صدر کی زندگی پر ایک نظر ڈال لیتے ہیں۔

وہ 12 اگست 1924 کو جالندھر کے ایک غریب کسان محمد اکبر کے ہاں پیدا ہوئے۔ گھرانا مذہبی مزاج کا حامل تھا۔ نماز روزے کے پابند تھے۔ جالندھر اور دہلی میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ 1945 میں فوج میں کمیشن ملا۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران برما، ملایا اور انڈونیشیا میں خدمات انجام دیں۔ تقسیم کے بعد یہ خاندان ہجرت کرکے پاکستان آگیا۔

1964 میں انہوں نے لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے پر ترقی پائی۔ اب وہ اسٹاف کالج کوئٹہ میں انسٹرکٹر ہوگئے۔ آنے والے برسوں میں انہوں نے اردن کی شاہی فوج میں بھی اہم ذمے داریاں سنبھالیں۔ مئی 1969 میں انہیں آرمرڈ ڈویژن کا کرنل اسٹاف بنایا گیا۔

اور پھر وہ بریگیڈیر ہوگئے۔ 1973 میں میجر جنرل کا عہدہ سنبھالا۔ اپریل 1975 میں لیفٹیننٹ جنرل کے عہدے پر ترقی دی گئی۔ گو وہ سینئر افسر نہیں تھے، مگر اُس وقت کے وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو نے یکم مارچ 1976 کو جنرل کے عہدے پر ترقی دے کر آرمی چیف بنانے کا فیصلہ کیا۔ کچھ ہی عرصے بعد انہیں اس فیصلے کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔

1977 کے انتخابات ملک میں بگاڑ لائے۔ اپوزیشن جماعتوں نے دھاندلی کا الزام لگا دیا۔ ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف ملک گیر احتجاج شروع ہوا۔ سیاسی حالت ابتر ہوگئے۔ قومی اتحاد کے کئی لیڈروں کو گرفتار کرلیا گیا۔ آخر پیپلز پارٹی اور قومی اتحاد کے درمیان مذاکرات کا عمل شروع ہوا۔ ادھر سے میاں طفیل، نواب زادہ نصر اللہ خان اور پروفیسر غفور نے حصہ لیا۔ معاملات لگ بھگ طے پاگئے تھے کہ 4 جولائی 1977 کی شام... محمد ضیاء الحق نے ملک میں مارشل لا لگا کر وزیر اعظم کو گرفتار کرلیا۔

ان کے ناقدین ان کے عہد کو وعدہ خلافیوں کا عہد بھی ٹھہراتے ہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ انہوں نے اقتدار میں آتے ہی 90 دن میں الیکشن کروانے کا وعدہ کیا تھا مگر یہ وعدہ کبھی پورا نہیں ہوسکا۔ انہوں نے اپنے ایکٹ کو آپریشن فیئر پلے قرار دیا گیا۔ اس عرصے میں ذوالفقار علی بھٹو پر ایک شہری کے قتل کا مقدمہ شروع ہوا۔ حیران کن طور پر ایک ایسے کیس میں، بھٹو جس میں براہِ راست شامل نہیں تھے، لاہور ہائی کورٹ نے اُنھیں سزائے موت سنادی۔ یہ کیس سپریم کورٹ میں پہنچا، تو وہاں بینچ میں ہونے والی کچھ پُراسرار تبدیلیوں کے بعد اس فیصلے کی توثیق کردی گئی۔ یوں 4 اپریل 1979 کو بھٹو کو پھانسی دے دی گئی۔

اس فیصلے کو عالمی دنیا میں ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ صدر پاکستان کی ایک منفی شبیہہ ابھرنے لگی۔ اقتدار میں آنے کے بعد انہوں نے اسلامائزیشن کا سلسلہ شروع کیا۔ ریاست نے مذہبی بیانیہ اختیار کرلیا۔ ملک کا سماجی وثقافتی رنگ ڈھنگ بدلنے لگا۔ مخالف تحریکوں کو کچلنے کے لیے سخت فیصلے کیے گئے۔ صحافیوں کو کوڑے مارنے جیسے ہولناک واقعہ ہوا۔ جنرل محمد ضیاء الحق نے ڈکیتی، شراب نوشی، تہمت زنا اور تازیانے کی سزاؤں سے متعلق حدود آرڈیننس اور زکوٰۃ آرڈیننس نافذ کیا۔ وفاقی شرعی عدالت اور قاضی عدالتیں قائم کیں۔

دسمبر 1984 میں انہوں نے صدارتی ریفرنڈم کروایا۔ یہ عجیب ریفرنڈم تھا جس میں عوام سے پوچھا گیا۔

"کیا آپ ملک میں نفاذ شریعت چاہتے ہیں، اگر ہاں تو جنرل ضیاالحق اگلے پانچ برس کے لیے ملک کے صدر ہیں اس متنازع ریفرنڈم کے ذریعے انہوں نے اپنے اقتدار میں توسیع کی۔ فروری 1985 میں انتخابات تو کروائے، مگر پی پی کے خوف سے انہیں غیر جماعتی بنیادوں پر منعقد کیا گیا۔ خاصی جوڑ توڑ بھی ہوئی۔ مجبوراً پیپلز پارٹی نے انتخابات کا بائیکاٹ کردیا۔ اب محمد خان جونیجو وزیر اعظم بنے۔ 30 دسمبر 1985 کو مارشل لا اٹھانے کا اعلان کر دیا مگر طاقت کا محور اب بھی صدارتی محل تھا۔ آخر پھر ایک وار ہوا، آٹھویں ترمیم کے تحت جنرل ضیاء الحق نے 29 مئی 1988 کو محمد خان جونیجو کی حکومت برطرف کردی۔

سوویت یونین کا افغانستان پر جارحیت کا مقصد ایک جانب افغانستان میں قائم روس نواز حکومت کو مستحکم کرنا تھا، وہیں بحیرۂ عرب کے گرم پانیوں تک رسائی کی خواہش بھی تھی۔ پاکستان ایک مشکل کیفیت میں تھا، ایک جانب بھارت، دوسری طرف سوویت یونین۔ مگر امریکیوں کی خطے میں دل

جبیبوں نے پاکستان کو اس کا اسٹریٹیجک پارٹنر بنا دیا اور جنرل ضیاء الحق کی اہمیت یکدم بڑھ گئی۔ آگے کی کہانی تاریخ کا حصہ ہے۔

یوں لگتا تھا کہ اب کوئی ضیاء الحق کو نہیں ہلا پائے گا مگر بے نظیر بھٹو کی منظر میں آنے کے بعد اور ان کے عظیم الشان استقبال نے صورت حال تبدیل کر دی۔ حکومتی صفوں میں اندیشے بڑھنے لگے مگر اس سے پہلے ایک اہم سیاسی واقعہ رونما ہوا، ایک پراسرار سانحہ ہوا... 17 اگست 1988 کو بہاولپور کے قریب ایک فضائی حادثہ پیش آیا، جس میں صدر پاکستان ضیاء الحق سمیت پاکستانی فوج اور امریکی ایمبیسی کے اہم ارکان اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

اس سانحے کے اسباب کیا تھے؟ اس کے پیچھے کون تھا؟ یہ گتھی کبھی نہیں سلجھ سکی۔ کتنی ہی سازشی تھیوریاں اس سے وابستہ ہیں۔ تفتیش ہوئی، تحقیقات کے لیے ماہرین بیرونی ملک سے آئے، اس پر کتابیں اور ناول لکھے گئے مگر یہ کیس آج بھی ایک معما ہے۔

جنرل محمد ضیاء الحق کی نماز جنازہ 19 اگست 1988ء کو شاہ فیصل مسجد، اسلام آباد میں پڑھائی گئی، جو ٹی وی پر لائیو نشر ہوئی۔ عوام کی بڑی تعداد نے اس میں شرکت کی۔ گو آج محمد ضیاء الحق کے ناقدین کی تعداد زیادہ ہے، مگر اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ ان کے دور اقتدار میں ملک نے اقتصادی طور پر ترقی کی، امن و امان کی صورتِ حال بہتر تھی اور خارجہ امور کو کامیابی سے نمٹا گیا۔ ان کے انکساری اور اخلاق پر بھی کوئی سوال نہیں۔ ان کی دینی فکر کی وجہ سے بھی انہیں عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔

احمد فراز

اس کو جدا ہوئے بھی زمانہ بہت ہوا
اب کیا کہیں یہ قصہ پرانا بہت ہوا

اب جو صاحب ہمارا موضوع، وہ ایک جانب جہاں اپنی رومانوی شاعری کے لیے مشہور، وہیں ان کے انقلابی مصرعے بھی ایسے کہ ہجوم میں اچھال دو تو آگ لگ جائے۔ ایک جانب محبوب کی زلف کا ایسا تذکرہ کہ سیدھا دل میں اتر جائے، وہیں آمروں کو یوں للکارا کہ خلق خدا میں بجلی سی دوڑ جاتی تھی۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس عظیم شعر نے کلاسیکی اور عصری... دونوں تقاضوں سے بھرپور انصاف کیا۔ یہی وجہ ہے کہ شہرت بھی ملی اور احترام بھی۔ ہر طبقے سے محبت سمیٹی۔ اپنے اس شعر میں اس عالم گیر محبت کا کیا خوب اظہار کیا۔

اور فراز چاہییں کتنی محبتیں تجھے
ماؤں نے تیرے نام پر بچوں کے نام رکھ دیے

یہ ذکر ہے ممتاز شاعر احمد فراز کا۔ خوبصورت لب و لہجے کا یہ ہر دلعزیز شاعر 12 جنوری 1931 کو کوہاٹ میں پیدا ہوا۔ ان کا اصل نام سید احمد شاہ علی تھا۔ کوہاٹ کی پُرفضا وادی میں ابتدائی برس گزرے، جس نے شخصیت پر ان مٹ نقوش چھوڑے۔ قابل طالب علم تھے۔ اردو اور فارسی میں ایم اے کی اسناد حاصل کیں۔

زمانۂ طالب علمی میں شاعری کی سمت مائل ہوئے۔ ایڈورڈ کالج، پشاور کے زمانے میں ریڈیو کے لیے فیچر نگاری شروع کی۔ مشاعروں اور ادبی جرائد کے ذریعے ان کی تخلیقات لوگوں تک پہنچنے لگیں۔

فراز پر فیض نے گہرے اثرات مرتب کیے اور انہوں نے ہمیشہ اس جید شاعر کا تذکرہ احترام اور محبت سے کیا۔

نوجوان فراز نے تیزی سے شہرت کے مدارج طے کیے پہلا شعری مجموعہ "تنہا تنہا" شائع ہونے سے پہلے ہی ان کے کئی اشعار زبان زد خاص و عام ہو گئے تھے۔ یہ مجموعہ جب آیا، وہ گریجویشن کے طالب علم تھے۔

شہر والوں کی محبت کا میں قائل ہوں مگر
میں نے جس ہاتھ کو چوما وہی خنجر نکلا

ایم اے کے بعد انہوں نے ریڈیو سے علیحدگی اختیار کر لی۔ اب وہ پشاور یونیورسٹی میں لیکچرر ہو گئے۔ اسی زمانے میں ان کا دوسرا مجموعہ "دردِ آشوب" چھپا۔ اس کا بڑا چرچا ہوا۔ دیگر ادبی اعزازات تو اپنی جگہ، اسے پاکستان رائٹرز گلڈ کے "آدم جی ادبی ایوارڈ" سے نوازا گیا۔ اب فراز کے نام کا ڈنکا بج رہا تھا۔ اس کے وقت کے سامنے کئی نام ماند پڑ گئے۔ کچھ عرصے بعد وہ پاکستان نیشنل سینٹر، پشاور کے ڈائریکٹر مقرر ہو گئے۔ بھٹو دور میں انہیں اکادمی ادبیات پاکستان کا سربراہ بنایا گیا۔ وہ ترقی پسند نظریات کے حامل تھے۔ جمہوریت کو ملکی ترقی کے لیے ضروری خیال کرتے، آمریت سے نالاں تھے، یہی سبب ہے کہ جب ضیاء الحق کا مارشل لا لگا، تو ان کے اشعار میں

احتجاج در آیا۔ حالات اتنے بگڑ... گئے کہ الفاظ کے اس جادوگر کو مجبوراً جلاوطنی اختیار کرنی پڑی۔

آج ہم دار پہ کھینچے گئے جن باتوں پر
کیا عجب کل وہ زمانے کو نصابوں میں ملیں

حکومت کی خواہش تھی کہ وہ لوٹ آئیں، پاکستان کی ادبی سرگرمیوں میں شرکت کریں، انہیں عہدوں کی بھی پیشکش کی گئی، مگر انہیں یہ گوارا نہیں تھا کہ سرکار ادیبوں پر اپنی مرضی تھوپے، اُن قیود کا تعین کرے، جن میں رہتے ہوئے انہیں لکھنا چاہیے۔ ہاں، بہت سے ادیبوں نے مارشل لا کی چھتری قبول کرلی، مگر انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ 1979 ایک حکومتی نمائندہ ان سے ملا اور انہیں صدر پاکستان کا پیغام دیا، تو انہوں نے اپنے انکار کو کچھ یوں منظوم شکل دی۔

سو شرط یہ ہے جو جاں کی امان چاہتے ہو
تو اپنے لوح و قلم قتل گاہ میں رکھ دو
وگرنہ اب کے نشانہ کمان داروں کا
بس ایک تم ہو، سو غیرت کو راہ میں رکھ دو
یہ شرط نامہ جو دیکھا تو ایلچی سے کہا
اسے خبر نہیں تاریخ کیا سکھاتی ہے
کہ رات جب کسی خورشید کو شہید کرے
تو صبح اک نیا سورج تراش لاتی ہے
سو یہ جواب ہے میرا میرے عدو کے لیے
کہ مجھ کو حرصِ کرم ہے نہ خوفِ خمیازہ
اسے ہے سطوتِ شمشیر پر گھمنڈ بہت
اسے شکوہ قلم کا نہیں ہے اندازہ
میرا قلم نہیں کردار اس محافظ کا
جو اپنے شہر کو محصور کرکے ناز کرے
میرا قلم نہیں کاسہ کسی سبک سر کا
جو غاصبوں کو قصیدوں سے سرفراز کرے
میرا قلم نہیں اوزار اس نقب زن کا
جو اپنے گھر کی ہی چھت میں شگاف ڈالتا ہے

بعد میں جب کبھی وہ یہ نظم سناتے، سامعین کے بدن میں بجلی سی دوڑ جاتی۔ فیض کے مصرعے "ہم دیکھیں گے" کے سننے والوں پر جو جادوئی اثرات ہوتے تھے، انہیں سوائے جالب کے اگر کسی نے پایا، تو فراز کی اس نظم نے پایا۔ آنے والے برسوں نے اُن کی شہرت کو مہمیز کیا۔ ان کا کلام پھیلتا رہا۔ اردو کی نئی بستیوں میں بالخصوص انہوں نے اہمیت اختیار کرلی تھی۔

1988 میں "آدم جی ادبی ایوارڈ" اور 1990 میں انہیں "اباسین ایوارڈ" سے نوازا گیا۔ 1988 میں انہیں بھارت نے "فراق گورکھ پوری ایوارڈ" پیش کیا۔ اکیڈمی آف اردو لٹریچر، کینیڈا نے انہیں نشان سپاس پیش کیا۔ 1992 میں بھارت کی جانب سے "ٹاٹا ایوارڈ" دیا گیا۔

انہوں نے ہمیشہ جمہوریت کے حق میں آواز اٹھائی، اسی باعث جب پرویز مشرف نے مارشل لا لگایا، تو توقع کی جارہی تھی کہ وہ اس کے خلاف احتجاج کریں گے، مگر خلاف توقع انہوں نے نہ صرف خاموشی اختیار کی، بلکہ بعد میں اس کا خیر مقدم کیا۔ مشرف دور میں انہیں حکومتی تمغوں سے بھی نوازا گیا۔ انہیں "نیشنل بک فاؤنڈیشن" کا سربراہ بنادیا گیا۔ البتہ ایک ٹی وی انٹرویو میں انہوں نے حکومت کی پالیسیوں کو تنقید کا نشانہ بنایا، تو انہیں ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑا۔ وہ اس پر مطمئن تھے۔ اس واقعے سے وہ اپنی پرانی جون میں لوٹ آئے۔ انہیں 2007 میں ہلال امتیاز سے نوازا گیا تھا، جو انہوں نے لوٹا دیا۔ وکلا تحریک کے دوران ان کے چہرے پر انقلابی سرخی تھی، مگر اب عمر ڈھل چکی تھی۔

کئی ممالک کی جامعات میں ان پر تحقیقی مقالات لکھے گئے۔ ان کا کلام علی گڑھ یونیورسٹی اور پشاور یونیورسٹی کے نصاب میں شامل ہے۔ ان کی شاعری کا انگریزی، فرانسیسی، ہندی، یوگوسلاوی، روسی، جرمن اور پنجابی میں ترجمہ ہوا۔ 25 اگست 2008 کو اسلام آباد میں ان کا انتقال ہوا۔ ایک عہد تمام ہوا۔

اب نہ وہ میں ہوں، نہ وہ تو ہے، نہ وہ ماضی ہے فراز
جیسے دو سائے تمنا کے سرابوں میں ملیں

قرۃ العین حیدر

اردو کے عہد ساز فکشن نگار، اسد محمد خاں نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا تھا: "قرۃ العین حیدر ایک پورا عہد ہیں، بڑے سے بڑا نقاد اردو ادب میں ان کی حیثیت سے انکار نہیں کرسکا۔" ناول کے معروف ناقد ڈاکٹر ممتاز احمد خان کی رائے میں اردو کے جن تخلیق کاروں کو نوبیل کا حق دار ٹھہرایا جانا چاہیے تھا، ان میں قرۃ العین حیدر سرفہرست تھیں۔ اردو کے پہلے ماہر نوبیلیات، باقر نقوی کی رائے بھی یہی۔ نوبیل انعام یافتگان پر ان کی گہری نظر ہے اور سمجھتے ہیں کہ قرۃ العین کو اس میں شامل ہونا چاہیے تھا۔

اس ضمن میں کوئی دو رائے ہو بھی نہیں سکتی۔ اردو فکشن

میں جو مقام قرۃ العین حیدر کا، اس کی مثال ملنا مشکل۔ ہاں، کرشن چندر، منٹو اور بیدی عظیم افسانہ نگار تھے، مگر ناول کے میدان میں تو قرۃ العین یکتا تھیں۔ کچھ لوگوں نے ان کے مقابلے میں عبداللہ حسین کو کھڑا کرنے کی کوشش کی، کچھ صاحبان نے ''اداس نسلیں'' کو پاکستان کا پہلا ناول قرار دے کر عبداللہ حسین کے تاج میں کچھ پنکھ بڑھائے، بے شک ''اداس نسلیں'' ایک بڑا ناول ہے مگر اس کا مقابلہ کسی بھی طور ''آگ کا دریا'' سے نہیں کیا جاسکتا۔ عبداللہ حسین خود قرۃ العین سے متاثر تھے، انہوں نے یہ اعتراف بھی کیا کہ قرۃ العین کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے انہوں نے کچھ صفحات ان ہی کے انداز میں لکھے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر اردو ادب میں کسی نے لازوال شہرت حاصل کی، تو وہ بلاشبہ قرۃ العین تھیں۔ ایک بھرپور زندگی انہوں نے گزاری۔ ان کے چار افسانوی مجموعے، پانچ ناولٹ، آٹھ ناول منظر عام پر آئے۔ متفرق کتابوں کی تعداد بھی خاصی تھی۔ مختلف زبانوں سے تراجم بھی کیے۔ چار کتابوں کا اردو سے انگریزی میں ترجمہ کیا۔ ہر عظیم ادیب کی طرح بچوں کے لیے بھی لکھا۔ بچوں کی کہانیوں کی کئی کتابیں منظر عام پر آئیں۔ الغرض پڑھنے لکھنے کو اوڑھنا بچھونا بنائے رکھا۔

اردو کی یہ عظیم ادیبہ 20 جنوری 1927 کو علی گڑھ میں پیدا ہوئیں۔ وہ اپنے وقت کے ممتاز ادیب اور دانشور سجاد حیدر یلدرم کی صاحب زادی تھیں۔ اردگرد علمی و ادبی ماحول تھا۔ اگر کہا جائے کہ وہ چاندی کا چمچہ منہ میں لے کر پیدا ہوئی تھیں، تو بھی غلط نہ ہوگا۔ ننھیال، ددھیال دونوں ہی خاندان مسلم امراء کی تہذیب اور ثقافت کے نمائندے۔ مستقبل میں یہ تہذیب اور اس کا زوال ان کے فکشن کا بنیادی موضوع بننے والا تھا۔ بالخصوص ان کے سوانحی ناول ''کار جہاں دراز ہے'' میں اس کی واضح تصویر ابھرتی ہے۔

گیارہ برس کی عمر ہی میں لکھنا شروع کر دیا۔ اسی وقت وہ علامتیں ظاہر ہوگئیں، جو ان کی عظمت کی سمت اشارہ کرتی ہیں۔ مگر یہ کسے خبر تھی کہ مستقبل میں انہیں اردو ادب کی ''ورجینا وولف'' کہا جائے گا۔ انہوں نے پہلی بار اردو ادب میں ''شعور کی رو'' کی تکنیک استعمال کی۔ اس تکنیک کے تحت کہانی ایک ہی وقت میں مختلف سمت میں چلتی ہے۔

تقسیم کے بعد قرۃ العین پاکستان آ گئی تھیں مگر یہاں ان کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا گیا۔ جس تہذیب کی وہ علم بردار تھیں، وہ ہندوستان کے مانند یہاں بھی شکست و ریخت کا شکار ہو رہی تھی، لسانی دیوار اونچی ہو رہی تھی۔ مذہب فرقوں میں بٹ گیا، بدعنوان لوگ میدان میں اتر آئے، سچے کھرے لوگ پیچھے دھکیل دیے گئے۔ وہ خود بھی اس تجربے سے گزریں۔

سوانح عمری میں ان کی پی آئی اے سے وابستگی کا ذکر بھی ملتا ہے۔ معروف کالم نگار رئیس فاطمہ کے مطابق خواتین فضائی میزبانوں کی روایت انہوں نے ڈالی۔ اس وقت ایئر ہوسٹس کی ملازمت کے لیے مسلمان لڑکیوں کو آمادہ کرنا ذرا مشکل تھا۔ انہوں نے یہ بیڑہ اٹھایا۔ کئی افراد کو اپنی بیٹیوں کو اس پیشے میں بھیجنے کے لیے قائل کیا، تمام لڑکیوں کو ریہرسل

سب سے پہلے فضائی حادثات

☆ سعودی عرب میں سب سے پہلا فضائی حادثہ 20 اگست 1980ء کو ہوا جس میں 300 افراد ہلاک ہوگئے۔

☆ برطانیہ میں سب پہلا فضائی حادثہ 14 اکتوبر 1930ء کو پیش آیا۔ جس میں 48 افراد ہلاک ہوئے۔

☆ امریکا میں بوئنگ طیارے کو حادثہ 21 دسمبر 1988ء کو پیش آیا۔ جس میں 149 افراد ہلاک ہوئے۔

☆ چین میں سب سے پہلا فضائی حادثہ جون 1994ء کو پیش آیا جس میں 146 مسافر ہلاک ہوئے۔

☆ لیبیا میں سب سے پہلا فوکر جہاز گر کر 1973ء میں تباہ ہوا۔ جس میں کل 108 افراد تھے۔

☆ یوروگوا میں سب سے پہلا 12 اکتوبر 1972 کو فضائی حادثہ پیش آیا۔ جس میں 45 افراد ہلاک ہوئے۔

☆ نیوزی لینڈ میں سب سے پہلا حادثہ ڈی سی 10 کو 5 نومبر 1979ء کو پیش آیا۔ 237 افراد ہلاک ہوئے۔

☆ کوریا میں سب سے پہلا فضائی حادثہ کیم ستمبر 1983ء کو پیش آیا۔ 269 افراد ہلاک ہوگئے۔

☆ بھارت کے جمبو جیٹ سب سے پہلے 24 جون 1985ء کو سمندر میں گرا۔ جس میں 329 افراد تھے۔

رانا حبیب الرحمن۔ سینٹرل جیل لاہور

کروائی، مگر پھر ایک بڑے بیوروکریٹ کی سفارش پر ایک اور صاحب کو اس کام کے لیے منتخب کرلیا گیا۔ اس رویے سے اور حق تلفی سے وہ اس قدر دل برداشتہ ہوئیں کہ فوراً ہی پی آئی اے سے استعفیٰ دے دیا۔ اس واقعے کی تفصیل ''کار جہاں دراز ہے'' میں درج ہے۔

جب انہوں نے ''آگ کا دریا'' لکھا، اس وقت پاکستان میں حب الوطنی اور مذہب کو اپنے مفادات کے لیے استعمال کرنے کا مکروہ کھیل شروع ہوچکا تھا۔ یہ ناول اس کھیل کے سوداگروں کو اپنے مفادات سے متصادم معلوم ہوا۔ انہیں اندازہ تھا کہ قرۃ العین کی شہرت کے سامنے بندھ باندھا مشکل ہے، سو وہ انہیں دق کرنے لگے۔ وہ جس محکمے کا حصہ تھیں، اس کے سربراہ کا رویہ انتہائی ہتک آمیز تھا، دیگر افراد بھی انہیں نیچا دکھانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتے۔

بیوروکریسی اور نام نہاد ادیبوں کے منفی رویے نے اس حساس قلم کار کا دل توڑ دیا۔ انہیں لگا کہ مولانا ابوالکلام آزاد صحیح کہتے تھے۔ سامان سمیٹا اور ہندوستان لوٹ گئیں۔ وہاں عزت اور شہرت ان کی منتظر تھی۔ انہیں وہ مقام ملا، جس تک پہنچنے کا دیگر اردو ادیب فقط خواب ہی دیکھ سکتے ہیں۔ ایک معنوں میں ان کی کہانی بھی استاد بڑے غلام علی جیسی ہے، جو تقسیم کے بعد پاکستان چلے آئے تھے، مگر یہاں فن کی بے توقیری دیکھ کر ہندوستان چلے گئے اور وہاں لیجنڈ کی حیثیت اختیار کرگئے۔

کہتے ہیں، قرۃ العین حیدر کا مزاج ترش تھا۔ بہت جلدی ناراض ہوجاتیں، ڈانٹ دیا کرتیں۔ تذکرہ ملتا ہے کہ وہ غصے کی بہت تیز تھیں۔ لوگ ملنے سے کتراتے۔ اس کے اسباب جاننا مشکل نہیں۔ اس عظیم ادیبہ سے جو رویہ روا رکھا گیا، جو حق تلفی ہوئی، جس طرح زچ کرنے کی کوشش کی گئی، وہ ان کے لہجے میں تلخی بھرنے کے لیے کافی تھا۔ پھر وہ منافقت سے نفرت کرتی تھیں۔ ایک بھرپور تہذیب کو مصلحت پسندی اور موقع پرستی کی بھینٹ چڑھتے دیکھا تھا۔ لوگوں کو بدلتے ہوئے دیکھ چکی تھیں۔ یہ سب عوامل ان کے مزاج کو ترشی سے بھرنے کے لیے کافی تھے، مگر یہ تلخی، یہ غصہ اس عظیم قلم کار کے فن کو متاثر نہ کرسکا۔ ان کا فکشن عظیم تر تھا۔ انہوں نے گردش رنگ چمن، آگ کا دریا، آخر شب کے ہم سفر جیسے ناول لکھے، جو ماسٹر پیس ٹھہرائے گئے۔ ناول ''آخر شب کے ہم سفر'' میں سابقہ مشرقی پاکستان کا منظر بڑی خوبی سے کھینچا۔ اسی علاقے کو انہوں نے ناولٹ ''چائے کے باغ'' میں بھی موضوع بنایا۔

ناقدین کے مطابق ان کی ناولوں اور افسانوں کے بیشتر کردار حقیقی ہیں۔ ان کی تخلیق ''اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجو'' کی قمرن بھی حقیقی کردار تھی، جسے پر مظفر علی نے بھارت میں ''انجمن'' نامی فلم بنائی۔ فلم میں مرکزی کردار شبانہ اعظمی نے ادا کیا تھا۔

یہ بات درست ہے کہ وہ زود رنج تھیں۔ بہت جلدی ناراض ہوجاتیں۔ پروین شاکر ہندوستان گئیں، تو ان سے ملیں۔ وہ پاکستان لوٹیں، تو ایک نظم لکھی۔ بہ ظاہر اس نظم میں کوئی منفی بات نہیں، مگر جانے کیوں قرۃ العین حیدر کو وہ ناگوار گزری۔ انہوں نے سخت خط لکھا۔ پروین شاکر نے یہ کہہ کر بات ختم کردی کہ اگر آپ کو میری کوئی بات بری لگی، تو معذرت۔

اس طرح کے اور واقعات بھی ہیں۔ ادبی جریدے ''ذہن جدید'' کے لیے ایک سروے ہوا، جس میں اردو کے بہترین ناولوں کی فہرست مرتب کی گئی۔ اس سروے میں ''اداس نسلیں'' کو بہترین ناول قرار دیا گیا۔ ''آگ کا دریا'' دوسرے نمبر پر تھا۔ عبداللہ حسین نے اپنے ایک انٹرویو میں انکشاف کیا: ''میں نے سوچا، اس سروے سے انہیں شدید صدمہ پہنچا ہوگا، تو میں نے پرچے کو ایک خط لکھا کہ میرے ناول کو پہلے نمبر پر رکھنے کے لیے شکریہ، مگر میں قرۃ العین کو سب سے بڑا ناول نگار مانتا ہوں۔''

خیر، ان کا لہجہ تلخ تھا، تو ان پر جچتا تھا۔ اس پایہ کی ادیبہ اگر مغرور ہو، تھوڑی غصہ ور ہو، تو کیا برا ہے۔ ان کی عظمت کا ان کے فکشن کا کوئی مقابلہ نہیں۔ انہیں متعدد ایوارڈز سے نوازا گیا۔ ''آخر شب کے ہم سفر'' کے لیے 1989 میں انہیں ہندوستان کے سب سے باوقار ادبی اعزاز گیان پیٹھ ایوارڈ سے نوازا گیا۔ بھارتی حکومت نے انہیں 1985 میں پدم شری اور 2005 میں پدم بھوشن جیسے اعزازات بھی دیے۔ 21 اگست 2007 کو دہلی میں طویل علالت کے بعد ان کا انتقال ہوا۔

پرویز مشرف

ایک جانب جہاں یہ موقف درست کہ ضیاء الحق کا مارشل لا اپنی اثر پزیری کے لحاظ سے دیگر آمریتوں سے آگے تھا، وہیں یہ بھی درست ہے کہ پرویز مشرف کا مارشل لا، ماضی میں لگنے والی آمریتوں سے یکسر مختلف تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ انہوں نے دیگر آمروں سے مختلف رویہ اختیار کیا۔ وہی طریق تھا، پی سی او کے تحت ججز سے حلف لینا، ریفرنڈم، پھر بلدیاتی انتخابات... مگر جو شے انہیں دیگر آمروں سے الگ کرتی ہے، وہ تھی میڈیا کی آزادی۔ عشروں تک ریاستی دباؤ میں رہنے والے انتہائی محدود ذرائع ابلاغ کے لیے پرویز مشرف کی آمد تازہ ہوا کا جھونکا ثابت ہوئی۔ یک دم متعدد پرائیویٹ چینلز کھل گئے۔ ان چینلز کو حکومت اور حاکم وقت پر تنقید کا لائسنس بھی دیا گیا۔ بعد میں یہی آزادی پرویز مشرف کے لیے دردسر بن گئی... وکلا تحریک کے دوران میڈیا افتخار چوہدری کے ساتھ جا کھڑا ہوا۔ ٹی وی چینلز نے انہیں ایک ہیرو کے طور پر پیش کیا۔ مشرف کی عطا کردہ آزادی اور اختیار کو استعمال کرتے ہوئے سپریم کورٹ کی بینچ نے اُنھیں بحال کر دیا، تو میڈیا نے اس عمل کا بھرپور جشن منایا۔ پھر جسٹس وجیہہ الدین کی دائر کردہ ایک ایسی خطرناک پٹیشن افتخار چوہدری کے سامنے آ گئی، جو پرویز مشرف کی بہ طور صدر انتخاب کو کالعدم ٹھہرا سکتی تھی۔ اس کا نتیجہ ایمرجنسی کی صورت نکلا۔ ججز کو فارغ کر دیا گیا۔ میڈیا زیر عتاب آیا اور ایک بار پھر وکلا تحریک شروع ہوئی جس کے نتیجے میں بالآخر پرویز مشرف کو استعفیٰ دینا پڑا۔

دراصل پرویز مشرف ایک روشن خیال شخص تھے۔ اپنے پہلے ہی خطاب میں انہوں نے کمال اتاترک اور اس کے ویژن کا ذکر کیا تھا، جو اس جانب اشارہ تھا کہ وہ مستقبل میں کس قسم کا پاکستان دیکھ رہے ہیں۔ انہوں نے دھیرے دھیرے وہ اقدامات کیے، جس سے پاکستان کا بیانیہ بدلنے لگا۔ ضیاء الحق کے لگائے انتہاپسندی کے پیڑوں کی نشوونما کچھ دھیمی پڑنے لگی مگر اتفاق دیکھیں جناب، ایک بار پھر افغانستان خطے کا مرکز بن گیا۔ امریکا نے 9/11 کو جواز بنا کر اس بدقسمت ملک پر چڑھائی کر دی۔ پاکستان کو امریکا اور طالبان میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا تھا۔ پرویز مشرف نے امریکا کا اتحادی بننے کا فیصلہ کیا۔ اس فیصلے نے پاکستان پر دیرپا اثرات مرتب کیے۔ ایک بار پھر آگ اور بارود کا کھیل کھیلا گیا جو اس بار افغانستان تک محدود نہیں رہا۔ پورے پاکستان میں پھیل گیا۔ مبصرین کے مطابق اس کا ایک سبب حکومت کی ناقص پالیسیاں بھی تھیں۔ انہوں نے امریکا کا ساتھ ضرور دیا، مگر طالبان اور عسکریت پسندوں کو اپنے اثاثہ سمجھنے کی فکر سے مکمل کنارہ کشی اختیار نہیں کی۔ پاک افغان سرحدی علاقے میں عسکریت پسندی بڑھی، تو اس کی جانب زیادہ توجہ نہیں دی گئی۔

پرویز مشرف ہی کے دور میں پہلا خودکش دھماکا ہوا اور پھر وہ وقت بھی آیا، جب خودکش دھماکوں کا مرض پورے ملک میں پھیل گیا۔ مساجد، بازاروں، کھیل کے میدانوں میں دھماکے ہونے لگے۔ ایک دن میں تین تین دھماکے ہوتے۔ ادھر امریکا کو شکایت تھی کہ پاکستان نے ان کے ساتھ ڈبل گیم کھیلا، ادھر افغانی اور طالبان کے حامیوں کو شکایت تھی کہ پاکستان نے ان کے ساتھ دھوکا کیا۔ پرویز مشرف کی حکومت کچھ کمزور پالیسیوں، کچھ اندرونی دباؤ کی وجہ سے اس پورے مسئلے کو سنبھالنے میں ناکام رہی۔ نتیجہ آگ اور خون کی صورت نکلا۔

11 اگست 1943 کو دہلی میں پیدا ہونے والے پرویز مشرف نے 12 اکتوبر 1999 کو میاں نواز شریف کی حکومت برطرف کر کے ملک کی باگ دوڑ سنبھال لی۔ اس مارشل لا کے پیچھے بھی عجیب کہانی تھی۔ جس طرح بھٹو صاحب نے نسبتاً جونیر آفیسر ضیاالحق کو آرمی چیف لگایا اور بعد میں ان ہی کے ہاتھوں معزول ہوئے، اسی طرح میاں نواز شریف نے پرویز مشرف کا انتخاب کیا اور بعد میں ان ہی ہاتھوں نے انہیں گھر بھیجا۔ مبصرین کے مطابق کارگل وار پرویز مشرف اور میاں صاحب کے درمیان اختلافات کی وجہ بنی۔ جو اتنے بڑھ گئے کہ جب وہ سری لنکا کے دورے سے لوٹ رہے تھے، انہیں برطرف کر کے نیا آرمی چیف لگا دیا گیا مگر کور کمانڈروں نے پرویز مشرف کا ساتھ دیا۔ یوں میاں صاحب کی حکومت ختم ہوگئی۔ کچھ عرصے تک پرویز مشرف بہ طور آرمی چیف ہی ملک کے معاملات سنبھالتے رہے۔ ان کا عہدہ چیف ایگزیکٹو کہلاتا تھا۔ رفیق تارڑ صدر پاکستان کے

عہدے پر فائز رہے، مگر دھیرے دھیرے مسائل جنم لینے لگے۔ پہلے پی سی او آیا، جس کی وجہ سے سپریم کورٹ کے چھ ججز نے حلف لینے سے انکار کر دیا۔ پھر 20 جون 2001 کو انہوں نے رفیق تارڑ کو گھر بھیج کر صدر کا عہدہ سنبھال لیا۔ وہ یہ عہدہ سنبھالنے والے دسویں پاکستانی تھے۔ انہوں نے بھارت سے بہتر تعلقات کے لیے کوششیں تیز کر دیں۔ ان کی شیک ہینڈ ڈپلومیسی بہت مشہور ہوئی۔ انہوں نے بھارت کا انتہائی اہم دورہ کیا، جس نے ان کی امیج کو مضبوط کیا۔ انہیں کسی سیلیبریٹی جیسی حیثیت حاصل تھی۔ یہ الگ بات کہ مذاکرات نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوئے۔

فوج کا حصہ بننے کے بعد انہوں نے تیزی سے ترقی کے مراحل طے کیے۔ انہوں نے 1965 اور 1971 کی جنگوں میں حصہ لیا اور فوجی اعزازات اپنے نام کیے۔ (البتہ کچھ سابق افسران اس کی تصدیق نہیں کرتے)۔ 99ء میں انہوں نے ایمرجنسی نافذ کر دی اور تین برس میں الیکشن کروانے کا وعدہ کیا۔ کچھ لوگوں کا دعویٰ ہے کہ یہ پلان پہلے ہی سے تیار تھا، جس کی وجہ سے انہیں میاں صاحب برطرف کرنا چاہتے تھے... 9 ستمبر 2001 کا واقعہ ان کے سفر میں اہم موڑ ثابت ہوا۔ 13 ستمبر 2001 کو پاکستان میں امریکی سفیر وینڈی چیمبرلین کے ذریعے پرویز مشرف کے سامنے واشنگٹن نے مطالبات رکھے، جنہیں انہوں نے فوری طور پر تسلیم کر لیا۔ یوں راتوں رات تین دہائیوں پر مشتمل افغان پالیسی تبدیل ہوگئی۔

اعداد و شمار کے مطابق اس جنگ کے دوران امریکی مطالبے پر 689 افراد کو گرفتار کیا گیا، جن میں سے 369 افراد بشمول خواتین کو امریکا کے حوالے کر دیا گیا۔ جنرل مشرف اپنی کتاب "ان دی لائن آف فائر" میں اعتراف کیا تھا کہ ہم نے ان افراد کے عوض امریکا سے کئی ملین ڈالرز لیے۔ بعد میں یہ جملہ کتابوں سے حذف کر دیا گیا۔ ان افراد کے ساتھ گوانتاناموبے میں بدترین سلوک کیا گیا۔ ڈاکٹر عافیہ بھی ان ہی میں شامل تھیں، جو بعد میں پرویز مشرف کے خلاف ایک بڑی تحریک کا سبب بنیں۔

20 مئی 2000 کو عدالت عظمیٰ نے جنرل پرویز مشرف کو حکم دیا کہ وہ اکتوبر 2002 تک انتخابات کروائیں۔ اپنے اقتدار کو طول دینے کی غرض سے انہوں نے 30 اپریل 2002 کو ایک صدارتی ریفرنڈم کروایا۔ جس کے مطابق 98 فیصد عوام نے انہیں آئندہ 5 سال کے لیے صدر منتخب کر لیا۔

البتہ اس ریفرنڈم کو سیاسی جماعتوں کی اکثریت نے مسترد کر دیا۔ جنرل پرویز مشرف نے اپنے اقتدار کے راستے میں آنے والے بہت سے عہدیداروں کو بھی ہٹایا۔

اکتوبر 2002 کے انتخابات میں خاصی جوڑ توڑ ہوئی۔ مسلم لیگ کی شکست وریخت سے ق لیگ برآمد ہوئی۔ میاں اظہر اس کے صدر چنے گئے۔ پھر جب یہ لگا کہ وہ آمریت کو طول دینے کے لیے آئیڈیل نہیں، تو ان کی جگہ چوہدری شجاعت آگئے۔ عام انتخابات میں پاکستان مسلم لیگ ق نے قومی اسمبلی کی اکثر سیٹیں جیت لیں۔ یہ جماعت اور جنرل پرویز مشرف ایک دوسرے کے زبردست حامی تھے۔ مذہبی جماعتوں کا اتحاد متحدہ مجلس عمل اس شرط پر حکومت میں شامل ہوگیا کہ پرویز مشرف دسمبر 2004 تک وردی اتار دیں گے۔ یوں حکومت بن گئی۔ البتہ انہوں نے اپنے اس وعدے کو پورا نہ کیا۔ جنرل پرویز مشرف نے اپنی حامی اکثریت سے قومی اسمبلی میں سترہویں ترمیم منظور کروالی، جس کی رو سے انہیں باوردی صدر پاکستان ہونے کا قانونی جواز مل گیا۔

پرویز مشرف کو اس عرصے میں میاں نواز شریف کی صورت بھی ایک خطرے کا سامنا رہا۔ ان کا دعویٰ تھا کہ میاں صاحب ایک معاہدے کے تحت سعودی عرب گئے ہیں، جب کہ مسلم لیگ اس دعوے کو مسترد کرتی رہی۔ 10 ستمبر 2007 کو میاں نواز شریف نے واپس آنے کی کوشش کی، مگر انہیں واپس سعودی عرب بھیج دیا گیا۔ اس عمل کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ یورپی یونین نے بھی نواز شریف کے حق میں بیان دیا۔

3 نومبر 2007 کو پرویز مشرف نے ایمرجنسی لگا دی۔ اسی برس انہوں نے بالآخر وردی اتار دی اور اگلے پانچ برس کے لیے بہ طور صدر حلف اٹھا لیا۔ اسی زمانے میں محترمہ بے نظیر بھٹو واپس آئیں۔ یہ خبر عام تھی کہ پی پی اور پرویز مشرف کے درمیان معاہدہ ہوگیا ہے، حکومت میں آنے کے بعد انہیں بہ طور صدر تسلیم کیا جائے گا، مگر حالات بگڑ گئے... 27 دسمبر کو محترمہ کا قتل ہوگیا۔ کچھ حلقے اس قتل کا الزام حکومت کو دیتے ہیں۔

نئے سیٹ میں سیاسی حالات بگڑنے لگے۔ ادھر اپوزیشن جماعتیں، ادھر وکلا تحریک، میڈیا بھی پرویز مشرف سے ناراض تھا۔ اب وہ وردی میں بھی نہیں رہے تھے۔ دباؤ اتنا بڑھا کہ پرویز مشرف نے 18 اگست 2008 کو قوم سے خطاب میں مستعفی ہونے کا اعلان کر دیا اور بیرونِ ملک چلے

گئے۔ اُن کی جگہ آئین کے تحت سینٹ کے چیئرمین میاں محمد سومرو نے عبوری صدر کا عہدہ سنبھالا۔ بعد میں آصف علی زرداری نے نئے صدر کا حلف اٹھایا۔

حدود آرڈیننس میں ترمیم، لال مسجد آپریشن، این آر او، بلوچستان آپریشن، اکبر بگٹی کا قتل، ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی طویل نظر بندی، یہ وہ اقدامات تھے، جن پر انہیں شدید تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ ان ہی کی بنیاد پر ان کے خلاف کیسز بنے۔ غداری کا الزام لگا۔ کچھ حلقوں نے پھانسی کا انتہائی مطالبہ کر دیا۔ 2011 میں زرداری حکومت نے بے نظیر قتل کی تفتیش کی خاطر برطانیہ سے مشرف کو پاکستان واپس بھیجنے کا مطالبہ کر دیا، جسے برطانیہ نے رد کر دیا۔

خیر خواہ تو نہیں چاہتے تھے کہ پرویز مشرف پاکستان آئیں، مگر انہوں نے آل پاکستان مسلم لیگ بنانے کا اعلان کر دیا تھا۔ اس ضمن میں خاصے پُرجوش تھے۔ 2013 کے انتخابات سے قبل وہ پاکستان لوٹ آئے۔ انہیں اُمید تھی کہ عوام ان کا شان دار استقبال کریں گے، ماضی میں جو جماعتیں ان کی اتحادی رہی تھیں، وہ ان کا ساتھ دیں گے، مگر حالات بدل چکے تھے۔ چند ہی لوگ استقبال کو پہنچے۔ سیاسی جماعتوں کا رویہ بھی انتہائی محتاط تھا۔ پھر آتے ہی مقدمات شروع ہو گئے۔ وہ پہلے چک شہزاد میں نظر بند ہوئے، پھر کراچی میں اپنی صاحب زادی کے گھر۔ دباؤ بڑھتا گیا، حکومت ان کے خلاف کارروائی کرنا چاہتی تھی مگر کچھ قوتوں کو یہ گوارا نہیں تھا۔ بالآخر انہیں باہر جانے کی اجازت مل گئی۔ اس سلسلے میں خاصی لے دے ہوئی۔ خیر، ان کی سیاسی جماعت اب فقط علامتی طور پر موجود ہے۔

پرویز مشرف کی پالیسوں میں کئی سقم تھے، اگر وہ درست فیصلے کرتے، تو ملک کو ترقی کی راہ پر گامزن کر سکتے تھے، مگر اپنے اقتدار کو طول دینے کے لیے انہوں نے کچھ ایسے فیصلے کیے، جس سے ملک کو نقصان پہنچا۔ البتہ یہ کریڈٹ انہیں جاتا ہے کہ انہوں نے میڈیا کو آزاد کیا، نوجوانوں کو متحرک کیا اور روشن خیال بیانیے کو آگے بڑھایا۔ ان کے چاہنے والے اُمید رکھتے ہیں کہ مستقبل میں وہ اہم کردار ادا کریں گے۔

شعیب اختر

کرکٹ کی تاریخ میں نہ تو اس جیسا کوئی پہلے گزرا، نہ ہی یہ امکان کہ کل کوئی اس جیسا آئے گا!

وہ شیر تھا، اس کی دہاڑ مخالفین پر لرزہ طاری کر دیتی۔ اس کے حملے گھاتک ہوتے، اس کی گیند توپ کے گولے کی مانند تھی۔ اس کی رفتار گولی سے بھی تیز تھی۔ وہ اپنی نوعیت کا واحد کھلاڑی تھا، جس کا نام دہشت بن گیا۔ وہ ہیبت کا دوسرا نام تھا... اس کی گولا باری کے سامنے کتنی ہی دیوار ڈھیر ہو گئیں... کتنے ہی قلعے اس نے تن تنہا فتح کیے۔ عظیم تصور کیے جانے والے بلے باز بھی اس کے نام سے کانپتے تھے۔

ایک سابق کرکٹر کے یہ قول۔ ''شعیب اختر کھلاڑی نہیں تھا، وہ تو قدرت کا معجزہ ہے۔'' کاش اسے خود اس بات کا اندازہ ہوتا۔ کاش کرکٹ بورڈ کو علم ہوتا کہ وہ کیسا انوکھا اور لاجواب ہے، تو اسے سنبھال کر رکھا جاتا۔ دیکھ ریکھ کی جاتی، مگر ایسا ہوا نہیں تھا، یوں ایک ایسا بالر، جو دنیا کے عظیم ترین کھلاڑیوں میں شمار ہو سکتا تھا، فقط دنیا کے تیز ترین بالر کا اعزاز اپنے نام کر کے میدانوں سے رخصت ہو گیا۔ اگر وہ جم کر کھیلتا، فٹنس مسائل کا شکار نہ ہوتا، قواعد وضوابط کے مسائل جنم نہیں لیتے، تو شاید وہ شہرت کی اس بلندی پر پہنچ جاتا، جو فقط اساطیری کرداروں کا نصیب بنتی ہے۔

شعیب کو قدرت کا معجزہ قرار دینے کا سبب یہ نہیں کہ وہ دنیا کا تیز ترین بالر تھا اور اس نے دو مرتبہ سو میل فی گھنٹے (100) کی رفتار سے گیند... کروائی۔ بے شک یہ ناقابلِ فراموش کارنامہ، اس سے قبل کوئی اس حد تک نہیں پہنچ سکا تھا، اب تک یہ ریکارڈ موجود ہے... مگر ہم اس امکان کو نظر انداز نہیں کر سکتے کہ کل یہ ریکارڈ ٹوٹ جائے... اصل معاملہ تو یہ ہے کہ پاکستان کا یہ سورما ''فلیٹ فٹ'' (چپٹے پاؤں) تھا۔ اس کے پیر عام لوگوں جیسے نہیں تھے۔

فلیٹ فٹ لوگوں کو چلنے میں دقت ہوتی ہے۔ جب وہ کم سن تھے، ڈاکٹروں نے یہ کہہ کر ان کے اہل خانہ کو اندیشوں میں مبتلا کر دیا کہ شاید وہ ساری زندگی نہ دوڑ پائیں (کس نے سوچا تھا کہ مستقبل میں وہ اس بیان کو یکسر غلط ثابت کر دے گا)

ان کے اہل خانہ نے اسے قدرت کا فیصلہ سمجھ کر قبول کر لیا مگر پھر ایک روز انہوں نے عجیب منظر دیکھا۔ ننھے شعیب نے گیند اٹھائی، تیزی سے آگے بڑھا، اب وہ بھاگ رہا تھا...

ایک معجزہ ہو چکا تھا۔ ایک فلیٹ فٹ انسان دنیا کا تیز ترین بالر بننے والا تھا۔ 13 اگست 1975 کو راولپنڈی کے ایک مڈل کلاس گھرانے میں پیدا ہونے والا یہ بچہ مستقبل میں ''راولپنڈی ایکسپریس'' کہلانے والا تھا۔ (ویسے شعیب اختر کو راولپنڈی ایکسپریس کہنا اسے محدود کرنے کے مترادف ہے، وہ تو جہان بھر میں یکتا ہے۔)

مورگہ شعیب کا آبائی شہر تھا۔ ان کے والد اٹک آئل ریفائنری میں کام کرتے تھے۔ فلیٹ فٹ ہونے کی وجہ سے چار سال کی عمر میں انہوں نے چلنا شروع کیا۔ اپنی ابتدائی تعلیم ایلیٹ ہائی اسکول، مورگہ سے حاصل کی۔ پھر راولپنڈی میں واقع اصغر مال کالج میں داخلہ لے لیا۔ اوائل عمری میں انہوں نے کرکٹ کو سنجیدگی سے نہیں لیا۔ لاابالی اور دل پھینک نوجوان تھا۔ اسمارٹ تھا۔ ان کے اپنے الفاظ میں وہ لڑکیوں کے کالج کے باہر کھڑے رہتے تھے۔ پھر راولپنڈی کے ایک کوچ نے انہیں علاقائی میچ میں بولنگ کرتے دیکھا، تو بڑا حیران ہوا۔ کہا، فلاں جگہ کیمپ لگا ہے، فوراً پہنچو۔ انہوں نے ہنس کر کہا، میں کیوں دھوپ میں اپنا رنگ کالا کروں؟ مگر ان صاحب نے لاابالی شعیب کو منا ہی لیا۔ باقاعدہ کرکٹ کھیلنے کا آغاز انہوں نے 19 سال کی عمر میں کیا۔ جلد ہی لوگوں کو اندازہ ہوگیا کہ ان کی رفتار حیران کن ہے۔ ان کا رن اپ شان دار تھا۔ فرسٹ کلاس کرکٹ کا آغاز 1994 کے سیزن میں ایگریکلچر ڈویلپمنٹ بینک آف پاکستان کی جانب سے کیا۔ کارکردگی متاثر کن رہی۔ یہ کہا جانے لگا کہ یہ نوجوان مستقبل میں پاکستان کی نمائندگی کرے گا۔

ان کے اندازے درست ثابت ہوئے۔ انہیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ شعیب نے بین الاقوامی کرکٹ کا آغاز ویسٹ انڈیز کے خلاف نومبر 1997 میں کیا۔ ان کی برق رفتاری نے سب کو متاثر کیا۔ اس وقت ٹیم میں وسیم اور وقار یونس جیسے لیجنڈ موجود تھے۔ کسے پتا تھا کہ کل شعیب اختر ان ہی میں سے کسی ایک کی جگہ لینے والا ہے... ورلڈ کپ 1999 سے قبل پاکستان نے بھارت کا انتہائی اہم دورہ کیا۔ پہلا ٹیسٹ میچ پاکستان نے جیتا، دوسرا بھارت نے... تیسرا ٹیسٹ میچ کلکتہ میں ہوا۔ اس میں عظیم وقار یونس کے بجائے نوجوان کھلاڑی شعیب اختر کو آزمانے کا فیصلہ کیا گیا۔ آگے جو کچھ ہوا، وہ تاریخ کی کتابوں میں درج ہے۔

بھارتی شائقین کو اپنے کھلاڑیوں کو ''عظیم ترین'' کہنے کا خبط ہے، ہر ایک کو دنیا کا بہترین کھلاڑی ٹھہرا دیا جاتا ہے۔ اس زمانے میں بھارتی سچن ٹنڈولکر اور راہول ڈریوڈ کے ناموں کی مالا جپتے تھے۔ اس میچ میں عجب معاملہ ہوا۔ شعیب اختر کی ایک لہراتی، بل کھاتی ناقابلِ شکست گیند نے راہول ڈریوڈ کو بولڈ کر دیا۔ اب سچن شان سے میدان میں اترے۔ ستر ہزار افراد نے کھڑے ہو کر ان کا استقبال کیا۔ بڑا جوش و خروش تھا، مگر چند ہی سیکنڈز بعد ان ستر ہزار تماشائیوں کو سانپ سونگھ گیا... شعیب کی ایک جادو بھری گیند نے عظیم سچن کو بولڈ کر دیا تھا۔ اس وقت پُرجوش شعیب کی آواز گراؤنڈ میں گونجتی اکلوتی آواز تھی، ورنہ مکمل سناٹا تھا۔ الغرض دو گیندوں پر راہول ڈریوڈ اور سچن ٹنڈولکر کی وکٹ لے کر انہوں نے تہلکہ مچا دیا۔ شعیب نے اس میچ میں کل آٹھ وکٹیں اپنے نام کیں۔ وقار یونس پس منظر میں جانے لگے تھے۔

بعد کے میچز میں ان کی کارکردگی متاثر کن رہی۔ یہی وجہ ہے کہ جب عالمی میلا سجا، تو وہ مرکز نگاہ تھے۔ ان کا طویل رن اپ دلوں کو گرماتا۔ ان کی تیز رفتاری آنکھوں کو خیرہ کر دیتی، ان کا شیر کی طرح جھپٹنا لوگوں کو گرویدہ بنا لیتا۔ پاکستان کو فائنل تک پہنچانے میں شعیب کا کردار اہم رہا۔ اگلے کچھ برس تک وہ ٹیم کا مستقل حصہ رہے۔ ان کی شہرت دن بہ دن پھیلتی جا رہی تھی، مگر ساتھ ہی ڈسپلن ایشوز بھی کھڑے ہونے لگے۔ انہوں نے ایک منہ زور گھوڑے کی حیثیت اختیار کر لی تھی، ایک بگڑا شہزادہ۔ پھر فٹنس مسائل بھی تھے۔ البتہ کامیابیوں کا سفر بھی جاری رہا۔ انگلینڈ کے خلاف 2003 میں انہوں نے 100.2 میل فی گھنٹا یعنی 161.4 کلومیٹر فی گھنٹے کی رفتار سے گیند پھینکی، جو آج بھی ایک ریکارڈ ہے۔

2003 کا عالمی کپ پاکستان کے لیے ڈراؤنا خواب ثابت ہوا۔ پہلے ہی راؤنڈ میں باہر ہونے والی ٹیم شدید تنقید کی زد میں آئی۔ شعیب کو بھی کچھ عرصے باہر بیٹھنا پڑا۔ 2004 میں واپسی ہوئی۔ انہوں نے نیوزی لینڈ کے خلاف شاندار کارکردگی کا مظاہرہ کیا، مگر 2004 میں بھارت کا دورہ ان کے لیے مشکلات لے کر آیا۔ اس سیریز میں ان کی فٹنس کے ایشو نے پُراسرار شکل اختیار کر لی۔ اس کی وجہ سے کوچ اور کپتان کے درمیان ٹھن گئی۔ اچھا خاصا بتنگڑ بنا۔

2005 میں انگلینڈ کا دورہ اہم ثابت تھا۔ انہوں نے بیٹنگ کے لیے سازگار پچوں پر بہترین بولنگ کی اور سیریز میں سب سے زیادہ، یعنی سترہ (17) وکٹیں حاصل کیں۔ مگر اب تنازعات نے انہیں گھیر لیا تھا۔

پہلا تنازع تو 1999 ہی میں سامنے آگیا تھا، جب

آسٹریلیا میں ڈیرل ہیئر اور پیٹر ویلی نے ان کے ایکشن کو مشکوک قرار دیا۔ بعد میں میڈیکل چیک اپ کے بعد ان کا ایکشن کلیئر قرار دے دیا گیا۔ یہ مسئلہ 2001 میں پھر ابھر کر سامنے آیا۔ امپائر اسٹیوڈن نے شعیب کے ایکشن پر دوبارہ اعتراض کردیا۔ اب یونیورسٹی آف ویسٹرن آسٹریلیا میں ان کے ایکشن پر مطالعہ کیا گیا۔ بازو کا خم حد سے زیادہ تھا، مگر اس کی وجہ ان کا پیدائشی نقص تھا۔ ایک بار پھر شعیب لوٹ آئے۔ 2002 میں زمبابوے کے خلاف میچ میں بال ٹیمپرنگ کا الزام گھاتک تھا۔ ماضی کے الزامات کے برعکس اب ان پر دھوکا دہی کا الزام لگایا جا رہا تھا... 2003 سری لنکا کے خلاف میچ میں ایک بار پھر بال ٹیمپرنگ کا جو الزام لگا، وہ ثابت بھی ہوگیا۔ پاکستان کی بڑی بدنامی ہوئی۔ وہ دنیا کے دوسرے کھلاڑی تھے، جن پر اس الزام میں جرمانہ اور پابندی عائد کردی گئی۔ 2005 میں آسٹریلیا کے دورے پر تو حد ہوگئی۔ ڈسپلن کی دھجیاں اڑانے پر انتظامیہ نے انہیں وطن واپس بھیج دیا۔ اکتوبر 2006 کے آئی سی سی کے ایک اہم ٹورنامنٹ میں شعیب اختر اور محمد آصف کا ڈوپ ٹیسٹ مثبت آگیا۔ انہوں نے ممنوعہ ادویہ استعمال کی تھیں۔ ایک بار پھر یہ اسٹار کرکٹر پابندی کی زد میں تھا۔ بورڈ کی کوششوں سے وہ ٹیم میں واپس آگئے، مگر ان کا مزاج نہیں بدلا۔ اگست 2007 پاکستان کرکٹ بورڈ نے شعیب پر تین لاکھ روپے کا جرمانہ عائد کردیا۔ ان پر الزام تھا کہ انہوں نے بورڈ انتظامیہ سے بدتمیزی کی تھی۔ شعیب کے لیے اب حالات بگڑنے لگے۔ ان کا وزن بڑھ گیا تھا۔ کارکردگی میں تسلسل نہیں رہا تھا۔ ایک غیر ملکی دورے پر ان کے اور محمد آصف کے درمیان جھگڑا ہوگیا۔ شعیب نے ان پر بلے سے حملہ کیا تھا۔ انہیں ٹیم سے باہر کا راستہ دکھا دیا گیا۔

بھارت کے دورے پر انہیں پھر موقع ملا، مگر صاف نظر آرہا تھا کہ وہ فٹ نہیں۔ شعیب اختر... ایک عظیم کھلاڑی بن سکتے تھے، مگر فقط دنیا کے تیز ترین بولر کا خطاب لے کر کرکٹ کی دنیا سے لوٹ گئے۔ البتہ ان کی کارکردگی کی شیٹ جاذبِ نظر ہے۔ 46 ٹیسٹ میچز میں انہوں نے 178 وکٹیں اپنے نام کیں۔ 163 ون ڈے میچز میں وکٹوں کی تعداد 247 تھی۔ بولنگ اوسط دونوں ہی فارمیٹ میں متاثر کن رہی۔ ون ڈے میں 16 رنز کے عوض چھ وکٹیں ان کی بہترین کارکردگی رہی۔ وہ فقط 15 ٹی ٹوئنٹی ہی کھیل سکے۔

کرکٹ سے دور ہونے کے بعد شعیب اختر کا زیادہ وقت ہندوستان میں گزرنے لگا۔ انگریزی پر ان کی گرفت تھی، تنازعات کی وجہ سے وہ مقبول تھے، ان عوامل کو انھوں نے بڑی مہارت سے اپنا ہتھیار بنایا۔ وہ کمنٹری کے میدان میں نظر آئے اور بہت جلد اپنی جگہ بنا لی۔ ان کی کتاب Controversially Yours بھی خاصی خبروں میں رہی۔ فروخت بھی خوب ہوئی۔ کتاب میں انہوں نے پاکستان اور ہندوستان کے کئی اہم اور بڑے کھلاڑیوں کو سخت تنقید کا نشانہ بنایا۔ وہ ہندوستانی شوبز کی شخصیات کے ساتھ بھی کثرت سے دکھائی دیتے ہیں۔ ساتھ ہی پاکستانی بورڈ اور کھلاڑیوں پر تنقید کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔ الغرض خبروں میں رہنا کا فن شعیب اختر کو خوب آتا ہے۔ وہ بلاشبہ پاکستانی تاریخ کے متنازع ترین کھلاڑیوں میں سے ایک ہیں، ایسا کھلاڑی، جسے کروڑوں افراد نے چاہا۔

محمد یوسف

تاریخ گواہ ہے کہ پاکستانی کرکٹ ٹیم کے مڈل آرڈر کو بیٹنگ میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ جب جب ہمیں اچھے مڈل آرڈر بلے باز میسر آئے، پاکستان کی کارکردگی میں تسلسل رہا، جب ہم ان سے محروم ہوگئے، ہماری بیٹنگ لائن ریت کی دیوار ثابت ہوئی۔ دور کیوں جائیں، پاکستان کی موجودہ ٹیسٹ اور ون ڈے ٹیم میں بنیادی فرق مڈل آرڈر بیٹنگ ہی کا تو ہے۔ اگر پاکستان ٹیسٹ میں ٹاپ پر ہے، تو سبب مصباح الحق اور یونس خان جیسے عظیم کھلاڑی ہیں، جن سے ہم ون ڈے میں محروم ہیں۔ آج جو کرکٹر ہمارا موضوع، کسی زمانے میں وہ پاکستان کی مڈل آرڈر کا نہ صرف اہم ترین مہرہ تھا، بلکہ مبصرین اس کا شمار اپنے زمانے کے بہترین بلے بازوں میں کرتے تھے۔ کرکٹ کی اس جیسی سمجھ بہت کم کھلاڑی میں ہوتی ہے، اسے وکٹ پر ٹھہرنا بھی آتا تھا اور بہ وقتِ ضرورت تیز شاٹس کھیلنے پر بھی عبور تھا۔ اس کا قابلِ فخر ریکارڈ عکاس ہے کہ وہ کس معیار کا کھلاڑی تھا۔ بدقسمتی سے پاکستان اس عظیم بلے باز سے پوری طرح فائدہ نہیں اٹھا سکا۔ آخر کے برس تنازعات اور بدلتی ہوئی مینجمنٹ کے نذر ہوگئے۔ گو یونس خان آج بھی ٹیم کا حصہ ہیں، مگر محمد یوسف کو باہر کا راستہ دکھایا جا چکا ہے۔ اور یہ بڑی زیادتی ہے۔

محمد یوسف کے کیریر پر نظر ڈالنے سے پہلے یہ واضح کرنا مناسب رہے گا کہ پاکستانی تاریخ کے کامیاب ترین کھلاڑیوں میں سے ایک تصور کیا جانے والا یہ بلے باز ایک مسیحی گھرانے میں پیدا ہوا تھا۔ نام تھا یوسف یوحنا۔ انتہائی کسمپرسی میں آنکھ کھولی۔ وسائل کا فقدان تھا۔ جو ڈنڈا کپڑے

دھوتے ہوئے کوٹنے کے لیے استعمال ہوتا ہے، وہ کم سنی میں اس سے کرکٹ کھیلا کرتے تھے کہ بلا خریدنے کے پیسے نہیں ہوا کرتے تھے۔ مگر قدرت نے ساتھ دیا۔ نہ تو غربت رکاوٹ بنی، نہ ہی تعصب۔ اس کھلاڑی نے یوسف یوحنا ہی کی حیثیت سے کرکٹ ٹیم میں شمولیت اختیار کی۔ اس زمانے میں پاکستان کے کئی کھلاڑی تبلیغی جماعت سے وابستہ تھے۔ بالخصوص انضمام الحق، مشتاق احمد، ثقلین مشتاق، سعید انور، شاہد آفریدی وغیرہ۔ انضمام بعد میں کپتان بنے۔ ان کا اثر زیادہ تھا۔ مڈل آرڈر بلے باز ہونے کی وجہ سے یوسف ان کے قریب تھے۔ یہ متوقع تھا کہ وہ ان کے اخلاق، طور طریقے سے متاثر ہوتے۔ اسی کے نتیجے میں آخر انہوں نے پورے خاندان کے ساتھ اسلام قبول کر لیا اور داڑھی رکھ لی۔

اب ذرا ان کے اعداد و شمار پر نظر ڈال لیجیے۔ 26 فروری 1998 کو انہوں نے جنوبی افریقا کے خلاف اپنا پہلا ٹیسٹ میچ کھیلا۔ آخری بار وہ 26 اگست 2011 کو انگلینڈ کے خلاف ایکشن میں نظر آئے۔ پہلا ون ڈے میچ انہوں نے 28 مارچ 1998 کو زمباوے کے خلاف کھیلا تھا۔ آخری بار وہ 8 نومبر 2010 کو جنوبی افریقا کے خلاف میدان میں اترے۔ الغرض ان کا کیریئر کم و بیش بارہ برسوں پر محیط تھا۔ اس مختصر عرصے میں انہوں نے کئی کارنامہ انجام دیے۔ 90 ٹیسٹ میچز میں 52.29 کی شان دار اوسط سے 7,530 رنز اسکور کیے۔ اگر وہ کھیلتے رہتے، تو نجانے کتنے ریکارڈز اور بناتے۔ اس فارمیٹ میں انہوں نے 24 بار سو کا ہندسہ عبور کیا۔

ون ڈے کے وہ بادشاہ تھے۔ 288 میچز کھیلے۔ 41.71 کی انتہائی متاثر اوسط سے انہوں نے 9,720 رنز بنائے۔ 15 سنچریاں بنائیں۔ *141 ان کا بہترین اسکور رہا۔ یہ اسکور کارڈ شان دار ہے۔ بہت سے کھلاڑی اس تک پہنچنے کا فقط خواب ہی دیکھ سکتے ہیں۔ اس کے باوجود یہ ان کی صلاحیتوں کا اصل عکاس نہیں۔ اس سے ان درجنوں میچوں کی خبر نہیں ملتی، جب ان کی جادوئی بلے بازی نے پاکستان کو فتح دلائی۔

محمد یوسف 27 اگست، 1974 کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ 1998 میں انہوں نے پاکستانی ٹیم تک رسائی حاصل کی۔ ابتدا میں کچھ مشکلات پیش آئیں۔ کچھ مبصرین نے ان کی بیٹنگ کے انداز پر تنقید بھی کی، مگر ایک بار اعتماد بحال ہونے کے بعد انہوں نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ جلد وہ ٹیم کا مستقل حصہ بن گئے۔ کتنے میچز ان کے نام رہے۔ 2006 میں اپنے فن کی عروج پر دکھائی دیے۔ انہوں نے نہ صرف سر ویوین رچرڈ کا ٹیسٹ کرکٹ کے ایک کلینڈر ایئر میں سب سے زیادہ رنز بنانے کا ریکارڈ (1788 رنز) اپنے نام کیا، بلکہ ایک سال میں سب سے زیادہ... یعنی نو سنچریاں بھی داغ دیں۔ بے شک وہ ایک عظیم کھلاڑی بننے کی راہ پر قدم رکھ چکے تھے، مگر کسی خبر تھی کہ بورڈ کی اندرونی سیاست اور اختلافات اس کی راہ میں رکاوٹ بن جائیں گے۔

ان کے کارناموں کا جائزہ لے لیا جائے۔ وہ پاکستان کی تاریخ کے کامیاب ترین بلے باز تو ہیں ہی، ٹیسٹ کرکٹ میں اپنی 24 سنچریاں کے ساتھ وہ اس معاملے میں 15 ویں نمبر پر ہیں۔ ان کی ٹیسٹ اوسط کسی بھی پاکستانی کھلاڑی کی بہترین ٹیسٹ اوسط ہے۔ ایک سیریز میں سب سے زیادہ رنز کرنے والے وہ تیسرے کھلاڑی ہیں۔ ویسٹ انڈیز کے خلاف 2006ء کی سیریز میں انہوں نے 665 رنز بنائے تھے۔ اُن سے آگے فقط سرڈان بریڈمین (825 رنز) اور کلائڈ والکاٹ (806 رنز) ہیں۔ مگر یہ یاد رکھیں جناب کہ ان بلے بازوں کو یہ رنز بنانے کے لیے پانچ ٹیسٹ میچز میسر تھے۔ یوسف نے فقط تین میچز میں اتنے ڈھیروں رنز بنا لیے۔ ایک اہم ریکارڈ اور ہے۔ عظیم سرڈان بریڈمین نے چھ میچز میں چھ ٹیسٹ سنچریاں بنائی تھیں۔ محمد یوسف نے یہ کارنامہ فقط پانچ ٹیسٹ میچز میں کر دکھایا۔ انہوں نے چار ڈبل سنچریاں بھی بنائیں۔ وہ دنیا کے اکلوتے بلے باز ہیں جو تین مرتبہ 190 تک پہنچ کر آؤٹ ہوا۔

محمد یوسف کچھ اور برس پاکستان کی نمائندگی کر سکتے تھے۔ وہ کپتانی کے بھی حق دار تھے۔ انہیں بورڈ نے کپتان مقرر بھی کیا، مگر پھر حالات نے پلٹا کھایا۔ یہ اعزاز ان سے چھن گیا۔ بعد میں وہ مبصر کے طور پر دکھائی دیے۔ گو وہ متواتر ٹی وی چینلو پر دکھائی دیتے ہیں، مگر اُن کی آراء اور انداز گفتگو میں وہ عظیم کرکٹر کم ہی نظر آتا ہے، جو ہمیں میدانوں میں دکھائی دیا تھا۔

منظر امام

یہ عالمِ رنگ و بو لفظِ کُن سے خلق ہوا، سائنسدانوں نے کہا یہ تو بگ بینگ سے وجود میں آیا۔ اس کرۂ ارض کے وجود میں آتے ہی زندگی نے انگڑائی لی۔ آدمی کا وجود سامنے آیا۔ آدمی نے ہی اس کرۂ ارض کی رنگینی میں اضافہ کیا۔ اس میں ترقی کا اسپ تیز رفتار دوڑایا۔ یہ دنیا ترقی یافتہ دنیا، رنگینیوں، آسائشوں سے بھری دنیا کوئی ایک دن کی کہانی نہیں۔ ہزاروں سال پر محیط کہانی ہے جسے نہایت مختصر مگر جامع انداز میں احاطہ تحریر میں لایا گیا۔

خوش ذوق قارئین کے لیے ایک دلچسپ تحریر کا تیرھواں حصہ

تاریخ کا سفر اپنے اختتام پر ہے۔
یہاں تک آتے آتے بہت کچھ ہو چکا ہے۔ خاص طور پر سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں۔ انسان نے بہت کچھ حاصل بھی کیا ہے اور بہت کچھ کھو بھی دیا ہے۔
سلطنتیں ٹوٹتی بھی رہی ہیں اور بن بھی رہی ہیں۔
موت سستی ہو گئی ہے۔ آتشیں ہتھیار انسانوں کو اب بہت آسانی سے مارنے لگے ہیں۔
ہم نے پچھلی قسط میں 1899ء تک کا جائزہ لیا تھا۔

اب اس سے آگے کا سفر ہے۔ یعنی 1900ء سے 1999ء تک۔

آئیں سب سے پہلے ہم خاص خاص واقعات کو دیکھتے ہیں اس میں ہم خاص خاص لوگوں کا ذکر بھی کریں گے اور بین الاقوامی واقعات کا تذکرہ بھی ہوگا۔

سگمنڈ فرائڈ۔ میکس پلانکھا۔

وائٹ برادران نے ہوائی جہاز تیار کیا۔ آئن اسٹائن نے انسانیت کا نظریہ پیش کیا۔ میزن فورڈ نے ماڈل ٹی متعارف کروایا۔

1910ء۔ روتھر فورڈ نے ایٹمی نیوکلیس دریافت کیا۔

جنگ عظیم اوّل شروع ہوئی۔ خندق میں مورچہ بندی۔ زہریلی گیس اور ٹینک کا استعمال شروع ہوا۔

لینن نے روس انقلاب برپا کیا۔

1920ء کوانٹم میکانکس پر کام ہوا۔

ڈی بروگلی۔ چین برگ۔ شروڈنگر۔ فلیمنگ نے پینسلیس ایجاد کیں۔

1930ء کی پکاسو۔ فرینکلن ڈی روز ویلٹ۔ اسٹالن۔ کینز۔ ہٹلر۔ اہم شخصیات۔

1940ء۔ دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی۔

فری نے اولین نیوکلیئر ری ایکٹر تعمیر کیا۔ عمومی استعمال کے کمپیوٹر بنائے گئے۔ ایٹم بم تیار ہوئے۔ ٹرانزسٹر ایجاد ہوا۔ ماؤزے تنگ۔ اہم شخص قرار پائے۔

1950ء۔ ٹیلی ویژن کا استعمال عام ہوا۔

ہائیڈروجن بم تیار کیا گیا۔ کرک اور واٹسن نے ڈی این اے کی ہیئت دریافت کی۔

1960ء۔

جان ایف کینیڈی نے اپالو منصوبے کا سنگ بنیاد رکھا۔ اپالو دوئم کے ذریعے پہلی بار چاند پر جہاز اترا۔

1970ء۔ ویت نام کی جنگ۔ بیکٹریا میں مصنوعی تخم ریزی کی گئی۔

1980ء۔ گورباچوف۔ اہم شخصیت کے روپ میں سامنے آئے۔

1990ء۔ مشرقی یورپ میں سوویت سلطنت کا اختتام ہوا اور سرد جنگ کا خاتمہ ہوا۔

اب آجائیں 1900ء کی دہائی کی پہلی شخصیت کو دیکھتے ہیں اور وہ ہے سگمنڈ فرائڈ۔

تحلیل نفس کا بانی سگمنڈ فرائڈ موجودہ چیکوسلواکیہ کے ایک قصبے فرائی برگ میں 1856ء کو پیدا ہوا تھا۔

جب وہ چار برس کا تھا تو اس کا خاندان ویانا منتقل ہو گیا جہاں وہ تقریباً ساری عمر رہا۔ اسکول میں فرائیڈ ایک غیر معمولی ذہین طالب علم تھا۔ اس نے طب میں اپنی ڈگری 1881ء میں ویانا یونیورسٹی سے حاصل کی۔ ایک نفسیاتی علاج گاہ کے عملے میں شامل رہا۔

علم الاعصاب (Nevrology) میں پیشہ وارانہ ریاضت کی۔ فرانسیسی ممتاز ماہر اعصاب ژاں چارکوئی کے ساتھ پیرس میں کام کیا۔ اس کی پہلی کتاب ''ہسٹریا'' پر تحقیقی مقالہ تھی۔

1900ء میں خوابوں کی توضیح شائع ہوئی۔ یہ اس کی شاندار اور انتہائی یادگار تحریروں میں شمار ہوتی ہے۔

1908ء میں جب فرائیڈ امریکا میں لیکچر دینے آیا تو وہ خاص و عام میں شہرت حاصل کر چکا تھا۔ 1902ء میں اس نے ویانا میں نفسیاتی موضوعات پر مذاکرے کرنے کے لیے ایک تنظیم بنائی تھی۔ ابتدائی اراکین میں الفریڈ ایڈلر بھی شامل تھا۔

چند سال بعد ان میں کارل یونگ بھی شامل ہوگیا۔ فرائیڈ نے شادی کی بچوں کا باپ بنا۔ زندگی کے آخری برسوں میں اسے کینسر ہوگیا تھا۔ اس کا انتقال 1939ء میں لندن میں ہوا تھا۔

علم نفسیات میں فرائیڈ کے کارنامے اس قدر ہیں کہ انہیں مختصراً بھی بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اس نے انسانی رویے میں لاشعوری ذہنی عوامل کی اہمیت پر سب سے زیادہ زور دیا۔ اس نے ثابت کیا کہ کس طرح یہ عوامل خوابوں کو متاثر کرتے ہیں اور کس طور عمومی نوعیت کی معذوریاں پیدا کرتے ہیں۔ جیسے زبان کی ہکلاہٹ اور ناموں کی فراموشی یا پھر خود ساختہ سانحات حتیٰ کہ بیماریاں بھی۔

اب ان سو برسوں کا ایک اور اہم کردار میک پلانک بھی ہے۔

ہوسکتا ہے کہ بہت سے لوگ اس نام سے واقف ہی نہ ہوں۔

دسمبر 1900ء میں جرمن ماہر طبیعات میکس پلانک نے اپنے ان جرأت مندانہ مفروضات سے سائنس کی دنیا کو چونکا دیا کہ شعاعی توانائی ایک مسلسل بہاؤ کی صورت میں خارج نہیں ہوتی بلکہ چھوٹی چھوٹی قاشوں اور ڈلوں پر مشتمل

ہوتی ہے جنہیں اس نے قدروں (Quantum) کا نام دیا۔

پلانک کا مفروضہ روشن اور برقی مقناطیسیت کے کلاسیکی نظریات کا استرداد تھا۔ یہ تھاویری (Quantum) نظریات کے لیے نقطۂ آغاز کی حیثیت رکھتا ہے جنہوں نے طبیعات میں انقلاب برپا کیا۔

پلانک جرمنی کے شہر کیل میں 1858ء میں پیدا ہوا۔ اس نے برلن اور میونخ کی یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کی۔ اکیس برس کی عمر میں میونخ یونیورسٹی سے طبیعات میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔

کچھ عرصہ وہ میونخ یونیورسٹی اور پھر کیل یونیورسٹی میں بھی پڑھتا رہا۔ 1909ء میں وہ برلن یونیورسٹی میں پروفیسر بن گیا۔ جہاں وہ 1928ء میں اپنی ریٹائرمنٹ تک رہا۔

نازیوں کے خلاف پلانک کے خیالات نے اسے ہٹلر کے دور میں شدید خطرے سے دوچار کیا۔ 1945ء میں ہٹلر کو قتل کرنے کی فوجی افسروں کی ناکام سازش میں شمولیت کی بنیاد پر اس کے بیٹے کو قتل کر دیا گیا۔

اس کی وفات 1947ء میں ہوئی تھی۔

متعاویری میکانیات کا نظریہ بیسویں صدی کا اہم ترین سائنسی پیش رفت شمار ہوتا ہے۔

رائٹ برادرز۔ ویلی رائٹ اور دلبر رائٹ۔

دلبر رائٹ 1867ء میں انڈیانا میں پیدا ہوا۔ ویلی وائٹ 1871ء میں اوہیو کے مقام پر پیدا ہوا۔

دونوں لڑکوں نے اسکول کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ تاہم کوئی ایک بھی ڈپلومہ حاصل نہ کر سکا۔ دونوں بھائیوں میں میکانکس کا خداداد جوہر موجود تھا۔ دونوں ہی کو انسان کے پرواز کے موضوع سے دلچسپی تھی۔ 1892ء میں انہوں نے سائیکل بیچنے، مرمت کرنے اور تیار کرنے کی دکان کرلی۔ اس سے انہیں اپنی ہوابازی سے متعلق تحقیقات کرنے میں مالی مدد ملی۔

1899ء میں انہوں نے خود ہوابازی کے موضوع پر کام شروع کیا۔ دسمبر 1903ء تک چار سال کی محنت کے بعد آخر کار وہ کامیابی سے ہمکنار ہوئے۔

دونوں بھائیوں میں بے پناہ ذہنی موافقت تھی۔ اس لیے دونوں مل کر کام کرتے رہے اور کامیاب ہوئے۔ رائٹ برادران نے پہلے گلائیڈر اڑانا سیکھا۔

انہوں نے 1899ء میں گلائیڈروں اور پتنگوں سے آغاز کیا۔ اگلے برس وہ ایک بڑے حجم کا گلائیڈر شمالی کیرولینا میں کٹ پاک کے مقام پر لائے لیکن یہ قابلِ اطمینان نہیں تھا۔ 1901ء میں دوسرا بڑا گلائیڈر تیار کر کے اڑایا۔

1902ء میں تیسرا اڑایا اور یہی گلائیڈر ان کی کامیابی اور جنون کے لیے سنگِ میل ثابت ہوا۔ تیسرے گلائیڈر میں انہوں نے ہزاروں سے زیادہ کامیاب پروازیں کیں۔ اپنا طاقت ور ہوائی جہاز تیار کرنے سے پہلے وہ دنیا کے بہترین اور کہنہ مشق ہواباز بن چکے تھے۔

اس کے لیے تجربات کا دور شروع ہوا۔ ہزاروں قسم کے پر اور انجن ڈیزائن کیے۔ ان کو بہت باریکی سے دیکھا گیا۔ بالآخر وہ اپنی مرضی کا جہاز تیار کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ پہلی اڑان کا واقعہ شمالی کیرولینا میں کیٹی پاک کے مقام پر 17 دسمبر 1903ء میں رونما ہوا۔ اس روز دونوں بھائیوں نے دو دو پروازیں کیں۔

انہوں نے اس جہاز کا نام فلائر ون رکھا تھا۔ اس کے بعد ان کی کامیاب پروازوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

دلبر وائٹ اپنے ایک جہاز میں بیٹھ کر امریکا سے فرانس پہنچ گیا اور اس طرح انسانی پروازوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

دلبر وائٹ کا انتقال 1912ء میں ہوا جب کہ ویلی رائٹ کا انتقال 1948ء میں ہوا تھا۔

1900ء کی ایک اور اہم شخصیت جس سے پوری دنیا واقف ہے۔ وہ ہے آئن اسٹائن۔

آئن اسٹائن 1879ء میں جرمنی کے الم شہر میں پیدا ہوا۔ سوئٹزرلینڈ میں اس نے میٹرک کیا۔ 1900ء میں وہ اس ملک کا شہری بن گیا۔

زیورچ یونیورسٹی سے 1905ء میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ 1913ء میں اسے برلن یونیورسٹی میں پڑھانے کی نوکری مل گئی۔ 1921ء میں اس نے نوبیل پرائز حاصل کیا۔ انہیں بقیہ نصف زندگی کے دوران آئن اسٹائن کو عالم گیر شہرت حاصل ہوگئی۔

وہ دنیا کا سب سے مقبول سائنس دان تصور کیا جاتا ہے۔ وہ چونکہ یہودی تھا اس لیے ہٹلر کے زیرِ عتاب آگیا۔ 1931ء میں وہ نیو جرسی امریکا چلا گیا۔ 1955ء میں پرنسٹن میں اس کی موت ہوگئی۔

آئن اسٹائن کی وجۂ شہرت اس کا نظریہ اضافیت ہے۔

آئن اسٹائن کا کشش ثقل کا نظریہ بھی کہا جاتا ہے۔
اس صدی کا ایک اور قابلِ ذکر شخص ہنری فورڈ تھا۔
یہ معروف صنعت کار کسی بھی دوسرے فرد کی نسبت جدید صنعت سازی میں کثیر پیداوار کے نت نئے طریقے متعارف کروائے۔
فورڈ مشی گن میں ڈیئر بورن کے مقام پر پیدا ہوا۔ وہ پرائمری اسکول سے زیادہ نہ پڑھ سکا۔ ابتدائی تعلیم کے بعد وہ ایک مشین ساز کے یہاں ملازم ہوگیا۔ وہ ابھی نوجوان ہی تھا۔ جب 1885ء میں کارل بنز اور گوٹیب ڈیملر نے اپنی موٹر گاڑیاں ایجاد کیں اور انہیں فروخت کرنا شروع کردیا۔
فورڈ کو ان میں دلچسپی محسوس ہوئی۔ 1846ء تک اس نے اپنے نقشے کے مطابق ایک موٹر گاڑی تیار کی لیکن اس کی ابتدائی دو کاوشیں ناکام ہوگئیں۔
تاہم وہ مایوس نہیں ہوا۔ 1903ء میں اس نے پھر کوشش کی۔ اپنی تیسری کاوش یعنی ''فورڈ موٹر کمپنی'' کے ذریعے اسے دولت، شہرت حاصل ہوئی۔
اس کے ابتدائی نمونے اپنی عمدہ کارکردگی کے باوجود بڑے مقاصد حاصل نہ کرسکے تھے لیکن اس کا معروف ماڈل ٹی جو 1908ء میں متعارف ہوا۔ انتہائی کامیاب رہا۔ یہ تب تک بنائی جانے والی کاروں میں سب سے بہتر تھا۔
یہ موٹر 15 ملین سے زیادہ تعداد میں فروخت ہوئی۔
فورڈ بے پناہ ذہین آدمی تھا۔ وہ کاروبار جانتا تھا۔ اس نے مزدوروں کی سہولت کے لیے بے شمار اوزار بنائے۔ جن سے پیداوار میں اضافہ ہوتا چلا گیا اور خود فورڈ دنیا کا امیر ترین انسان بن گیا۔ اس کا انتقال 1947ء میں ہوا تھا۔
پہلی جنگِ عظیم کا آغاز 1914ء کو ہوا جو 1918ء تک جاری رہی۔ یہ جنگ جرمن کے ولیم ثانی نے شروع کی تھی۔
برطانیہ مصر کو اپنا محرومہ ملک قرار دے دیتا ہے۔
ایران پر برطانوی اور روسی فوجیں قبضہ کرلیتی ہیں۔
اس جنگ میں مہلک حربے استعمال کیے جاتے ہیں۔ خندقوں میں مورچے بنائے جاتے ہیں اور زہریلی گیس کا استعمال ہوتا ہے اس جنگ کے اثرات عرصے تک محسوس کیے جاتے رہے۔
1930ء کی دہائی میں عظیم مصور پکاسو سامنے آیا۔
پکاسو کو تجریدی آرٹ کا بانی کہا جاتا ہے۔
1900ء کے دورانیے کا ایک اور اہم کردار جوزف اسٹالن بھی ہے۔
آئیں ذرا جوزف اسٹالن پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔
اسٹالن کا اصل نام چونکہ بہت طویل ہے۔ اس لیے اسے صرف اسٹالن لکھا جارہا ہے۔ وہ جارجیا کے قصبے لوگوں میں 1879ء میں پیدا ہوا۔
اس کی مادری زبان جارجین تھی۔ یہ روسی زبان سے خاصی مختلف ہے جسے اس نے بعد میں سیکھا۔
اسٹالن کی پرورش غریب ماحول میں ہوئی۔ اس کا باپ ایک شرابی انسان تھا اور بیٹے کو بے تحاشا مارتا تھا۔ وہ گیارہ برس کا تھا جب اس کا باپ چل بسا۔
ایک کلیسائی مدرسے میں تعلیم حاصل کی۔ 1899ء میں اسے اس کے خیالات کی وجہ سے نکال دیا گیا۔ وہ مارکس تحریک میں شامل ہوگیا۔ پھر جب تنظیم میں نفاق ہوا تو وہ بالشویک دھڑے کا حامی بن گیا۔
وہ کئی بار گرفتار ہوا۔ سزائیں ہوئیں۔ وہیں سے فرار ہوا۔
1924ء میں لینن کی وفات کے بعد اس کی کامیابیاں شروع ہوتی ہیں۔ 1930ء کی دہائی میں وہ سوویت یونین کا مطلق العنان آمر بن چکا تھا۔
آمر بن جانے کے بعد اس کی خوفناکیوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اس نے چن چن کر اپنے مخالفین کو قتل کروا دیا۔
اسٹالن کی معاشی پالیسیاں انتہائی جابرانہ تھیں۔ کسانوں نے ان کی مخالفت کی۔ مزدوروں نے احتجاج کیا۔
1930ء کی دہائی میں اسٹالن کے فرمان کے تحت لاکھوں مزدوروں کو مار دیا گیا یا فاقوں سے وہ خود مر گئے۔
وہ ایک بے رحم اور سفاک انسان تھا۔
5 مارچ 1953ء کو یہ آمر ماسکو میں فوت ہوا۔ اس کی لاش کو محفوظ کرلیا گیا اور اعزاز کے ساتھ ریڈ اسکوائر کے عجائب گھر میں لینن کی میت کے برابر عوامی نمائش کے لیے رکھ دیا گیا۔ بعد کے سالوں میں اسٹالن کی توقیر میں بڑی تیزی سے کمی آئی۔ جب کہ آج کل اس سے نفرت کا اظہار کیا جاتا ہے۔
اب اس عہد کی ایک اور شخصیت ہٹلر، جس کا نام مثال

بن کر رہ گیا ہے۔ جب کسی کو اس کے بے رحم مزاج کے حوالے سے یاد کیا جاتا ہے تو اسے ہٹلر کہا جاتا ہے۔

ایڈولف ہٹلر آسٹریا کے شہر براؤنا میں 1889ء میں پیدا ہوا۔ نوجوانی میں اس نے اپنی عملی زندگی کا آغاز ایک مصور کی حیثیت سے کیا کہ بعد میں وہ ایک پُرجوش جرمن قومیت پسند بن گیا۔

جنگ عظیم اوّل میں وہ جرمن فوج میں بھرتی ہوا۔ جنگ میں زخمی ہوا اور شجاعت کے مظاہرے پر میڈل ملے۔

جرمنی کی شکست نے اسے صدمہ پہنچایا۔ 1919ء میں جب وہ تیس برس کا تھا تو وہ میونخ کی ایک دائیں بازو کی جماعت میں شامل ہو گیا۔ جس نے اپنا نام بدل کر مختصراً نازی کرلیا۔ اگلے دو برسوں میں ہٹلر اس کا غیر متازعہ قائد بن گیا تھا۔

جنوری 1933ء میں کئی نشیب و فراز سے گزرنے کے بعد ہٹلر جرمن کا چانسلر بن گیا۔ چانسلر بننے کے لیے اس نے اپنے تمام مخالفین کو مقدمات کے بعد یا تو قید کرلیا یا ٹھکانے لگا دیا۔

اس کے بعد اس کی فتوحات کا سلسلہ شروع ہو گیا جو دوسری جنگِ عظیم کا سبب بن گیا۔ اس جنگ نے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

روس، انگلستان، فرانس، جاپان، امریکا سب کے سب الجھ پڑے تھے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ اس جنگ میں ایک کروڑ کے قریب افراد ہلاک ہوئے تھے۔

تاریخ اسے ایک بے رحم ترین آمر کی حیثیت سے یاد رکھتی ہے۔

30 اپریل 1945ء کو ہٹلر نے ناکامی کے بعد خودکشی کرلی تھی۔

اب آجائیں اس عہد کی ایک اور شخصیت کی طرف۔ جس کا تعلق چین سے تھا۔ میری مراد ماؤزے تنگ سے ہے۔ عام طور پر اسے ماؤ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

وہ ایک آسودہ حال کسان کے گھر ہرکان صوبے میں شازستان کے قبضے میں 1893ء میں پیدا ہوا۔ 1911ء میں جب وہ اٹھارہ سالہ طالب علم تھا۔ چنگ خاندان کی بادشاہ کے خلاف بغاوت نے سر اٹھایا۔

یہ خاندان سترہویں صدی سے ملک پر حکمران تھا۔ چند ماہ کی بغاوت میں شاہی حکومت کا تخت الٹ دیا گیا۔ چین ایک جمہوری ریاست بن گیا۔

پرسشِ احوال

اس حالیہ دورہ میں ہمیں امرتسر میں ایک ہوٹل میں ٹھہرایا گیا تھا لیکن لدھیانہ اور چنڈی گڑھ میں یونیورسٹیوں کے گیسٹ ہاؤسوں کے کمروں میں رکھا گیا۔ یہ بات تو بہرحال خوش آیند ہے کہ ان یونیورسٹیوں نے مہمان خانے بنا کے ملک اور بیرونِ ملک سے آنے والوں کی مہمان نوازی کا اہتمام کر رکھا ہے لیکن ان مہمان خانوں کے کمروں کی حالت دیکھ کر ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ علمی مشاغل میں مصروفیت کی وجہ سے ان اداروں کی انتظامیہ کو یہ کمرے رہائش کے قابل بنانے کی فرصت ہی نہیں ملی۔ مثلاً لدھیانہ اور امرتسر کے مہمان خانوں کے ان کمروں میں صابن اور تولیہ نہیں ہے۔ ہم ایک روز صبح نہانے کے لیے غسل خانے میں گئے تو دروازہ بند کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ تولیہ نہیں ہے۔ ہم نے نہانے کا ارادہ ترک کر کے منہ دھونے پر اکتفا کیا مگر جہاں منہ دھونے میں دو منٹ لگتے وہاں اسے سکھانے میں دس منٹ لگ گئے۔ ویسے بھی ہمیں منہ دھونا ہمیشہ ہی سے مشکل نظر آتا ہے۔ اس لیے ہم عمر بھر منہ دھونے کی بجائے نہانے کو ترجیح دیتے رہے ہیں۔ ہمارا مشورہ ان دوستوں کے لیے یہ ہے کہ مسلمانوں کو بلانے اور ان کو وہاں ٹھہرانے سے پہلے مہمان خانوں کو بھی ٹھیک کرلیں تو بہتر ہے۔ ابن انشا مرحوم جس حوائج کو غیر ضروری تصور کرتے ہیں ان سے فراغت کا انتظام بھی ان کمروں میں خاصا غیر تسلی بخش تھا۔

اقتباس: کالم حمید اختر

مرسلہ: قدیر رانا۔ راولپنڈی

بدقسمتی سے انقلابی رہنما ایک مستحکم اور متحد حکومت قائم کرنے کے اہل نہیں تھے۔ لہٰذا خانہ جنگی کا ایک طویل دور شروع ہوگیا جو 1949ء تک جاری رہا۔

1920ء تک ماؤ ایک کٹر مارکسٹ بن گیا۔ 1921ء میں وہ چین کی اشتراکیت پسند تنظیم کے بارہ بانی رہنماؤں میں شامل تھا۔

1935ء میں وہ تنظیم کا سربراہ بن گیا۔

1935ء کے بعد ماؤ کی قیادت میں جماعت کی طاقت میں بتدریج اضافہ ہوا۔ 1947ء تک یہ قومیت پسند حکومت کے خلاف جس کا سربراہ چیانگ کائی شیک تھا ایک مکمل جنگ لڑنے کو تیار تھا۔

1949ء میں ان کی فوجوں نے فتح حاصل کی۔ جماعت کے سربراہ کی حیثیت سے ماؤ کو چین کی قیادت سونپی گئی۔ ماؤ کا اصل کام تو اب شروع ہوا تھا۔

اس کی وفات 1976ء میں ہوئی تھی اور اس عرصے میں اس کی پالیسیوں نے چین کی حالت کو بدل کر رکھ دیا اور اسی کی پالیسیوں کا نتیجہ ہے کہ چین آج دنیا کی ایک عظیم قوت کے طور پر سامنے ہے۔

ان سو برسوں میں اور بھی کئی واقعات رونما ہوئے۔ کئی عظیم کردار سامنے آئے۔ جیسے قائداعظم محمد علی جناح، مہاتما گاندھی وغیرہ لیکن ان کا ذکر برصغیر کے حوالے سے آگے آئے گا۔

اب ہم مجموعی طور پر پوری اسلامی دنیا کے حالات کا جائزہ لیتے ہیں۔

1900ء سے 1999ء تک ایک لمبی چوڑی فہرست ہے لیکن ان کا ذکر اس لیے ضروری ہے کہ آپ سو برسوں کے حالات سے واقف ہو جائیں اور جو خاص خاص کردار سامنے آتے جائیں گے ان کا ذکر کر دیا جائے گا۔

1901ء۔ ایران میں تیل دریافت ہوا اور برطانویوں کو رعایت دے دی گئی۔

1903-14ء تک۔ برطانویوں کے بنگال کو تقسیم کرنے سے خوف پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو تقسیم کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

1906ء۔ اس خوف سے فرقہ وارانہ بے چینی پیدا ہوتی ہے اور مسلم لیگ کا قیام عمل میں آتا ہے۔

1905ء۔ مصری ریفارمر محمد عبدی وفات پا جاتے ہیں۔

محمد عبدی کا زمانہ 1849ء سے 1905ء تک کا ہے۔

یہ ایک مصری مصلح تھے۔ جنہوں نے ملک کو متحد کرنے اور مسلمانوں کو نئے مغربی تصورات کے سمیٹنے کا اہل بنانے کے لیے اسلامی اداروں کو جدید بنانے کی کوشش کی۔

1906ء۔ ایران میں ایک دستوری انقلاب شاہ کو مجبور کرتا ہے کہ وہ دستور کا اعلان کرے اور ایک مجلس قائم کرے۔ تاہم ایک انگریز روسی معاہدہ (1907ء) اور شاہ کی طرف سے روسی حمایت کے ساتھ ہونے والا انقلاب دستور کو منسوخ کر دیتا ہے۔

1908ء۔ نوجوان ترکوں کا انقلاب سلطان کو دستور کی بحالی پر مجبور کر دیتا ہے۔

1914ء سے 1918ء۔ پہلی عالمی جنگ۔

1916ء سے 1921ء۔ عرب برطانویوں کے اشتراک سے عثمانیوں کے خلاف بغاوت کر دیتے ہیں۔

1917ء۔ برطانیہ فلسطین میں یہودی وطن کے قیام کے لیے باقاعدہ تائید و حمایت مہیا کرتا ہے۔

1919ء۔ 1921ء۔ اتاترک (مصطفیٰ کمال) ترک جنگ آزادی۔ اتاترک یورپی طاقتوں کے خلیج میں روکے رکھنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور ایک آزاد ترک ریاست قائم کرتا ہے۔ سیکولر اور جدیدیت پسندانہ انقلابی پالیسی اختیار کرتا ہے۔

1920ء سائکس پیکاٹ معاہدے کی اشاعت۔

پہلی عالمی جنگ میں عثمانی سلطنت کی شکست کے بعد .... اس کے صوبہ جات برطانیہ اور فرانس میں تقسیم کر دیے جاتے ہیں۔

1920ء سے 1922ء۔ گاندھی برطانوی حکمرانی کے خلاف عوامی نافرمانی کی دو مہمات کے ذریعے ہندوستان کے عام لوگوں کو متحرک و بے دار کرتا ہے۔

موہن داس کرم چند گاندھی (1869ء سے 1948ء تک)۔ خود مختار ہندوستان کی تحریک کا سب سے بڑا رہنما۔

گاندھی کی بنیادی اہمیت اس کا اہنسا کی پالیسی پر اصرار تھا لیکن یہ پالیسی صرف زبانی رہی۔ ہندوستانی حکومتوں نے اس کی نہ تو پرواہ کی اور نہ ہی کبھی اس پر عمل کیا۔

1954-55ء میں پرتگیزیوں سے گوا خالی کرا لیا

گیا۔ اس کے علاوہ ہندوستان نے پاکستان سے تین اور چین سے ایک سرحدی جنگ کی۔

اور آج بھی کشمیر پر ہندوستان کی پالیسی اور سرحدوں پر آئے دن کی فائرنگ یہ صاف بتا رہی ہے کہ گاندھی کی اہنسا کی پالیسی کہاں ہے۔

1921ء۔ رضا خان ایران میں ایک کامیاب انقلاب کی قیادت کرتا ہے اور پہلوی عہد حکومت کی بنیاد رکھتا ہے۔

1922ء۔ مصر کو رسماً آزادی مل جاتی ہے۔ تاہم برطانیہ دفاع، خارجہ پالیسی اور سوڈان پر اپنا کنٹرول برقرار رکھتا ہے۔ 1923ء سے 1930ء تک مقبول عام وفد پارٹی تین قانونی انتخابی فتوحات حاصل کرتی ہے لیکن ہر مرتبہ اسے یا تو برطانیہ یا بادشاہ مستعفی ہونے پر مجبور کردیتے ہیں۔

1932ء۔ مملکتِ سعودی عرب قائم کی جاتی ہے۔

1935ء۔ مصر میں سلفیہ تحریک کے بانی اور ریفارمر راشد رضا کی وفات۔

1938ء۔ علامہ اقبالؒ کی وفات ہوجاتی ہے۔

1939ء۔ 1945ء۔ دوسری عالمی جنگ، برطانوی رضا شاہ کو معزول کردیتے ہیں جس کا جانشین ان کے بیٹے محمد رضا کو بنایا جاتا ہے۔

1940ء کی دہائی۔ اخوان المسلمون مصر میں سب سے زیادہ مضبوط سیاسی قوت بن جاتی ہے۔

1945ء۔ ترکی اقوام متحدہ میں شامل ہو جاتا ہے اور ایک کثیر جماعت ریاست بن جاتا ہے۔

1947ء عرب لیگ کی تشکیل۔

1946ء۔ ہندوستان میں فرقہ وارانہ فسادات کے بعد مسلم لیگ ایک الگ ریاست کے لیے تحریک شروع کردیتی ہے۔

1947ء۔ مسلم اکثریت والے علاقوں پر مشتمل پاکستان وجود میں آجاتا ہے۔ ہندو مسلم فسادات، بے شمار لوگ مارے جاتے ہیں۔

1948ء۔ اقوام متحدہ کے ایک اعلامئے کے نتیجے میں فلسطین میں برطانوی اقتدار ختم ہو جاتا ہے اور یہودی ریاست اسرائیل وجود میں آتی ہے۔

یہودی فوجیں پانچ عرب ملکوں کی فوجوں کو شکست دیتی ہیں۔ یہودیوں کے ظلم وستم کی وجہ سے ساڑھے سات لاکھ فلسطینی ملک چھوڑ دیتے ہیں۔ بعد میں انہیں واپس آنے کی اجازت بھی نہیں ملتی۔

1951ء سے 1953ء۔ محمد مصدق اور قومی محاذ ایرانی تیل کو قومیا لیتے ہیں۔ شاہ مخالف مظاہروں کے بعد شاہ ایران سے فرار ہوجاتا ہے مگر سی آئی اے اور برطانوی انٹیلی جنس کے منظم کردہ انقلاب کے بعد واپس آجاتا ہے اور تیل کی یورپی کمپنیوں کے ساتھ نئے معاہدے عمل میں آتے ہیں۔

1952ء۔ مصر میں جمال عبدالناصر کی قیادت میں آزاد افسران کے انقلاب میں شاہ فاروق کو معزول کردیا جاتا ہے۔

ناصر اخوان المسلمون پر جبر کرتا ہے اور ہزاروں اخوانوں کو عقوبت خانوں میں بند کردیا جاتا ہے۔

1954ء۔ الجیریا میں سیکولر نیشنل لبریشن فرنٹ فرانسیسی نوآبادیاتی حکمرانی کے خلاف انقلاب کی قیادت کرتا ہے۔

1956ء۔ پاکستان کا پہلا آئین منظور کیا جاتا ہے۔

جمال عبدالناصر نہر سوئز کو قومیا لیتے ہیں۔

1957ء۔ ایران میں شاہ محمد رضا پہلوی امریکی سی آئی اے اور اسرائیلی موساد کی مدد سے خفیہ پولیس ساواک کی بنیاد رکھتا ہے۔

1958ء سے 1969ء۔ پاکستان میں جنرل محمد ایوب خان کی حکومت۔

1961ء۔ شاہ ایران محمد رضا شاہ پہلوی جدیدیت پذیری کے سفید انقلاب کا اعلان کرتا ہے۔ جس میں مذہب کو محدود کردیا جاتا ہے اور ایرانی معاشرے کے اندر تقسیم واقع ہوتی ہے۔

1963ء۔ این ایل ایف الجیریا میں سوشلسٹ حکومت قائم کردیتا ہے۔

ایران میں آیت اللہ خمینی پہلوی شہنشاہی پر تنقید کرتے ہیں۔ پورے ایران میں عوامی مظاہرے کرواتے ہیں۔ انہیں پہلے قید کردیا جاتا ہے۔ پھر جلاوطن کر کے عراق بھیج دیا جاتا ہے۔

1966ء۔ مصر میں ناصر ممتاز مصری بنیاد پرست سید قطب کو سزا کا حکم دیتا ہے۔

1967ء۔ اسرائیل اور اس کے عرب پڑوسیوں کے درمیان چھ روزہ جنگ ہوتی ہے۔ اسرائیل کی فتح اور

عربوں کی شکست کی وجہ سے پورے مشرقِ وسطیٰ میں مذہبی احیاد رونما ہوتا ہے۔ چونکہ سیکولر پالیسیاں ناقابلِ اعتبار دکھائی دیتی ہیں۔

1970ء۔ ناصر کی وفات۔ انوار السادات اس کا جانشین بنتا ہے۔ وہ مصری اسلام پسندوں کی حمایت اور تائید حاصل کرنے کے لیے انہیں حکومت میں شامل کرتا ہے۔

1971ء۔ شیخ احمد یاسین مجاسلہ (کانگریس) کے نام سے ایک فلاحی تنظیم قائم کرتے ہیں اور فلسطین کا ایک اسلامی تشخص حاصل کرنے کے لیے پی ایل او کی سیکولر قوم پرستی کے خلاف مہم چلاتے ہیں۔

1971ء۔ پاکستان اور ہندوستان کے درمیان جنگ، بنگلہ دیش کا قیام۔

1971-7ء۔ پاکستان کے وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو ایک بائیں بازو کی سیکولر حکومت قائم کرتے ہیں مگر یہ اقدامات تسلی بخش نہیں ہوتے۔

1973ء۔ مصر اور شام اسرائیل پر حملہ کردیتے ہیں اور جنگ کے میدان میں ایسی پُراثر کارکردگی دکھاتے ہیں جو سادات کو 1978ء میں کیمپ ڈیوڈ میں امن معاہدہ کرنے کی حیثیت دلا دیتی ہے۔

1977-88ء۔ پاکستان میں ضیاء الحق ایک کامیاب انقلاب کی قیادت کرتے ہیں اور ایک اسلامی حکومت قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر پھر بھی وہ حقیقی سیاست سے مذہب کو الگ رکھتے ہیں۔

1978-79ء۔ انقلاب ایران، آیت اللہ خمینی اسلامی جمہوریہ کے اعلیٰ ترین فقیہہ بن جاتے ہیں۔ روس، افغانستان پر حملہ کردیتا ہے۔ اس کی تفصیل بعد میں آئے گی۔

پاکستان میں ابوالاعلیٰ مودودی کا انتقال ہوجاتا ہے۔ آپ جماعت اسلامی کے بانی اور ایک مفکر تھے۔

اسی دوران بہت سے بنیاد پرست مکہ میں کعبہ پر قبضہ کرلیتے ہیں اور اپنے لیڈر کے مہدی ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ ریاست ان کا قبضہ ختم کرنے میں کامیاب ہوجاتی ہے۔

1979-81ء۔ تہران میں امریکی سفارت خانے میں امریکی یرغمالیوں کو قیدی بنالیا جاتا ہے۔

1981ء۔ صدر انوار السادات کو مسلمان انتہا پسند قتل کردیتے ہیں جو مصری لوگوں کے ساتھ ان کے غیر منصفانہ برتاؤ اور جبر کے خلاف ہیں۔ اس کے علاوہ انہیں اسرائیل کے ساتھ معاہدہ امن بھی گوارا نہیں ہے۔

1987ء۔ مغربی کنارے اور غزہ کی پٹی پر اسرائیلی قبضے کے خلاف فلسطینیوں کے عوامی احتجاجی مظاہرے شروع ہوجاتے ہیں .... ایک ذیلی تنظیم حماس اب پی ایل او کی مخالفت کے ساتھ ساتھ اسرائیل کی مخالفت بھی شروع کردیتی ہے۔

1989ء۔ آیت اللہ خمینی برطانوی مصنف سلمان رشدی کے ناول "شیطانی آیات" میں حضرت محمدؐ کی توہین آمیز تصویر کشی کے خلاف فتویٰ جاری کرتے ہیں کہ سلمان رشدی واجب القتل ہے لیکن ایک ماہ بعد اسلامی کانفرنس کے 49 ارکان میں سے 48 اس فتوے کو غیر اسلامی قرار دے دیتے ہیں۔

آیت اللہ خمینی کی وفات کے بعد آیت اللہ خامنہ ای ایران کے اعلیٰ ترین فقیہہ بن جاتے ہیں اور رفسنجانی صدر ہو جاتے ہیں۔

1990ء۔ الجیریا کے مقامی انتخابات میں اسلامی محاذ آزادی (ایف آئی ایس) سیکولر ایف ایل این کے خلاف زبردست کامیابی حاصل کرلیتا ہے۔

1992ء کے قومی انتخابات میں ان کی فتح یقینی دکھائی دینے لگی ہے۔

1991ء۔ صدر صدام حسین کویت پر حملہ کردیتے ہیں۔ اس کے جواب میں امریکا اور اس کے مغربی اور مشرقِ وسطیٰ کے اتحادی عراق کے خلاف آپریشن ڈیزرٹ اسٹارم شروع کرتے ہیں۔

1992ء۔ الجیریا میں فوج ایف آئی ایس کے اقتدار میں آنے سے روکنے کے لیے انقلاب بپا کرتی ہے اور تحریک کو دبا دیتی ہے اس کے نتیجے میں زیادہ انقلابی ارکان ایک ہولناک دہشت گردانہ مہم کا آغاز کرتے ہیں۔

ایودھیا میں ہندو جماعت بی جے پی کے ارکان بابری مسجد کو شہید کردیتے ہیں۔

1992-99ء۔ سرب اور کروٹ قوم پرست منصوبہ بندی کے ساتھ بوسنیا اور کوسوو کے باسیوں کو قتل اور گھروں کو چھوڑنے پر مجبور کرتے ہیں۔

1993ء۔ اسرائیل اور فلسطین معاہدہ اوسلو پر دستخط کرتے ہیں۔

1994ء۔ جبران کی ایک مسجد میں ایک یہودی انتہا

احادیثِ مبارکہ

☆ شرک کے بعد بدترین گناہ کسی انسان کو تکلیف پہنچانا ہے۔
☆ جس کو مسلمان کا غم نہ ہو، وہ میری امت میں سے نہیں۔
☆ تم اپنے بھائی کی مدد کرو، خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم، مظلوم کی مدد ظالم سے اس کو چھڑانا اور ظالم کی مدد اس کو ظلم سے باز رکھنا ہے۔
☆ جو شخص سلام سے پہلے بات کرے اس کا جواب مت دو، جب تک پہلے سلام نہ کر لے۔
☆ جو اللہ تعالیٰ اور قیامت پر ایمان رکھتا ہے، اسے کہہ دو کہ پڑوسی کی تکریم کرے۔
☆ سخی اللہ سے قریب ہے، جنت سے قریب ہے، لوگوں سے قریب ہے اور آگ سے دور ہے۔
☆ تین باتوں میں دیر نہ کرو، نماز میں جب اس کا وقت ہو جائے، جنازے میں جب تیار ہو جائے اور بیوہ کے نکاح میں جب اس کا جوڑ مل جائے۔

پسند کے ہاتھوں 29 مسلمانوں کے قتل کے بعد حماس کے خودکش بمبار اسرائیل میں یہودیوں کو نشانہ بناتے ہیں۔

اوسلو معاہدے پر دستخط کرنے کی وجہ سے ایک یہودی انتہا پسند صدر اسحاق رابن کو قتل کر دیتا ہے۔ افغانستان میں طالبان بنیاد پرست اقتدار میں آجاتے ہیں۔

1997ء۔ لبرل حجۃ الاسلام سید خاتمی انتخابات میں زبردست کامیابی حاصل کرتے ہوئے ایران کے جمہور منتخب ہو جاتے ہیں۔

اب ہم ان جائزوں کے بعد پاکستان کی طرف آتے ہیں اور یہ دیکھتے ہیں کہ برصغیر میں سن 1900ء سے 1999ء تک کیا کچھ واقعات رونما ہوتے رہے۔

1947ء میں قیام پاکستان کے بعد ہماری توجہ پاکستان کی طرف ہو جائے گی۔

اب جو ہم جائزہ لے رہے ہیں اس سے اندازہ ہو جائے گا کہ قیام پاکستان کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی۔

یہ جائزہ بھرپور لیا ہے اور پاکستان کے حوالے سے مکمل ہے۔

1900ء میں ہندوؤں میں ایک فرقہ پرست جماعت بھارت سیوا منڈل کے نام سے قائم ہوئی۔ اس کے اجلاس ہر سال منعقد ہونے لگے۔

1900ء میں یو پی کے گورنر میکڈانل نے جو اردو دشمنی کے لیے مشہور تھا۔ ہندی زبان کو عدالتوں میں رائج کر دیا۔

1906ء میں لاکھوں کے اجلاس میں بھارت سیوا منڈل کا نام ہندو مہا سبھا کر دیا گیا جو مسلمانوں کے جائز مطالبات کی بھی مخالفت کرتی تھی۔

گاؤ کشی کی تحریک کو ہندوؤں نے اتنی اہمیت دی کہ جگہ جگہ اس کی انجمنیں قائم ہو گئیں اور کئی مقامات پر فسادات بھڑک اٹھے۔

1902ء میں لارڈ کرزن کے سامنے بنگال کے دو صوبے بنانے کی تجویز پیش ہوئی۔ کیونکہ بنگال بہت بڑا صوبہ تھا۔ مشرقی بنگال اور مغربی بنگال۔

1904ء میں عوامی ردِعمل کا جائزہ لینے کے لیے لارڈ کرزن نے مشرقی بنگال کا دورہ کیا اور مسلمان رہنماؤں سے ملاقاتیں کیں۔

1905ء فروری۔ لارڈ کرزن نے تقسیم بنگال کے منصوبے کے تمام عملی پہلوؤں کا جائزہ لینے کے بعد اسے حتمی منظوری کے لیے برطانیہ بھیج دیا اور 1905ء ہی میں تقسیم بنگال کا رسمی طور پر اعلان بھی کر دیا گیا۔

16 اکتوبر 1905ء میں بنگال کو مشرقی اور مغربی بنگال میں تقسیم کر دیا گیا۔ مشرقی بنگال ڈھاکا، چٹاگانگ، راجشاہی، کھلنا، سلہٹ اور آسام کے کچھ علاقوں پر مشتمل تھا۔ دارالحکومت ڈھاکا قرار پایا جب کہ مغربی بنگال کا کلکتہ۔

ہندوؤں نے اس پر ایک ہنگامہ برپا کر دیا۔ مار دھاڑ اور توڑ پھوڑ شروع ہو گئی۔ فسادات ہونے لگے۔

اگست 1906ء۔ وائسرائے ہند لارڈ منٹو نے اعلان کیا کہ ہندوستان میں بہت جلد آئینی اصلاحات کا نفاذ کیا جائے گا۔

مسلمانوں نے ضروری سمجھا کہ وہ بھی لارڈ منٹو سے ملاقات کر کے اپنا مؤقف پیش کریں۔ نواب محسن الملک نے مسلمان رہنماؤں سے رابطے کیے۔ ستمبر 1906ء میں لکھنو میں ایک اجلاس منعقد ہوا۔ اکتوبر 1906ء کو سر آغا خان سوئم کی قیادت میں ایک 35 رکنی وفد شملہ پہنچا۔ اس میں

ہندوستان بھر کے مسلمانوں کی نمائندگی تھی۔ چند لوگوں کے نام یہ ہیں۔ سر آغا خان سوئم۔ نواب محسن الملک، صاحب زادہ آفتاب احمد خان (علی گڑھ) خان بہادر، میاں محمد شفیع (لاہور)، نواب سرفراز حسین خان (پٹنہ)۔ ملک محمد حیات خان ٹوانا وغیرہ۔

ان کے مطالبات درج کیے جارہے ہیں تاکہ قارئین کو بتدریج تاریخ سے آگاہی ہوتی جائے۔

جداگانہ بنیادوں پر نمائندگی۔

کلی نمائندگی میں مسلمانوں کا اضافہ۔

مسلم یونیورسٹی کا قیام۔

یونیورسٹیز کی گورننگ باڈی میں بھی مسلمانوں کو رکھا جائے۔

سرکاری ملازمتوں میں کوٹہ مخصوص کیا جائے۔

مسلمانوں کو عدالتوں میں بھی نمائندگی دی جائے۔

لارڈ منٹو نے تو اتفاق کیا لیکن کانگریس نے پُرزور مخالفت کی۔

دسمبر 1906ء میں ڈھاکا میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا انعقاد ہوا اور یہیں مسلم لیگ کی بنیاد رکھی گئی۔

30-29 دسمبر۔ 1907ء۔ مسلم لیگ کا پہلا باقاعدہ اجلاس کراچی میں ہوا۔ صدارت بمبئی کے سر آدم پیر بھائی نے کی۔ دوسرا اجلاس علی گڑھ میں 1908ء میں ہوا۔

1908ء میں مسلمانوں کے لیے جداگانہ انتخاب کا حق تسلیم کرلیا گیا۔

12 دسمبر 1911ء کو دہلی دربار میں بادشاہ جارج پنجم کی تاجپوشی کا جشن بنایا گیا اور باقاعدہ طور پر تقسیم بنگال کی تنسیخ کا اعلان کیا گیا۔ ہندو اس پر بہت خوش تھے۔ مسلمانوں کو اس سے بہت صدمہ ہوا۔

20 دسمبر 1911ء میں نواب وقار الملک نے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں تحریر کیا کہ مسلمانوں کو اب حکومت پر بھروسا نہیں کرنا چاہیے بلکہ ایک ہوجانا چاہیے۔

4 مارچ 1912ء کو بنگال کی تقسیم کے حوالے سے کلکتہ میں مسلم لیگ کا ایک اجلاس ہوا۔

1911ء میں مولانا محمد علی جوہر نے اپنا انگریزی اخبار کامریڈ جاری کیا۔ 1912ء میں مولانا آزاد کا اخبار ''الہلال'' جاری ہوا۔ لاہور سے روزنامہ ''زمیندار'' نکلتا تھا۔ مسلمانوں نے ساتھ دیا۔ ان تینوں اخباروں نے ترکی کی حمایت میں اداریے اور مضامین لکھے۔ اس کے ساتھ ہی کانگریس کا اصل چہرہ دکھانا شروع کردیا۔

کانگریس نے روایتی مکاری سے کام لیتے ہوئے مسلمانوں کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی۔ ممتاز مسلم رہنما سید امیر علی کو کانگریس کی صدارت کی پیشکش کی لیکن سید امیر علی نے انکار کردیا۔

1913ء میں مسلمانوں نے ایم اے او کالج علی گڑھ کو یونیورسٹی کا درجہ دینے کے لیے حکومت سے مطالبہ کیا۔ حکومت نے بہانے بازی شروع کردی اور یہ کہا کہ اگر تیس لاکھ کا فنڈ جمع ہوجائے تو پھر سوچا جاسکتا ہے۔

مسلمان چونکہ اس مطالبے میں مخلص تھے۔ اس لیے فنڈ جمع ہونا شروع ہوگیا۔ حکومت کو اندازہ ہوگیا کہ اتنی بڑی رقم بہت جلد جمع ہوجائے گی۔ اس لیے اس نے کوئی اور بہانہ بنایا۔ اس دوران پہلی عالمی جنگ شروع ہوگئی۔

1913ء میں کانپور میں ایک بڑا واقعہ رونما ہوا۔

کانپور کے محلے مچھلی بازار میں اے بی روڈ پر ایک مندر اور ایک مسجد تھی۔ سڑک کو چوڑا کرنے کے لیے یہ سوچا گیا کہ تھوڑا حصہ مندر کا اور تھوڑا مسجد کا توڑ دیا جائے۔ ہندوؤں نے تو کسی طرح حکومت سے مل کر اپنا مندر بچالیا لیکن پہلی جولائی 1913ء کو پولیس کی نگرانی میں مسجد کو منہدم کردیا گیا۔

12 اگست کو مسلمانوں نے ایک بہت بڑا جلوس نکالا اور اپنے طور پر مسجد کی تعمیر شروع کردی۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ٹاسکر نے مسلمانوں پر گولیاں چلانی شروع کردیں۔ درجنوں مسلمان شہید اور سینکڑوں زخمی ہوگئے۔

اگست 1913ء ہی کو راجا صاحب آف محمود آباد کی قیادت میں ایک وفد گورنر سے ملا اور گورنر سے مسجد تعمیر کرنے کی اجازت مانگی۔ گورنر نے کوئی مثبت جواب نہیں دیا۔

ستمبر 1913ء میں مسلم لیگ نے ایک وفد انگلستان روانہ کیا۔ اس میں مسلم لیگ کے سیکریٹری وزیر حسن اور مولانا محمد علی جوہر بھی تھے۔

حکومت اور کسی بھی ذمے دار فرد نے اس مسئلے پر توجہ نہیں دی۔ اس دورے کی سب سے بڑی کامیابی یہ تھی کہ اس وفد نے قائداعظم محمد علی جناح کو مسلم لیگ کا رکن بنالیا تھا جو اس وقت تعلیم کے سلسلے میں انگلستان ہی میں تھے۔

1913ء کا سال مسلم لیگ اور مسلمانوں کے لیے بہت اہمیت کا ہے۔ ایم اے او کالج کو یونیورسٹی کا درجہ دینے

سے حکومت کا انکار۔ سانحہ کانپور اور قائداعظم کی مسلم لیگ میں شمولیت۔

1914ء میں پہلی جنگِ عظیم کی ابتدا ہوئی تھی جو 1918ء تک جاری رہی۔ اس جنگ میں ترکوں نے جرمنی کا ساتھ دیا تھا۔ اس موقع پر مولانا محمد علی جوہر نے جو اداریے ترکوں کے حق میں لکھے وہ اپنی مثال ہیں۔

1915ء میں مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی دونوں بھائیوں کو نظر بند کر دیا گیا۔

دسمبر 1916ء میں مسلم لیگ اور کانگریس دونوں کے مشترکہ اجلاس لکھنو میں ہوئے۔ کانگریس کے اجلاس کی صدارت ایبکا چرن نے کی جب کہ مسلم لیگ کا اجلاس قائداعظم محمد علی جناح کی زیرِ صدارت منعقد ہوا۔

قائداعظم کی محنت اور کوشش سے دسمبر 1916ء میں مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان جو مشہور معاہدہ ہوا وہ میثاقِ لکھنو کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے بے شمار نکات ہیں۔ جن کی الگ تفصیل ہے۔

مسلمان اور ہندو اس میثاق کے بعد ایک صفحے پر نظر آرہے ہوں لیکن ہندوؤں کی سازشیں اپنی جگہ جاری تھیں۔

10 نومبر 1917ء مسٹر ایڈرن نے رپورٹ دی کہ ہندو مسلم کے تناظر میں دیکھا جائے تو ہم آگ کے دہانے پر بیٹھے ہیں۔

ستمبر 1917ء میں ہندوؤں نے بہار کے اضلاع شاہ آباد اور آرہ میں مسلمانوں پر حملے کر کے ہندو مسلم اتحاد میں دراڑیں ڈال دیں۔

قائداعظم کو ان فسادات کا بہت دکھ تھا۔

1918ء میں وائسرائے ہند لارڈ چمنسورڈ نے ایک مشترکہ کانفرنس بلوائی۔ اس میں ہندوؤں نے صرف اپنے مفاد کی بات کی جب کہ مسلم لیگ نے پورے ہندوستان کی بات کی۔

1918ء میں حکومت کی طرف سے ایک کالا قانون رولٹ ایکٹ کے نام سے پیش کیا۔ قائداعظم محمد علی جناح نے اس پر زبردست احتجاج کیا کہ کوئی بھی مہذب حکومت اس ایکٹ کو تسلیم نہیں کر سکتی۔

گاندھی نے ایک عرصے سے حکومت کے خلاف تحریک چلا رکھی تھی۔ ستیہ گرہ اور راستہ روک قسم کی تحریکیں بھی ان میں تھیں۔

6 اپریل 1919ء۔ گاندھی کی طرف سے ملک بھر میں ہڑتال کی کال دی گئی۔

گاندھی جی بمبئی سے دہلی کے لیے روانہ ہوئے تو ان کو جبری روک دیا گیا۔ لوگ جذباتی ہو گئے جنگ کی سی صورتِ حال پیدا ہو گئی۔ انگریزوں پر قاتلانہ حملے اور سرکاری املاک کو نقصان پہنچانا شروع کر دیا۔ امرتسر میں زبردست احتجاجی جلوس نکالے گئے۔

10 اپریل 1919ء کو ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور ڈاکٹر ستیہ پال کو گرفتار کر لیا گیا۔ ان دونوں رہنماؤں کی گرفتاری پر تیس ہزار افراد کا جلوس نکلا۔ انتظامیہ نے فائرنگ شروع کر دی۔ بہت سے لوگ جاں بحق ہوئے۔ امرتسر کو فوج کے سپرد کر دیا گیا۔ پھر بھی یہ سیلاب نہ رک سکا۔

1919 (13 اپریل) جلیانوالہ باغ میں سیکڑوں افراد جمع ہوئے۔ جنرل ڈائر نے اندھا دھند گولیاں چلوا دیں۔ ہر طرف لاشیں ہی لاشیں بکھر گئیں۔

ہندوستان اور پاکستان کی تاریخ میں سانحہ جلیانوالہ باغ ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ جب اس کی خبر دیگر شہروں میں پہنچی تو وہاں بھی فسادات کا آغاز ہو گیا۔

لاہور، قصور، گوجرانوالہ جگہ جگہ ہنگامے ... ہوئے۔ لاہور، قصور، گوجرانوالہ، مریدکے اور کاموکی میں تو بم بھی پھٹے۔

1919ء میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ سامنے آیا۔ جس سے ہندو اور مسلمان دونوں ہی سخت نااُمید ہوئے۔

27 اکتوبر 1919ء کو ہندوستان کے مسلمانوں نے یومِ خلافت بھرپور طور پر منایا۔ اس کے ساتھ ہی تحریک خلافت کانفرنس کا قیام عمل میں آیا۔

24 نومبر 1919ء کو خلافت کمیشن کا پہلا اجلاس شیرِ بنگال مولوی فضل الحق کی صدارت میں دہلی میں ہوا۔

دسمبر 1919ء۔ خلافت کانفرنس کا دوسرا اجلاس امرتسر میں ہوا۔ جس میں مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی نے شرکت کی۔ یہ دونوں چار سال کی قید کے بعد رہا ہوئے تھے۔

1920ء میں مولانا محمد علی جوہر کی قیادت میں ایک وفد انگلستان گیا۔ اس کی واپسی اکتوبر 1920ء کو ہوئی تھی۔

خلافت وفد کے انگلستان جانے کے بعد خلافت کمیٹی کی ذمہ داری مولانا شوکت علی اور مولانا عبدالباری فرنگی نے سنبھال لی۔ گاندھی جی پیش پیش تھے۔

مئی 1930ء کو بمبئی میں خلافت کمیٹی کا اجلاس ہوا جس میں انگریزوں کے خلاف ملک گیر عدم تعاون تحریک منظور کی گئی۔ گاندھی نے اس کی تائید کی۔

قائداعظم کو یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ ہندو اپنے مفاد کے لیے مسلمانوں کے کاندھوں کو استعمال کر رہے ہیں اس لیے انہوں نے کانگریس کو خیرباد کہہ دیا۔

جنوری 1921ء میں تعلیمی اداروں کے مقاطعے کا سلسلہ شروع ہوا۔ مسلمان اساتذہ نے استعفیٰ دے دیا۔ پھر مولانا محمد علی جوہر کو نظربند کیا گیا۔

تاج برطانیہ کے ولی عہد پرنس آف ویلز ہندوستان آنے والے تھے۔ ہندوستان کے لوگوں نے استقبال کے بائیکاٹ کا فیصلہ کر لیا۔

وائسرائے اس پر سخت پریشان تھا۔ اس نے گاندھی سے مصالحت کی کوشش کی۔ گاندھی نے شرط لگا دی کہ پہلے تمام گرفتار رہنماؤں کو رہا کیا جائے۔ حکومت نے انکار کر دیا۔

جس وقت مولانا محمد علی اور شوکت علی جیل میں تھے، تحریک خلافت گاندھی کے ہاتھ میں تھی۔ مالابار کے ساحل پر مسلمان آباد تھے۔ انہوں نے تحریک خلافت کا بھرپور ساتھ دیا۔ فروری 1922ء میں بلوہ ہوا۔ جس میں ایک تھانے کو آگ لگا دی گئی اور 21 سپاہی مارے گئے۔ اس پر گاندھی نے اچانک تحریک ختم کرنے کا اعلان کر دیا۔

دوسری طرف ترک میں بھی مصطفیٰ کمال پاشا برسراقتدار آگئے تھے۔ لہٰذا خلافت ختم کر دی گئی اور 1924ء میں ہندوستان میں ہی اس تحریک کا خاتمہ ہو گیا۔

شدھی سنگھٹن تحریکیں شروع ہوئیں اور مسلمانوں پر زندگی عذاب کر دی گئی۔

20 مارچ 1927ء کو قائداعظم محمد علی جناح کی صدارت میں دہلی کے ویسٹرن ہوٹل میں ہندوستان کے تیس سرکردہ رہنما شریک ہوئے۔ ایک قرارداد کا مسودہ تیار کیا جسے بعد میں تجاویز دہلی کہا گیا۔

اس میں ایک تجویز یہ بھی تھی کہ سندھ کو بمبئی سے الگ کر کے علیحدہ صوبے کی حیثیت دی جائے۔ نومبر 1927ء میں برطانوی حکومت نے سائمن کمیشن تشکیل دیا۔ قائداعظم نے مخالفت کی۔ کیونکہ اس میں ہندوستان نمائندوں کو شامل نہیں کیا گیا تھا۔

نومبر ہی میں بمبئی میں قائداعظم نے ایک قرارداد پیش کی۔

3 نومبر 1923ء کو سرجان سائمن کی قیادت میں سائمن کمیشن جب ہندوستان پہنچا تو ملک بھر میں اس کے خلاف احتجاجی مظاہرے ہوئے۔

31 مارچ 1928ء کو سائمن کمیشن واپس چلا گیا۔

19 مئی 1928ء کو نہرو رپورٹ پیش کی گئی۔

قائداعظم نے بھی اس کی مخالفت کی۔

دہلی میں 31 دسمبر 1928ء سے یکم جنوری 1929ء تک آل انڈیا مسلم لیگ کانفرنس منعقد کی گئی جس کی صدارت سر آغا خان نے کی۔

مارچ 1929ء میں دہلی میں آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس میں قائداعظم نے اپنے چودہ نکات پیش کیے۔

1930ء کے آغاز میں کانگریس نے سول نافرمانی کی تحریک شروع کر دی تھی جس کے روح رواں گاندھی تھے۔

مسلمانوں نے اس میں کوئی حصہ نہیں لیا تھا۔

نومبر 1930ء کو لندن میں گول میز کانفرنس کا انعقاد کیا گیا۔ مسلمان رہنماؤں میں قائداعظم محمد علی جناح، سر محمد شفیع، مولانا محمد علی جوہر، سر آغا خان، بیگم شاہنواز اور فضل حق شامل تھے۔ یہ اجلاس 19 جنوری 1931ء تک جاری رہے۔

16 نومبر 1930ء کو دوسری مسلم کانفرنس منعقد ہوئی جس کی صدارت نواب اسماعیل نے کی۔ دسمبر 1930ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس علامہ اقبال کی صدارت میں الٰہ آباد میں منعقد ہوا۔

اس اجلاس میں علامہ اقبال کا خطبہ صدارت، تحریک پاکستان کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ ایک طویل خطبہ ہے اور ہماری تاریخ کے صفحات پر محفوظ ہے۔

7 ستمبر 1931ء کو دوسری گول میز کانفرنس لندن میں ہوئی۔ اس کانفرنس میں گاندھی بھی تھے اور علامہ اقبال بھی۔ مسلمانوں کے وفد کی قیادت سر آغا خان نے کی تھی۔

17 نومبر 1932ء سے 24 نومبر 1932ء تک لندن میں تیسری گول میز کانفرنس ہوئی۔

28 جنوری 1933ء کو چوہدری رحمت علی کا مشہور پمفلٹ ”اب یا کبھی نہیں“ سامنے آیا۔ جس میں انہوں نے پہلی بار ”پاکستان“ کا لفظ استعمال کیا۔

(جاری ہے)

نغمہ نگار

انور فرہاد

اگر شاعر ہفت بیاں کی فہرست مرتب کی جائے تو سب سے اوپر اس شاعر کا نام آئے گا جس نے فلمی شاعری میں خوب نام کمایا حمد نعت ، منقبت،قوالی ، سلام ، ہائیکو،قطعات اور دوہے خوب، خوب لکھے لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ قسمت نے اس شاعر کو قدم بہ قدم ستایا، کبھی مال ومتاع لٹا تو کبھی ادبی سرمایہ چھنا، کبھی اس کی کاوش کسی اور کے نام کر دی گئی۔

اس نغمہ نگار کی زندگی پر ایک نظر جس کی زندگی خود ایک طربیہ نظم ہے

ایک خاتون گنگنا رہی تھیں

کہاں ہو تم چلے آؤ، محبت کا تقاضا ہے
غم دنیا سے گھبرا کر تمہیں دل نے پکارا ہے

میں نے ان سے پوچھا۔ ''محترمہ! یہ کس کا گانا ہے؟''

انہوں نے جواب دینے میں دیر نہیں لگائی۔ ''شہناز بیگم کا۔''

''ہاں شہناز بیگم نے ہی شاید یہ گانا گایا تھا......''

''شاید نہیں، شہناز بیگم ہی نے یہ گیت گایا ہے۔ وہی
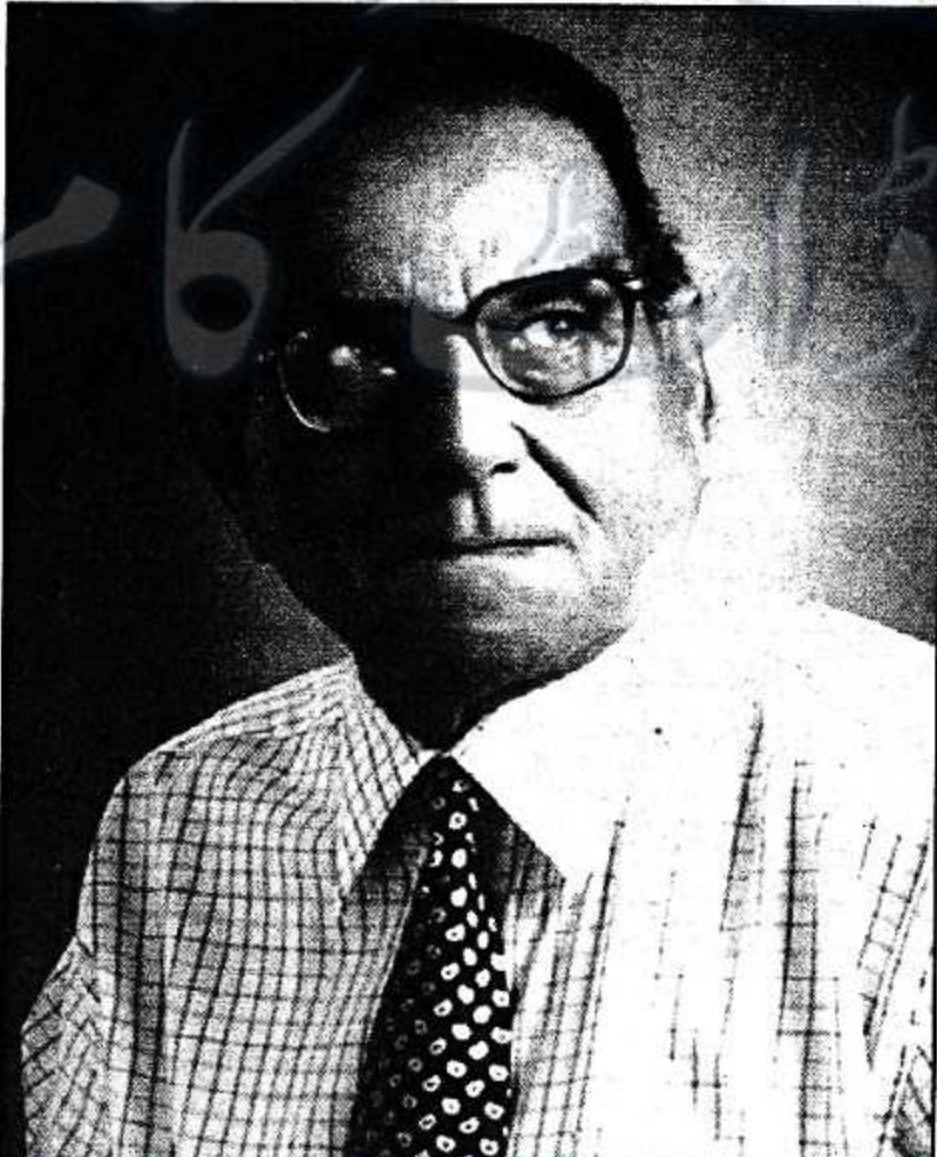
شہناز بیگم جنہوں نے ''سوہنی دھرتی اللہ رکھے قدم قدم آباد'' گایا تھا۔''

''شکریہ، میری معلومات میں اضافہ کرنے کا مگر میں اصل بات یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ شہناز بیگم کا یہ گانا، گیت یا، غزل۔ کہاں ہو تم چلے آؤ، محبت کا تقاضا ہے۔ لکھا کس نے ہے؟ کس کی تخلیق ہے؟''

خاتون سوچ میں پڑ گئیں۔ ''ٹھہریے...... میں یاد کرتی ہوں'' پھر کچھ دیر تک ذہن پر زور دینے کے بعد انہوں نے کہا۔ ''شاید...... شاید کوئی ساغر صدیقی تھے۔ دراصل میں رائٹر کے نام پر زیادہ توجہ نہیں دیتی۔''

ایک بزرگوار کو جھوم جھوم کر یہ نعتیہ شعر پڑھتے ہوئے سنا۔

مدینے والے سے میرا سلام کہہ دینا
تڑپ رہا ہے تمہارا غلام کہہ دینا

''سبحان اللہ! سبحان اللہ! کتنا پیارا شعر ہے۔'' میں بے اختیار بول اٹھا۔

محترم نے اپنی سرمہ سے روشن نظریں اٹھا کر مجھے دیکھا۔ میں نے جھٹ اپنی بات آگے بڑھائی۔ ''کس شاعر کا یہ کلام ہے؟ جس نے اس خوبصورتی سے اپنے دل کی لگی کا اظہار کیا ہے۔ آقائے دوجہاں کو سلام عرض کرنے کے بعد حاضری کے لیے تڑپنے کا حال زار بیان کیا ہے۔''

''کس شاعر کا کلام ہے؟'' بزرگ محترم نے تسبیح کے دانوں کی حرکت کو روکتے ہوئے ذہن پر زور دیا۔ ''شاعر کا نام تو مجھے یاد نہیں...... البتہ احمد رشدی کا نام یاد ہے۔ جس نے یہ نعتیہ قوالی گائی ہے۔'' پھر ذہن پر زور دیتے ہوئے بولے۔ ''میں یقین سے تو نہیں کہہ سکتا لیکن شاید کوئی شاعر لکھنوی تھے اس نعتیہ قوالی کے لکھنے والے۔''

یہ عام لوگ ہیں جن کی بے خبری کا یہ عالم ہے کہ شاعر صدیقی کا نام انہیں یاد نہیں، شاعر صدیقی کی تخلیق کو کوئی ساغر صدیقی اور کوئی شاعر لکھنوی کا بتاتا ہے۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ آج کا میڈیا بھی شاعر صدیقی کے نام اور کام سے اس قدر بے خبر ہے کہ اکثر ان کے حوالے سے بات کرتے ہوئے شاعر صدیقی کی بجائے ساغر صدیقی، شاعر لکھنوی یا اسی طرح کا کوئی اور نام لکھ دیتے ہیں۔

شاعر صدیقی کوئی غیر معروف نام نہیں۔ فلم اور ٹی وی کے حوالے سے ان کا بہت بڑا کنٹری بیوشن ہے۔ سابق مشرقی پاکستان کی فلموں کے بہت سینئر نغمہ نگار اور اسکرپٹ رائٹر رہ چکے ہیں۔ جبکہ ڈھاکا اور کراچی ٹیلی ویژن سے مقبول پروگرام بھی نشر کرتے رہے ہیں۔

آج کے نوجوانوں اور ان سے زیادہ نئی نسل کے میڈیا مینوں کی معلومات کے لیے ضروری ہے کہ ماضی کے ایک مقبول اور معروف شاعر کو متعارف کرانے کے لیے شاعر صدیقی کی کہانی سناؤں۔

مشرقی اور مغربی پاکستان کے اشتراک سے بننے والی پہلی فلم ''ہمسفر'' پاکستان کی پہلی رنگین فلم ''سنگم'' کے علاوہ بھیا، قلی، کارواں، بیگانہ، بینا، پائل، منا اور بجلی، ادھوری فلموں میں تان سین، اصلی نقلی، اپنی منزل اپنی راہیں اور ایک ہی راستہ ان کے کریڈٹ میں شامل ہے جن کے گیت مارکیٹ میں آکر مقبول ہونے کے باوجود فلمیں ریلیز نہ ہوسکیں۔ اس کے علاوہ شہناز بیگم کا گایا ہوا نغمہ ''کہاں ہو تم چلے آؤ محبت کا تقاضا ہے'' اور ''ہم تم جہاں ملے تھے پھولوں کی رہ گزر میں۔'' یا جمال اکبر کی آواز میں ''وہیں زندگی کے حسین خواب ٹوٹے'' اور میرے سپنوں میں آکے نیند چرا کے (مالا)۔ یہ پیار کی سوغات ہے (فردوسی بیگم) اور مدینے والے سے میرا سلام کہہ دینا (احمد رشدی) جیسے متعدد مقبول کلام فلم کے حوالے سے شاعر صدیقی کی خوبصورت شعری شناخت ہے۔

شاعر صدیقی نے اپنی فلمی شاعری کا سفر فلم ''ہمسفر'' سے شروع کیا تھا جو رائٹر اور ڈائریکٹر شوکت ہاشمی کی فلم تھی۔ یہ فلم سابق مشرقی پاکستان کے مختلف مقامات پر فلمائی گئی تھی۔ سارا یونٹ مغربی پاکستان (موجودہ پاکستان) کے لوگوں پر مشتمل تھا۔ ''ہمسفر'' سے پہلے ڈھاکے میں ایک اور اردو فلم ''جاگو ہوا سویرا'' بن چکی تھی۔ اس کے نغمہ نگار اور اسکرپٹ رائٹر فیض احمد فیض اور ہدایتکار اے جے کاردار تھے۔ ''ہمسفر'' کی کاسٹ میں یاسمین، اسلم پرویز، نگہت سلطانہ اور اسد جعفری کے نام نمایاں تھے۔ جبکہ اس کی موسیقی بنگالی موسیقار مصلح الدین نے ترتیب دی تھی جو اعلیٰ معیار کی تھی۔ یہ ہر لحاظ سے ایک شاندار فلم تھی۔ جس کے گیت تنویر نقوی کے علاوہ ڈھاکے کے ایک ممتاز شاعر، شاعر صدیقی نے تحریر کیے تھے۔ تنویر نقوی کا لکھا یہ المیہ گیت مقبولیت کے لحاظ سے سرفہرست تھا۔ جو ناہید نیازی اور سلیم رضا نے الگ الگ گایا تھا۔

زندگی میں ایک پل بھی چین آئے نا
اس جہاں میں کاش کوئی دل لگائے نا

تنویر نقوی کا ہی تحریر کردہ ایک اور گیت ''کھویا کھویا

چاند'' ہے۔ ہیمنت کمار کی آواز میں مصلح الدین نے کلکتہ جا کر ریکارڈ کیا تھا۔ یہ اپنے زمانے کا مقبول گیت تھا۔ شاعر صدیقی نے اس فلم کے لیے دو گیت لکھے تھے۔ جو بھارتی گلوکارہ سندھیا مکرجی کی آواز میں ریکارڈ ہوئے تھے۔ جس کے بول تھے۔

1- انکھیاں چھلکیں میرا دل دھڑکے

2- سانوریا ہو

سانورے آ و رے

سانوریا ہو

یہ دونوں گیت بھی اپنے زمانے کے مقبول شمار ہوئے تھے۔ ''ہمسفر'' 1956ء میں شروع ہوئی تھی مگر اس کی نمائش 1960ء میں ہوئی۔

اس تفصیل سے اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ شاعر صدیقی کتنے سینئر نغمہ نگار تھے۔ ''چندا'' اور ''تلاش'' سے پہلے انہوں نے نغمہ نگاری کا آغاز کر دیا تھا۔

مشرقی پاکستان میں بننے والی پاکستان کی مکمل رنگین فلم سنگم میں کئی نغمہ نگاروں سے گیت لکھوائے گئے تھے۔ جن میں ایک شاعر صدیقی بھی تھے۔ شاعر صدیقی کا یہ گیت اختر شادمان کی آواز میں کمپوز ہوا اور ہارون اور روزی پر پکچرائز کیا گیا تھا۔ اس کی موسیقی خان عطاء الرحمان نے کمپوز کی تھی۔ گیت کے بول تھے۔

دل میرا لے کے آپ کہاں چل دیئے حضور

گو آپ ہیں حسین مگر اتنا بھی کیا غرور

مانا کہ آپ کی ہیں نگاہوں میں بجلیاں

یہ بھی سہی کہ آپ سے ہے زندگی جواں

لیکن جناب عشق سے ہے حسن کا ظہور

دل میرا لے کے آپ کہاں چل دیئے حضور

''بھیا'' قاضی ظہیر کی فلم تھی۔ جس کی نعتیہ قوالی شاعر صدیقی نے لکھ کر اپنی مقبولیت کے ڈنکے بجوا دیئے تھے۔ احمد رشدی اور ساتھیوں نے یہ قوالی گائی تھی اور شوکت اکبر اور ساتھی اداکاروں پر فلمائی گئی تھی۔

مدینے والے سے میرا سلام کہہ دینا

تڑپ رہا ہے تمہارا غلام کہہ دینا

مدینے سے گزر جب ہو صبا صلی علیٰ پڑھ کر

ادب سے روضۂ اقدس کو ان کے چومنا بڑھ کر

پھر ان سے دیدۂ و دل کا پیام کہہ دینا

تڑپ رہا ہے تمہارا غلام کہہ دینا

یہ نعتیہ قوالی آج بھی پہلے کی طرح مقبول ہے، محبت اور عقیدت سے سنی جاتی ہے۔ اسی فلم ''بھیا'' کا یہ گیت بھی بہت مقبول ہوا تھا۔ جس کے بول تھے۔

میرے سپنوں میں آ کے، نیندیں چرا کے

دل میرا تڑپاتے ہو

کہو تم میرے کون ہوتے ہو

میری راتوں میں اکثر چاندنی بن کر

سامنے تم آ جاتے ہو

کہو تم میرے کون ہوتے ہو

یہ گیت مالا نے گایا تھا۔ چترا سنہا پر عکس بند ہوا تھا۔ موسیقی روبن گھوش کی تھی۔ ہدایتکار ایس ایم پرویز کی فلم ''کارواں'' کے گیت اور اسکرپٹ شاعر صدیقی نے لکھے تھے۔ ایک دوگانے بی اے دیپ نے بھی تحریر کیے تھے۔

شاعر صدیقی کا ''کارواں'' کے لیے تحریر کیا ہوا یہ گیت جسے سلیم رضا کی آواز میں سجایا گیا تھا اور ہارون شبنم پر پکچرائز کیا گیا تھا۔ بے حد مقبول ہوا۔

تیری تصویر بناتا ہوں مٹا دیتا ہوں

تجھ سے بہتر تیری تصویر نہیں بن سکتی

تیری زلفیں ہیں کہ ساون کی گھٹا آوارہ

تیرا چہرہ ہے کہ کھلتے ہوئے نسرین و گلاب

تیری آنکھیں ہیں کہ دو جام شراب رنگیں

کچھ سمجھ میں نہیں آتا یہ حقیقت ہے کہ خواب

وہ حسین خواب کہ تعبیر نہیں بن سکتی

تجھ سے بہتر تیری تصویر نہیں بن سکتی

اس گیت کے ایک ایک لفظ سے شاعر کی تخلیقی صلاحیتوں کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ شاعر صدیقی اپنے احساس اور جذبات کو فکر اور جذبے کی ماہرانہ طریقے پر اجاگر کرنے کی زبردست شاعرانہ صلاحیت رکھتے ہیں۔

شاعر صدیقی اپنے مزاج اور شاعرانہ محسوسات کے اعتبار سے رومانیت پسند شاعر ہیں، معاملات عشق ہوں یا حسین قدرتی مناظر۔ ان کے گیتوں اور نغموں میں یہ رومان پسندی، طرز بیان کی نغمگی اور اظہار کی بے ساختگی کے ساتھ کھل کر اپنے جوہر دکھاتی نظر آتی ہے۔

1- ہم تم جہاں ملے تھے پھولوں کی راہ گزر میں

2- وہیں زندگی کے حسین خواب ٹوٹے

3- کہاں ہو تم چلے آؤ محبت کا تقاضا ہے

جیسے متعدد نغمے شاعر صدیقی کے مذکورہ خصوصیت کی

روشنی بن کر جگمگاتی ہے۔

شاعر صدیقی نے جہاں فلموں کو متعدد گیتوں کا انمول تحفہ دیا ہے وہاں ٹیلی ویژن پروگراموں کے ذریعہ بھی خوبصورت شاعری کی ہے۔ ٹی وی پروگراموں کے حوالے سے بات کرنے سے پہلے بہتر ہوگا کہ ان کی ریلیز ہونے والی اور ریلیز نہ ہونے والی کچھ فلموں کے گیتوں پر بھی کچھ روشنی ڈالی جائے۔

شاعر صدیقی کو ہمیشہ اس بات کا دکھ رہا کہ انہیں فلم یا ٹیلی ویژن میں جو بھی میوزک ڈائریکٹر ملے انہوں نے سب سے پہلے دھنیں بنائیں اس کے بعد انہیں اس دھن کے محدود دائرے میں گیت لکھنے کے لیے کہا گیا۔ اس طرح انہیں اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کے اظہار کا کم موقع ملا۔ بہر حال اس کے باوجود انہوں نے جو کچھ لکھا ان کی بھی شاعری کے حوالے سے کچھ کم اہمیت نہیں۔

ڈھاکے میں ایک فلم ''جنگلی'' کے نام سے بنائی جارہی تھی۔ جو کسی وجہ سے ریلیز نہ ہوسکی۔ ان کے موسیقار مصلح الدین تھے۔ جنھوں نے شاعر صدیقی سے ایک گیت لکھوایا۔ جسے نامور بھارتی گلوکار طلعت محمود کی آواز میں ریکارڈ کروایا۔ اگرچہ یہ نغمہ بھی پہلے کمپوز کی ہوئی دھنوں پر تحریر کروایا گیا اس کے باوجود اس میں شاعری کے کیسے تیکھے تیور تھے۔

رات روپہلی چنچل تارے
پیار بھرا دل تجھ کو پکارے
تیرے لیے بے تاب ہیں سارے
رنگ بھرے پُرکیف نظارے

روپ تیرا بکھرا ہر سو
بن کے پھول، کلی اور جگنو
دل پہ نہیں ہے اپنے قابو
جیسے کوئی کردے جادو

چال غضب، نیناں متوارے
پیارا بھرا دل تجھ کو پکارے

جانِ وفا، اے جانِ جگر
کہتی ہوئی کچھ تیری نظر
میں نے تجھے پہچان لیا
تیری قسم تجھے جان لیا

ڈھونڈ رہا ہوں تیرے سہارے
پیار بھرا دل تجھ کو پکارے

اسی طرح ''کارواں'' کے اس گیت سے جذبات کا اندازہ لگائیے۔ روبن گھوش کی موسیقی اور ناہید نیازی کی آواز میں ریکارڈ کیا گیا یہ گیت شبنم پر عکسبند کیا گیا تھا۔

چھوڑ کے جانے والے
دل توڑ کے جانے والے
تجھ بن کیسے جیوں
تو ہی بتا

اپنے دیس چلا پردیسی چھوڑ کے میرا ہاتھ
دیکھ تو لے کیسی ہوتی ہے نین کی برسات
کہہ نہ سکوں رک جا بے دردی
چھپ چھپ نیر پیوں
تجھ بن کیسے جیوں

سونا کر گیو دن اجیارا کالی کر گیو رین
گونج رہی ہے پربت پربت گھائل من کی بین
چپ چپ میں تو چلوں
تجھ بن کیسے جیوں

فلم ''بیگانہ'' کا یہ گیت بھی قابل توجہ ہے۔ نسیمہ خان اور مصطفیٰ پر یہ نغمہ پکچرائز ہوا تھا۔ روبن گھوش کی موسیقی آواز کا جادو فردوسی بیگم نے جگایا تھا۔ گیت کے بول ملاحظہ فرمائیے۔

یہ پیار کی سوغات ہے
نظروں سے دل کی بات ہے
تم ہو میرے پاس تو کتنی حسیں یہ رات ہے
یہ پیار کی سوغات ہے

رات کی بانہوں میں تھک کر سوگئی ہے یہ چاندنی
جانے کس کی یاد میں یوں کھوگئی ہے چاندنی
ہر طرف رنگوں کی بارش نور کی برسات ہے
یہ پیار کی سوغات ہے

دھیرے دھیرے بے خودی ہر چیز پر چھانے لگی
تم بھی سو جاؤ کہ اب تاروں کو نیند آنے لگی
خواب میں ڈوبی ہوئی کتنی نشیلی رات ہے
یہ پیار کی سوغات ہے

آپ نے محسوس کیا؟ پہلے سے کمپوز کی ہوئی دھنوں پر لکھے جانے والے گیت میں کتنی نغمگی ہے۔ فلمی گانے میں ایسے کیف و مستی میں ڈوبے پیرائے اظہار کسی عام شاعر کے بس کی بات نہیں۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ شاعر صدیقی ایک قادرالکلام شاعر تھے۔ جو ہر جذبے ہر احساس کو اس کی شدت کے ساتھ پیش کرنے کا ملکہ رکھتے تھے۔ ڈھاکے سمیت برصغیر کی فلمی دنیا میں متعدد ایسے نام نہاد گیت نگار گزرے ہیں جن کی شاعری تک بندی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ جبکہ آج کل بالی ووڈ میں جو شاعری ہو رہی ہے وہ شاعری کے علاوہ سب کچھ ہے جبکہ بالی ووڈ میں کسی زمانے میں شکیل بدایونی، ساحر لدھیانوی، مجروح سلطان پوری، جانثار اختر، کیفی اعظمی اور جاوید اختر دل میں اتر جانے والی شاعری کیا کرتے تھے۔ آج کل آئٹم سونگ کے نام پر وہاں جو کچھ پیش کیا جا رہا ہے۔ نہ وہ رقص ہے، نہ موسیقی اور نہ ہی شاعری۔ وہ سراسر بیہودگی ہے، طوفان بدتمیزی ہے۔ اب پاکستانی فلموں میں بھی اس کی نقالی کی جانے لگی ہے۔ اللہ پاکستانی فلموں کے حال پر رحم فرمائے۔

شاعر صدیقی نے ''اپنے ہوئے پرائے'' نام کی ایک فلم کے لیے تھیم سانگ کے طور پر ایک گیت لکھا تھا۔ ناشاد اس کے موسیقار تھے اور آواز میڈم نور جہاں کی تھی۔ گیت کے بول تھے۔

اپنے ہوئے پرائے
پھر موت کیوں نہ آئے
بے درد آسماں نے ہم پر ستم وہ ڈھائے

دیکھا تھا خواب جس کا تعبیر جل گئی ہے
دل کی ہر ایک حسرت اشکوں میں ڈھل گئی ہے
کیا تھی خطا ہماری اتنا کوئی بتائے

اپنے ہوئے پرائے

آنکھوں میں اشک ہوں گے لب پر ہنسی نہ ہوگی
لیکن وفا جہاں میں رسوا کبھی نہ ہوگی
جی لیں گے تیرے غم کو سینے سے ہم لگائے

اپنے ہوئے پرائے

اک ہمسفر ملا تھا، رستے میں ساتھ چھوٹا
قسمت نے آج ہم کو منزل پہ لا کے لوٹا
گھیرے ہیں ہر طرف سے مایوسیوں کے سائے

اپنے ہوئے پرائے

اصلی نام: عبدالرزاق
قلمی نام: شاعر صدیقی
تاریخ پیدائش: کیم فروری 1933ء
مقام: کلکتہ (مغربی بنگال)
والد: عبدالغفار خان (مرحوم)
والدہ: فیروزہ خانم
تعلیم: ابتدائی کلکتہ۔ ایم اے (اردو) ڈھاکا یونیورسٹی
ملازمت: کئی سرکاری اور غیر سرکاری اعلیٰ عہدے پر فائز
فنی کارکردگی: ریڈیو، ٹیلی ویژن اور فلموں کے لیے نغمہ نگاری، فلموں کے لیے اسکرین پلے، کہانی اور مکالمہ نویسی

کتابیں:

1- آنکھوں میں سمندر
پہلا مجموعہ کلام جو اسلام آباد سے امیر حسین چمن نے پرنٹ میڈیا سے شائع کیا۔ 2004 میں شائع ہوا ہے۔

2- بجھتے سورج نے کہا۔ دوسرا مجموعہ کلام۔
اشاعت ستمبر 2009ء اس میں نظموں اور غزلوں کے علاوہ ''آنکھوں میں سمندر'' پر مشاہیر اور رسائل و اخبارات کے تبصرے شامل ہیں۔

3- جگر لخت۔لخت
تیسرا شعری مجموعہ جو مکمل طور پر رباعیات و قطعات پر مشتمل ہے۔ اس کی اشاعت ستمبر 2012ء کو ہوئی۔

4- پانی کا ملک پتھر کے لوگ
سانحہ مشرقی پاکستان کے پس منظر میں کہی ہوئی طویل نظم اس کی اشاعت مئی 2015 کو ہوئی۔ مگر یہ نظم سانحہ کے بعد ڈھاکے ہی میں لکھی گئی تھی۔

5- سندربن میں آگ
اس میں فلم، ٹیلی ویژن اور ریڈیو کے لیے لکھے گئے نغمات گیت اور دوہے شامل ہیں۔ اس کی اشاعت مارچ 2016ء میں ہوئی۔

ادبی رسائل و جرائد میں شاعر صدیقی کا کلام شائع ہوتا رہا سہ ماہی خیال کراچی۔ بیاض لاہور۔ سہ ماہی روشنائی کراچی۔ ماہنامہ صریر کراچی۔ سہ ماہی ارتکاز کراچی۔ طلوع افکار کراچی۔ تخلیق لاہور۔ اردو ادب راولپنڈی۔ الفاظ کراچی۔ بیسویں صدی دہلی۔ فنون لاہور۔ شمع کراچی۔ قلمکار ڈھاکا۔ آثار کلکتہ۔ میزان ڈھاکا۔ سہیل۔ گیا (بھارت) اوراق لاہور۔ آزاد ایشیا دہلی۔ میزان، سید پور۔

اس گیت کے بارے میں یہ بھی بتانے کی ضرورت نہیں کہ اس میں جدائی کے احساسات و جذبات کی کتنی سچی اور حقیقت پسندانہ عکاسی کی گئی ہے۔ جو شاعر صدیقی جیسا کہنہ مشق شاعر ہی کر سکتا ہے۔

محبوب سے ملن کی گھڑی کا بھی ایک رنگ، ایک امنگ ہوتا۔ فلمی شاعر کو ہر موڑ اور مزاج کے مطابق اپنی شاعرانہ صلاحیت کا اظہار کرنا پڑتا ہے۔ دیکھیے شاعر صدیقی نے جدائی کے جذبات کی کامیاب عکاسی کی وہاں ملن کے احساسات کا اظہار کیسے کیا۔ یہ گیت فلم ''مہربان'' کے لیے انہوں نے تحریر کیا تھا۔ آواز اور موسیقی بشیر احمد کی تھی۔ رزاق اور شبانہ پر یہ گیت عکسبند کیا گیا تھا۔

پاگل تھا میں یا دیوانہ، تم کیا ہو تمہیں کیا سمجھا تھا
اک چاند تھا اپنی قسمت میں اور میں نے اندھیرا سمجھا تھا

☆☆☆

زلفوں میں یہ نورانی چہرہ، ہو رات میں جیسے تاج محل
یہ نیند بھری بوجھل آنکھیں، پانی میں کھلے ہوں جیسے کنول
وہ خواب ہوا پورا میرا، میں جس کو ادھورا سمجھا تھا
اک چاند تھا اپنی قسمت میں اور میں نے اندھیرا سمجھا تھا

☆☆☆

سابق مشرقی پاکستان کی اور بھی کئی فلموں میں شاعر صدیقی نے اپنے دل میں اتر جانے والی شاعری سے انہیں کامیابی کے رنگ میں رنگا ہے۔ جن میں ''ایک ظالم ایک حسینہ''، ''پونم کی رات''، ''منا اور بجلی''، ''قلی'' اور ''اصلی نقلی'' کے نام شامل ہیں

1- تم کیا جانو تمہیں کیوں چاہا
کیوں دل نے تمہیں نظروں نے تمہیں
اپنایا صنم
تم کیا جانو (ایک ظالم ایک حسینہ)

2- کوئی آئے جیون لائے
بیکل آشا کل پا جائے
کوئی آئے (پونم کی رات)

3- بیتے ہوئے دن کو نہ آواز دو
نہ وہ گیت چھیڑو نہ وہ ساز دو (مینا)

4- جانے کیسے لوگ ہیں یہاں
جھوٹی عظمتوں کے پاسباں
روشنی سے دور دور
پھر بھی ہیں نشے میں چور
اے دل جائیں ہم کہاں (منا اور بجلی)

5- تم کو مبارک ہو یہ سماں شاد رہو آباد رہو

6- ہے ہے رے دیا
لاگے موہے لاج
من گبھراوے تن مسکاوے
تو نے کیا کہا آج
ہے ہے رے دیا (اصلی نقلی)

شاعر صدیقی کی شاعری کا ہر رنگ بڑا گہرا اور پُراثر ہوتا تھا۔ وہ شاعری فلموں کے لیے کریں یا ٹیلی ویژن پروگرام کے لیے۔ ریڈیو پاکستان ڈھاکا اور کراچی سے بھی نشر ہونے والے پروگراموں کے لیے انہوں نے بے شمار گیت، غزلیں اور نغمے لکھے۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد کراچی آئے تو پاکستان ٹیلی ویژن کراچی کے پروگرام ''سنڈے کے سنڈے'' سیریز کے لیے انہوں نے نغمات لکھنے شروع کیے۔ جس کے کمپوزر کریم شہاب الدین ہوا کرتے تھے۔ یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ پاکستانی پاپ سنگر عالمگیر کو شاعر صدیقی نے ہی اپنے پروگرام ''سنڈے کے سنڈے'' سے شوبز میں متعارف کروایا تھا۔ شاعر صدیقی کے لکھے گیت اور کریم شہاب الدین کی کمپوز کی دھنوں پر ''البیلا راہی'' گا کر اپنی شناخت کروائی

البیلا راہی
میں ہوں البیلا راہی
راہوں میں گاتا چلا ہوں
نغمے لٹاتا چلا ہوں
سب کو بتاتا چلا ہوں
انسانی روحیں دنیا میں
صرف ہیں پیار کی پیاسی
البیلا راہی، میں ہوں البیلا راہی

البیلا راہی کے علاوہ بھی ''سنڈے کے سنڈے'' میں شاعر صدیقی نے عالمگیر سے کئی گیت گوائے جن میں ایک نغمہ یہ بھی ہے

شہر میں گاؤں میں گھوم آیا
یہ نہ پوچھو کہ کیا کیا دیکھا
جو بھی دیکھا بس اتنا ہی سمجھا
پیار ہے زندگی کا گہنا
مانو میرا کہنا

جبکہ اس پروگرام میں دیگر گلوکار اور گلوکاراؤں کو بھی

گانے کا موقع دیا جاتا تھا۔ جن میں فاطمہ جعفری، روبینہ بدر، جمال اکبر اور دیگر کے نام شامل ہیں۔

اس پروگرام کے دوسرے اہم کردار کریم شہاب الدین جو اس پروگرام کے کمپوزر تھے ان کے بارے میں یہ بتانا ضروری ہے کہ وہ ڈھاکا ٹیلی ویژن میں بھی شاعر صدیقی کے ساتھ اسی طرح کے پروگرام کرتے رہے تھے۔ جن میں سے بیشتر کو انہوں نے کراچی ٹیلی ویژن پر بھی دوبارہ پیش کیا۔ کریم شہاب الدین کے بارے میں یہاں پاکستان میں کچھ غلط فہمیاں بھی عام ہوگئی ہیں کہ وہ بنگالی تھے جبکہ وہ بنگالی نہیں آغا خانی کمیونٹی سے تعلق رکھتے تھے۔ فلمی موسیقی ترتیب دینے سے پہلے وہ ڈھاکے میں ایک آغا خانی جماعت خانے کے میوزک بینڈ کا حصہ تھے اور ساز بجاتے تھے۔ پھر جب ڈھاکے میں اردو فلموں کا سیلاب آیا تو کریم شہاب الدین نے بھی موسیقار کی حیثیت سے اپنی قسمت آزمائی اور متعدد فلموں کی موسیقی ترتیب دی۔ اس کے علاوہ ٹی وی پر پروگرام بھی کیے اور جب وہاں کے حالات خراب ہوئے تو کراچی آگئے۔ ڈھاکے سے آنے کی وجہ سے بہت سے کم فہموں نے انہیں بنگالی سمجھا۔

شاعر صدیقی نے ''سنڈے کے سنڈے'' کے علاوہ کراچی ٹیلی وژن کے لیے ''شیشے کا گھر'' نامی میوزیکل پروگرام کے لیے بھی نغمہ نگاری کی۔ اس کے موسیقار مختلف ہوتے تھے کبھی دیبو بھٹا چاریہ، کبھی علی حسین، کبھی کوئی اور۔ جیسا کہ پہلے عرض کرچکا ہوں کہ شاعر صدیقی اور کریم شہاب الدین ڈھاکا ٹیلی ویژن سے بھی موسیقی پروگرام کرچکے ہیں۔ جن میں شہناز بیگم کا گایا ہوا مقبول گیت

کہاں ہو تم چلے آؤ محبت کا تقاضا ہے

اور

ہم تم جہاں ملے تھے پھولوں کی رہ گزر میں

خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ جنہیں بعد میں پاکستان میں بھی ٹی وی پروگراموں میں پیش کیا گیا۔ ہم تم جہاں ملے تھے...... دوبارہ پاکستان میں فاطمہ جعفری کی آواز میں پیش کیا گیا۔ اسی طرح فردوسی بیگم کی آواز میں ڈھاکے میں گایا ہوا شاعر صدیقی کا گیت

وہیں زندگی کے حسین خواب ٹوٹے

دوبارہ کراچی میں جمال اکبر سے گوایا گیا کراچی ٹی وی کے پروگرام ''بزم لیلیٰ'' کے لیے شاعر صدیقی سے نغمہ نگاری کروائی گئی۔ یہ پیش کش امیر امام کی تھی۔ موسیقار دیبو بھٹا چاریہ تھے اور آواز رونا لیلیٰ کی تھی۔ گیت کے بول تھے، کس کس کو میں بتلاؤں، یہ راز کیسے میں سمجھاؤں

کی نہیں جاتی، ہو جاتی ہے جس کا نام ہے چاہت
لٹ جاتا ہے دل ول سب کچھ رہ جاتی ہے حسرت

جیتے جی مرجانا ہی، ہے اس کا انجام
اشکوں سے منہ دھولو، ارے تم بھی تو کچھ بولو
نہ سسی ہوں، نہ ہیر ہوں، نہ لیلیٰ کی تصویر ہوں
پھر کیوں رانجھے آگے پیچھے پھرتے ہیں یوں میرے
سانجھ سویرے کرتے ہیں کیوں میری گلی کے پھیرے

ان آنکھوں پر چھائے ہیں، سوہنی اور مہینوال
ان کے بھید تو کھولو، ارے تم بھی تو کچھ بولو

اس پروگرام کا نام ''بزم لیلیٰ'' اس لیے رکھا گیا تھا کہ رونا لیلیٰ کی آواز میں اس بزم کو سجایا جاتا تھا۔ مختلف شاعروں سے گیت لکھوائے جاتے تھے جبکہ ان گیتوں کو رونا لیلیٰ کی آواز سرسنگیت کا ایک نیا رنگ دیتی تھی۔

شاعر صدیقی کا یہ نغمہ اس جگہ پورے کا پورا نقل کرنے کا یہ مطلب و مقصد ہے کہ قاری کو اس بات کا اندازہ لگانے میں آسانی ہو کہ اس گیت کا تخلیق کار اپنے جذبات و احساسات کے اظہار میں کس قدر قدرت رکھتا ہے۔ یہ مقصد گیت کے دو مصرعوں یا ایک شعر سے پورا نہیں ہوسکتا تھا۔ اس سے پہلے بھی جہاں جہاں پورا نغمہ نقل کیا گیا ہے۔ وہاں بھی یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ شاعر صدیقی کی خدا داد شاعرانہ صلاحیتوں کو اجاگر کیا جائے۔ وہ شاعر جو ایسا قادر الکلام ہے۔ فنی لحاظ سے اس قدر مستحکم ہے۔ اسے اس طرح نظر انداز کردینا کیسا ظلم اور زیادتی ہے کہ اگر کبھی اس کی شاعری کی بات ہو تو اس کا نام ساغر صدیقی یا شاعر لکھنوی ظاہر کیا جائے۔

چاند کے چہرے کو بادلوں سے جتنا بھی چھپایا جائے چاند کی چاندنی پھیل کر ہی رہتی ہے۔ شاعر صدیقی کو نظر انداز کہاں تک کیا جائے گا؟ اس کے گیتوں کے رنگ اور انگ کو کیسے فراموش کیا جائے گا؟ تو نہیں اور سہی، اور نہیں اور سہی کے مصداق کینیڈا کے پاکستانی نژاد گلوکار فردوس راجن اور امینہ راجن نے اپنی آوازوں سے شاعر صدیقی کے گیتوں پر مبنی پاپ میوزک کیسٹ Reflection کے

نام سے شالیمار ریکارڈنگ کمپنی اور پھر میگا ساؤنڈ انڈیا بمبئی سے ریلیز کیا۔

ناقدرے لوگ شاعر صدیقی کو جتنا بھی نظر انداز کریں، فراموش کریں، وہ اپنی زبردست شاعرانہ صلاحیتوں کی بنا پر فن کی دنیا میں زندہ و تابندہ رہے گا۔

شاعر صدیقی نے محض شاعری ہی نہیں کی۔ ایک فعال انسان کی طرح بھرپور زندگی بھی گزاری۔ پیدا کلکتہ میں ہوئے مگر آبائی وطن لکھنؤ ہے۔ تعلیم و تربیت اور عملی زندگی کا آغاز کلکتے سے کیا۔ جبکہ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ سابق مشرقی پاکستان اور پھر کراچی میں گزرا۔ تعلیم ایم اے (اردو ادب)۔ کل وقتی پیشہ سرکاری ملازمت اور جز وقتی صحافت، شاعری اور تصنیف و تالیف رہا۔ عملی زندگی کا آغاز سرکاری ملازمت سے کیا جبکہ جز وقتی جگن ناتھ کالج ڈھاکا سے بحیثیت اردو لیکچرار کیا۔ صحافت کی ابتداء روزنامہ ''پاسبان'' ڈھاکا اور ''نگارہ'' سے سب ایڈیٹری سے کی۔ 1967ء سے 1971ء تک ڈھاکے سے شائع ہونے والے ہفت روزہ ''چترالی'' اردو کے ایڈیٹر انچارج اور ماہانہ شمع کراچی کے مدیر معاون رہے۔ بحیثیت فری لانسر روزنامہ ''حریت'' کراچی اور ہفت روزہ ''پیمان انٹرنیشنل'' کراچی سے بھی ان کا تعلق رہا۔ ریڈیو پاکستان ڈھاکا اور کراچی سے بھی ان کی طویل وابستگی رہی۔ جس کے دوران شاعر صدیقی نے اسکرپٹ کے علاوہ بے شمار گیت، غزلیں اور نغمات لکھے۔ جن میں متعدد معروف نغمے برسوں شہناز بیگم، فردوس رحمان، مالا، رونا لیلیٰ، مجیب عالم، جمال اکبر، احمد رشدی، عالمگیر، فاطمہ جعفری، روبینہ بدر، ریحانہ یاسمین، بشیر احمد، ناہید نیازی، سلیم رضا، طلعت محمود اور میڈم نور جہاں کی آوازیں فضاؤں میں بکھیرتی رہیں۔ کراچی ٹیلی ویژن سے بھی کئی مقبول میوزیکل پروگرام کیے۔

ڈھاکے کے دوران قیام وہاں بننے والی اردو فلموں کے لیے بھی انہوں نے کہانی، مکالمے، اسکرین پلے اور گیت لکھے۔ شوکت ہاشمی کی فلم ''ہمسفر'' سے فلمی کیریئر کا آغاز کیا تو وہاں کی دیگر فلموں ''سنگم، بھیا، قلی، کارواں، بیگانہ، بینا، پائل، منا اور بجلی'' جیسی فلموں کے لیے اپنی تخلیقی کاوشوں کا مظاہرہ کیا۔ ان کی کچھ فلمیں بوجوہ ریلیز نہ ہوسکیں یا مکمل نہ ہوسکیں۔ مگر ان کے لیے شاعر صدیقی کے لکھے ہوئے گیت مارکیٹ میں آکر مقبول ہوئے۔ ایسی فلموں میں ''تان سین، اصلی نقلی، اپنی منزل اپنی راہیں'' اور ''ایک ہی راستہ'' کے نام قابل ذکر ہیں۔

شاعر صدیقی کی زندگی میں صرف کامیابیاں، کامرانیاں و خوشیاں ہی نہیں، انہیں کچھ تلخ اور صبر آزما حالات کا بھی سامنا کرنا پڑا۔

مارچ کے اواخر سے دسمبر 1971ء کے اوائل تک یعنی تقریباً نو مہینے تک پورے مشرقی پاکستان میں دہشتگردی کا راج رہا۔ قتل و غارتگری کی کارروائیاں عروج پر تھیں۔ بم پھٹ رہے تھے، مائن بلاسٹ ہو رہے تھے، دوست اور دشمن کی تمیز مٹ چکی تھی۔ گھر سے باہر نکلنے والوں کی بخیریت واپسی کی دعائیں مانگی جاتی تھیں۔ فلم اسٹوڈیوز اور فلمی دفاتر بند ہوچکے تھے۔ پھر ہونی ہوکر رہی 16 دسمبر 1971ء کو مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن گیا۔ خون آشام عفریت کی پیاس اور بھڑک اٹھی، بنگلہ دیش کی خون سے لکھی جانے والی کہانی کو سرخرو کرنے کے لیے مزید خون کی ضرورت محسوس کی گئی جو پاکستان کے لیے جان نچھاور کرنے والوں کے پاس اب بھی وافر مقدار میں موجود تھا۔

شاعر صدیقی کی تلاش شروع ہوگئی کیونکہ اپنی شخصیت کے ہمہ پہلوؤں کی وجہ سے ان کا شمار اردو داں دانشوروں میں ہوتا تھا۔ حالانکہ کلکتے سے تعلق رکھنے کی وجہ سے وہ بنگلہ زبان بھی بڑی روانی سے بولتے تھے۔ بہرحال شاعر صدیقی کے خلاف چارج شیٹ تیار ہوئی جس میں ان کے جرائم کی فہرست کچھ اس طرح تھی۔

اردو اسپیکنگ دانشور ہونا۔

بنگال میں اردو کی ترویج و اشاعت میں اہم رول ادا کرنا۔

بنگال سے اردو زبان میں ہفت روزہ چترالی نکالنا اور اس کا ایڈیٹر انچارج ہونا۔

بنگال میں اردو فلموں کے فروغ کے لیے کام کرنا۔

فلم، ٹیلی ویژن اور ریڈیو وغیرہ کے ذریعہ اردو گانے پیش کرکے بنگالی عوام کو اردو زبان کی طرف راغب کرنا۔

بنگالی آرٹسٹوں کو اردو لکھانا تاکہ وہ صحیح تلفظ کے ساتھ مکالموں کی ادائیگی کرسکیں۔

بنگلہ دیش کی تحریک کے دوران مشہور ہندوستانی گانا ''میرا سندر سپنا ٹوٹ گیا'' کی پیروڈی بنا کر بنگلہ دیشی تحریک کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرنا۔ گانا کچھ یوں تھا۔

''میرا سندر سپنا ٹوٹ گیا''
سب پاکستانی ایک ہیں
اک ساتھی مجھ سے چھوٹا

اب کلکتہ کے رہنے والے
ہلسا مچھلی کھائیں گے
میری بنتی بازی بگڑ گئی
میرا بیچ میں بھانڈا پھوٹ گیا
میرا سندر سپنا ٹوٹ گیا

(حالانکہ یہ پیروڈی شاعر صدیقی نے نہیں لکھی تھی۔ مگر چونکہ شہناز بیگم نے اسے گایا تھا اور ان دنوں وہ سارے اردو گانے شاعر صدیقی کے لکھے ہوئے ہی گاتی تھیں۔ لہٰذا جرائم کی فہرست بنانے والوں نے اس پیروڈی کو بھی شاعر صدیقی کے کھاتے میں ڈال دیا اور اس مضحکہ خیز چارج شیٹ کا ایک حصہ بنالیا)

اس چارج شیٹ کی خبر شاعر صدیقی کو ہوئی تو انہیں روپوش ہونا پڑا۔ رات کی تاریکی میں چھپتے چھپاتے وہ اپنے دوست مصطفیٰ کمال جو سحر عظیم کا ادبی نام بھی استعمال کرتے تھے۔ ان کے گھر پہنچے۔ دوست نے گھبرا کر پوچھا۔ ''خیریت تو ہے؟''

''نہیں......بہت گڑبڑ ہے۔''

اور پھر اس گڑبڑ کی تفصیل سے مصطفیٰ کمال عرف سحر عظیم کو آگاہ کر دیا۔ ''کسی وقت بھی کوئی میری تلاش میں میرے گھر آسکتا ہے۔ اس لیے میں تمہارے گھر چلا آیا۔''

''بہت اچھا کیا۔'' کہہ کر دوست نے انہیں ایک کمرے میں چھپا دیا۔ دوسری طرف دوست کی بیوی ایک دم پریشان ہوگئی۔

''یہ آپ نے کیا کیا؟'' اس نے شوہر کو جھنجوڑ کر کہا۔ ''اتنے ''خطرناک مجرم'' کو اپنے گھر میں پناہ دے کر آپ نے اپنے لیے بھی خطروں کو دعوت دے دی ہے۔ مکتی، باہنی والے ایسے خطرناک مجرم کا ساتھ دینے والے کو کسی رعایت کا مستحق نہیں سمجھیں گے۔ آپ کو کیا یہ حقیقت معلوم نہیں کہ مکتی باہنی والے جس کے پیچھے پڑے وہ موت کے گھاٹ ضرور اترا۔''

حواس باختہ بیوی کو شوہر نے سمجھایا۔ ''مجھے سب معلوم ہے۔ مگر میں ایسے حالات میں اپنے دوست کی مدد نہ کروں۔ یہ میرے لیے ناممکن ہے۔ گھبراؤ مت۔ اللہ سے بہتری کی دعا کرو۔ ناخدا جن کا نہ ہو، ان کا خدا ہوتا ہے۔''

دل سے نکلی ہوئی دعائیں بارگاہ ایزدی میں قبول ہوئیں اور اگلے ہی دن مکتی باہنی کا ایک کمانڈر شمس الدین المعروف مامون شاعر صدیقی کے گھر پہنچا۔

وزیر اطلاعات و نشریات کے نام شاعر صدیقی کے خط کا اقتباس

شہناز بیگم کی آواز میں میری ایک غزل
کہاں ہو تم چلے آؤ محبت کا تقاضا ہے

ریڈیو پاکستان کراچی سے 15 اگست 1983ء کی صبح نشر ہوئی۔ اس کے ساتھ شاعر کا نام بجائے شاعر صدیقی کے کچھ اور نشر کیا گیا۔ ریڈیو یہ غلطی اس سے پہلے بھی کرتا رہا ہے۔ 3 دن بعد 18 اگست 83ء کو پروگرام ''بہار صبح'' میں ایک مرتبہ پھر یہی نغمہ اسی آواز میں میرے نام کے بغیر نشر کیا گیا۔ واضح رہے کہ میری یہ غزل میری اجازت کے بغیر 1971ء میں سقوط ڈھاکا سے قبل کراچی ریڈیو نے ریکارڈ کی تھی۔ شہناز بیگم ان دنوں کراچی آئی ہوئی تھی۔ بارہ سال کے عرصے میں یہ غزل سینکڑوں بار نشر ہو چکی، جبکہ اکثر میرا نام ہی نشر نہیں کیا گیا۔ میں نے 25 فروری 1981ء کو بذریعہ رجسٹری ڈاک اس غزل کی رائلٹی طلب کی تھی۔ پھر یاد دہانی کے لیے خطوط بھی لکھے تھے۔ لیکن مجھے کوئی جواب نہیں ملا۔ البتہ اس کے بعد یہ غزل نشر ہونا بند ہوگئی۔

شاعر صدیقی

دروازے پر دستک دینے پر شاعر صدیقی کا چھوٹا عبدالسلام باہر نکلا۔ ''شاعر صدیقی کہاں ہے، اسے بلاؤ۔''

''وہ یہاں نہیں ہیں۔''

''پھر کہاں ہے؟''

''یہیں، اسی محمد پور میں، اپنے ایک دوست کے گھر میں چھپے ہوئے ہیں۔''

''چلو۔ مجھے وہاں لے چلو۔''

شاعر صدیقی کا لرزہ براندام بھائی مکتی باہنی کے کمانڈر شمس الدین المعروف مامون کے ساتھ سحر عظیم کے گھر پہنچا تو اڑوس پڑوس کے گھروں کے علاوہ سحر عظیم کے گھر میں بھی کہرام مچ گیا۔ کیونکہ ان دنوں مکتی باہنی اردو داں طبقے کے لیے فرشتۂ اجل ہی ہوا کرتی تھی۔

''دیکھا، وہی ہوا نا جس کا ڈر تھا۔'' سحر عظیم کی بیگم نے ان سے کہا۔

سحر عظیم کی تھرتھر کانپتی ہوئی بیوی کو شوہر نے سمجھایا۔

''ڈرنے کی خوفزدہ ہونے کی کوئی بات نہیں، مکتی باہنی کا یہ کمانڈر شاعر صدیقی کا بہت اچھا دوست ہے۔ ان کی دوستی کالج کے زمانے سے ہے۔ وہ انہیں نقصان پہنچانے نہیں، ان کی مدد کرنے کو آئے ہیں۔''

کمانڈر مامون نے شاعر صدیقی سے مل کر کہا۔

''شاعر تم گھبراؤ مت جب تک مامون زندہ ہے کوئی تمہیں ہاتھ بھی نہیں لگا سکتا۔''

اتنا کہہ کر مامون چلا گیا۔ مگر دوسرے دن پھر آیا۔ شاعر صدیقی کو مکتی باہنی محمد پور سیکٹر آفس لے گیا۔ مامون غالباً پہلے ہی سارے معاملات طے کر آیا تھا۔ پھر بھی شاعر صدیقی کو ان کے جرائم کی فہرست پیش کی گئی۔ یعنی فرد جرم عائد کیا گیا۔ ادھر سحر عظیم اندر ہی اندر گھبرا رہے تھے کہ جانے شاعر صدیقی کے حق میں کیا فیصلہ ہوتا ہے۔ وہ واپس آتے بھی ہیں یا...... ؟ مگر تھوڑی دیر بعد شاعر ان کے سامنے صحیح سلامت کھڑے تھے۔ تو سحر عظیم نے اطمینان کا سانس لیا۔

''کیا ہوا؟'' اس سے زیادہ اور کچھ نہ بول سکے۔

''مامون نے جان بخشی تو کروادی مگر میری زندگی کا تاوان پانچ ہزار روپے قرار دیا گیا۔''

1971ء میں پانچ ہزار روپے ایک بڑی رقم ہوتی تھی۔ ''جان بچی سو لاکھوں پائے۔'' سحر عظیم بولے ''یہ بڑی رقم سہی، مگر تمہاری جان سے بڑھ کر تو نہیں۔''

شاعر صدیقی نے یہ رقم ادا کردی اور ان کی جان بخشی ہوگئی۔ یہ ایک معجزہ سے کم نہ تھا۔ کیونکہ مکتی باہنی کے ہتھے چڑھنے والے غالباً وہ واحد آدمی تھے جو زندہ بچ گئے۔

اس موقع پر یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں ہوگی کہ وہی مکتی باہنی والے چند دنوں بعد شاعر صدیقی کے گھر آئے اور ان سے ان کی فلموں کے گانوں کے ریکارڈز یہ کہہ کر لے گئے کہ ہم لوگ آزادی کا جشن منا رہے ہیں۔ وہاں ان گانوں کی ریکارڈنگ کریں گے۔ واضح رہے کہ یہ سارے کے سارے گانے اردو میں تھے۔

کچھ دنوں بعد شاعر صدیقی بڑی خاموشی کے ساتھ اپنی فیملی کے ہمراہ ڈھاکے سے کلکتے پہنچے اور کلکتہ سے نیپال چلے گئے۔ ان دنوں دلالوں کے ذریعہ غیر قانونی طور پر بارڈر کراس کرایا جاتا تھا۔ جو کسی طرح بھی خطرے سے خالی نہیں تھا۔ اس میں پکڑے جانے کا بھی امکان ہوتا تھا اور دلالوں کے ہاتھوں لوٹے جانے کا بھی۔ بہر حال شاعر صدیقی اپنی اہل وعیال کے ساتھ بخیریت کلکتہ اور کلکتے سے نیپال پہنچ گئے اور پھر جب پاکستان سے کلیئرنس آگیا تو کراچی آگئے۔

نیپال سے وطن واپسی کے وقت انہوں نے ''نذرانہ محبت'' کے عنوان سے جو طویل نظم کہی ہے۔ وہ بہت خوبصورت، بہت اثر انگیز اور ان کے احساسات و جذبات کی حسین تصویر ہے۔ اس طویل نظم کے چند اشعار نمونتاً پیش ہیں۔

الوداع اے دیار کھٹمنڈو
یاد آتا رہے گا ہم کو تو
تیرے احسان مند ہیں ہم لوگ
کہ حقیقت پسند ہیں ہم لوگ
دے دیا تو نے آشتی کا ثبوت
اور انسان دوستی کا ثبوت
ارض بنگال کے ستائے ہوئے
آج ہیں تیرے در پہ آئے ہوئے
ہوگئی تنگ جب زمیں اپنی
تو نے آغوش اپنی پھیلادی

اس طرح کے دیگر اشعار کے سوا نیپال اور اس کے حسن کی عکاسی بھی اس نظم کا حسن ہے۔

شاعر کے کراچی آنے کے کچھ دنوں کے بعد مجھے خبر ملی کہ میرا یار نہ صرف بخیریت یہاں آگیا ہے بلکہ کراچی ٹیلی ویژن کے میوزیکل پروگرام کے لیے نغمہ نگاری بھی کر رہا ہے۔ واضح ہو کہ میں جولائی 1969ء میں کراچی آگیا تھا جبکہ شاعر صدیقی 1973ء میں کراچی پہنچے۔ ان سے جب پہلی ملاقات ہوئی تو میں نے پوچھا۔

''یار! کراچی آتے ہی ٹیلی ویژن تک کیسے رسائی حاصل کرلی؟''

''یہ قصہ یوں ہے کہ ایک دن شام کے وقت کراچی ٹیلی ویژن کا پروگرام دیکھ رہا تھا کہ موسیقار کریم شہاب الدین کا نام دیکھا۔ تم بخوبی جانتے ہو کہ کریم شہاب الدین کے ساتھ ڈھاکے میں کتنی فلمیں کرچکا ہوں اور کتنے ٹی وی پروگرام۔''

''ہاں مجھے بخوبی علم ہے۔''

''بس میں اپنی پہلی فرصت میں کراچی ٹیلی ویژن جا پہنچا۔ کریم شہاب الدین مجھ سے لپٹ گیا اور چھوٹتے ہی کہا۔ ''آپ زندہ ہیں؟''

''آپ زندہ ہیں۔'' اس نے کہا تو میں چونکے بغیر نہ رہ سکا۔ اس نے میری حیرت دور کرتے ہوئے بتایا کہ ''یہاں تو یہ خبر پھیل گئی تھی کہ شاعر صدیقی کو مکتی باہنی نے مار ڈالا ہے۔''

بہر حال کریم شہاب الدین نے مجھے پی ٹی وی کے کئی پروڈیوسروں، گلوکاروں اور اداکاروں سے ملوایا۔ جن میں پروڈیوسر امیر امام، قریش پور، تصور آفتاب، آفتاب عظیم اور عارفین کے علاوہ معین اختر، شکیل، خالد نظامی اور گلوکاروں میں افراہیم اور روبینہ بدر قابلِ ذکر ہیں۔ یہاں والے مجھے میرے دو گیتوں کے حوالے سے جانتے ہیں وہ دو گیت شہناز بیگم نے یہاں خوب گائے جو بے حد مقبول ہوئے۔ جو یہ ہیں

1- کہاں ہو تم چلے آؤ محبت کا تقاضا ہے

2- ہم تم جہاں ملے تھے پھولوں کی رہ گزر میں

اس کے علاوہ فلم ''بھیا'' کی قوالی۔ مدینے والے سے میرا اسلام کہہ دینا۔

جو ان دنوں ریڈیو پاکستان سے تقریباً ہر روز ہی فرمائشی پروگرام میں نشر ہوتی تھی۔

قصہ مختصر یہ کہ اسی دن پروڈیوسر عارفین نے اپنے پروگرام ''شیشے کا گھر'' کے لیے ایک نظم کی فرمائش کی جسے دوسرے ہی دن کریم شہاب الدین کی موسیقی پر لکھا جو روبینہ بدر کی آواز میں ریکارڈ ہو کر نشر ہوا۔ اس کے بعد امیر امام کے پروگرام ''بزم لیلیٰ'' کے لیے موسیقار دیبو بھٹا چاریہ کی موسیقی میں گیت لکھا جو رونا لیلیٰ کی آواز میں آن ائیر ہوا۔ اس کے بعد اس وقت کے جنرل منیجر پی ٹی وی کنور آفتاب کے پروگرام ''سنڈے کے سنڈے'' جو پاکستان کا پہلا پاپ میوزک پروگرام تھا کے لیے مجھ سے گیت لکھوائے گئے۔ پہلا پروگرام تارا گنشام اور افراہیم کی آواز میں ریکارڈ ہو کر مقبول ہوا۔ (یہ پروگرام نو مہینے جاری رہا۔ ایک دو پروگرام کنور آفتاب کی سرپرستی میں ہوئے پھر ظہیر خان کے سپرد کر دیئے گئے۔

''یہ عالمگیر اور اس کے گیت ''البیلا راہی کی کیا کہانی ہے؟''

''عالمگیر اس وقت تک پی ٹی وی میں صرف گٹار بجانے پر مامور تھا۔ میری درخواست پر ظہیر خان نے عالمگیر کو بطور گلوکار گانے کا موقع دیا۔ اس کے پہلے گیت کے لیے مجھ سے کہا گیا۔

''تو پھر آپ ہی اس کے لیے کوئی نغمہ لکھیں۔''

''عالمگیر ایک فرنچ گانا۔ وان تا نا میرا، گٹار بجاتے وقت اکثر گایا کرتا تھا۔ عالمگیر نے مجھ سے کہا۔ ''شاعر صاحب۔ آپ اس فرنچ گانے کی دھن پر گانا لکھیں۔''

پھر جب اس دھن پر کریم شہاب الدین نے موسیقی ترتیب دی تو میں نے ''البیلا راہی'' لکھا۔ جسے عالمگیر نے گایا اور ہٹ ہو گیا۔

کچھ دنوں کے بعد مجھے اطلاع ملی کہ شاعر صدیقی نے ٹیلی ویژن کے لیے نغمہ نگاری ترک کر دی ہے۔ یہ اطلاع میرے لیے اچھی نہیں تھی۔ پھر جب مجھے اس سے ملاقات کا موقع ملا تو میرا پہلا سوال یہی تھا۔

''کیا یہ خبر درست ہے کہ تم نے ٹی وی پروگراموں کے لیے لکھنا بند کر دیا ہے۔''

''ہاں۔ بالکل درست ہے۔''

''مگر کیوں۔ تم نے ایسا کیوں کیا؟''

اس لیے کہ ٹی وی سے ملنے والے پیسے بہت کم ہوتے تھے۔ اس لیے میں نے روزنامہ ''حریت'' کراچی، پی پی آئی (PPI) کے ویکلی اخبار پیمان انٹرنیشنل اور ماہ نامہ ''شمع'' کراچی سے فری لانسر صحافی کے طور پر منسلک ہو گیا ہوں۔ ان تمام کاموں کے باوجود میری آمدنی اتنی نہیں تھی جس سے میرے گھر کے اخراجات پورے ہوتے۔ لہٰذا مجھے نوکری ڈھونڈنی پڑی۔ نوکری ملی بھی تو واپڈا کے پروجیکٹ ''حب ڈیم'' پر جو ان دنوں زیر تعمیر تھا۔ مجھے روزانہ کراچی سے سندھ اور بلوچستان کے بارڈر ''حب ندی'' پر صبح سات بجے جانا پڑتا تھا اور واپسی شام کے سات بجے ہوتی تھی۔ اس نوکری کے چکر میں مجھے ٹیلی ویژن سے اپنا رابطہ منقطع کرنا پڑا۔ البتہ صحافت اور ادبی رسالوں سے جڑا رہا۔

اس ملاقات کے دوران شاعر نے مجھے ایک افسوسناک بات بتائی۔ اس نے کہا کہ ''اس دوران مجھے خبر ملتی رہی کہ میرے گیت اکثر و بیشتر ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر دوسرے گیت نگاروں کے نام سے نشر ہو رہے ہیں۔''

''ارے نہیں......!!'' میں نے حیرت کا اظہار کیا۔

''یہ تو ان لوگوں کے لیے بڑی شرمناک بات ہے۔''

''یار! اس کی ابتداء تو'' اس وقت سے ہو گئی تھی جب میں ڈھاکے میں تھا۔

''اچھا''!

''یہاں پہنچنے کے بعد میرے علم میں یہ بات آئی کہ میرا ایک گیت جسے ڈھاکے میں فردوسی بیگم نے گایا تھا کراچی ٹیلی ویژن سے کسی اور نغمہ نگار کے نام سے جمال اکبر نے گایا ہے۔ اس سلسلے میں جب میں نے کریم شہاب الدین سے بات کی تو اس نے اس کا اعتراف کیا اور مجھ سے معافی مانگی اور کہا کہ کراچی ٹیلی ویژن پر قدم جمانے کے لیے میں نے یہ غلطی کی۔ پھر میں نے اس کے پروڈیوسر کا نام پوچھا تو اس نے بتایا۔ ''عارفین'' عارفین سے میں نے

شکایت کی تو اس نے بتایا کہ یہ اس کے علم میں نہیں تھا کہ یہ نغمہ تمہارا کیا ہوا ہے۔ اس نے اس کا ذمہ دار کریم شہاب الدین کو ٹھہرایا۔''

''مگر یار۔ انہوں نے ایسا کیوں کیا؟''

شاید اس کی وجہ وہ افواہ ہو کہ شاعر صدیقی تو مکتی باہنی کے ہاتھوں مارا گیا ہے۔ کریم شہاب الدین نے سوچا ہوگا کہ اب کون ہے جو اس کی تردید کرے گا۔ بہرحال عارفین نے وعدہ کیا کہ اب یہ گیت

وہیں زندگی کے حسین خواب ٹوٹے

مرے ہمسفر تم جہاں سے روٹھے

نشر نہیں ہوگا۔ اور ایسا ہی ہوا۔ اس گیت کے دو انترے میرے لکھے ہوئے تھے جبکہ اس کا تیسرا انترا اس کا تھا جس کے نام پر یہ نغمہ نشر ہوا۔

پھر شاعر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''یہ بات بڑی دلچسپ ہے کہ اس شاعر کے نام پر کراچی کی ایک سڑک بھی منسوب ہے۔''

''تمہاری عدم موجودگی میں جو کچھ ہوا، اس کو تو گولی مارو۔'' میں نے کہا۔ ''یہ بتاؤ تمہاری موجودگی میں تمہارے ساتھ کیا زیادتی ہو رہی ہے؟''

شاعر نے پہلے ایک ٹھنڈی آہ بھری پھر کہا۔ ''ففٹی ففٹی'' پی ٹی وی کا ایک مقبول پروگرام ہے۔ 4 مارچ کو اس کا جو پروگرام ہوا۔ اس کا پہلا نغمہ

پیار ہے زندگی کا گہنا

مانو میرا کہنا

میرے نام کے بغیر کسی اور شاعر کے نام سے چلایا گیا۔ جبکہ یہ نغمہ 1974ء میں پی ٹی وی کے پروگرام ''سنڈے کے سنڈے'' میں عالمگیر گا چکا ہے۔

اسی طرح پی ٹی وی کے ایک پروگرام ''جھرنے'' میں میرا ایک مشہور گیت

ہم تم جہاں ملے تھے پھولوں کی رہ گزر میں

شامل کیا گیا۔ یہ فاطمہ جعفری کی آواز میں ریکارڈ کیا گیا۔ جبکہ یہ نغمہ ڈھاکے میں شہناز بیگم نے گایا تھا۔

چوری اور سینہ زوری کی ایک مثال پاکستان ٹیلی ویژن اسلام آباد نے اس وقت قائم کی جب اس کا ڈراما ''ہم کہ ٹھہرے اجنبی'' نشر ہوا۔ جس میں میرے دونوں مشہور گیت اور غزل

1- ہم تم جہاں ملے تھے پھولوں کی رہ گزر میں

2- کہاں ہو تم چلے آؤ محبت کا تقاضا ہے

نیرہ نور کی آواز میں شامل کیے گئے تھے۔ یہ کوئی عام ڈراما نہیں تھا۔ اس کی مصنفہ حسینہ معین اور پروڈیوسر خواجہ نجم الحسن تھے۔ ڈرامے کا نام فیض احمد فیض کے ایک مصرعہ کا اجراء تھا۔ جبکہ ٹیلپ پر نام بھی فیض احمد فیض کا تھا۔ جس کی وجہ سے شاید متعدد ناظرین کو یہ غلط فہمی ہوئی کہ یہ گیت فیض احمد فیض کے ہیں۔

''تو کیا تمہارے یہ دونوں نغمے تمہاری اجازت کے بغیر شامل کیے جانے کے علاوہ ان کے بارے میں تمہارا نام بھی ظاہر نہیں کیا گیا تھا۔''

''اگر میرا نام ظاہر کرتے تو میں یہ کیوں کہتا کہ متعدد ناظرین کو یہ غلط فہمی ہوئی ہوگی کہ یہ گیت فیض احمد فیض کے ہیں۔''

''مگر یار! تمہارے یہ دونوں گیت تو کریم شہاب الدین کی موسیقی میں 1968ء میں ڈھاکا ٹیلی ویژن سے نشر ہو کر ملک گیر طور پر مقبول ہو چکے تھے۔ اس کے باوجود پروڈیوسر خواجہ نجم الحسن اور مصنفہ حسینہ معین کی یہ بے خبری؟ اسے ان کی بے خبری کہا جائے یا دیدہ و دانستہ دیدہ دلیری کہ ہم نہیں ظاہر کرتے اصل شاعر کا نام۔ جس کو جو کرنا ہے کر لے۔

''میں کیا عرض کر سکتا ہوں۔ بڑے لوگوں کی بڑی باتیں ہوتی ہیں۔''

''اتنی زیادتی اور اس قدر ظلم کے باوجود تم نے کچھ نہیں کیا۔ خاموش بیٹھے رہے؟''

''نہیں، میں خاموش نہیں بیٹھا۔ میں جو کر سکتا تھا کیا۔ میں صحافی ہوں اس لیے اخبارات کا سہارا لیا۔ روزنامہ حریت کراچی، روزنامہ نوائے وقت کراچی اور روزنامہ جنگ کراچی میں اس ظلم اور زیادتی کے خلاف خبریں اور مضامین اور کالم شائع کروائے۔ اپنے وکیل کے ذریعہ قانونی نوٹس بھجوائے مگر کوئی ٹس سے مس نہیں ہوا۔ کیونکہ میرے مالی وسائل ایسے نہ تھے کہ کورٹ کچہری کے اخراجات برداشت کر سکتا۔'' اتنا کہہ کر وہ ذرا رکا پھر بولا۔ ''یار انور فرہاد! تو بھی تو اپنے اخبار میں ان بڑے لوگوں کی چوری اور سینہ زوری کے بارے میں لکھ۔''

میں ان دنوں ہفت روزہ ''نگار'' کراچی میں اداریہ اور ایک کالم لکھا کرتا تھا۔ میں نے بھی اپنے طور پر اس ظلم اور زیادتی کی کہانی لکھی۔ مگر ان بے ضمیروں پر کیا اثر ہوتا جن پر حریت، نوائے وقت اور جنگ کی تحریروں کا کوئی اثر نہیں ہوا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

جن پہ ہے ناز
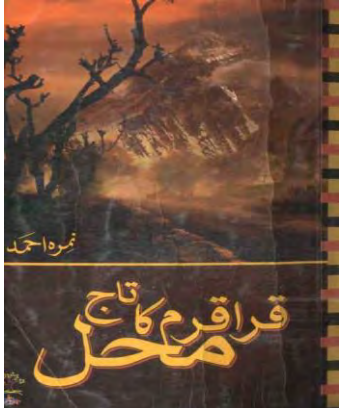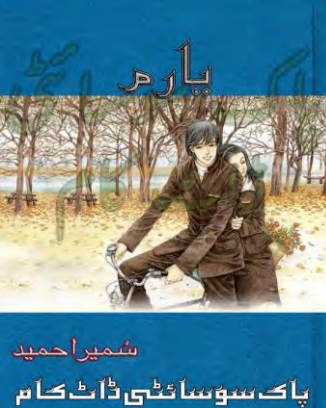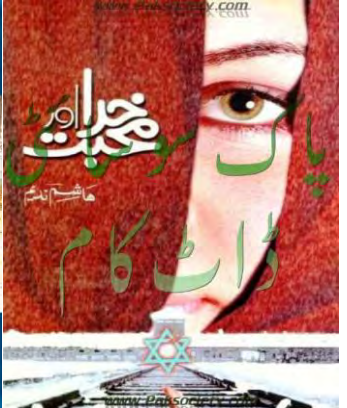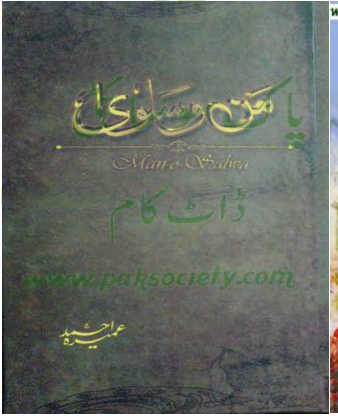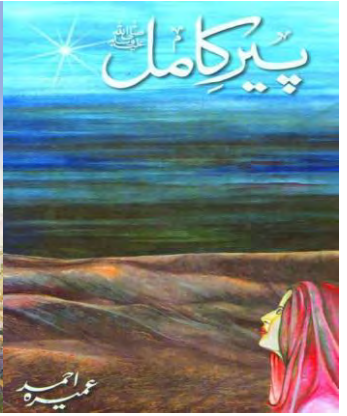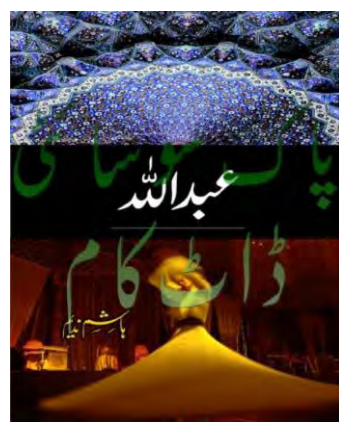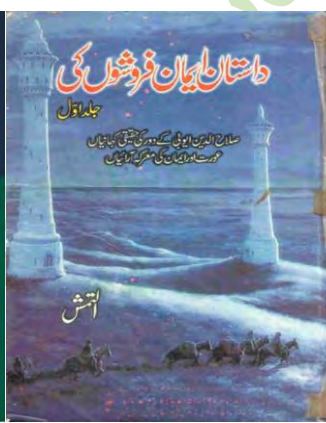
شکور پٹھان

کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کا نام آتے ہی سر عقیدت سے جھک جاتا ہے، ایسے روشن مینارہ لوگوں کی تعداد کم نہیں لیکن افسوس تب ہوتا ہے جب نئی پود کو ان سے لاعلم پاتے ہیں۔ چند ایسے ہی لوگوں کا مختصر مختصر سا ذکر جن کی وجہ سے ہمارا سر فخر سے بلند ہے۔

چند قابلِ فخر ہستیوں کا تذکرۂ خاص

خاندان، ایک مقدس ادارہ، ایک بابرکت لفظ، ایک پہچان، ایک پناہ گاہ، ایک ٹھنڈی چھاؤں۔

کسی کے لیے فخر کا نشان تو کسی کے لیے شرمندگی کا باعث۔ کوئی خاندان لیے سر اونچا کرنے کا سبب تو کوئی خاندان کے لیے رسوائی کا اعلان۔

خاندان، سماج کی عمارت کی پہلی اینٹ بہترین انسان، بہترین خاندان تشکیل دیتے ہیں اور بہترین خاندان بہترین معاشرے وجود میں لاتے ہیں۔ کوئی خاندان یا گھرانا ایسا کہ لوگ کہہ اٹھیں، ایں خانہ ہمہ آفتاب است۔

جیسے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا خاندان۔ شاہ صاحب خود اپنے وقت کے مجدد تو بڑے بیٹے شاہ عبدالعزیز، ساٹھ سال تک قرآن اور حدیث کا علم پھیلانے والے تو دوسرے

بیٹے شاہ رفیع الدین سب سے پہلے قرآن کا اردو ترجمہ کرنے والے، تو تیسرے شاہ عبدالقادر سب سے پہلے قرآن کی اردو تفسیر کرنے والے۔ ایک اور بیٹے شاہ عبدالغنی کے بیٹے شاہ اسماعیل شہید جیسے عالم باعمل اور مجاہد۔

جہاں کچھ خاندان دینداری، علم وفضل، راست وپاکیزگی کی مثال تو کچھ قہاری اور ظلم وجبر کا نشان جیسے، چنگیز، ہلاکو اور قبلائی خان۔

خاندانوں نے ملکوں پر حکومت کی جیسے ہندوستان پر موریہ، سورج ونشی، ناگ بنسی، راجپوت، لودھی، تغلق، خلجی، خاندان غلاماں اور تین سو سال تک حکمراں رہنے والے مغل۔

خاندانوں کی حکومتیں آزادی کے بعد بھی رہیں جیسے دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت بھارت پر نہرو خاندان کی تین نسلوں نے راج کیا۔

میرے ملک میں بدقسمتی سے کچھ ایسے خاندانوں کی حکومتیں رہیں اور ہیں کہ لوگ باگ نام سن کر کانوں کو ہاتھ لگاتے ہیں لیکن باریاں لے لے کر یہی خاندان مرکز اور صوبوں میں پیر تسمہ پا کی مانند ہم پر سوار رہتے ہیں جن کی وجہ سے لوگ خاندان کے مقدس لفظ سے بھی بدکتے ہیں۔

میں ان خاندانوں کا ذکر کر کے آپ کا جی خراب نہیں کرنا چاہتا، کیوں کہ میرے ملک میں ایسے گھرانے بھی ہیں جنہوں نے اپنے اپنے شعبے میں نہ صرف خود نام کمایا بلکہ ملک کا نام بھی اونچا کیا۔ کسی نے علم وہنر میں، کسی نے خدمت خلق میں تو کسی نے موسیقی، تو کوئی مصوری تو کوئی گھرانا شعروادب میں نمایاں رہا، تو کسی نے کھیل کود میں نام کمایا۔

میرے شہر کراچی کی خوش قسمتی کہ یہاں دو ایسے بھی خاندان گزرے کہ دور دور تک ان کا شہرہ رہا۔ جن کا نام چہار دانگ عالم میں گونجتا رہا۔ جن کی عظمت کے اپنے پرائے سب ہی گن گاتے رہے۔ یہ وہ گھرانے ہیں جنہوں نے میرے ملک سے لیا تو کچھ نہیں لیکن دنیا میں میرے ملک کا نام روشن کیا۔

محمد برادرز

ہوش سنبھالا تو قائد اعظم اور شہید ملت کے بعد تین ناموں کا چرچا تھا۔ انہیں ہی میں ملک کی اہم ترین شخصیات مانتا تھا۔ ان میں ایک تو تھے اس وقت کے صدر جنہیں ہم جنرل ایوب کے نام سے جانتے تھے۔ اخباروں، ہوٹلوں، دکانوں، بازاروں اور سینما ہال، ہر جگہ جنرل صاحب کی تصویر، یونیفارم پہنے ہوئے، نظر آتی۔ جنرلوں سے ہمارے رومانس کا نیا نیا آغاز ہوا تھا۔ دوسری تھیں ملکہ ترنم نور جہاں جن کی مدھ بھری آواز صبح شام سنائی دیتی حالانکہ اس وقت یہ ہوش نہیں تھا کہ نور جہاں کی آواز کون سی ہے اور زبیدہ خانم، کوثر پروین یا آئرین پروین کی آواز کون سی ہے لیکن نور جہاں کا نام ایسا بھاری بھرکم تھا اور ان کے تذکرے اتنے سنتے کہ ہم انہیں کوئی ماورائی ہستی جانتے تھے۔

چوتھے جو تھے ان کے نام کے ساتھ ایک لفظ ذہن میں گونج جاتا اور وہ لفظ تھا سنچری کہ اس کے ساتھ ہی حنیف محمد یاد آتے تھے۔ اگر ہمارے شروع کے دنوں کی کرکٹ میں فضل محمود اور حنیف محمد نہ ہوتے تو کرکٹ ابتدا ہی سے اتنی مقبول نہ ہوتی کہ ان دنوں صرف پڑھے لکھے اور پیسے والے ہی کرکٹ کا شوق رکھتے تھے۔ عوام الناس تو فٹبال، ہاکی اور کبڈی جیسے کھیل کھیلتے کہ کرکٹ کا کھیل خاصا مہنگا تھا۔

سولہ برس کی بالی عمریا سے ہی حنیف محمد نے ایسے ایسے کارنامے انجام دیے کہ سالہا سال تک کوئی ان کے قریب بھی نہیں پہنچ سکا۔ یہ نوخیز نوجوان اس وقت کے سیاہ طوفان، ویزلی ہال جس کے بارے میں ضمیر جعفری نے کہا تھا کہ ہال آتا ہے اس سے پہلے حال آتا ہے اور گلکرسٹ کی خونخوار بولنگ کے سامنے ساڑھے سولہ گھنٹے چٹان کی طرح ڈٹا رہا اور 337 رنز کی یادگار باری کھیل کر ایک یقینی ہار کو ''ڈرا'' میں تبدیل کردیا۔ یہ ایک ایسا ریکارڈ ہے کہ ساٹھ سال گزرنے کے باوجود کوئی اس کے قریب بھی نہ پہنچ سکا۔

عزم وہمت کا پہاڑ، توجہ اور یکسوئی کے ضرب المثل۔ حنیف کے زمانے میں ٹیسٹ کرکٹ کم کم ہی ہوتی تھی۔ ایک روزہ اور بیس اوور کی ''تماشا'' کرکٹ کا تو دور دور وجود نہ تھا لیکن حنیف نے ایسے ایسے کارنامے انجام دیے کہ وہ نوجوانی ہی میں انہیں ''دلیجنڈ'' کا درجہ دے دیا گیا اور ''لٹل ماسٹر'' ہر دل کی دھڑکن بن گئے۔

محمد برادرز کا سب سے درخشاں ستارہ تو حنیف محمد ہی تھے لیکن ان کے بھائیوں نے بھی ایک سے بڑھ کر ایک ہاتھ اس کھیل میں دکھائے۔

ریاست جوناگڑھ کی بیڈمنٹن چیمپئن 'امیر بیگم' کے پانچ بیٹوں میں سے چار نے ٹیسٹ کرکٹ میں پاکستان کی نمائندگی کی۔ جب کہ ایک بیٹے رئیس محمد بھی ایک میچ میں بارہویں کھلاڑی تھے۔ حنیف محمد کے بڑے بھائی وزیر محمد کے علاوہ ان کے چھوٹے بھائیوں مشتاق اور صادق نے بھی پاکستان کے لیے ٹیسٹ کرکٹ کھیلی۔ حنیف کے بیٹے شعیب

محمد نے بھی پاکستان کی نمائندگی کی اور محمد خاندان کی روایتوں کو برقرار رکھا۔ ستر کی نصف دہائی تک پاکستان کے لیے بنائی جانے والی سنچریوں میں محمد برادرز کا حصہ نصف سے زیادہ تھا۔ محمد فیملی کے پانچ فرزندوں نے پاکستان کا سبز کوٹ پہنا اور ایسا پہنا کہ حق ادا کر دیا۔

سب سے بڑے بھائی وزیر محمد نے پاکستان کے لیے بیس میچ کھیلے اور دو بار سنچری بنانے کا اعزاز حاصل کیا۔

مشتاق محمد ایک بہترین آل راؤنڈر ہونے کے علاوہ پاکستان کے کامیاب ترین کپتانوں میں سب سے ذہین کپتان تھے۔ اپنے وقت میں مشتاق ٹیسٹ کرکٹ کھیلنے والے نوجوان ترین کھلاڑی تھے جنہوں نے پندرہ سال کی عمر میں پاکستان کے لیے کھیلا۔ 57 میچوں میں دس سنچریاں بنانے کے علاوہ مشتاق نے اپنی مشہور گگلی کی مدد سے 79 وکٹ بھی حاصل کیے۔ وکٹ اور موسم کے اور دستیاب ٹیم کے ساتھ کھیل کی بہترین حکمت عملی، مشتاق کا کمال تھا۔ سترہ سال کے وقفے کا بعد جب بھارت اور پاکستان کے کرکٹ تعلقات بحال ہوئے تو یہ مشتاق کی کپتانی کا اعجاز تھا جس نے بھارت کو دو صفر کی شکست سے دوچار کیا۔ یہ اور بات ہے کہ مشتاق نے کبھی اس قوم کو نہیں جتایا کہ ''جب میں کپتان تھا۔'' جیسا کہ ایک سابق کپتان اٹھتے بیٹھتے کہتے رہتے ہیں۔

سب سے چھوٹے بھائی صادق نے 41 میچوں میں پاکستان کی نمائندگی کی اور پانچ سنچریاں بنائیں۔ بائیں ہاتھ سے جارحانہ بلے بازی کرنے والے صادق کی ماجد خان کے ساتھ افتتاحی جوڑی نے پاکستان کو کئی بار کامیاب آغاز مہیا کیا۔

ستر کی دہائی میں ویسٹ انڈیز کی کالی آندھی کے خلاف کراچی ٹیسٹ صادق کا ایک یادگار میچ ہے۔ سر پر شدید چوٹ لگنے کی وجہ سے صادق میدان سے باہر تھے لیکن جب دن کے اختتام سے قبل شکست سامنے نظر آرہی تھی تو صادق سر پر پٹیاں باندھے میدان میں دوبارہ اترے اور نوآموز بالر لیاقت علی جو اپنا پہلا میچ کھیل رہے تھے اور جنھیں بلے بازی کا کوئی تجربہ نہیں تھا، کے ساتھ بے جگری سے کالی آندھی کا مقابلہ کرتے رہے اور لیاقت علی کو سامنے آنے سے بچاتے رہے۔ لیکن کب تک۔ آخر کھیل ختم ہونے سے کچھ دیر قبل لیاقت علی بھی میدان چھوڑ گئے۔

اب صرف ایک کھلاڑی بچا تھا جو اپنی زخمی ٹانگ پر پلاسٹر چڑھائے باہر بیٹھا تھا وہ تھے بہادر کھلاڑی وسیم حسن راجا۔ آخر ملک کو شکست سے بچانے کے لیے وہ اپنی پلاسٹر شدہ ٹانگ کے ساتھ صادق محمد کا ساتھ دینے میدان میں اترے۔ آخری دو تین اوور باقی تھے اور ایک طرف سر پر پٹیاں باندھے صادق محمد اور دوسری جانب پلاسٹر والی ٹانگ کے ساتھ وسیم راجا۔ تماشائی آنکھوں میں آنسو لیے ان دونوں اور پاکستان کی عزت کے لیے دعائیں کر رہے تھے۔ آخر صادق اور راجا کی جوانمردی اور تماشائیوں کی دعائیں کام آئیں اور پاکستان یہ میچ بچانے میں کامیاب ہوگیا۔

انیس سو انہتر کا نیوزی لینڈ کے خلاف کراچی کا ٹیسٹ ایک تاریخ ساز میچ تھا جس میں تینوں بھائیوں حنیف، مشتاق اور صادق نے ایک ساتھ شرکت کی۔ صادق محمد کا یہ پہلا میچ تھا جو حنیف کا آخری میچ بھی ثابت ہوا۔

حنیف کھیل سے کیسے اور کیوں باہر ہوئے، اس بارے میں بہت سی کہی ان کہی کہانیاں ہیں۔ وہ کھیل کے میدان سے تو چلے گئے لیکن ہمارے دلوں سے نہیں گئے۔ حقیقی لٹل ماسٹر اگر کوئی ہے تو وہ صرف اور صرف حنیف محمد ہیں جن کے گھرانے نے بے غرضی سے اس ملک کی خدمت کی اور شاندار طور پر کی۔

کراچی میں بسنے والے ایک اور خاندان یعنی ''بھولو برادران'' نے بھی میرے ملک کی نیک نامی میں اپنا بھرپور حصہ ڈالا۔ ان کے کارناموں کی اس قدر طویل فہرست ہے کہ یہ علیحدہ مضمون چاہتی ہے۔

بھلے دنوں میں جینے کے اور وقت گزاری کے ڈھنگ بھی اور ہی تھے۔ ہم لڑکے بالے جہاں اور طرح کے کھیل کود اور مشغلوں میں وقت گزارتے وہیں بہت سے کھیل ایسے بھی تھے جن میں جسم و جان کی نشوونما بھی ہوتی۔ کھیل کیا ہوتے اچھی خاصی ورزش ہوتی۔ کبھی جی میں آتی تو ہم دوڑ کے مقابلے کرتے، کبھی پنجہ لڑا کر ایک دوسرے کی طاقت آزماتے، کبھی کوئی بھاری پتھر اٹھانے کا چیلنج ہوتا۔ ساون بھادوں میں کبھی بادل گھر گھر آئے، جھینٹا پڑا اور زمیں نرم ہوئی تو کبڈی کا مقابلہ شروع ہوگیا یا پھر کشتی میں زور آزمائی ہونے لگتی۔

اب یہ سب کچھ سمٹ کر کمپیوٹر اور موبائل فون میں آگیا ہے۔ کہتے ہیں اس سے دماغی ورزش ہوتی ہے۔ خیر یہ وہ بہتر جانتے ہوں گے جن کے دماغ ہوتے ہوں گے۔ ہم نے تو انہی دیہاتی طرز کے مشاغل میں بچپن سے لڑکپن اور لڑکپن سے جوانی کے مراحل طے کیے اور زندگی کو اس کے سادہ لیکن

دلفریب رنگ میں دیکھا۔

یاد پڑتا ہے کورنگی دو نمبر کے جس علاقے میں ہم رہتے تھے وہاں جہاں کوارٹروں کی حدیں ختم ہوتی تھیں اور ایک وسیع غیر آباد علاقہ ملیر ندی تک چلا جاتا تھا، وہیں میدان میں اتوار کے اتوار اکھاڑہ سجتا اور دنگل کا اہتمام ہوتا۔ نوخیز اور پہلوانی کے شوقین نوجوانوں سے زمین کو خوب گہرا کھدوا کر اکھاڑا بنایا جاتا۔ کورنگی، لانڈھی، ملیر اور شہر کے دوسرے علاقوں سے نامی گرامی پہلوان اپنے استادوں اور حمایتیوں سمیت آتے۔ استاد جوان پہلوانوں کے مینیجر بھی ہوتے، اپنے، پٹھے کو لے کر اکھاڑے کا چکر لگاتے اور، جوڑ کو للکارتے "ہے کوئی برابر کی جوڑ" مقابلہ ہمیشہ برابر کی جوڑ میں ہی ہوتا۔ یہ نہ ہوتا کہ "لڑا دیا ممولے کو شہباز سے"۔

دوسری جانب سے کسی کا خون جوش مارتا اور وہ میدان میں کود پڑتا۔ اکھاڑے کے بزرگ منتظمین دونوں پہلوانوں کو ٹٹولتے اور مطمئن ہو کر مقابلے کی اجازت دیتے۔ کشتی طے پا جاتی تو اعلان ہوتا، فلاں پہلوان، پسر فلاں، پٹھا فلاں کا مقابلہ فلاں، پسر فلاں، پٹھا فلاں سے ہوگا۔ جوانوں کی جسمانی ساخت کے مطابق کشتی کا دورانیہ بھی طے کیا جاتا ہے جیسے باکسنگ میں ہیوی ویٹ، لائٹ ویٹ وغیرہ کی درجہ بندی کی جاتی ہے۔

دونوں پہلوان ایک دوسرے سے ہاتھ ملا کر اپنے حواریوں کی طرف چلے جاتے۔ اس دوران، ڈھولی، مسلسل ڈھول بجائے جاتا۔ بڑی کشتیوں کی تیاری کے دوران چھوٹی جوڑیں زور آزمائی کرتی رہتیں۔

دونوں پہلوان اپنے اپنے کارنر میں جا کر کپڑے اتارتے، لنگوٹ کس کر باندھتے۔ چھوٹے ان کے جسم پر تیل ملتے۔ ساری تیاری مکمل ہوتے ہی ڈھول کی تھاپ تیز تر ہو جاتی اور دونوں جانب سے کڑیل جوان، لنگوٹ زیب تن کیے، لوہے کے سے جسموں کو تیل سے چمکائے، رقص کے سے انداز میں "وارم اپ" کرتے اکھاڑے میں اترتے اور دوبارہ ہاتھ ملا کر ایک دوسرے کے بدن پر مٹی ملتے تاکہ تیل کا اثر زائل ہو اور، پکڑائی، آسان ہو۔

سیٹی بجتے ہی دونوں میں زور شروع ہو جاتا، ڈھول کی تھاپ تھم جاتی اور تماشائیوں کی ہلاشیری اور نعروں کا غلغلہ بڑھتا جاتا۔ پہلوان ایک دوسرے کو قابو کرنے کے لیے سر جوڑے، بازو ایک دوسرے کے بازوؤں میں پھنسائے زور لگاتے، دھوبی پاٹ، قینچی، لنگوٹی اور کئی طرح کے داؤ پیچ آزمائے جاتے۔ اگر زور لگاتے اکھاڑے کے کنارے آ جاتے تو منصف، دونوں کو چھڑا کر اکھاڑے کے درمیان لے آتے اور اسی حالت میں دوبارہ کشتی شروع کرواتے۔ اگر کسی کی پیٹھ زمین سے لگ گئی تو منصف فاتح کا ہاتھ بلند کر کے اس کی جیت کا اعلان کرتا، تماشائیوں کی تالیوں اور داد و تحسین میں فاتح جوان اکھاڑے کا چکر لگاتا اور تماشائیوں سے داد اور نقدی وصول کرتا۔ کشتی اگر برابر چھوٹ جاتی تو دونوں پہلوان تماشائیوں کی داد اور انعام پاتے اور اس میں مقامی اور غیر مقامی کا امتیاز نہ کیا جاتا۔

اب اگلی جوڑ کا اعلان کیا جاتا اور پھر وہی سب کچھ دہرایا جاتا۔

جب مشغلے ایسے تھے تو جسم کو متناسب، پھرتیلا اور طاقتور رکھنے کے جتن بھی کیے جاتے۔ لڑکے روزانہ ورزش کرتے، دودھ پیتے، جان بناتے اور بری صحبتوں اور حرکتوں سے پرہیز کرتے۔ انہیں اپنی طاقت پر مان ہوتا تو وہ اسے اپنے گلی محلے

کی امانت سمجھتے اور خود کوئی قبیح حرکت کرتے نہ کسی باہر والے کو اپنے محلے میں غلط کام کرنے دیتے۔ پہلوانوں کی مشہوری دوسروں کو اپنی اوقات میں رکھتی اور وہ ان علاقوں میں سوچ سمجھ کر آتے جہاں کوئی نامی پہلوان رہتا۔

ہمارے علاقے میں راجا، کرجی اور رحمت پہلوان ہوا کرتے تھے۔ یہ تینوں دوست جب کڑھے ہوئے کرتے اور پنجابی فلموں کے ہیرو کے سے انداز میں باندھی ہوئی دھوتی اور کندھوں پر چار خانے والے رومال ڈالے بازار اور گلیوں سے گزرتے تو لڑکے بالے انہیں یوں دیکھتے جیسے، سپر اسٹارز گزر رہے ہیں۔

نوجوانوں میں یہ شوق پیدا کرنے والے تھے میرے شہر کے مشہور بھولو برادران۔ رستم زماں گاما کے بھتیجے، رستم ہند امام بخش کے فرزند اور اپنے وقت کے مشہور حمیدا پہلوان کے یہ شاگرد میرے ملک کے لیے فخر کا نشان تھے۔

آیئے آج کچھ باتیں ان کی کریں جو کبھی شاہد آفریدی اور وسیم اکرم سے بھی زیادہ مشہور اور مقبول ہوا کرتے تھے۔

دارالصحت

شاید کچھ دوستوں کو یاد ہو۔ پاکستان چوک پر، جنرل پوسٹ آفس کے عقب میں، ایک قدیم حویلی نما عمارت کے بڑے سے دروازے کے ساتھ، چارپائیوں اور مونڈھوں پر بیٹھے کچھ قوی الجثہ صاحبان کرتے اور دھوتی یا شلوار میں ملبوس نظر آتے۔ حویلی نما مکان پر ایک بورڈ آویزاں تھا جس پر لکھا ہوتا تھا۔ ''دارالصحت'' اور اس پر رستم زماں حاجی موسیٰ گینی بھولو پہلوان کی تصویر ہوتی تھی جس میں وہ لنگوٹ باندھے، دونوں ہاتھ آگے کی طرف پھیلائے، دعوت مبارزت دیتے نظر آتے۔ دارالصحت کی یہ عمارت ملک کے پہلے وزیراعظم، شہید ملت لیاقت علی خان کا بھولو خاندان کی لیے عطیہ تھی۔

یہ تھا اکھاڑہ، ورزش گاہ اور رہائش گاہ، اس گاماں پہلوان کے بھتیجوں کی جو ایک عالم میں طاقت، جوانمردی اور بہادری کا استعارہ تھا۔ جو ایک زمانے تک سارے عالم کا غیر متنازعہ چیمپئن تھا اور اپنوں غیروں سب نے اسے رستم زماں مانا۔

اسی گاماں کے بھائی رستم ہند امام بخش کے بیٹے بھولو، اعظم، اسلم، اکرم اور گوگا نے اپنے چچا اور باپ کی روشن کی ہوئی مشعل کو اٹھائے رکھا اور یہ سلسلہ بھولو کے بیٹے ناصر اور اسلم کے بیٹے، زبیر عرف جھارا تک چلتا رہا۔

اور وہ بھی دن تھے کہ ان پہلوانوں کی جھلک دیکھنے کے لیے سڑکیں بند ہو جایا کرتیں۔ مرد حضرات سڑکوں پر ان پہلوانوں کو دیکھتے اور آس پاس کے مکانوں کے چوباروں اور چھتوں پر عورتیں اور بچے ان کے درشن کر رہے ہوتے اور اس ساری مقبولیت کا مرکز تھا، بھولو خاندان۔

بھولو برادران نہ صرف برصغیر بلکہ ایشیا بھر میں جانے جاتے تھے اور گاماں کے زمانے سے انہیں ماورائی اور اساطیری (لیجنڈری) حیثیت حاصل تھی۔ ہر کشتی کے بعد اور اکثر انٹرویو وغیرہ میں ان پہلوانوں کی خوراک کے بارے پوچھا جاتا۔ دراصل لوگ باگ انہیں انسانوں سے الگ کوئی مخلوق سمجھتے تھے۔

پاکستان بننے کے بعد بھولو پہلوان نے رستم پاکستان کا اعزاز حاصل کیا، اسلم کے سر پر رستم پنجاب کا تاج سجا، اعظم کو 1953 میں رستم ہند کا خطاب دیا گیا، اکرم نے افریقا میں اپنی شہرت کے جھنڈے گاڑے تو گوگا نے تمام مقامی پہلوانوں سے اپنے آپ کو منوایا۔

حاجی منظور حسین عرف بھولو (1922-1985)

رستم ہند امام بخش پہلوان کے سب سے بڑے بیٹے، آزادی سے قبل ہی اپنے وقت کے مشہور پہلوانوں کو ہرا چکے تھے۔ آزادی کے بعد یونس پہلوان گوجرانوالہ سے رستم پاکستان کے خطاب کے لیے اس وقت کے گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین کی موجودگی میں کشتی جیتی جنہوں نے فاتح بھولو کو چیمپئن کی پٹی پہنائی۔ 1962 میں صدر ایوب نے انہیں حسن کارکردگی کا اعلیٰ اعزاز عطا کیا۔

بھولو نے دنیا کے تمام پہلوانوں کو چیلنج کیا اور 1967 میں لندن میں اینگلو فرنچ چیمپئن ہنری پیرلو کو عالمی اعزاز کے لیے شکست دے کر رستم زمان کا خطاب حاصل کیا۔

میرے ہوش سنبھالنے کے بعد یہ واحد کشتی تھی جو بھولو نے لڑی۔ وہ اپنے تمام بھائیوں کے ساتھ زور آزمائی کرتے اور ان کی قوت ضرب المثل تھی۔

ان سے چھوٹے اسلم عرف اچھا پہلوان (1927-1989) بلاشبہ اور بلا مبالغہ چیمپئن پہلوان تھے جنہوں نے کبھی کوئی کشتی نہیں ہاری۔ سب بھائیوں میں طویل القامت اسلم ''رستم زماں'' گاما کے لے پالک بیٹے تھے۔ عام زندگی میں اسلم ایک دلچسپ انسان تھے لیکن رنگ میں ان سا طاقتور اور پھرتیلا کوئی نہیں تھا۔ تین سو پونڈ وزن اور تقریباً ساڑھے چھ فٹ طویل اسلم انتہائی محنتی اور جفاکش پہلوان تھے جن کی تربیت غیر منقسم ہندوستان کے عظیم ''حمیدا'' پہلوان

نے کی تھی۔ اسلم دیسی کے علاوہ فری اسٹائل اور ٹیگ کشتی کے بھی ماہر تھے۔ یورپ، امریکا، افریقا، مشرق وسطیٰ میں اپنے وقتوں کے مشہور پہلوانوں، کنگ کانگ، پال واچن، بیرن وان ہیگزی، ترلوک سنگھ اور بے شمار پہلوانوں کو زیر کیا۔

اعظم ایک روایتی پہلوان تھے لیکن فری اسٹائل بھی لڑتے تھے۔ اعظم عرف راجا ایک خاموش طبیعت اور دیندار شخص تھے۔ بھائیوں کے مقابلے میں اعظم سب سے کم وزن تھے اور جب انہیں اچھال کر پھینکا جاتا تو ہمیشہ بلی کی طرح اپنے پیروں پر دوبارہ کھڑے نظر آتے۔

اکرم عرف اکی تمام بھائیوں میں دلچسپ اور مقبول پہلوان تھے۔ وہ فری اسٹائل اور باکسنگ ٹائپ ہر طرح کی کشتیوں پر قادر تھے۔ ڈھائی سو پاؤنڈ اور چھ فٹ طویل اکرم نے افریقا کے ممتاز پہلوانوں کو شکست دے کر ''ڈبل ٹائیگر،، کا نام پایا۔ انہوں نے یوگنڈا کے عیدی امین، کینیا کے چیمپئن مہندر سنگھ کو خاک چٹائی اس کے علاوہ اسلم اور گوگا کے ساتھ ٹیگ کشتی، میں حصہ لیا، ابتدا میں اکرم بھی عظیم گاما کے زیر تربیت رہے ہے۔ لاہور میں اپنے ابتدائی دنوں میں ہی اکرم نے اپنے سے کہیں زیادہ طاقتور پہلوانوں کو شکست دی کہ اکرم ایسے ہی پھرتیلے اور باوقار پہلوان تھے۔

1954 میں بمبئی میں بھارت کے تمام پہلوانوں کو للکارا اور ناقابلِ تسخیر رہے، بھارت کے گرنام سنگھ کے علاوہ، ملیشا، کابل، آسٹریلیا، نیپال، غرض جہاں بھی کشتی لڑی وہاں کے چیمپئن پہلوانوں کو زیر کیا۔ اکرم نے چند ایک کشتیاں ہاریں بھی لیکن دوبارہ چیلنج کر کے انہیں جیتا۔

ہر عروج کو..... ایک زوال ہوتا ہے۔ اکرم کی عمر ڈھل رہی تھی کہ انہوں نے جاپان کے مشہور پہلوان ''انوکی'' کو چیلنج کیا جو فری اسٹائل کے علاوہ جوڈو کے بھی چیمپئن تھے اور جو عظیم باکسر محمد علی سے بھی لڑ چکے تھے۔ انوکی، اکرم کو ہرانے میں کامیاب رہے۔ سنا ہے بعد میں اسلم کے بیٹے جھارا نے انوکی کو چیلنج کیا اور انہیں شکست دی۔

بھولو پہلوان کے سب سے چھوٹے بھائی گوگا اصل نام معظم سے بہت کم لوگ واقف تھے۔ گوگا ایک مقبول پہلوان اور چیتے کی طرح پھرتیلے تھے لیکن قوت میں اپنے بڑے بھائیوں کی ہمسری نہیں کر سکتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے کچھ کشتیاں ہاریں بھی۔ گوگا نے اپنے وقت کے مشہور پہلوانوں کو شکست دی جن کی ایک طویل فہرست ہے۔

1981 میں اپنے بھتیجے ناصر بھولو کے ساتھ ایک نمائشی کشتی کے دوران پڑنے والا دل کا دورہ، گوگا کے لیے جان لیوا ثابت ہوا اور گاماں پہلوان سے شروع ہونے والے ایک عہد کا خاتمہ ہوا۔

بھولو کے ایک اور شاید ان کے بعد دوسرے نمبر پر ایک بھائی حسین بخش عرف حسو تھے لیکن انہیں پہلوانی کا کوئی شوق نہ تھا نہ کسی نے ان کا نام سنا۔

اسلم کے بیٹے زبیر عرف جھارا نے کچھ عرصہ اپنے دادا، باپ اور چچاؤں کی جلائی ہوئی شمع کو روشن رکھا۔ میں عرصہ دراز سے ملک سے باہر ہوں، مجھے علم نہیں کن حالات میں اس عظیم خاندان کا خوبصورت فرزند عین نوجوانی میں چل بسا اور نہ ہی مجھے یہ علم ہے کہ کب بھولو برادران کراچی سے رخصت ہوئے۔

بھولو برادران اور حنیف برادرز، میرے شہر کے یہ دو خاندان ایسے ہیں کہ میرا ملک تو کیا، ایک عالم میں ان کا نام تھا۔ ایسا تھا میرا شہر اور ایسے تھے میرے شہر والے۔

شمشاد اے ٹورنٹو

ندیم اقبال

شاعر نے غلط نہیں کہا ہے کہ چاند میری زمیں پھول میرا وطن۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ میرا وطن چاند سے بھی زیادہ خوب صورت ہے۔ اس کی وادی، اس کے دریا، شہر وکوہسار سب کے سب بے نظیر و بے مثال ہیں۔لیکن ان فضاؤں سے جو نکل کر کسی اور شاخ پر آشیانہ سجانے کی خواہش کرتا ہے۔ اسے کیسی کیسی پریشانیاں گھیرتی ہیں اس کا ذکر جو یورپ و امریکا میں بسنا چاہتے ہیں وہ اس تحریر کو ضرور پڑھیں۔

ایک جداگانہ انداز کی دلچسپ سفر کہانی کا پانچواں حصہ

اس کے خطرناک تیور نے مجھے اندر تک لرزا دیا تھا۔وہ مجھے ایسے دیکھ رہی تھی جیسے مجھے ابھی گردن سے پکڑ کر اٹھائے گی اور ہوا میں اس تیزی سے اچھالے گی کہ میں سیدھا وطن عزیز میں جا کر گروں گا۔ مجھے یقین ہو چلا تھا کہ وہ ایک لمحہ ضائع کیے بنا مجھے ڈی پورٹ کرے گی پھر بھی میں اسے معصوم صورت بنائے دیکھ ہی رہا تھا کہ ایک بجلی سی ذہن میں کوندی اور مجھے خیال آیا کہ میرے پاس تو امریکا میں مستقل رہائش کا ویزا بھی ہے۔میں پُراعتماد ہو گیا۔کندھے اچکائے اور پُراعتماد

لہجے میں اس سے کہا۔ ”مجھے امریکا میں چھپنے کی کیا ضرورت ہے کیونکہ میرے پاس تو امریکا کا H1-B ویزا ہے اگر میں چاہوں تو آج ہی وہ ویزا اسٹیمپ کروا کر مستقل طور پر یہیں رہ جاؤں۔“

وہ چونک پڑی اور کہا۔ ”کدھر ہے۔“

میں بولا۔ ”گاڑی میں ہے۔“

فرمایا۔ ”لے آؤ۔“

میں نے گاڑی کی پچھلی سیٹ سے پیکٹ اٹھایا اور اس کے ہاتھوں پر رکھ دیا۔ وہ اندر لے گئی اور کسی سے کہیں فون پر باتیں کرنے لگی۔ بات کرتے ہوئے وہ شیشے سے مجھے دیکھ بھی لیتی۔ پھر واپس آئی تو اس کے چہرے کا کھنچاؤ ختم ہو کر ایک مسکراہٹ میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اس سے پہلے میں چودھری سے کہہ رہا تھا کہ لگتا ہے میری چھ مہینے کی محنت غارت ہوگئی۔ یہ موٹی مجھے امریکا کا بارڈر کراس کرنے نہ دے گی۔ لیکن جب وہ واپس آئی تو لگ ہی نہیں رہا تھا کہ یہ وہی ہے سر تا پا فرش راہ بنی ہوئی تھی۔ موٹے موٹے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ آتے ہی بولی۔ ”کمپنی والے تم لوگوں کو پروفیشنل ویزا دیتے ہیں، ہزاروں ڈالر خرچ کرتے ہیں اور تم لوگ ویزا لے کر سالوں گھر بیٹھ جاتے ہو۔“ پھر ہنستے ہوئے کہا۔ ”اگر کہو تو ویزا ابھی اسٹیمپ کردوں۔“

میں اب شیر ہو چکا تھا جان لیا تھا کہ قانونی طور پر میں مضبوط ہوں اور قانون کا احترام یہ لوگ خوب کرتے ہیں اس لیے بے پروائی سے جواب دیا۔ ”ابھی نہیں! اگر پہلا ٹیسٹ پاس ہوگیا تو پھر دوبارہ آؤں گا۔“ اس نے معذرت کی اور ہمیں بارڈر کراس کرنے کی اجازت دے دی۔

یہ وہی چودھری تھا جس سے آج واجد سے ملنے کے بعد بات تک نہ ہوئی تھی اور وہ واجد سے کہہ رہا تھا۔ ”گاڑی کا دروازہ جلدی بند کرو، سرد ہوا چل رہی ہے۔“

وہ لوگ چلے گئے اور میں مفتی کو واجد کے بارے میں بتا رہا تھا۔ گیارہ بج گئے تھے اور میں نیند سے جھول رہا تھا۔ بستر پر لیٹتے ہی نیند میں چلا گیا۔

پھر آدھی رات کو آنکھ کھل گئی۔ وہی اندھیرا اور تنہائی کا سناٹا اور پھر سے افسردگی نے مجھے کس کے جکڑ لیا۔ ہوا زور سے شیشے کے دروازے پر دستک دے رہی تھی۔ باہر ایک شور برپا تھا اور میرے اندر بھی کوئی طوفان تھا۔ میں زندگی میں کبھی ایک دن کے لیے بھی بیکار نہیں بیٹھا تھا۔ یہاں آکر نجانے کتنے دن مجھے دھکے کھانے تھے۔ اس پر ستم یہ کہ میں اپنی فیملی کو یاد کر رہا تھا۔ دن تو مفتی کے ساتھ مال میں گزر گیا تھا مگر تنہائی میں سوچوں نے دماغ میں گھر کر لیا تھا۔ انسان بھی بڑا ناشکرا واقع ہوا ہے۔ سالوں دعائیں مانگیں کہ کینیڈا پہنچ جاؤں اور یہاں آیا تو دوسرے ہی دن سے اپنے آپ کو کوسنا شروع کر دیا۔ وضو کر کے نماز پڑھی اور پھر سونے کی کوشش کرتے کرتے دن نکل آیا۔

ہم ناشتے سے فارغ ہوئے تو مہران آگیا۔ مہران ہمارے مشہور اداکار قوی خان کا چھوٹا بیٹا ہے۔ کچھ ڈراموں میں کام بھی کیا تھا مگر پھر بھائی عدنان اور وہ کینیڈا شفٹ ہو گئے۔ مہران کے پاس اپنی گاڑی تھی اور یہاں گاڑی کا ہونا ایک نعمت سے کم نہیں ہوتا ہے۔ آپ کینیڈا میں گاڑی کے بغیر کسی کام کے نہیں ہوتے۔ گاڑی لینا اتنا مشکل نہیں ہوتا جتنا ڈرائیونگ لائسنس لینا دشوار ہوتا ہے۔ وہ تو خیر میں آگے چل کر بتاؤں گا کہ یہ لائسنس لینے میں، میں نے کیا کیا گل کھلائے۔

مہران کی گاڑی میں میٹرس لانے تھے اور مفتی نے اسے فون کر کے بلا لیا تھا۔ آج اتوار کا دن تھا اور مہران کی بھی چھٹی تھی۔ میٹرس فلی (Flea) مارکیٹ سے خریدنے تھے۔ فلی مارکیٹ ایک طرح کا اتوار بازار ہے۔ ہم مارٹن گروو سے شمال کی جانب گئے جہاں آگے گلاٹی اسٹور ہے۔ ہم دو تین میل آگے گئے اور البین (Albion) پر بائیں طرف مڑے اور کچھ ہی دیر میں الٹے ہاتھ پر ایک بہت بڑا پارکنگ لاٹ جو مکمل طور پر گاڑیوں سے بھرا تھا اس میں مہران نے اپنی گاڑی موڑ لی۔ سامنے ایک بڑی سی ہال نما عمارت تھی اور اسی میں فلی مارکیٹ لگتی تھی۔ بڑی مشکل سے پارکنگ ملی۔ گاڑی سے مارکیٹ تک کا راستہ شدید سردی اور ٹھٹھرتی ہوا سے طے کرنا مشکل ہو گیا۔ ہم بھاگ کر مارکیٹ میں داخل ہوئے۔ اندر کا ماحول گرم تھا، کچھ سکون ملا۔ چھوٹی چھوٹی دکانیں تھیں جہاں گارمنٹس، لیدر کا سامان، الیکٹرونکس آئٹم، کھانے پینے کی چیزیں، سبزیاں، فروٹ، پرفیومز کے علاوہ بہت سی چیزیں نہایت ہی سستے داموں دستیاب تھیں۔ زیادہ تر چینی، انڈین، پاکستانی اور جنوبی امریکا کے لوگ خریداری اور دکانداری کر رہے تھے۔ ہم میٹرس اور تکیے کے چکر میں پہلے تو بے مقصد گھومتے رہے۔ پھر ایک چینی باشندے کے پاس نظر آئے۔ جب سے بروس لی کی انٹر دی ڈریگون دیکھی ہے۔ ہر چینی پر مجھے کراٹے ماسٹر کا گمان ہونے لگا ہے۔ قیمت پوچھتے ہوئے بھی جان جا رہی تھی کہ اگر قیمت زیادہ ہوئی اور ہم لے نہیں پائے تو وہ کہیں ”ہو“ کا نعرہ لگا کر کراٹے کا وار کرنے کے لیے

اڑتا ہوا مجھ پر نہ آپڑے۔ میری مشکل مہران نے آسان کر دی۔ اس نے قیمت کا ٹیگ دیکھا اور مڑ کر قیمت بتائی۔ میں نے جلدی سے اپنا پرس نکالا۔ نوٹ دیکھ کر چینی کے چہرے پر مسکراہٹ کھل اٹھی۔ چھوٹے سے چہرے پر پیاری سی مسکراہٹ دیکھ کر خوف کا احساس کم ہو گیا۔ میں نے میٹرس اور دو تکیے خریدے۔ شہباز کے لیے بھی میٹرس خرید لیا اور گاڑی میں ٹھونس کر اپارٹمنٹ میں لانے کے لیے خوب پھرتی کا مظاہرہ کیا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس چینی نے مفت میں میٹرس دی ہے۔

اپارٹمنٹ پہنچ کر میں نے اپنی جگہ کمرے میں کھڑکی کے ساتھ بنائی۔ ساتھ میں شہباز کا میٹرس رکھا۔ مجھے رات میں گھٹن ہوتی تو میں کھڑکی میں لگے دروازے کو ذرا سا کھول لیتا تاکہ کچھ تازہ ہوا آئے، بھلے برفوں سے لپٹی ہی کیوں نہ ہو۔ کھڑکی کے باہر پھولوں کی جھاڑیاں تھیں جو اب صرف خشک ٹہنیوں کی صورت نظر آرہی تھیں۔ اپنے میٹرس کے ساتھ میں نے اپنی کتابیں اور دوسرا سامان رکھا اور اپنے بستر کے ارد گرد ایک ادبی ماحول سا بنالیا۔

نئے میٹرس اور تکیے سے عجیب سی باس اٹھ رہی تھی جو ہمیشہ کے لیے میرے سخت اور اداس دنوں کے احساسات سے جڑ گئی تھی۔ یہ بو کم درجے کے اس میٹریل سے نکلتی ہے جو تکیوں اور میٹرس میں بھرا جاتا ہے۔ میں جب بھی اداس اور تنہا ہوتا تو یہ بو اس کے ساتھ ہوتی گویا جب بھی میں یہ بو محسوس کرتا تو اداس ہو جاتا۔ اب اتنے سالوں بعد بھی وہی بو مجھے اداس کر کے اسی پرانی ذہنی حالت میں لا پھینکتی ہے۔

شام ہوئی تو مفتی مجھے ڈاؤن ٹاؤن دکھانے لے گیا۔ میرا کہیں بھی جانے کو دل نہیں کر رہا تھا مگر مفتی تو میرے لیے جا رہا تھا اور اس لیے ہم ڈاؤن ٹاؤن کے لیے تیار ہو گئے۔

سب وے کے کسی اسٹیشن سے باہر نکلے تو لوگ گرم کوٹ اور اونی ٹوپیاں پہنے تیز تیز قدم اٹھاتے چلے جا رہے تھے۔ روشنیوں سے دن کا گمان ہو رہا تھا۔ میں بیزار سا تھا مگر پھر بھی مفتی کا ساتھ دے رہا تھا۔ اونچی اونچی عمارتوں کے نیچے نائٹ کلب تھے۔ ان کے باہر قطاریں لگی تھیں۔

یہ ماحول، یہ منظر میرے لیے گراں بار تھا لیکن مفتی اتنی محبت سے لے کر آیا تھا اس لیے دل پر جبر کر کے میں اس کے ہمراہ یہ پُراسرار سا ماحول دیکھتا تھا۔ لمبے کوٹوں اور مفلروں میں لپٹے مرد اور عورتیں بلند اور روشنیوں سے نہائی عمارتوں کے نیچے جھک کر تیز تیز چلتے تھے۔ ارد گرد نائٹ کلب ایک لائن میں کھڑے آتے جاتے کو اپنی طرف کھینچتے تھے اور جگمگاتے نیو سائن ان کے ماتھے کا جھومر تھے۔ میری نظر میں نائٹ کلب ایسی جگہ ہو گی جہاں لوگ پی پلا کر ڈانس کرتے ہوں گے اور تیز گھومتی رنگ برنگی روشنیاں ان پر پڑتی ہوں گی۔ مفتی نے کہا کہ کینیڈا آئے ہو اور ہر چیز کا جائزہ لے رہے ہو تو تم کو کلب بھی دکھاتا ہوں۔ ایک کلب کے اندر مدھم روشنیوں میں اسٹیج بنا ہوا تھا۔ پانچ ڈالر میں کوک کا آرڈر دیا۔ کم لباس میں لڑکیاں کوک اور شرابیں ہنس ہنس کر پیش کر رہی تھیں اور لوگوں کے دل لبھا رہی تھیں۔ تبھی اسٹیج کی روشنی بڑھی۔ کچھ دیر تک ست رنگی روشنیوں کا رقص ہوا۔ رنگ برنگ کی روشنیاں ادھر سے ادھر لہرائیں اور پھر ساکت ہو گئیں۔ میں نے سوچا شاید کوئی مغنی آکر اپنا فن پیش کرے گا مگر کچھ دیر میں اسٹیج پر وہ کچھ شروع ہو گیا جس نے میرے تنفس کی رفتار تیز کر دی اور میرا سر شرم سے جھک گیا۔ میں کوئی مذہبی انسان نہیں ہوں کہ میں ایسی چیزوں پر ہر وقت لعنتیں بھیجتا رہتا ہوں۔ میں کوئی پارسا انسان بھی نہیں رہا کہ ایسا کوئی واقعہ کسی کی زبانی سن کر لاحول پڑھنا شروع کر دوں نماز بھی کبھی باقاعدگی سے نہ پڑھی ہو گی مگر اندر ایک حیا اور شرم ہمیشہ موجود رہی ہے۔ کچھ چیزیں آپ کی یا کسی کی بھی انتہائی ذاتی ہوتی ہیں اور جن کا خفیہ رہنا میرے حیا کا حصہ ہے۔ وہ راز کھلے بازار عیاں ہو جائے تو ایک بے چینی اندر سے اٹھتی ہے کہ یہ سب کیوں کر ہو رہا ہے۔ ہر بدن کی اپنی پرائیویسی ہوتی ہے۔ بہت سے لوگ یہ راز نہیں سمجھتے کہ مگر میں پانچ ڈالر کے عوض بھی کسی کو کھلے عام بے لباس دیکھنا اپنی توہین سمجھتا تھا کہ جیسے سب کی نظریں مجھ پر گڑھی ہیں۔ میں اپنے آپ سے شرمندہ ہو رہا تھا کہ میں نے کسی کی خلوت میں کیوں جھانکا ہے۔ اسی لیے اٹھ کھڑا ہوا اور مفتی سے کہا کہ میں باہر جا رہا ہوں اور تم جب چاہے آجانا۔

میں باہر نکل کر کلب کی دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا تھا اور سگریٹ سلگا کر ویران آنکھوں سے آتے جاتے ٹھٹھرتے لوگوں کو دیکھنے لگا تھا۔ میں یہی سوچ رہا تھا کہ اپنے بچوں کو میں اس ماحول میں کیسے رکھ سکتا ہوں جہاں اتنی بے حیائی ہو۔ میں شدید بے زاری کے عالم میں تھا۔

تماشائیوں میں مرد اور عورتیں دونوں تھے اور اتنے انہماک سے کلبوں کے باہر قطار بنائے ایک وحشت کے عالم میں کھڑے تھے جیسے دوبارہ دیکھنے کا موقع نہیں ملے گا۔ ایسے مناظر کے بعد مجھے جو کرنا چاہیے تھا وہ میں کر رہا تھا۔ بے چینی سے حسن اور بے حیائی کے بازار میں شرم کا سودا بکتے

دیکھ رہا تھا۔ تبھی مجھے مفتی کی بات یاد آئی کہ ان کو اپنا کام کرنے دو اور ہمیں اپنا کام کرنا ہے۔ اس خیال نے مجھے مطمئن کر دیا۔

میں نے سگریٹ کا گہرا کش لیا اور ٹوٹے کو ڈسٹ بن میں ڈال دیا تبھی دروازے پر نظر پڑی۔ کچھ ہی دیر میں مفتی بھی باہر نکل آیا تھا۔ وہ تو مجھے اس ملک کا یہ چہرہ دکھانے آیا تھا۔ جب میں ہی نہ دیکھنا چاہتا تھا تو اسے اندر بیٹھ کر کیا کرنا تھا۔ یہ ریڈ لائٹ ایریا تھا۔ بعد میں کبھی بھی میرا اس جانب گزر نہ ہوا اور اب مجھے یہی محسوس ہوتا ہے کہ کوئی ایسی جگہ یہاں تھی بھی نہیں اور بس کوئی خیال یا خواب تھا جو آیا اور تیزی سے گزر گیا۔

ہم خاموش اور شرمندہ شرمندہ سے واپس آئے۔ مفتی کہنے لگا۔ ”لگتا ہے تم نے برا منایا ہے۔ مجھے تم کو وہاں لے کر نہیں جانا چاہیے تھا۔“

میں نے اس کا دل رکھنے کے لیے ہنستے ہوئے کہا۔ ”نہیں! کم از کم مجھے یہ تو اندازہ ہو گیا کہ ”یہ بھی“ یہاں ہوتا ہے اور میں اپنے سفرنامے میں اسے لکھ تو سکتا ہوں۔ ورنہ لوگ یہی سمجھیں گے اس نے کینیڈا دیکھا ہی نہیں۔“

وہ کہنے لگا۔ ”اگر لکھنا تو میرا ذکر نہ کرنا۔“

میں نے کہا۔ ”اس سے کچھ نہیں ہوتا اور لوگ صرف یہ ہی سمجھیں گے ناں کہ مفتی نے مجھے پُرخلوص طور پر ٹورنٹو کا ہر زاویہ دکھایا تھا۔“

”مگر یار پڑھنے والے تو یہ سمجھیں گے کہ میں وہاں آتا جاتا ہوں۔ قسم لے لو جو پہلے کبھی گیا ہوں۔ صرف تمہیں کینیڈا کا یہ چہرہ دکھانے لے گیا تھا۔“

”تم نے تو یہ بات دل پر لے لی۔ مجھے یقین ہے تمہارا ایمان مضبوط ہے۔ جس کا ایمان محفوظ ہوتا ہے .... وہ ان خرافات سے دور رہتا ہے۔“

معلوم نہیں یہ ایمان کی مضبوطی تھی یا ذاتی پسند و ناپسند...... اور تو اور مجھے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ ایمان کی مضبوطی ہوتی کیا ہے؟ میں نے وہ کیا جو مجھے ٹھیک لگا تھا۔ مجھے اپنے کچھ سفرنامہ نگار یاد آ گئے۔ ایک نے ایمسٹرڈم میں زنانہ ایریا کا ذکر کیا تھا کہ کیسے وہ ایک کلب میں گیا اور کوئی ڈچ حسینہ اس پر مرمٹی تھی۔ وہ صاحب آج کل حکومتی مراعات کے مزے لے رہے ہیں اور سفیر بھی بنے رہے۔ میں جب سفرنامہ لکھنے بیٹھا تو پہلے یہ سوچا کہ کوئی ایسی کہانی میں بھی بناؤں گا اور کوئی افسانہ تراشوں گا کہ کوئی پری چہرہ مجھ پر بھی فدا ہو گئی تھی اور پھر میں نے اس سے بے وفائی بھی کی ہو مگر ایسا فضول اور بے تکا واقعہ لکھنے سے ہمیشہ گریزاں رہا جو ہوا بھی نہیں اور خاص کر جس واقعے سے ذاتی تشہیر ہو۔

اپارٹمنٹ واپس آ کر گھر فون کیا۔ قندیل کہہ رہی تھی ”بابا آپ کب آئیں گے؟“ میں خاموش ہو گیا تو وہ بولی۔ ”بابا! اگر آپ نہیں بولیں گے تو میں فون بند کر دوں گی۔“ یہی الفاظ مجھے چیر کر رکھ دیتے تھے۔ میرے دل پر گھونسا سا لگا۔ آنکھیں بھیگ اٹھیں۔ مجھ سے بولا نہ گیا اور لائن کٹ گئی۔

وہ رات بڑی بے آرام گزری۔ اگر میں کینیڈا اسیر کے لیے آتا تو یہ خیال تو ہوتا کہ کچھ دن بعد واپس چلا جاؤں گا مگر اب تو واپسی کی کوئی راہ نہ دکھائی دیتی تھی۔ سب راستے گم ہو گئے تھے۔ کوئی دھول تھی جو ان راستوں پر اڑتی دکھائی دیتی تھی۔ میں بو والے تکیے میں منہ دبائے لیٹا تھا۔ میرا دم گھٹ رہا تھا اور پھر میں نے ہلکا سا دروازہ کھول دیا اور چند ہی لمحوں میں کمرا برف بن گیا۔

صبح اٹھا تو آج مفتی کو دوپہر والی شفٹ پر جانا تھا۔ شہباز اپنے ماموں کے گھر سے ابھی نہیں آیا تھا۔ مفتی نے کہا کہ اپنے کاغذات اٹھاؤ، آج تمہارا بینک اکاؤنٹ کھلواتے ہیں۔ خاموشی اور افسردگی اپارٹمنٹ میں آ ٹھہری تھی۔ مفتی مجھے اداس دیکھ رہا تھا اور خاموش تھا۔ رائل بینک گئے تو بینک منیجر ایملی (Emily) سے ملاقات ہوئی۔ بھرپور انداز میں اس نے ہاتھ ملایا۔ مفتی ہنستے ہوئے کہنے لگا۔ ”تمہاری بیوی سے کہوں گا کہ تم نے ایک غیر عورت سے ہاتھ ملایا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”میں کوئی مولوی تو نہیں جو ہاتھ ملانے سے بھی کتراؤں؟“

مفتی نے دراصل جانچ لیا تھا کہ میں مکمل طور پر فیملی پرست انسان ہوں اور وہ اسے سراہتا بھی تھا۔ ایملی سے اکاؤنٹ کھلوانے کے لیے بولا تو اس نے نہایت احترام سے ہمیں اپنے آفس میں لا کر بٹھا دیا۔ ایک صاف ستھرے آفس میں شیشے کی میز کے پار ایک کرسی تھی اور ساتھ ایک ڈیسک پر آفس کا سامان رکھا تھا اور اس میں بچوں کی تصویر والا ایک فریم رکھا تھا۔ میں جب بھی کسی کے آفس میں گیا تو عورت ہو یا مرد سب اپنے بچوں کی تصویر ہمیشہ اپنے سامنے رکھتے ہیں۔ میں نے اس کے بچوں کی فوٹو دیکھی تو مجھے اپنے بچے یاد آ گئے اور آنکھیں خود بخود پرنم ہو گئیں۔

اس نے اکاؤنٹ کھولا اور کاغذی کارروائی مکمل کی۔ پھر مجھ سے میرے بارے میں پوچھنے لگی۔ میں اسے اپنے بچوں کے بارے میں بتا رہا تھا۔ وہ میری انگریزی بولنے کی کمزوری کو جان چکی تھی اور آہستگی سے بول رہی تھی۔ کوئی بھی

زبان سیکھنے کے لیے ستر فیصد اس زبان کا سننا ہوتا ہے۔ بیس فیصد بولنا اور دس فیصد لکھنا ہوتا ہے۔ ہم پاکستان میں برٹش لہجے میں بات کرتے ہیں اور یہاں امریکن لہجے میں بولتے ہیں۔ یہ تو اپنی روانی میں بولتے ہیں اور میرے پلے ایک لفظ بھی نہیں پڑ رہا تھا۔ یہاں آنے کے بعد ایک ماہ تک تو میں کوئی فون بھی نہیں اٹھاتا تھا۔ مجھے ان کی زبان سمجھنے میں ایک سال سے زیادہ لگ گیا اور ابھی تک میں انگریزی سے کتراتا ہوں۔ جتنی اچھی انگلش اب میں پاکستان میں پاکستانی بچوں کو بولتے سنتا ہوں وہ وہاں عنقا ہے اس لیے حیران ہو جاتا ہوں۔ پاکستان میں لوگ مجھ سے انگلش بولنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پاکستان میں تو انگلش کو زندگی اور موت کا مسئلہ بنا دیا گیا ہے۔ بچے کے پاس کوئی علم ہو یا نہ ہو، بس اسے انگریزی بولنا اچھا آتا ہو تو والدین فخر اور ستائشی نظروں سے ہمیں دیکھتے ہیں۔ میں ان سے کئی بار کہتا ہوں کہ انگریزی ایسی ہی ایک زبان ہے جیسے اردو، عربی، پشتو، سرائیکی، سندھی یا بلوچی۔ ہمیں یہ زبانیں نہیں آتی تو ہم اس کی پرواہ بھی نہیں کرتے مگر انگریزی سیکھنا اپنی شان سمجھتے ہیں۔ اس لیے مجھے سب یہی سمجھتے ہیں کہ میں وہی پینڈو کا پینڈو ہوں۔

ایملی میری حالت زار دیکھ رہی تھی، کہنے لگی۔

”تم نے ایک طرح سے خود ہی ایک نیا جنم لیا ہے اور تمہیں ہمت سے کام لینا ہوگا۔“ پھر کچھ دیر میری جانب دیکھتی رہی اور بولی۔ ”لگتا ہے تم شدید ڈپریشن کا شکار ہو اور یہ حالت تمہیں اپنے مقصد سے دور کر دے گی۔“

کہتی تو وہ ٹھیک تھی مگر انسان خود اپنی حالت قابل رحم کبھی بھی نہیں بنانا چاہتا۔ ہر انسان کی اپنی فطرت ہوتی ہے۔ کوئی اپنا وطن اور بچے چھوڑ کر آتے ہیں اور بہت خوش ہوتے ہیں۔ بعد میں بہت سے آئے جو آتے ہی پاکستان کی برائیاں کرنے لگے۔ بات بات پر تقابل کرتے اور اپنے ملک پر ہنستے تھے۔ میں ایک عام سا بندہ تھا جو اپنے ملک، شہر اور گلی، گلی کے کتے کو بھی آہیں بھر کر یاد کرتا تھا۔ میں نے ایملی کا شکریہ ادا کیا اور باہر نکل آیا۔ پیچھے سے اس کی یہ آواز سنی۔ ”جب بچے آئیں تو مجھے ضرور ملوانا۔“ میں نے دل میں کہا تیرے منہ میں گھی شکر۔ مگر مجھے کیا پتا تھا کہ ابھی قسمت نے میرے نام اور کتنے دھکے لکھ رکھے ہیں۔ ابھی کن حالات سے گزرنا ہے۔

آج طبیعت بہت بوجھل تھی۔ یہ صاف ستھرا ماحول مجھے کاٹنے کو دوڑ رہا تھا۔ میں پہلے تو ہر وقت کسی نہ کسی مصروفیت میں گھرا رہتا تھا اور آج بالکل نکما ہو گیا تھا۔ مجھے دوری کے علاوہ یہ نکما پن بھی کھائے جاتا تھا۔ میں بھاری قدموں سے اپارٹمنٹ کی جانب پیدل چلنے لگا۔ سوچوں میں اتنا محو تھا کہ اپنے پہنچنے کی خبر بھی نہ ہوئی۔ مفتی نے اپارٹمنٹ کی ایک چابی مجھے بنوا کر دے دی تھی۔ میں اپارٹمنٹ میں آیا اور رو رو کر اپنا بوجھ ہلکا کیا۔ پھر قرآن پاک لے کر تلاوت کی تو مجھے ایک نئی طاقت مل گئی۔

یہاں ایک کمپیوٹر تو رکھا تھا مگر ابھی انٹرنیٹ عام نہ تھا اور اس میں موڈیم بھی نہ تھا۔ میں نے اپنی مصروفیت یہ ڈھونڈی کہ کمپیوٹر پر مائیکروسافٹ آفس کی پریکٹس کرنے لگا جو میں پاکستان سے سیکھ کر آیا تھا۔ ان دنوں میں اپنا ٹائم کچھ سیکھنے میں گزارتا تھا اور پھر بعد میں یہ میرے بہت کام آیا۔

شام تک شہباز بھی ماموں کے گھر ویک اینڈ گزار کر واپس پہنچ گیا۔ میں نے کہا۔ ”تمہارے تو مزے ہیں کہ ماموں یہاں ہیں اور گھر کے کھانے بھی ملے ہوں گے؟“

اس نے مجھے عجیب نظروں سے دیکھا کیونکہ اس کی حالت مجھ سے بھی بدتر تھی۔ پھر اس نے اپنا پرانا فقرہ دہرایا۔ ”حالات بہت خراب ہیں اور ماموں بھی بڑا سیاپا ہے۔“

شہباز اور میں ایک ہی کشتی کے مسافر تھے۔ ہمارے دکھ اور سکھ سانجھے تھے۔ ایک ہی طرح کے حالات سے گزر رہے تھے۔ کہتے ہیں کہ دکھوں کے ساتھی اچھے دوست بن جاتے ہیں اور یہی ہوا۔ میں امریکا آ گیا اور وہ ٹورنٹو میں ہے۔ اس کے والد جمیل فخری صاحب وفات پا گئے اور وجہ ان کا وہ بیٹا تھا جو بیاہ کر امریکا آ گیا تھا اور پھر کہیں قتل ہو گیا۔ ان دنوں وہ نیویارک میں تھا اور شہباز اس سے ہر روز فون پر بات کرتا تھا اور اس کی گھریلو نا چاقی کے قصے مجھے سناتا تھا۔ وہی جھگڑے اس کے قتل کا سبب بنے تھے اور میڈیا میں کچھ سال پہلے اس بھی قتل کا بڑا چرچا رہا تھا۔

اب گھر میں دو نکمے اور پریشان حال بندے تھے اور ہم ہی ایک دوسرے کا سہارا تھے۔ وہ مجھے فلمی اور ٹی وی کے اداکاروں کے قصے سناتا جو ان کے گھر بھی آتے جاتے تھے۔ میں ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جاتا۔ وہ اداکار آج بھی بڑے سینئر اور مشہور ہیں ان کے نام اور وہ واقعات نہیں بتانا چاہتا۔ ورنہ میرا اچھا کا کھل گیا تو لوگ انتہائی دلچسپ کہانیاں سنیں گے لیکن ہر ایک کی اپنی زندگی ہوتی ہے اور دوسرا اللہ کا فرمان ہے کہ تم دوسروں کے عیب چھپاؤ، میں تمہارے عیب چھپاؤں گا

اور میں نے اللہ سے یہ سودا کرلیا ہے۔

ہمیں سب سے پہلے اپنے SIN کارڈ کے لیے اپلائی کرنا تھا۔ یہ کارڈ دو ہفتے میں بن کر آتا ہے اور اس کارڈ کے بغیر ہم کہیں بھی جاب نہیں کرسکتے۔ یہ ہمارا ٹیکس نمبر ہوتا ہے۔ اس کے بغیر آپ کیش پر جاب کرسکتے ہیں جو غیر قانونی ہے کیونکہ اس پر ٹیکس نہیں دیا جاتا ہے۔ یہاں ٹیکس کا نہ دینا بہت بڑا جرم ہے۔ یہاں Human Resource (HRDC) Development کا محکمہ ہے۔ جہاں آپ SIN کارڈ کے لیے اپلائی کرتے ہیں۔ اب اس کا نام تبدیل کرکے سروس کینیڈا رکھ دیا گیا ہے۔ وہیں وہ ہر نئے تارک وطن کو انٹرنیٹ، انٹرنیٹ پر نوکری تلاش کرنے کی تربیت، کینیڈا کے بنیادی نظام پر کورسیس اور بھی کئی طرح کی سہولتیں دیتے ہیں تاکہ آپ کینیڈا سے مکمل طور پر واقف ہو جائیں۔ اس کے علاوہ HRDC نے اپنے فنڈز سے ایسے بہت سے ادارے کھول رکھے ہیں جہاں آپ کو انٹرویو دینے کی تربیت، Resume بنانے کا طریقہ سکھانا اور فون پر انٹرویو، کینیڈا کا سیاسی نظام، آپ کے حقوق، کسی لائبریری میں کسی کتاب کو کمپیوٹر پر سرچ کرنا، ٹورنٹو کے سارے اخبارات اور ان کا سیاسی جھکاؤ، مختلف قسم کے اسٹور اور شاپنگ کرنے کے گر......! غرض ہر قسم کی ٹریننگ آپ کو بالکل مفت دی جاتی ہے۔ ان کے سینٹر پر کمپیوٹر اور پرنٹر بالکل مفت ہوتے ہیں۔ آپ کچھ بھی پرنٹ کریں کوئی آپ سے کچھ نہیں پوچھے گا کہ کتنے صفحے پرنٹ کیے ہیں۔ میرے خیال میں ہر نئے آنے والے کو کچھ دن ان سینٹرز میں ضرور گزارنے چاہئیں تاکہ وہ یہاں کے نظام سے واقف ہو جائے۔

ان دنوں پاکستانی خبریں انٹرنیٹ پر آنا شروع ہو گئی تھیں اور شہباز ہر اخبار کے کالم پرنٹ کرکے لاتا اور مفتی کو سناتا تھا۔ مجھے سیاست سے دلچسپی نہ تھی اور میں کچھ نہ جانتا تھا کہ ملک میں کیا ہو رہا ہے۔

میں اپنے سیاسی نظام سے متنفر ہو چکا تھا ایک ہی طرح کے لوگ باری باری کرسی پر آبیٹھتے اور پھر ایک دوسرے کی کاپی کرنا شروع کردیتے۔ مجھ جیسے کئی اس نظام کی برکتوں سے ملک چھوڑ رہے تھے۔

میں اور شہباز دوسرے دن بس میں بیٹھ کر HRDC کے... آفس گئے۔ وہی کپلنگ سب وے والی بس تھی اور ہم راستے میں سب وے سے پہلے اتر کر HRDC سینٹر کے اندر داخل ہوئے۔ وہاں ہم نے اپنے کارڈز کے لیے اپلائی کیا۔

کوئی بھی مشکل نہ ہوئی۔ دس منزلہ عمارت میں سب دفتر نئے آنے والوں کی مدد کرنے کے لیے بنائے گئے تھے جو بھی لگاتار ایک ماہ یہاں آتا رہے گا پورے نظام کو بہ آسانی سمجھ لے گا۔ اکثر لوگ نوکری کی تلاش میں نہیں بلکہ ان کے نظام کو سمجھ کر اور پھر اس سے ناجائز فائدہ اٹھا کر اپنے آپ کو حکومتی وظیفے پر رکھ لیتے ہیں اور تمام عمر کوئی کام نہیں کرتے مگر ایک بہتر زندگی سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو جاتے ہیں۔

کارڈز اپلائی کرنے کے بعد ہمیں ان کے ایک دوسرے جاب سینٹر پر نوکری ڈھونڈنے کی تربیت دی گئی۔ یہ سینٹر والوں کا اپنا سسٹم تھا جس میں آپ کمپیوٹر کے اندر جا کر اپنی مطلب کی جاب تلاش کرتے ہیں اور وہیں سے ان کو اپنے کوائف اور فون نمبر دے دیتے ہیں۔ کسی کو آپ کی ضرورت ہوگی تو وہ آپ کو فون کردے گا۔ ہم کوئی اچھی جاب نہیں ڈھونڈ رہے تھے بلکہ کسی ریسٹورنٹ سیکیورٹی گارڈ یا کسی اسٹور کی جاب ڈھونڈ رہے تھے۔ ایک تو ہمارا Resume (CV) بھی نہیں بنا تھا اور دوسرا ہمیں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ اچھی جاب کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ ہر کسی کو آسانی سے مل جائے۔ پھر ہمیں کچھ مثالیں دی گئی تھیں کہ کون کون کتنے کتنے مہینوں سے اپنی فیلڈ کی جاب تلاش کررہا ہے اور اسے نہیں ملی Resume جب تک آپ کا ٹھیک سے نہیں بنتا جاب ملنا ناممکن ہوتا ہے اور سونے پر سہاگا یہ بھی ہے کہ آپ کو انٹرویو دینے کی بھی مہارت چاہیے ہوتی ہے۔ اگر آپ کا Resume دیکھ کر آپ کو انٹرویو کی کال بھی آجاتی ہے تو یہ پچاس فیصد نوکری ملنے کی علامت ہوتی ہے اور لوگ آپ کو مبارکباد دیتے ہیں۔ مجھے ایک کافی شاپ کے بارے میں معلوم ہوگیا کہ وہاں کاؤنٹر کی کوئی جاب ہے اور میں نے اس کا پتا لکھ لیا۔ وہ کافی شاپ مشہور چین Tim Horton تھی۔

شہباز کافی دیر سے غائب تھا۔ میں اس کو ڈھونڈ رہا تھا۔ ادھر ادھر بھٹکتا ہوا وہاں جا پہنچا۔ ایک بڑا سا ہال تھا جس میں کئی کمپیوٹر رکھے تھے۔ سارا عملہ مدد کے لیے مستعد تھا مگر شہباز کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ کافی کوشش کے بعد وہ ایک کونے میں بیٹھا نظر آیا۔ اس کے سامنے کمپیوٹر تھا۔ وہ اس کے آگے یہ کہتا ہوا اٹھ گیا۔ ”یہاں حالات بہت برے ہیں۔ بڑا سیاپا ہے۔“

پھر ہم انٹرنیٹ سکھانے والے ڈیپارٹمنٹ میں گئے۔ وہاں کلاس لینے کے لیے اپنے آپ کو رجسٹرڈ کروایا اور پھر ہمیں

ایک ایک کارڈ تھما دیا گیا جس پر ہمارا رجسٹریشن نمبر لکھا تھا۔ یہ کارڈ دکھلا کر ہم کسی بھی سینٹر میں داخل ہو سکتے تھے۔ ایک عمر رسیدہ خاتون نے نہایت پیار اور توجہ سے ہمیں معلومات فراہم کیں، تسلی دی اور کافی پلائی۔ شہباز کو ای میل کرنا آتا تھا، اس نے اپنے ایک دوست کو لاہور ای میل کیا۔ اس ای میل کے مندرجات میں بیان نہیں کر سکتا کیونکہ کینیڈا کو ننگی اور بے ہودہ گالیاں دی گئی تھیں اور آخر میں یہی لکھا کہ یہاں حالات بہت ہی خراب ہیں۔ دور کے ڈھول سہانے لگتے ہیں۔

فارغ ہوئے تو شہباز اپارٹمنٹ اور میں Tim Hortn جاب کی تلاش میں جانا چاہتا تھا۔ وہ گھر یعنی اپارٹمنٹ چلا گیا اور میں نے اپنے بیگ سے ٹرانسپورٹ والا نقشہ نکالا۔ مفتی کا سبق میرے کام آرہا تھا۔ کچھ بسیں تبدیل کر کے میں ٹم ہارٹن پہنچ گیا۔ سردی سے قلفی جم رہی تھی۔ درجہ حرارت منفی سے بہت نیچے تھا اور ساتھ ہی یخ بستہ ہوا بھی چل رہی تھی۔ میں فٹ پاتھ پر چلتا جا رہا تھا۔ میرا بیگ گلے میں لٹکا تھا اور مجھے اردگرد کا ہوش نہ تھا کہ کوئی پارک ہے یا کوئی بلند عمارت یا کوئی دل آویز منظر ہے۔ سارا شوق کہیں دھرا کا دھرا رہ گیا تھا۔ کافی شاپ کی تزئین و آرائش ہو رہی تھی۔ ایک لبنانی ملا جس کو یہ فرنچائز ملی تھی۔ اس نے پہلے تو مجھے اوپر سے نیچے دیکھا۔ پھر تعلیم پوچھی اور جب معلوم ہوا کہ میں نے فارمیسی میں ماسٹر کیا ہے تو اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آیا اور پھر اتر گیا۔ یہ تو بعد میں مجھے کسی نے بتایا کہ جس قسم کی جاب ڈھونڈنے جاؤ تو ویسے ہی اپنی تعلیم کم کرتے جاؤ۔ کوئی کافی شاپ والا اس بندے کو کیسے کاؤنٹر کی نوکری پر رکھے گا جس نے ماسٹر کیا ہوا ہو۔ اسے معلوم ہوگا کہ جیسے ہی اسے اپنے معیار کی نوکری ملے گی تو یہ بھاگ جائے گا اور اس کو ابتداء میں دی ہوئی ٹریننگ بھی ضائع چلی جائے گی۔ مجھے بھی اس نے یہ کہا کہ کل فون کر کے بتا دے گا کہ جاب ہے یا نہیں۔ میں نے بھی مایوسی سے چڑتے ہوئے اس کا جواب سنا اور دوبارہ بسیں بدل بدل کر اپارٹمنٹ آپہنچا۔

آج خان قیصر اپنا بستر باندھ کر اپنے کسی دوست کے ہاں شفٹ ہو رہا تھا۔ ایک مہینے میں اس کی فیملی آرہی تھی۔ اس کے جانے پر میں بھی خفا تھا کیونکہ وہ بہت ہنس مکھ انسان تھا مگر مجھے معلوم تھا کہ ایک ماہ میں وہ سامنے والی بلڈنگ میں شفٹ ہو رہا ہے اور اس سے ملاقات تو رہے گی۔ آج میں نے خان قیصر کے لیے کڑاہی گوشت بنایا۔ خان قیصر نے مجھے ایک کارڈ دیا اور کہا۔ ”اگر امریکا میں فارماسسٹ کے لائسنس کا امتحان دینا ہے تو یہ ادارے کا نام اور فون نمبر ہے جہاں سے تم کو ساری معلومات مل جائیں گی۔“

میں نے شکریے کے ساتھ وہ کارڈ رکھ لیا۔ پھر بعد میں اللہ کی مدد سے اسی کارڈ کو استعمال کر کے امریکا میں لائسنس لیا تھا۔ وہ کارڈ آج بھی میرے پاس محفوظ ہے اور آج بھی سوچتا ہوں کہ کس ذہنی دباؤ کی حالت میں وہ کارڈ میں نے کہاں بیٹھ کر کس بے دلی سے لیا تھا اور اللہ پاک نے مدد کی اور ایک لمبے مرحلے کے بعد اپنے مقام پر آپہنچا۔

مطیع اللہ سے کل سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ فون پر پیغام بھی چھوڑا مگر جواب نہیں آیا تھا۔ یہ بعد کے تجربات ..... سے معلوم ہوا کہ یہاں اگر کوئی کسی بھی جاب میں آگیا تو ایک چکر میں پھنس گیا۔ نہ اس کے لیے دن دن ہوتا اور نہ رات رات۔ ایک مشین کی طرح زندگی چلتی جاتی ہے۔ جس کو بٹن دبا کر اسٹارٹ کر لیں اور پھر اس مشین نے بند نہیں ہونا ہوتا ہے۔ وہ ویکن ہٹ (Wackenhut) سیکورٹی کمپنی میں سیکورٹی گارڈ کی جاب کرتا تھا۔ سیکورٹی گارڈ کی جاب نچلے لیول کی جاب میں سب سے بہتر سمجھی جاتی تھی۔ پینٹ کوٹ پہن کر کسی اپارٹمنٹ بلڈنگ، کسی بینک یا کسی فیکٹری میں بغیر جسمانی مشقت کے آپ اپنے گھنٹے گزار کر آجاتے ہیں۔ کسی فیکٹری یا اسٹور میں لیبر کی جاب پر تو بوجھ اٹھاتے ہیں یا فرش صاف کر رہے ہوتے ہیں۔ یہ سب کام کرتے آپ مر بھی رہے ہوتے ہیں اور اندر ہی اندر رستے اور سسکتے رہتے ہیں۔ سیکورٹی گارڈ کی جاب میں آپ صاف ستھری وردی میں ملبوس ہوتے ہیں اور بہت سے دوسرے آپ کو قانون کا محافظ سمجھ رہے ہوتے ہیں۔

سیکورٹی کی رات کی جاب سب سے آسان سمجھی جاتی ہے۔ رات کو آپ نے ایک کرسی پر بیٹھ جانا ہوتا ہے اور ساری رات یا تو کتابیں پڑھیں اور اگر کسی امتحان میں بیٹھ رہے ہوں تو اس کی تیاری کریں۔ ان دنوں آس پاس کے بہت سے دوست سیکورٹی کی جاب کر رہے تھے اور آج اللہ کی مدد سے امتحان پاس کر کے اچھی نوکریوں پر آچکے ہیں مگر ان دنوں سیکورٹی کی جاب کا ملنا بھی مشکل تھا اور مطیع اللہ تو ویسے بھی نہیں مل رہا تھا۔ شہباز فخری جس کو میں کبھی فخری اور کبھی شہباز کہتا تھا۔ وہ کارپٹ پر بنیان پہنے لیٹا یہی کہتا تھا۔ ”یہ ملک ہے ہی بے وفا۔ نرا سیاپا ہے۔ کوئی دوست دوست نہیں ہے۔ نہ نوکری ملتی ہے اور نہ چین نصیب ہوتا ہے۔ بہت برے حالات ہیں۔ پھر دس ٹھنڈی سانسوں کے برابر ایک سانس لیتا ہوا

خیالوں میں کسی کو غصے یا دکھ سے گھورنے لگا۔
کل HRDC میں انٹرنیٹ ٹریننگ کی کلاس ساڑھے نو بجے تھی۔ میں اور شہباز رات کو اپنے اپنے قصے سناتے سناتے سو گئے۔
صبح اٹھے تو مفتی چھ بجے جا چکا تھا۔ ایک ہفتے اس کی صبح کی شفٹ ہوتی جو سات بجے شروع ہوتی تھی اور ایک ہفتہ دوپہر تین سے رات دس بجے تک شفٹ ہوتی تھی۔ ہم دونوں اسے رشک بھری نظروں سے دیکھتے تھے کہ وہ ایک اچھی جاب پر لگا تھا اور پانچ دن کام کرتا اور ویک اینڈ گھر پر گزارتا تھا۔ ایسی جاب خوش نصیبوں کے حصے میں آتی ہے۔ شہباز گالیاں دیتا بیدار ہوا تھا۔ "یار کیا سیاپا ہے؟ جاب تو نہیں مگر جاب ڈھونڈنے کی ٹریننگ کے لیے صبح سویرے اٹھ بھی جاؤ!" وہ بڑبڑا رہا تھا۔
میں نے کہا۔ "صرف اٹھو نہیں بلکہ ناشتا بھی تیار کرو۔"
وہ دوبارہ سے بڑبڑاتا ہوا کچن میں گھس گیا۔
"ناشتے کے لیے بیٹھے تو کہنے لگا کہ کیا ڈبل روٹی سے بھی ناشتا ہوتا ہے؟ ناشتے میں جب تک چنے اور نان نہ ہوں تو معدے کو معلوم بھی نہیں پڑتا کہ اس میں کچھ گیا ہے یا نہیں؟"
"تیرے معدے میں سالم بکرا بھی غائب ہو جائے تو تمہیں خبر نہ ہوگی۔ جلدی کرو ابھی بس کے آنے کا وقت ہو رہا ہے۔" میں نے کہا۔
ایک بات کی وضاحت کر دوں کہ شہباز فخری کا لہجہ خالص لاہوریوں والا تھا اور خیر سے ہر فقرے میں دو گالیاں ضرور ہوتی تھیں اور اگر وہ فقرہ دو لفظوں کا ہو تو سمجھ لیں کہ اس میں صرف گالیاں ہی ہیں جو قابلِ اشاعت ہرگز نہیں۔
اپنی ہمیشہ والی چھیالیس نمبر بس پکڑی اور ڈنڈاس اسٹریٹ پر HRDC کے کثیر منزلہ سلیٹی عمارت کے سامنے اتر گئے۔ دونوں نے بیگ اٹھائے ہوئے تھے جن میں اپنی ڈگریاں اور معلوماتی کتابچے تھے۔ آج انٹرنیٹ کی کلاس کی ترتیب بورڈ پر لگی تھی۔ ہر کرسی کے ساتھ میز لگی تھی۔ کمرا روشنیوں سے جگمگا رہا تھا جیسے کسی ملٹی نیشنل کمپنی کے بورڈ آف گورنرز کی میٹنگ ہو۔ سارے بے روزگاران کرسیوں پر بیٹھے انٹرنیٹ سیکھ رہے تھے۔ ایک سیاہ فام خاتون نے پہلے سب سے کہا کہ کس کس کا ای میل ایڈریس نہیں ہے تو شہباز کے علاوہ سب نے ہاتھ اٹھا دیئے۔ سب نے شہباز کے لیے تالیاں پیٹیں اور وہ پھولے نہیں سماتا تھا۔ پہلے کچھ شرمایا اور پھر زرد پڑ گیا اور آخر میں چہرے پر پسینا بھی آ گیا۔ یہ اس کا زرد پڑنا، پسینا آنا، اس کی شدید کیفیات کی علامات تھیں۔ چاہے وہ خوشی کی ہوں یا الم کی۔
میرا ای میل اکاؤنٹ بنایا گیا اور جو آج بھی میں استعمال کر رہا ہوں۔ مجھے انٹرنیٹ اور ای میل کی بنیادی معلومات ملیں اور یہ سلسلہ پھر جاری رہا۔ دنیا سے رابطے کا نظام سمجھ میں آتا گیا۔ ای میل اور انٹرنیٹ نے دنیا میرے آگے کھولنا شروع کر دی۔
میرے ساتھ ایک کرسی پر پینٹ اور شرٹ میں ملبوس ایک لڑکی بیٹھی تھی۔ میں اس کی جانب تب متوجہ ہوا جب اس نے بھاری سی آواز میں مجھ سے کوئی سوال پوچھا۔ مجھے کیا معلوم تھا جو اسے جواب دیتا؟ بعد میں باتیں ہوئیں تو معلوم ہوا کہ وہ پاکستانی ہے اور نام لبنیٰ بتا رہی تھی۔ میں وقفے میں سگریٹ پینے عمارت سے باہر آیا تو وہ بھی باہر چلی آئی۔ میں ڈر رہا تھا کہ کہیں سگریٹ ہی نہ مانگ لے۔ جو پیکٹ ان دنوں پاکستان میں پچاس روپے کا تھا وہ یہاں بارہ ڈالر کا تھا۔ میں تو وہی پھونک رہا تھا جو پاکستان سے لایا تھا۔ لبنیٰ نے سگریٹ تو نہیں مانگا مگر اپنی کہانی بتانے لگی۔ کچھ اور لوگ بھی سگریٹ پینے باہر آ کھڑے تھے۔ وہ بتا رہی تھی۔ "میں اکیلی چند دن پہلے آئی ہوں۔ کسی جاننے والے گھرانے میں رہ رہی ہوں اور وہ لوگ اب منہ بنا رہے ہیں۔"
شہباز اپنے پیٹ پر اپنا بیگ لٹکائے ساتھ کھڑا تھا۔ وہ کہنے لگا۔ "نرا سیاپا ہے۔ حالات بہت خراب ہیں اور آپ اکیلی یہاں کیسے رہیں گی؟"
وہ بولی۔ "میں اپنی تعلیم کو آگے بڑھاؤں گی۔ یہاں حکومت آسان شرائط پر قرضہ دیتی ہے۔ جب یہاں کی تعلیم مکمل ہو جائے گی تو جاب بھی مل جائے گی۔"
یہاں ہر ایک کی اپنی کہانی تھی۔ ہر ایک تگ و دو میں لگا تھا۔ اتنے میں ایک دیسی لڑکا بوکھلایا ہوا ہمارے سامنے ہاتھ میں SIN کارڈ کا فارم لیے کھڑا ہماری جانب مدد طلب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ فارم اسے ایئرپورٹ پر تب دیا گیا ہوگا جب وہ امیگریشن کے خواب سجائے طیارے سے اترا ہوگا، کیونکہ ہمیں بھی وہیں سے یہ فارم ملے تھے۔ اسے دیکھتے ہی شہباز بولا۔ "لو ایک اور سیاپا آ گیا۔"
ہم سب اس کی جانب متوجہ ہو گئے۔ اس نے پوچھا۔ "آپ پاکستانی ہیں؟"
شہباز جواب میں کچھ کہہ ہی رہا تھا کہ میں نے

اشارے سے اسے روک دیا اور کہا "جی ہاں! فرمایئے ہم کیا کر سکتے ہیں آپ کے لیے؟"

اسے SIN کارڈ کے لیے اپلائی کرنا تھا۔ اسے میں نے گائیڈ کر دیا۔ پھر کہنے لگا۔ "میرا نام فیصل ہے۔ میں کل پاکستان سے آیا ہوں۔ کسی کے ذریعے سے ایک فیملی کے ساتھ ٹھہرا ہوں۔ وہ لوگ میرے آنے سے ذرا بھی خوش نہیں ہیں۔"

میں نے کہا کہ ایک دو دن میں کوئی اور جگہ دیکھ لینا اور ابھی کل ہی تو آئے ہو۔

وہ کہنے لگا۔ "پیسے تیزی سے خرچ ہو رہے ہیں، بہت زیادہ پریشانی ہے۔" اور پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور ساتھ ہی سردی سے وہ کانپنے لگا۔ میں نے اسے دلاسا دیا۔ لبنیٰ بھی اسے سمجھا رہی تھی کہ اس کی بھی یہی کہانی ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ اپنے میزبانوں کے رویے اور گھر سے بہت دور ہونے پر پریشان ہے۔ پھر وہ شہباز سے مخاطب ہوئی۔ "آپ کی کوئی جاننے والی فیملی یہاں ہے؟"

میں نے کہا۔ "اس کے ماموں نے ابھی نیا گھر خریدا ہے۔ شاید یہ ہی آپ کی مدد کر سکے۔"

یہ سن کر اس نے شہباز کا بازو پکڑا اور ایک دوسرے سرد کونے میں اسے لے گئی۔ کچھ دیر بعد میں نے دیکھا تو شہباز شرم سے دوہرا ہو رہا تھا اور چہرہ پسینے سے تر بتر تھا۔ چہرے پر شرمندگی کی زردی کھنڈ دی تھی۔

لبنیٰ کہنے لگی کہ آپ تو سب مرد اکٹھے رہتے ہیں۔ اگر کوئی ایسی فیملی ملے جو ایک کمرا کرایہ پر دینا چاہے تو مجھے ضرور بتانا۔ فیصل بھی اُمید بھری نظروں سے ہمیں دیکھنے لگا۔

میں بھی بے بس تھا اور اپنا چہرہ چھپا رہا تھا اور اندر سے شرمندہ ہو رہا تھا کہ میں ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ ہم دوبارہ کلاس میں چلے گئے۔ لبنیٰ جاتے جاتے پھر شہباز کو یاد دلا گئی کہ میرا خیال رکھنا اور شہباز سرشاری سے سنبھالے نہ سنبھلتا تھا۔ اس نے کل آنے کا کہا۔ ہم دونوں کل گئے مگر وہ نظر نہ آئی صرف اسی دن نہیں پھر کبھی بھی، کہیں بھی نظر نہ آئی۔ خدا جانے فیصل اور لبنیٰ اب کہاں ہوں گے؟

میں اور شہباز اپارٹمنٹ میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ مفتی جاب پر تھا۔ مجھے آئے ایک ہفتہ ہونے کو تھا اور محسوس ہو رہا تھا کہ سال بیت گئے۔ شہباز اپنے سچے جھوٹے قصے سناتا اور ہنس ہنس کر میرا برا حال ہو جاتا۔ میری اور شہباز کی اب بننے لگی تھی۔ ہمارے مسائل ایک جیسے تھے مگر اس کی شادی ابھی نہیں ہوئی تھی۔ مجھے تو کینیڈا کی امیگریشن کے لیے ڈھائی سال انتظار کرنا پڑا تھا اور وہ کم بخت آٹھ مہینوں میں یہاں آ پہنچا تھا اور آٹھ دنوں میں بدل ہو گیا تھا۔ اتنے میں دروازے کو کسی نے کھٹکھٹایا تو شہباز بولا۔ "کوئی سیاپا ہی ہو گا۔"

میں نے کئی بار شہباز سے پوچھا بھی تھا کہ کہیں اسے ماموں خورشید کا نمبر دے تو نہیں دیا تھا۔ جواب میں وہ جھلا کر کہتا۔ "کیا معلوم وہ ماموں کے ہتھے چڑھ گئی ہو اور بیسمنٹ میں اسے چھپا رکھا ہو۔" پھر کچھ سوچ کر کہتا۔ "ماموں بھی بہت بڑی شے ہے...... بہت بڑا سیاپا ہے۔"

اس نے دروازہ کھولا تو بلڈنگ کی صفائی کرنے والا رمضان تھا۔ وہ کوسوو سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ میرا دوست بن گیا تھا اور اکثر آجاتا تھا۔ اس کی کہانی یہ تھی کہ کوسوو میں قتل عام شروع ہوا تو رمضان کینیڈا آ چکا تھا۔ اس کے بچے وہاں پھنس گئے تھے۔ اس نے بتایا۔ "میں بچوں کی زندگی کی دعا مانگتا۔ ہر وقت اللہ کے حضور رو رو کر گڑگڑاتا اور بالآخر دو سال بعد میرے بچے مجھے آ ملے۔"

اب وہ اپنے بچوں کے ساتھ ہنسی خوشی رہ رہا ہے۔ وہ مجھ سے کہتا۔ "تم فکر مند مت ہو۔ بس اللہ کا در پکڑے رہو، انشاء اللہ جاب بھی مل جائے گی اور بچے بھی آجائیں گے۔"

یہی تسلیاں مجھے اُمید دلاتی تھیں۔ آج بھی رمضان بیٹھا میرے ساتھ شہباز کو بھی تسلیاں دے رہا تھا اور شہباز اس سے بے پروا ہو کر بیٹھا تھا۔ ٹھنڈی سانس بھرتا تھا۔

مفتی میری ایک عادت سے نالاں نظر آتا تھا کہ میں ہر ایک سے گھل مل جاتا ہوں۔ مفتی ایک پرائیویٹ قسم کی شخصیت رکھتا تھا۔ اس کا کوئی دوست نہ تھا۔ آج کل مجھ سے کہہ رہا تھا کہ تم پہلے بندے ہو جس کو میں نے دوست بنایا ہے۔ ایک بار کہنے لگا تھا کہ ہم دونوں کی عادتیں بالکل ایک جیسی ہیں۔ میں نے اور شہباز نے بہت غور کیا کہ کون سی عادتیں ہماری ایک جیسی ہیں تو ہم دونوں کو ایک بھی مطابقت نظر نہ آئی۔ شہباز نے ہنستے ہوئے کہہ دیا۔ "یار تیرا سیاپا بھی شروع ہونے والا ہے۔ مفتی جس کو دوست کہہ دے تو وہ کوئی نارمل انسان نہیں رہتا۔" پھر ہنستے ہوئے بولا۔ "ایک عادت تو دونوں کی مشترک ہے کہ تم دونوں ہی کھانا کھاتے ہو۔"

"اور تم کیا گھاس کھاتے ہو؟" میں نے چوٹ کی تو وہ اداسی کے سمندر میں ڈوب گیا۔

کل قندیل کی سالگرہ ہے اور وہ ماشاء اللہ چار سال کی

ہو جائے گی۔ اس کی سالگرہ میں سادگی مگر اہتمام سے مناتا تھا۔ ایک کیک لاتا اور سب گھر والے مل کر اکٹھے ہوتے۔ میرے بھائی اور ان کے بچے۔ قندیل سب کی آنکھ کا تارہ تھی۔

میں نے ڈائری اٹھائی اور اس پر کچھ لکھنے لگا۔ ''کل اس کی سالگرہ ہوگی مگر میں ان میں شامل نہیں ہوں گا۔ میں چار پانچ سال بعد کچھ کما کر واپس جاؤں گا۔ یہاں اپنے بچوں کو مستقل نہیں رکھوں گا۔ پاکستان میں جا کر اپنی جاب جوائن کروں گا۔ ان پیسوں سے اپنا گھر بنواؤں گا اور باقی رقم سے کچھ کاروبار شروع کروں گا۔ جو مزہ اپنی زمین پر رہنے میں ہے وہ غیر زمین پر کہاں ملتا ہے۔''

یہ الفاظ میں نے اس دن بیٹھ کر لکھے تھے جب رمضان چلا گیا تھا اور فخری خراٹے بھر رہا تھا۔ مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ تیز ہوا کے جھکڑ چل رہے تھے۔ آج ان الفاظ کو پڑھ کر ہنسی آتی ہے کہ ایک وہ میری پلاننگ تھی اور ایک میرے خالق نے کی۔ پانچ سال بعد پاکستان میں دہشت گردی بہت زیادہ پھیل چکی تھی۔ حالات خراب ہو گئے تھے اور لوگ بھاگ بھاگ کر دوسرے ملکوں کو جا رہے تھے۔ میں جب واپس آنے کا کہتا تو سب مل کر میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیتے کہ یہ بات نہ کہو کیونکہ قبولیت کی بھی کوئی گھڑی ہوتی ہے۔

میں نے گھر فون کیا کیونکہ آج قندیل کی سالگرہ تھی۔ قندیل کو سمیعہ پہلی بار اسکول لے گئی تھی۔ تیار تو خوشی خوشی ہوئی تھی مگر وہاں فساد ڈال دیا تھا کہ اکیلے نہیں رکے گی اور روتی ہوئی واپس آ کر اب ماں کی برائیاں کر رہی تھی۔ میں نے سالگرہ کی مبارکباد دی تو کہنے لگی۔ ''مما کہتی ہیں کہ جب بابا گاڑی لیں گے تو ہمیں بلوا لیں گے۔ سچ ہے نا بابا۔'' میں خاموش ہو رہا۔

صبح پھر ہم HRDC میں تھے۔ آج کی کلاس ایک عمر رسیدہ خاتون لے آ رہی تھی۔ کل والی ذرا آہستہ بول رہی تھی تو بات سمجھ آ جاتی تھی۔ آج تو یہ مائی ہوا کے گھوڑے پر سوار سرپٹ بھاگی چلی جا رہی تھی۔ نہ لفظ کی سمجھ آتی اور نہ کوئی معنی اسے پہنا سکتا تھا۔ اس نے آتے ہی اپنا تعارف کرایا تھا کہ میرا نام کفتی ہے۔ میں اس کی اس عمر میں اتنی رفتار پر پریشان تھا تو وہ جوانی میں کیا رفتار رکھتی ہوگی۔ مجھے کچھ اور نہ سوجھا کہ میں کیسے آہستگی سے اسے بولنے کا کہوں۔ میں نے اچانک زور سے کہا۔ ''کفتی!'' تو وہ پہلے ٹھٹک کر میری جانب مڑی اور سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔ اب میں پریشان تھا کہ اسے کیا کہوں؟ میں ہونق بنا اسے دیکھ رہا تھا اور وہ مجھے دیکھ رہی تھی۔

آخر میں نے سوچ کر کچھ الفاظ ترتیب دیے اور بولا۔ ''پلیز آہستہ بولیں۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہی ہے۔''

وہ میرا مطلب سمجھ گئی اور مسکرا کر کہا۔ ''آئی ایم سوری۔ اب تمہیں کوئی شکایت نہ ہوگی۔'' میں اس مرحلے کے گزرنے پر تھوڑا سا پُرسکون ہوا کہ یہ سوال کرنے کی بلا تو ٹلی۔

شہباز زور زور سے ہنس رہا تھا جیسے اس کے جسم میں زلزلہ آ گیا ہو۔ کہنے لگا۔ ''تو اب یہاں بھی سیاپا ڈالے گا۔''

اپارٹمنٹ واپس آئے تو ایسا محسوس ہوا کہ زندگی کا یہ دن بھی کالا ہوا ہے، ایسا لگ رہا تھا کہ میں کسی کام کا نہیں ہوں۔ ایسے فراغت سے بیٹھنا مجھے کھائے جا رہا تھا۔ میں نے میز پر پڑے کمپیوٹر پر مائیکروسافٹ آفس کے پروگرام ورڈ کی پریکٹس شروع کر دی۔ اتنے میں کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا تو شہباز بولا۔

''تیرا ہی کوئی ملنے والا ہوگا۔'' یہ کہہ کر دروازہ کھولا تو کوئی نوجوان لڑکا کھڑا تھا۔ کسی کی وساطت سے مجھ سے ملنے آیا تھا۔ اس کو ہم نے بٹھایا۔ چائے بنائی گئی۔ وہ اپنا نام نعیم بتا رہا تھا۔ اس کا ایک بھائی جاپان میں تھا اور اس نے اربوں روپے لگا کر لاہور کے آس پاس کہیں پاور پلانٹ لگایا تھا۔ نعیم کو امریکا آنے کا شوق تھا۔ ایک بار پہلے سیاحتی ویزے پر آ چکا تھا۔ دوبارہ ویزا نہ ملا تو پناہ گزین بن کر کینیڈا آ گیا۔ ایئرپورٹ پر جہاز سے اترتے ہی شور مچا دیا کہ میرا کوئی پاسپورٹ نہیں اور پاکستان میں میری جان کو خطرہ ہے۔ یہ ڈرامے یہاں بہت ہوتے ہیں۔ کوئی کسی سیاسی جماعت کا ورکر بن جاتا ہے کہ حکومت انتقام لے رہی ہے اور کوئی قادیانی بن جاتا ہے اور کوئی ایک فرقے کا بن کر دوسرے فرقے سے خطرہ بیان کرتا ہے۔ حالانکہ جس فرقے کا بن کر پناہ وصول کرتا ہے اسی کو بھی برا بھلا... کہہ رہا ہوتا ہے۔ لڑکی ہو تو کہتی ہے کہ ماں باپ میری شادی کسی بوڑھے سے زبردستی کر رہے تھے اور میں چھپ کر بھاگ آئی۔ پاکستان میں ایسی لڑکیوں کی مدد این جی اوز پیسے لے کر کرتی ہیں۔ میں ایک پاکستانی خاتون کو اچھی طرح جانتا ہوں بلکہ پورا پاکستان جانتا ہے جو عورتوں کے حقوق پر کینیڈا سے پیسے بٹور رہی ہے۔ یہ انسانوں کی اسمگلنگ کا دھندا کرتے ہیں اور دونوں جانب سے پیسے مارتے ہیں۔ اس میں ہمارے میڈیا کے کچھ نامور لوگ بھی شامل ہیں۔ اب تو یہ دھندا بہت کم ہو چکا ہے مگر ان بھیڑیوں نے ملک کو بہت بدنام کر دیا ہے۔ مجھے یہ سب اس وقت معلوم ہوا جب میں امیگریشن ہولڈنگ سینٹر میں سیکیورٹی پر

تھا۔ وہاں یہ سب پناہ گزین ایئرپورٹ سے ہم اٹھا کر لاتے تھے۔

نعیم بیٹھا اسی قسم کی کہانی بیان کررہا تھا۔ کہنے لگا کہ اب کسی طرح یہاں سے امریکا گھس جاؤں گا اور چار پانچ سال وہاں رہ کر پاسپورٹ لوں گا اور واپس اپنا کاروبار سنبھالوں گا۔

میں نے پوچھا۔ "مگر تم امریکا کیسے جاؤ گے؟"

کہنے لگا۔ "میری بات ہوگئی ہے۔ دو ہزار میں مجھے کسی کنٹینر یا کسی بوٹ میں بٹھا کر وہاں چھوڑ دیں گے اور کوئی ایک بار امریکا میں آگیا تو کوئی اسے نہیں پوچھتا کہ قانونی ہو یا غیر قانونی ہو؟"

میں اور شہباز حیرت سے یہ سب سنتے رہے۔ یہ سب تو گیارہ ہونے سے دو سال پہلے کی بات ہے۔ مگر میں نے ایسے لڑکوں کو نیویارک میں دیکھا ہے جو اس طرح آتے ہیں۔ میں نے کانوں کو ہاتھ لگا لیا تھا۔ کسی جانور سے بھی بدتر حالت میں ہوتے ہیں۔ جانوروں کی طرح ایک کمرے میں پانچ پانچ لڑکے کہیں نہ کہیں سوئے ہوتے ہیں۔ پورا دن کسی اسٹور پر صفائی یا کاؤنٹر پر گدھوں کی طرح آدھی اجرت پر کام کرتے ہیں۔ رات کو گھر آتے ہیں اور کچھ نہ کچھ کھا کر پھر سو جاتے ہیں اور دوسرے دن وہی کولہو کے بیل بن جاتے ہیں۔ ہر وقت یہی کہتے رہتے ہیں کہ پتا کیسے ملے گا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ پتا یہ لوگ گرین کارڈ کو کہتے ہیں۔ ایک دو سال محنت مزدوری کر کے چند ہزار ڈالر اکٹھے کرتے ہیں اور پھر انہی پیسوں سے کسی گوری یا کالی، عمر رسیدہ شرابن یا کم درجے کی کام کرنے والی سے جعلی شادی کرلیتے ہیں اور پھر اپنی زندگی پر آنسو بہاتے رہتے ہیں۔

نعیم کی باتیں میں دلچسپی سے سن رہا تھا کیونکہ یہ میرا پہلا موقع تھا کہ مجھے یہ معلومات مل رہی تھیں۔ میں اور شہباز ایک دوسرے کو خوش نصیب کہہ رہے تھے کیونکہ ہم اپنی قابلیت پر مکمل سکونت کا ویزا لے کر آئے تھے۔ نعیم چلا گیا اور اس کے بعد دوبارہ ملاقات نہیں ہوئی۔ یہاں آپ کو کئی ایک لوگ ایسے ملیں گے جو سراپا پرتپاک نظر آئیں گے اور پھر ہمیشہ کے لیے غائب ہو جائیں گے۔ یہاں آنا جانا لگا رہتا ہے۔ یہاں پر ملنے والے آپ کی گلی، علاقے یا شہر کے رہنے والے نہیں ہوتے جو وقتاً فوقتاً آپ سے ٹکراتے رہے ہیں۔ کئی ایک، ایک بار ملے اور پھر وہ چہرے ہمیشہ کے لیے کھو گئے۔ ٹورنٹو بہت سے شہروں کے آپس میں ملنے سے گریٹر ٹورنٹو ایریا (GTA) بنتا ہے۔ یہ سب شہر ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ ایک شہر مسی ساگا کہلاتا ہے۔ جب ہم آئے تھے تو یہاں خال خال پاکستانی بستے تھے اور اب یہ دیسی لوگوں کا گڑھ بن چکا ہے۔ نیا شہر ہے اور سب تعمیرات بھی نئی ہیں۔ شہباز کے والد جمیل فخری مرحوم نے اپنے بیٹے کو فون نمبر دیا تھا اور کہا تھا کہ تمہاری دور کے رشتے کی کوئی خالہ مسی ساگا میں ہے، اس کو فون کر دینا۔ شہباز آج اپنی خالہ کا نمبر نکال کر یہ سمجھ بیٹھا تھا کہ خالہ کا نام مسز ساگا ہے۔ اسے فون ملانے سے پہلے مجھے اطلاع دے رہا تھا کہ میری یہ خالہ تیس سال سے یہاں ہے۔ اس کی تو یہاں بہت جان پہچان ہوگی اور یہ کوئی جاب بھی دلوا دے گی۔ اس نے فون ملایا تو پہلے نمبر مصروف ملا تو یہ جھنجلا گیا۔ "بڑا اسیاپا ہے یہاں۔ کچھ بھی ٹھیک نہیں ہو رہا۔ بہت برے حالات ہیں۔" یہ کہہ کر پھر نمبر ملانے لگا تو کچھ دیر بعد کال لگ گئی۔ یہ اب فون پر پوچھ رہا تھا۔ "مسز ساگا سے بات ہوسکتی ہے؟"

میں کمپیوٹر پر اپنی پریکٹس کررہا تھا اور یہ دوسری کرسی پر بیٹھا فون پر مسز ساگا کا پوچھ رہا تھا۔ ریسیور پر اس خاتون کی آواز بھی آرہی تھی۔ پہلے تو وہ مسز ساگا پر ٹپٹائی اور پھر بولی کہ یہاں کوئی مسز ساگا نہیں رہتی۔ اسی دوران میں اپنا کام چھوڑ کر اس تماشے سے لطف اندوز ہونے لگا۔ پھر اس نے نمبر کنفرم کیا اور پھر بولا۔ "میرے والد صاحب نے یہی نمبر دیا تھا کہ تمہاری خالہ یہیں رہتی ہیں۔"

شہباز کے ماتھے پر پسینا آرہا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ اب وہ پریشانی میں گھبرا رہا ہے۔ یہ بحث کچھ دیر جاری رہی۔ پھر اس خاتون نے سوال کیا۔ "والد کا نام آخر ہے کیا؟"

جب اس نے اپنے والد کا نام بتایا تو ریسیور میں سے ایک قہقہہ بلند ہوا اور پھر اس نے رکنے کا نام ہی نہ لیا۔ شہباز واقعی گھبرا گیا تھا۔ آخر میں وہ خاتون بولیں۔ "پتر! مسی ساگا شہر کا نام ہے اور میں تیری خالہ پروین ہاں۔"

اب میرا قہقہہ جو نکلا تو اس نے رکنے کا نام ہی نہ لیا۔ میں ہنسی سے لوٹ پوٹ ہوتا مفتی کے میٹرس پر جا گرا۔ شہباز کا رنگ خجلت سے زیادہ زرد ہو رہا تھا اور پسینا اس کے شرمندہ ہوتے چہرے پر ٹپک رہا تھا۔

اس کی بات ختم ہوگئی تھی اور وہ غصے اور شرمندگی سے زرد ہو کر مجھے دیکھے چلا جا رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔ "تجھے تیری خالہ کے نام کا بھی پتا نہیں۔ ابو سے پوچھ کہ کوئی ٹورنٹو نام کے خالو بھی تو یہاں نہیں رہتے۔"

شہباز نے مجھ سے قسمیں لیں کہ مفتی اور خان قیصر کو

نہیں بتاؤں گا۔ میں نے کہا کہ ایک کو تو بتانے دو اور پھر وہ مفتی پر راضی ہوا کیونکہ اگر خان کو معلوم ہو جاتا تو پھر بات پورے ٹورنٹو میں پھیل جاتی۔ پھر اس نے بات بدلنے کے لیے ڈور وال کا پردہ ہٹا کر باہر دیکھا اور کہا۔ "لگتا ہے آج بارش ہوگی۔"

میں نے کہا۔ "خان کو بتا دیا تو اولے بھی پڑیں گے۔"

اس نے میرے آگے ہاتھ باندھ لیے "یار اسے مت بتانا وہ بہت بڑا ڈھول ہے۔"

بعد میں وہ اپنی خالہ پروین سے ملنے گیا تھا۔ واپس آیا تو میں کمپیوٹر پر بیٹھا کام کر رہا تھا۔ آتے ہی اپنا بیگ غصے اور بے بسی سے مفتی کے میٹرس پر زور سے پھینکتے ہوئے بولا تھا۔ "بس کی ٹکٹیں بھی کالی کیں اور وقت بھی۔"

میں نے مسکرا کر پوچھا۔ "ہوا کیا؟"

کارپٹ پر گرتے ہوئے بولا۔ "خالہ مجھے کیا جاب دلوائے گی۔ وہ خود پچیس سال سے ایک دیسی اسٹور کو روٹیاں بنا کر بیچ رہی ہے۔"

ایسی چھوٹی چھوٹی خوشیاں ہم چن کر اپنے دکھ بھلانے کی کوشش کرتے۔ شہباز بھی مجھے رگیدنے کا کوئی موقع نہ جانے دیتا تھا اور پھر ہم مل کر ہنستے رہتے۔ مفتی جاب سے آیا تو اس کو مسز ساگا کا واقعہ سنایا تو اس نے بھی جواباً ایک قصہ سنا دیا جو اس کے بقول اس کے سامنے بس پر جاتے ہوئے پیش آیا تھا۔ "ایک پاکستانی بس پر سوار ہوا۔ ڈرائیور کے ساتھ ٹکٹ ڈالنے کے لیے ایک سیاہ رنگ کا باکس پڑا ہوتا ہے۔ اس پاکستانی نے پوچھا کہ یہ بس کینیڈی سب وے جا رہی ہے تو ڈرائیور نے بکس کی طرف اشارہ کیا کہ پہلے ٹکٹ ڈالو۔ وہ سمجھا کہ ڈرائیور کہہ رہا ہے کہ یہ مائک ہے اور اس میں بول کر پوچھو۔ وہ پاکستانی اپنا منہ باکس کے قریب لایا اور زور لگا کر پوچھا کہ یہ بس کینیڈی جا رہی ہے۔"

مفتی یہ بتا کر ہنسنے لگا۔ میں نے کہا۔ "مفتی! تمہاری بہن بھی تو اس علاقے میں رہتی ہے۔"

وہ گھور کر بولا۔ "ہاں رہتی ہے تو......!"

میں نے کہا۔ "اچھا قسم وہ تم تو نہیں تھے۔"

مفتی ہنستے ہنستے مجھے مارنے لگا اور کہا۔ "خبیث! تمہیں کیسے پتا چلا" اس پر ہم تا دیر ہنستے رہے اور اسی دوران باہر زوردار بارش شروع ہوگئی اور چھینٹے ڈور وال کے شیشوں پر زور زور سے پڑنے لگے۔

میں نے اور شہباز نے ایک ڈیل کی تھی کہ ایک دن وہ اور دوسرے دن میں HRDC جایا کریں گے اور جہاں جہاں کوئی جاب ہوگی تو وہاں دونوں کے Resume فیکس کر دیا کریں گے۔ اس سے ایک بندے کی دو ڈالر کی ٹکٹ بچ جایا کرے گی۔ آج شہباز چلا گیا، میں نے اسے تاکید سے کہا کہ آج سیکیورٹی گارڈ کا کوئی Resume بنوا کر لائے تاکہ جیسے ہی SIN آئے تو ہم اس کے لیے اپلائی کرنا شروع کر دیں۔ وہ ہنس کر بولا۔ "ایک تیرا یہ سیاپا ختم نہیں ہوتا اور اب تو کہے گا کہ لبنیٰ آئے تو میرا اسلام دے دینا۔"

میں بولا۔ "تو سلام دینے میں تمہاری کون سی ٹکٹ لگتی ہے؟"

شہباز نے انگلی اور انگوٹھے سے دائرہ بناتے ہوئے کہا۔ "جیسے ہی اس کے یہ برے حالات بدلے تو وہ بڑی خوبصورت لگے گی اور میری تو دوستی بھی ہوگئی ہے۔"

میں بولا۔ "ٹھیک ہے، ایک یہ کام بھی کر دینا اور آج اس کی حالت بھی بدل ڈالنا۔"

اس نے یہ سنا اور یہ کہتے باہر نکل گیا۔ "یار بڑے برے حالات ہیں۔"

شام کو شہباز آیا تو اس کے ماموں کا تین بار فون آچکا تھا۔ کل سے پھر ویک اینڈ تھا اور وہ اسے بلا رہے تھے۔ وہ جانے کے لیے تیار ہوا۔ میں نے نکلنے سے پہلے اسے کہا کہ ماموں سے کوئی فون کارڈ وغیرہ لے لینا کیونکہ وہ سامان شفٹ کروانے کے لیے تمہیں بلاتے ہیں اور تم ان کو بلا معاوضہ مزدور ملے ہوئے ہو۔

یہاں سامان کی شفٹنگ بڑا مسئلہ ہوتی ہے۔ پاکستان میں تو ٹرک والے یہ کام کر دیتے ہیں یا آپ کوئی مزدور پکڑ لائیں۔ پھر محلے دار یا عزیز بھی آپ کی مدد کر دیتے ہیں۔ یہاں اگر ایک صوفہ بھی ہٹانا ہو تو آپ کسی کو ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ ایک عذاب میں پھنس جاتے ہیں اور خاص کر جب گھر میں بھی سب بچے ہوں۔ آپ کسی سے کوئی سروس لیتے ہیں تو اچھے خاصے ڈالر دینے پڑتے ہیں لیکن اس کے ماموں کوئی خود غرض نہ تھے۔ انہوں نے اس وقت بھی اور بعد میں بھی شہباز کا بڑا خیال رکھا تھا۔ میں تو صرف شہباز کو چھیڑنے کے لیے یہ بات کہتا تھا۔

ہمارے کھانے کا نظام کوئی خاص نہ تھا۔ ہم خمیر زدہ اور کیمیکل سے نچڑی سستی روٹیاں لاتے۔ کبھی انڈے بنا لیے اور کبھی کوئی سالن جو تین دن چلتا۔ میں سوچتا کہ پہلے ہی کسی بے چینی اور پریشانی میں دن گزر رہے ہیں اور پھر کوئی ڈھنگ کا کھانا بھی دستیاب نہیں۔ اس طرح تو ہم بیمار پڑ جائیں گے

ہم میں سے کوئی بھی رضامندی سے نہ کچن کو جاتا تھا اور نہ کوئی کھانا تیار ہوتا تھا۔ اتنے دنوں سے گوشت کی شکل نہ دیکھی تھی۔ اب گھر کے مزے یاد آتے تھے۔ مفتی ادھر یہ کہتا تھا کہ ایک بندے کا مہینے میں کچن کا پچاس ڈالر سے زیادہ خرچ بھی نہ ہو۔

آج مفتی آیا اور جب کچن میں جھانک کر دیکھا کہ کھانے میں کچھ نہیں ہے تو فرج کھولا۔ وہاں تادیر جھانکتا رہا اور پھر بددلی سے ایک انڈا فرائی کیا اور پھر ڈبل روٹی کے دو سلائس لے کر اپنا ڈنر کرنے لگا۔ میں کمپیوٹر کے سامنے بیٹھا یہ سب دیکھ رہا تھا۔ کھانے کے بعد وہ ناراض سا اپنے میٹرس پر لیٹ کر ٹی وی پر کوئی شو دیکھنے لگا۔ مجھے تو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ دیسی اسٹور کہاں ہیں اور گروسری کہاں سے ملتی ہے۔ سامان بھی موجود نہ ہوتا تھا کہ میں کچھ بناؤں مگر آج میں نے سوچا کہ پورا دن میں نکما کمپیوٹر کے سامنے بیٹھا، پریکٹس کرتا رہا تھا اور مجھے کم از کم کچھ انڈے پیاز ہی بنا لینے چاہیے تھے۔ میں دراصل پاکستان سے کھانا بنانے کی کوئی دو کتابیں بھی لایا تھا۔ اس دن کے بعد جب بھی میں گھر میں ہوتا تو کچھ نہ کچھ بناتا رہتا اور بعد میں تو اپارٹمنٹ میں روٹیاں تک بننے لگی تھیں۔ بھنے گوشت، قیمہ، کڑھائی گوشت اور سبزیاں تک بنتی تھیں۔ کھانے تو میں بنا لیتا مگر کچن صاف کوئی نہ کرتا اور پھر ایک متواتر تناؤ سا رہنے لگا تھا۔

کچھ دیر میں مطیع اللہ کا فون آ گیا۔ میں ابتدائی دنوں میں سوچتا تھا کہ ہم دونوں پاکستان میں ایک دوسرے سے ملنے اور کینیڈا کا خواب بانٹتے تھے۔ ڈھیروں باتیں کرتے۔ میں اس سے مذاق کرتا کہ کیسے پٹھان ہو کہ ایک تو لڑکیوں جیسی آواز ہے اور قد بھی چھوٹا ہے۔ میرے دوسرے پٹھان دوستوں کی طرح تم بھی اردو میں مذکر اور مونث کو گڈمڈ کر دیتے ہو۔ تو وہ جواب دیتا پٹھان پھر بھی پٹھان ہوتا ہے چھوٹے قد کا ہو یا لمبا ہو۔ ہماری گہری دوستی تھی مگر جب سے میں ٹورنٹو آیا تھا تب سے آج ہماری دوسری بار فون پر بات ہو رہی تھی۔ وہ چار ماہ سے آیا ہوا تھا۔ کہنے لگا۔ ”یار کہاں ہوتی ہو؟“

میں ہنس پڑا۔ ”میں تو پورا دن گھر پر ہوتی ہوں مگر تم کس کلب میں جاب کرتی ہو؟“

وہ تھوڑا شرمندہ ہوا اور کھسیانی ہنسی ہنس کر کہنے لگا۔ ”یار! یہ کینیڈا بھی بڑی منحوس جگہ۔ دوستی یاری بھی جاتی رہتی ہے، یہاں جاب کا کچھ پتا نہیں ہوتا۔ کبھی دن اور کبھی رات کو جاب ہوتی ہے۔ انسان ایک مشین سا بن کر رہ جاتا ہے۔“

مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ ٹورنٹو کیسے کسی بندے کو رگڑے لگاتا ہے۔ میں نے پوچھا کہ فیملی بلوا رہے ہو تو فرمانے لگا ”کہاں کی فیملی؟ ہم تو یہاں برباد ہو گئے ہیں۔ سکون سے بیٹھ کر بچوں کو بھی یاد کرنے کا وقت نہیں ملتا ہے۔“

پھر آنے کا وعدہ کر کے اس نے فون بند کر دیا مگر میں گہری سوچوں میں ڈوب گیا۔ ایک چبھتی ہوئی تنہائی تھی جو کٹتی نہیں بلکہ چیرتی تھی۔ سونے کے لیے لیٹا تو تادیر نیند نہ آئی۔

کسی نے بتایا کہ کینیڈا میں جاب حاصل کرنا ایک تکنیکی معاملہ ہے۔ ہر کمپنی کے پاس ہزاروں Resume جاتے ہیں اور ان کے پاس ٹائم نہیں ہوتا کہ ہر ایک کو پڑھیں۔ اس میں کچھ خاص الفاظ ڈالنے پڑتے ہیں جو دیکھنے والے کو ایک لمحے کے لیے روک لیں۔ جب آپ کا Resume انہوں نے سائیڈ پر رکھ لیا تو آپ کی آدھی جاب ہو گئی اور باقی آدھی جاب انٹرویو میں مل جاتی ہے بشرطیکہ آپ موثر انٹرویو دے دیں۔

میں نے پوچھا کہ یہ Resume کیسے بنایا جاتا ہے تو کہا گیا کہ کچھ ادارے ہیں جو حکومت کی فنڈنگ پر چلتے ہیں۔ وہاں Resume بنانے اور انٹرویو کے علاوہ یہاں زندگی گزارنے کے طور طریقوں سے بھی آگاہ کیا جاتا ہے اور مزے کی بات یہ ہے کہ سب مفت میں ہوتا ہے۔ ایک ادارے کا بتایا گیا جس کا نام کین (CAN) تھا۔ غیر ملک میں آپ کسی سے کھانا نہیں مانگتے نہ ادھار مانگتے ہیں بلکہ کوئی آپ کو صحیح سمت دکھا دے تو آپ پر بہت بڑا احسان ہوتا ہے۔ یہ احسان بھی میرے ساتھ معلوم نہیں کس نے کیا تھا کہ مجھے کین کے بارے میں بتا دیا۔ میں نے ایک ماہ کا کورس کیا تھا اور پھر پورے علاقے میں پاکستانیوں میں مشہور ہو گیا کہ ندیم سب سے اچھا Resume بناتا ہے اور انٹرویو کی تیاری بھی کرواتا ہے۔ اللہ کا شکر یہ ہوا کہ کئی لوگ اس طرح سے اچھی نوکریوں پر لگ گئے تھے اور آج تک وہ یاد کرتے ہیں مگر یہ ٹریننگ جس مشکل سے میں نے کی اس کا ذکر بعد میں کروں گا۔

کین میں فون کیا تو اشوک کمار نے فون اٹھایا۔ ایک انڈین جو بھائی کی طرح عزیز رکھنے لگا تھا۔ جوان سا اور گٹھے جسم والا اشوک مجھے ایک دوست کے روپ میں بھائی مل گیا۔ میں پاکستان میں تھا تو بھارتی لوگ ایک دشمن کی طرح لگتے تھے۔ ٹورنٹو پہنچا تو یہ بھید کھلا کہ عام لوگ یہاں سیاست اور دشمنی میں نہیں بلکہ ایک بھائی چارے کی فضا میں رہتے ہیں۔

سکھ ہوں یا ہندو۔ سب آپ سے ایسے بات کرتے ہیں کہ وہ آپ کے محلے دار ہیں۔ ہندو اور سکھ ایک فاصلے سے رہتے ہیں۔ ہندو جب یہ کہتے ہیں کہ پنجابی لوگ تو ان کا اشارہ سکھ ہوتے ہیں اور تب ایک دلچسپ صورتِ حال بن جاتی ہے۔ ایک بار ہندو دوست میرے کان میں اپنا منہ لگا کر بولا۔ ”اگر ان پنجابیوں کو اپنا ملک بنانا ہے تو یہیں کینیڈا میں بنا لیں۔“

میں حیران پریشان کھڑا سوچ رہا تھا۔ پنجابیوں نے کب اپنا الگ ملک بنانے کا کہا ہے۔ الحمدللہ پاکستان پنجابی، سندھی، بلوچی، پختون وغیرہ وغیرہ سب کا ہے اور کافی ہے۔ اس بات پر کچھ غصہ بھی آگیا تھا۔ جھٹکے سے اس کا منہ کان سے دور کیا اور کہا۔ ”یہ کیا بکواس کر رہے ہو؟“

پہلے تو وہ ٹپٹایا کہ کیا جرم اس نے کر دیا ہے مگر جب حقیقت یہ کھلی کہ ہندو جب کسی کو پنجابی کہتے ہیں تو اس کا مطلب سکھ ہوتا ہے۔ نامعلوم کیوں جب یہ تشریح سنی تو مجھے بہت خوشی ہوئی یوں بھی سکھ تو ہندوؤں سے زیادہ پاکستانیوں کے قریب ہوتے ہیں اور پنجابی میں بات کرنا پسند کرتے ہیں تاکہ اپنائیت کا احساس برقرار رہے۔ میں نے اپنے کراچی کے کئی دوست دیکھے ہیں جو پنجابی نہ ہوتے ہوئے بھی جب کسی سکھ سے کوئی سودا کرتے ہیں تو پنجابی میں بات کرتے ہیں۔ ہم یہاں جتنے بھی پاکستانی ہیں اپنے لوگوں سے صرف پاکستانی ہونے کے رشتے سے ملتے ہیں۔

اشوک کمار ایک بھارتی ہندو تھا مگر اس کا خلوص دیکھ کر پہلے تو میں حیران ہوا اور پھر عادی ہو گیا۔ فون پر بتایا کہ اگلا سیشن کچھ ہفتوں میں شروع ہوگا۔ میرا فون نمبر لیا اور اپنے گھر کا بھی نمبر مجھے دے دیا اور وعدہ لیا کہ جب بھابی آئیں تو مجھے چکن بریانی کھلانی ہے۔ میں نے کہا۔ ”کیا آپ گوشت کھاتے ہیں؟“

وہ ہنس کر بولا۔ ”جس طرح مسلمان شراب پی لیتا ہے اسی طرح ہم بھی گوشت کھا لیتے ہیں۔“

ہم چھوٹے تھے تو سنا کرتے تھے کہ ڈیرا خاکوانی خاندان کے تین بھائی کینیڈا میں رہتے ہیں۔ ان دنوں ہمیں یہ معلوم بھی نہ تھا کہ کینیڈا دنیا کے نقشے میں ہے کہاں؟ میں کینیڈا آرہا تھا تو ان کے چھوٹے بھائی سے محمود خاکوانی کا نمبر لے لیا تھا۔ آنے کے چند دن بعد انہیں فون کیا تو وہ بڑے خوش ہوئے کہ ایک گرائیں کینیڈا آگیا ہے۔ مجھے کہا کہ اگلی سنیچر کو ہمارے گھر آنا ہے۔ آج سنیچر آیا اور میں تیار ہو گیا۔ مفتی کو ساتھ چلنے کا کہا تو وہ بولا۔ ”تم پہلی بار جا رہے ہو تو اکیلے جاؤ یہ بہتر ہے۔“

بات اس کی صحیح تھی۔ خاکوانی صاحب سکاربرو میں رہتے تھے جو ٹورنٹو کا ان دنوں دوسرا کونا تھا۔ وہاں سب وے سے جانا پڑتا تھا اور میں ایک بار پہلے مفتی کے ساتھ کینیڈی تک آچکا تھا۔ انہوں نے مجھے ایڈریس مکمل طور پر سمجھا دیا تھا۔ باہر آیا تو سردی جوبن پر تھی۔ میں نے اپنی اکلوتی لیدر کی جیکٹ پہنی۔ اونی ٹوپی اوڑھی اور گلے میں مفلر لپیٹا۔ چھیالیس نمبر بس سے کپلنگ پہنچا اور ایک گھنٹے بعد کینیڈی سب وے کے باہر سولہ اے نمبر بس کا انتظار کرنے لگا۔

آج درجۂ حرارت منفی دس سے نیچے گر گیا تھا۔ سرد ہوا کے جھونکے جب چہرے کو چھوتے تو لرزہ پورے بدن میں جا پہنچتا۔ اتنے میں ایک گوری لڑکی میرے سامنے آ کھڑی ہوئی اور بھی لوگ اپنی اپنی بس کا انتظار کر رہے تھے۔ میں تھوڑا سا الجھ رہا تھا کہ یہ چاہتی کیا ہے۔ حالت خستہ سی تھی۔ جوان عمر تو تھی مگر ہونٹ سوکھے اور رنگت پیلی پڑ رہی تھی۔ کپڑے معمولی سے تھے۔ اس نے کچھ کہا مگر میں صرف یہ سمجھ سکا کہ اس نے ڈالر تو کہا ہی ہے۔ میں سوچنے لگا کہ یہ ڈالر دینا چاہتی ہے یا لینا چاہتی ہے۔ ویران آنکھوں سے دیکھتے ہوئے پھر بولی اور میں سمجھ گیا۔ پانچ ڈالر مانگ رہی تھی۔ ویک اینڈ پر کم بسیں چلتی ہیں اور ابھی بس بھی نہیں آئی تھی۔ میں نے کہا کہ میرے پاس نہیں ہیں۔ یہ سن کر اس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔ میں حیران تھا کہ بھیک مانگ رہی ہے پر رو کیوں رہی ہے۔ کہنے لگی۔

”کل رات سے بھوکی ہوں اور اب تو چلا بھی نہیں جا رہا۔“

میں نے پوچھا۔ ”گھر کہاں ہے۔“

کہنے لگی۔ ”میں بے گھر ہوں۔“

میں ایک عجیب سی کیفیت میں آگیا کہ کینیڈا میں کوئی بھوکا کیسے رہ سکتا ہے اور کوئی بے گھر بھی یہاں ہوتا ہے۔ میں نے سوچا کہ نشہ کرتی ہوگی اور اب گڑگڑائے گی مگر وہ خاموشی سے ذرا ہٹ کر بے چارگی سے کھڑی ہو گئی اور چہرہ دوسری طرف کر لیا۔ اس کا یہ انداز مجھے تجسس میں ڈال گیا۔ سوچنے لگا کہ واقعی یہ بھوکی نہ ہو۔ میں اس کی طرف چل کر گیا اور وہ مجھے اُمید افزا نظروں سے دیکھنے لگی۔ میں نے کہا کہ کیا کھانا ہے؟ کہنے لگی ”کچھ بھی۔“

میں خود بھی غریب الوطن تھا مگر کوئی بھوکا ہو اور آنکھوں میں نمی بھی ہو تو میں کیسے نظر انداز کرتا اور اگر نظر انداز کر ہی لیتا تو باقی کی زندگی کسی احساس جرم میں ہی گزارنی پڑتی۔ میں نے جیکٹ کی جیب سے پانچ ڈالر نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ

دیے اور اپنا چہرہ پھیر کر ایسے کھڑا ہو گیا جیسے وہ کھڑی ہو گئی تھی مگر اب اس کی نمی میری آنکھوں میں تھی۔
اتنے میں بس آ گئی اور میں اس میں سوار ہو گیا۔ میں نے کھڑکی سے دیکھا تو وہ تشکرانہ نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ بس چلی اور وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ بعد میں کئی بار ایسی صورتِ حال بنی مگر اس کا چہرہ ہمیشہ کے لیے یاد رہ گیا کیونکہ پہلا تجربہ کبھی نہیں بھولتا۔
سکاربرو ذرا پرانا لگتا تھا۔ درخت سردی میں اجڑے کھڑے تھے۔ ترتیب سے بنی عمارتیں اور سردی میں ٹھٹھرتی سڑکیں اور ان پر اکا دکا چلتے لوگ جو سر سے پاؤں تک گرم کپڑوں میں لپٹے ہوئے تھے۔ آسمان بے رنگ تھا اور سورج چمکتا تھا مگر کوئی حدت زمیں پر نہ پھینکتا تھا۔ مجھے پاکستان کی سردیاں یاد آ رہی تھیں، جب جاڑوں میں دھوپ سینکا کرتے تھے۔ صحن میں چارپائی ڈالے، سورج سے منہ پھیرے ایک آسودگی سے اس کی حدت اپنے اندر جذب کرتے تھے۔ یہ نرم اور گرم دھوپ ماں کی تھپکی کی طرح آپ کو آرام پہنچاتی تھی۔ میں سوچتے سوچتے خود ہی مسکرانے لگا اور سر بس کی کھڑکی سے ٹکا دیا۔
کچھ ہی دیر بعد ایک رہائشی علاقہ شروع ہوا۔ مجھے اپنے اسٹاپ کا پتا تھا۔ نقشہ میں ہمیشہ کھول کر رکھتا تھا۔ اپنے اسٹاپ پر اترا اور ان کے سمجھائے ہوئے راستے پر چلتا ہوا ٹھیک ان کے دروازے کے سامنے پہنچ گیا۔ ایک پتلی سی سڑک کے دونوں جانب ایک ہی طرز کے خوبصورت گھر بنے ہوئے تھے۔ حیرت انگیز طور پر سب کے رنگ اور طرزِ تعمیر، نقشہ اور سائز بھی ایک ہی تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی نے تھوک کے بھاؤ سے کھلونے خریدے اور ان کھلونا گھروں کو ایک ترتیب سے یہاں لا کر سجا دیے ہیں۔
گھروں کے باہر خاموشی تھی۔ پوری گلی میں واحد میں تھا جو باہر کھڑا اردگرد دیکھ رہا تھا۔ ڈور بیل بجنے پر خاکوانی صاحب نے دروازہ کھولا اور پہلے ہاتھ ملایا اور پھر گلے ملے۔ وہ میرا ہی انتظار کر رہے تھے۔
میں گھر میں داخل ہوا تو دروازے کے ساتھ ہی جوتے اتارنے پڑ گئے۔ باہر ٹھنڈ تھی اور اندر آرام دہ ماحول تھا۔ خاکوانی صاحب نے میری جیکٹ اتروا کر وہیں ایک الماری میں ٹانگ دی۔ میں ایک چھوٹے سے ڈرائنگ روم میں کھڑا تھا۔ فرش پر شوخ قالین بچھے تھے اور آرام دہ لیدر کے صوفے رکھے تھے۔ سامنے آتش دان تھا جو بجھا ہوا تھا کیونکہ اس کے آگے ساتھ انچ کا بڑا ٹی وی رکھا تھا۔ پچھلی دیوار کے ساتھ کھانے کی میز اور اس میں پھنسی کرسیاں رکھی تھیں۔ میز پر ایک خوبصورت فانوس لٹکا تھا اور ساتھ ایک الماری میں برتن سجے تھے۔ میں اس لیے یہ سب دیکھ رہا تھا کہ یہاں کسی گھر میں جانے کا اتفاق پہلی بار ہو رہا تھا۔ خاکوانی صاحب کی بیگم صاحبہ بہت تپاک سے ملیں۔ اپنی سرائیکی زبان جیسے صدیوں بعد آمنے سامنے بیٹھ کر سن رہا تھا اور سرشار ہو رہا تھا۔
ان کو بھی اپنے علاقے کا کوئی بندہ عرصے بعد ملا تھا اور وہ مجھ سے بھی زیادہ خوش نظر آ رہے تھے۔ وہ یہاں پچھلے تیس سال سے ہیں۔ شادی بیس سال پہلے کی اور اپنی بیگم کو ڈیرہ سے یہاں لائے۔ دو بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے۔ یہاں کے ماحول اور رہن سہن پر بات ہوتی رہی۔ خاکوانی صاحب بہت خوش مزاج طبیعت کے مالک ہیں اور بھابی صاحبہ بھی خوش مزاجی میں ان سے ایک ہاتھ بڑھ کر تھیں۔ میری دلچسپی یہ تھی کہ پوچھوں تیس سال پہلے ٹورنٹو کیسا تھا؟
خاکوانی صاحب ہنستے ہنستے بتا رہے تھے کہ ہم جب آئے تو شاید ہی کوئی مسجد تھی۔ حلال گوشت کی ایک دکان تھی اور ہم مہینے میں ایک بار گھنٹوں بس کا سفر کر کے گوشت لایا کرتے تھے۔ وہ ایک واقعہ سنانے لگے کہ جب پہلی حلال گوشت کی شاپ کھلی تو تمام مسلمان وہاں سے گوشت لینے لگے۔ اس دکان کے ساتھ ایک اور دکان تھی جہاں سے غیر مسلم گوشت لیتے تھے۔ اس نے جب یہ دیکھا کہ حلال میٹ کے نام پر اس کا کاروبار چمک اٹھا ہے تو اس نے باہر بورڈ پر لکھوا دیا کہ یہاں حلال پورک (سور) دستیاب ہے۔
"ہائے اللہ! تو کیا آپ حلال سمجھ کر لاتے تو نہیں تھے؟" بھابی نے سنا تو کچن سے دوڑتی چلی آئیں۔
"شادی کے پہلے سال وہی تو تمہیں کھلاتا رہا تھا۔" خاکوانی صاحب ہنستے ہوئے بولے۔
"آپ تو مذاق کر رہے ہیں مگر مہمان کیا سوچیں گے۔" بھابی نے ذرا ناراضگی کے انداز میں کہا۔
میں خود اس نوک جھوک سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ میں اپنی وطن سے دوری بھول گیا تھا۔ چھوٹی بیٹی انکل انکل کہتی ہوئی بڑے پیار سے ملی۔ ماں اس کو خوش خبری دے رہی تھی کہ انکل ڈیرہ سے ہیں اور جلد ان کے بچے بھی آ جائیں گے۔
وہ مسرت سے بولی۔ "سچ انکل۔ کب تک آئیں گے؟"
یہاں بچوں کے ساتھ سب سے بڑا مسئلہ یہی اکیلا پن

ہے۔ ماں باپ جاب پر ہوتے ہیں اور بچے اسکول کے بعد گھر میں اکیلے پن کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اگر گھر میں بچے زیادہ ہوں تو وہ آپس میں کھیل لیتے ہیں مگر جیسے جیسے عمر بڑھتی ہے وہ تنہا ہوتے جاتے ہیں۔

خاکوانی صاحب پہلے اپنا اسٹور چلاتے تھے۔ سادہ طبیعت کے شریف النفس انسان ہیں۔ زیادہ اکٹھا کرنے کا شوق تھا نہیں اور بس اتنا کام کیا جتنی ضرورت تھی۔ اسٹور کے اوپر ایک فلیٹ میں دونوں میاں بیوی ہنسی خوشی رہتے تھے۔ ایک بار ایک سیاہ فام ڈاکو گھس آیا۔ کچھ نقصان کر گیا تو انہوں نے اسٹور بیچ دیا۔ چند سال پہلے پاکستان میں اپنی زمینیں بیچ کر یہ گھر خریدا اور اب اس میں سکون سے خوش و خرم رہتے ہیں۔

بھابی نے کھانا بہت اچھا بنایا تھا۔ میں بھی کئی دنوں کے بعد گھر کا کھانا کھا رہا تھا۔ ہاتھ سے بنی توے کی روٹیاں، بریانی اور قورمہ۔ میرے تو وارے نیارے ہو گئے۔ پھر مجھے انہوں نے گھر دکھایا۔ یہاں کے حساب سے یہ بڑا گھر تھا اور تین کمرے تھے۔ یہاں ہر گھر میں بیسمنٹ (تہہ خانہ) ضرور ہوتا ہے۔ اس کا راستہ باہر سے علیحدہ ہوتا ہے۔ نیچے انہوں نے دو بیڈ روم اور ایک بڑا ہال نما کمرا بنا لیا تھا۔ ایک بیڈ روم کسی مولوی صاحب کو کرائے پر دیا ہوا تھا۔ بھابی صاحبہ کہنے لگیں۔ ”یہ الف ب ت انکل کا کمرا ہے۔“

میں نے چونک کر کہا۔ ”یہ کیا نام ہوا؟“

”بچوں کو قرآن پڑھاتے ہیں تو وہ انہیں اسی نام سے پکارتے ہیں۔“ وہ بتانے لگیں۔

ان حروف تہجی مولوی صاحب کے کمرے میں واٹر بیڈ پڑا تھا۔ ساتھ نائٹ ٹیبل پر سگریٹ کی ڈبیا پڑی تھی۔ سامنے ٹی وی کے ساتھ وی سی آر اور فلمیں رکھی تھیں۔ ان دنوں قرآن پڑھانے والوں کا قحط تھا۔ ہر مسلمان اپنے بچوں کو قرآن ضرور پڑھاتا ہے اور مولوی صاحبان کی حالت ایک انار سو بیمار والی تھی۔ ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتے تھے۔ ایک مولوی صاحب ہوتے جو صبح گاڑی لے کر نکلتے اور رات گئے کئی بچوں کو پڑھا کر واپس آتے۔ تراویح پڑھانے کے لیے مسجد کے مہتمم پاکستان سے ایک مخصوص ویزے پر پاکستان سے حافظ صاحب بلوایا کرتے تھے۔ حافظ صاحب رمضان شریف میں یہاں آ کر تراویح پڑھایا کرتے اور اچھا خاصا معاوضہ بھی انہیں مل جاتا تھا۔ اب مولوی صاحبان ذرا فارغ ہو گئے ہیں بلکہ ان پر بوجھ کم ہو گیا ہے۔ جب سے انٹرنیٹ آیا ہے تو آن لائن قرآن پاک کی کلاسیں ہوتی ہیں۔ اساتذہ پاکستان میں بیٹھے ہوتے ہیں اور کمپیوٹر پر یہاں ہمارے بچے قرآن کی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ ان کی تنخواہ ہم بینک سے ان کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کر دیتے ہیں جو مولوی صاحب ہفتے میں دو بار آ کر تین سو ڈالر لیتا تھا اب پاکستان کے اساتذہ ہفتے میں تین بار پڑھا کر ایک ماہ میں سو ڈالر لیتے ہیں۔ اب یہاں کے بچے حافظ بھی بننا شروع ہو گئے ہیں اور رمضان کے مہینے میں قرآن پاک کا ختم وہی کراتے ہیں۔

مختلف اسلامی تنظیموں نے آن لائن کورسز گھریلو خواتین کے لیے شروع کر رکھے ہیں۔ ہر دن کوئی نہ کوئی کلاس ہوتی ہے اور پھر کوئی ٹیسٹ ہو رہا ہوتا ہے۔ ایک خاتون نے کوئی کورس شروع کیا تو اس نے دو چار اپنے ملنے والیوں کو بھی اس پر لگا دیا۔ اسی طرح یہ سرکل بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ اس سے یہ فائدہ ہوا کہ گھر کا ماحول بدل گیا۔ بچوں نے اسکارف لینا شروع کر دیے۔ گھر میں بچے پانچ وقت نماز کے عادی ہو گئے۔ لڑکے بار ریش ہونا شروع ہو گئے۔ ماں کیا تبدیل ہوئی اس نے پورا گھر ہی بدل دیا۔ اب میرے بچے ماشاءاللہ تجوید کی تعلیم لے رہے ہیں۔ جس عمر میں وہ اسلام کے بارے میں جانتے ہیں۔ اس عمر میں ہم اس کا پانچ فیصد بھی نہیں جانتے تھے۔ گھر میں اذان والے کلاک لگ گئے اور پانچ وقت اذان شروع ہو گئی۔ یہ تبدیلی پچھلے چھ سات سال سے میرے سامنے ظہور پذیر ہوئی۔ اب گھر میں کوئی کھانے پینے کی چیز آتی ہے تو بچے پہلے اس کے اجزا دیکھتے ہیں کہ کوئی حرام چیز تو نہیں ہے اگر شک ہو تو کمپنی کو فون کر کے تصدیق کرتے ہیں۔ اب کچھ چپس کے برانڈز پر بچوں نے گھر میں پابندی لگا رکھی ہے۔ یہ صرف میرے گھر میں نہیں بلکہ ہر مسلمان گھر میں یہی چل رہا ہے۔ رات کو سونے سے پہلے مختلف سورتیں پڑھ کر سوتے ہیں۔

میں ایک بات کرنا چاہوں گا اور اُمید کروں گا کہ پڑھنے والے اس کا برا نہیں منائیں گے۔ پاکستان میں معاشرہ مغرب کی غلط تقلید کرتا جا رہا ہے۔ لگتا ہے کہ والدین بے بس ہو گئے ہیں۔ لڑکے ہوں یا لڑکیاں۔ راتوں کو پیغام رسانی کرتی نظر آتی ہیں۔ انہوں نے اس کو موجودہ زمانے کا تقاضا سمجھ لیا ہے۔ مغربی تہوار اس طریقے اور والہانہ پن سے مناتے ہیں کہ مغرب والے بھی نہیں مناتے۔ افسوس تو یہ ہے کہ وہ اسے اپنی ترقی سمجھنے لگے ہیں۔ انٹرنیٹ کا اچھا استعمال بھی سامنے آ رہا ہے۔ میں تو اپنے پڑھنے والوں سے ایک

التماس کروں گا کہ بچوں کو اب صرف اچھے اور برے کی تمیز سکھائیں، ان سے دوستی رکھیں اور ان پر اعتماد کریں۔ یہی اس وقت کا تقاضا ہے۔

بات کہاں سے کہاں نکل گئی۔ خاکوانی صاحب نے مولوی صاحب کی سگریٹ کی ڈبیا اٹھائی اور ہم نے ایک ایک سگریٹ وہیں پھونک ڈالی۔ اب شام ہونے کو تھی۔ وہ مجھے کہتے رہے کہ رات کا کھانا کھا کر جانا مگر میں نے لمبا سفر کرنا تھا۔ کل اتوار کا دن تھا اور بسیں بہت کم تھیں اور مفتی بھی میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے اجازت مانگی اور ان کا شکریہ ادا کیا کہ مجھے کتنے دنوں بعد ایک گھر کا ماحول ملا تھا۔ جس راستے سے آیا تھا اسی سے واپس اپارٹمنٹ دو گھنٹوں میں پہنچا۔ بعد میں جب اپنی گاڑی لی تو یہ فاصلہ آدھے گھنٹے میں طے ہوتا تھا۔

اپارٹمنٹ پہنچا تو دیکھا کہ شہباز، مفتی کو ماموں کے گھر میں گزرے دو دنوں کی داستان سنا رہا تھا جس میں زیادہ تر سامان کے شفٹ کرنے کا ذکر تھا۔ ''ماموں نے میرا کچومر نکال دیا۔ ایک ٹرک کرائے پر لیا تھا اور دو دن سامان ڈھوتا رہا۔'' شہباز شکایتی لہجے میں اپنی درد بھری داستان سنا رہا تھا۔

''ماموں کا بھی تو کچومر نکل گیا ہوگا؟'' میں نے سوالیہ انداز سے پوچھا۔

''نہیں! وہ تو اپنے ویڈیو کیمرے سے میری ویڈیو بناتے رہے اور ساتھ کمنٹری کرتے رہے کہ یہ سامان ٹرک میں جا رہا ہے۔ یہ چالیس انچ کا ٹی وی ہے۔ شہباز بہت بہادر لڑکا ہے۔ یہ میرا نیا گھر ہے۔ یہ بیڈ روم ہے۔ یہ کچن ہے۔ شہباز شاید تھک گیا ہے جو صوفے پر پڑا کراہ رہا ہے۔ آج شہباز کو بریانی کھلائیں گے مگر کیسے کھلائیں گے کیونکہ ابھی کچن کا سامان تو پیک پڑا ہے۔''

یہ سب سن کر ہنس ہنس کر ہمارا برا حال تھا۔ میں نے مسکراتی نگاہوں سے کہا۔ ''تو ماموں تمہیں ماموں بنا گئے۔''

شہباز نے اپنا مخصوص جملہ بولا۔ ''بڑا سیاپا ہے یہاں بھی بہت برے حالات ہیں۔''

آج اتوار کا دن تھا۔ جمال کو کل فون کیا تھا۔ جمال کا تعارف پہلے ہو چکا ہے۔ وہ ان دنوں ٹورنٹو میں رہتا ہے۔ ڈائیلیسز پر تھا۔ فون پر ہم بڑے بے تکلفانہ ملے حالانکہ ہم نے اس سے پہلے کبھی ایک دوسرے سے بات نہ کی تھی۔ اس نے کہا کہ کل میرے گھر آجاؤ اور کھانا اکٹھے کھائیں گے اور آج میں اس کے گھر جا رہا تھا۔

منگول

ایک نسل جس کے لوگ زیادہ تر مانچوریا کے شمال اور مغرب اور منگولیا میں آباد ہیں۔ ان کا رنگ بھورا، کلے کی ہڈی ابھری ہوئی اور آنکھیں ترچھی ہوتی ہیں۔ یہ لوگ عام طور پر خانہ بدوشانہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ گھوڑے، مویشی، بھیڑ بکریاں پالنا ان کا مشغلہ ہے جنہیں ایک چراگاہ سے دوسری چراہ گاہ میں لیے پھرتے ہیں۔ ان کی اصلیت کے متعلق کچھ کہنا مشکل ہے۔ تاہم قیاس کیا جاتا ہے کہ ہن جنہوں نے اپنی فتوحات کو یورپ تک پہنچا دیا تھا اور دوسری طرف شمالی چین میں 1916ء سے 1125ء تک حکومت کی، منگول ہی تھے لیکن تیرھویں صدی کے شروع میں جب چنگیز خان کی قیادت میں فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا تو تاریخ میں ان کو ایک خاص مقام حاصل ہو گیا۔ انہوں نے اپنی فتوحات کا سلسلہ مغرب میں یورپ کی طرف اور مشرق تک پھیلا دیا۔

مرسلہ: جہانگیر احمد۔ لاہور

اس کا اپارٹمنٹ وکٹوریہ سب وے کے قریب ہی تھا۔ نہا دھو کر باہر نکلا تو مفتی اپنے قدیمی انداز میں میٹرس پر پڑا ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ اسے بھی سب وے پر کہیں جانا تھا اور وہ بھی تیار ہونے چلا گیا۔ شہباز بڑبڑا رہا تھا کہ وہ اکیلا اپارٹمنٹ میں کیسے رہے گا؟ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''تو ماموں کے گھر چلے جاؤ۔''

وہ بھڑک اٹھا۔ ''میرا ایک ایک جوڑ ابھی تک درد کر رہا ہے اور تمہیں مذاق سوجھ رہا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ خود اپنے کندھے دبانے لگا۔

مفتی نے کہا۔ ''تو پھر اپنی خالہ مسز ساگا کی طرف چلے جاؤ۔''

شہباز ہنستے ہوئے بولا۔ ''وہ اپنے آپ کو مسز ساگا کہلوانے کے بعد میرا فون بھی نہیں اٹھاتی ہیں۔ ویسے ٹھیک کہتے ہو۔ آج ہی ان کی طرف چکر لگا آتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ ٹھنڈی سانسیں لیتے اور کراہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

ہم باہر آئے تو آج بادل برس رہے تھے۔ اندر ہمیں محسوس ہی نہ ہوا کہ باہر بارش ہے۔ بارش سے بچنے کے لیے بھاگتے بھیگتے ہم بس اسٹاپ پر پہنچے۔ اتوار کے روز بسیں کم

چلتی ہیں مگر ہم بس کے ٹائم پر آگئے تھے۔ سب وے پہنچے تو اتوار کی وجہ سے آج رش کم تھا۔ فراٹے بھرتی ٹرین ہر اسٹیشن پر رکتی، ذرا سا سانس لیتی اور دوبارہ دوڑ پڑتی۔ ینگ کے اسٹیشن پر مقتی اتر گیا۔ میں نے ابھی سی این ٹاور نہیں دیکھا تھا۔ یہیں کہیں تھا اور میں ٹرین سے تب جھانکتا جب وہ زمین کی سطح پر آتی مگر مجھے دور دور تک کوئی ایسا مینار نظر نہ آتا تھا جو آسمان کی بلندیوں کو چھور ہا ہو۔

آج ٹرین کی بوگی میں میرے علاوہ صرف ایک جوڑا بیٹھا تھا۔ جوڑا کیا تھا کہ کسی ہاتھی نے گنا اٹھار کھا ہو۔ ایک دبلا پتلا کورین لڑکا تھا اور ساتھ کوئی ہاتھی کی جسامت کی لڑکی نما کوئی چیز تھی مگر اس کے ہاتھ بچوں کی طرح چھوٹے چھوٹے اور گگلے گگلے تھے۔ کبھی وہ اس لڑکے کو اٹھا کر گود میں بٹھالیتی اور کبھی بڑے آرام سے اسے سیٹ پر رکھ دیتی۔ پھر اس سے کھیلتی اور اس گنے کو چباتی، مروڑتی اور پھر زور زور سے سانس لینے لگتی جیسے کوئی بہت بڑی مشقت سے گزری ہو۔ جب سانسیں بحال ہو جاتیں تو پھر اسے لپک کر اٹھالیتی۔ مجھے ہنسی آرہی تھی اور میں نے اپنا چہرہ اس ڈائری سے چھپالیا جس میں میرے سفری نوٹس ہوتے تھے۔ یہی نوٹس آج مجھے اس سفرنامے کو لکھنے میں کام آرہے ہیں۔ ڈر یہ تھا کہ اگر اس نے مجھے ہنستے دیکھ لیا تو کہیں مجھ پر بل نہ پڑے۔

وکٹوریہ اسٹیشن پر اترا تو چند لوگ آتے جاتے دکھائی دیے۔ ایک اور جوڑا اپنی مستی میں مگن کھڑا تھا۔ دور پرے ایک مسلمان فیملی بچوں کو ادھر دیکھنے سے روک رہی تھی۔ مجھے یہی نظارے سوچوں میں ڈال دیتے تھے کہ میں اپنے بچوں کو اس ماحول میں کیسے رکھوں گا بعد میں معلوم ہوا کہ یہ سب سب وے میں زیادہ ہوتا ہے۔ باہر ایسا دیکھنے کو بہت کم ملتا ہے۔ انہوں نے دو دو ڈالر کا ٹکٹ خریدا اور پھر ایک کونے سے دوسرے کونے تک ایک گھنٹے کا سفر کیا۔ آخری کونے میں اترے اور اسی ٹکٹ پر دوبارہ بیٹھ کر پھر گیان میں چلے گئے۔ نہ سردی کا خوف اور نہ بارش کا ڈر۔ نہ کوئی روکنے اور ٹوکنے والا اور نہ یہ رکنے والے۔

میں سب وے سے باہر آیا تو بارش برس رہی تھی۔ سردی کی کیفیت اتنی شدید نہ تھی۔ سب وے سے ہی ایک پگڈنڈی انتیس تیس منزلہ اپارٹمنٹ بلڈنگز کو جاتی تھی جس میں ایک کے اندر چوبیسویں منزل پر جمال کا اپارٹمنٹ تھا۔ بلڈنگ تک بھاگتا ہوا پہنچا کیونکہ بارش لگاتار برستی چلی جارہی تھی۔ نیچے سے جمال کو بزر دی، اس کو نیچے آنے کی زحمت نہ ہوئی اور اوپر ہی سے فون پر زیرو کا بٹن دبایا تو دروازہ کھل گیا۔

میں لفٹ کے انتظار میں تھا کہ وہ خود ہی نیچے آگیا۔ یہ میری اس سے پہلی ملاقات تھی۔ ہم بڑی گرم جوشی سے ملے۔ ایک دوسرے سے سرائیکی میں بات کررہے تھے اور اس میں ایک مکمل ڈیرہ وال بسا ہوا تھا اور یہی چیز ہمیں گہرا دوست بنا گئی۔ اپارٹمنٹ میں داخل ہوئے تو ایسا لگا کہ آسمان کی بلندیوں تک آپہنچا ہوں۔ چوبیس منزل پر ٹورنٹو اجڑا اجڑا لگ رہا تھا۔ درخت پتوں سے خالی بے رونق تھے۔ آس پاس بلند عمارتیں آمنے سامنے کھڑی تھیں۔ میں بالکونی میں آیا تو سردی سے کپکپی طاری ہوگئی۔ یخ بستہ ہوا مجھے کہیں پٹخنے پر تلی تھی۔ میں بھی ڈھیٹ تھا اور اسی موسم میں ٹورنٹو کے اس حصے کا منظر دیکھ رہا تھا۔ اس فضا میں برف زدہ خنکی کے ساتھ اداسی کی لہر بھی دل میں اتر رہی تھی۔ ایک اجاڑ ویرانگی نیچے، بہت نیچے سے نکل کر آسمان تک پھیلی تھی۔ ایک بے کیف سا منظر تھا جو دل میں افسردگی بھر رہا تھا۔ ایسا محسوس ہورہا تھا کہ ہر چیز قبر کی ٹھنڈک میں دفن ہے۔ میں گھبرا کر ہال کمرے میں دوبارہ آگیا۔

یہ اپارٹمنٹ ویسا ہی تھا جیسے اسے ہونا چاہیے۔ باہر کا دروازہ ایک بڑے کمرے میں کھلتا تھا جس کو لیونگ روم کہا جاتا ہے۔ اس میں صوفے رکھے تھے۔ بالکونی اور اس لیونگ روم کے بیچ شیشے کا بڑا سلائیڈنگ دروازہ تھا۔ کونے میں ڈائننگ ٹیبل رکھی تھی اور ساتھ کچن تھا جہاں سے کھانوں کی مہک اٹھ رہی تھی۔ جمال کی شادی ایک دو سال پہلے ہوئی تھی۔ بھابی کھانا تیار کررہی تھیں۔ جمال کا ایک کزن آیا ہوا تھا اور آتے ہی اسے بہت اچھی جاب مل گئی تھی۔ میں ستائشی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا کہ مجھے بھی کچھ بتائے کہ جاب کس طرح تلاش کروں۔ گو ان معلومات سے مجھے جاب کے ملنے میں کوئی مدد نہ ملی مگر میرے علم میں اضافہ ہوتا گیا۔ کچھ لوگ ایسے بھی خوش قسمت ہوتے ہیں کہ یلو پیجز کی کتاب کھول کر اپنی فیلڈ کی کمپنیوں کو فون کرتے ہیں اور دو دن بعد ہی کسی ایک کے ملازم بن جاتے ہیں۔

اپارٹمنٹ کے اندر باہر کی نسبت کافی حدت تھی۔ میں نے اپنی اکلوتی لیدر کی جیکٹ اتاری اور جمال نے اسے الماری میں لٹکا دی۔ جمال ڈائیلیسز پر تھا۔ وہ ایک اسپورٹس مین تھا اور اسی جرأت سے حالات کا مقابلہ کررہا تھا۔ زندہ دلی

اس کی برقرار تھی۔ میری ہمت بڑھا رہا تھا اور اپنے تجربے سے مجھے یہاں کے اسرار و رموز بتا رہا تھا۔ وہ دنیا گھوم چکا تھا۔ میں آج یہ الفاظ اس پہلی ملاقات کے پندرہ سال بعد لکھ رہا ہوں اور وہ کل ہی میرے پاس امریکا میں دو دن ٹھہر کر گیا ہے۔ اب ماشاء اللہ اس کے دو بچے ہیں۔ ہمت اس کی پہلے سے زیادہ جوان ہے۔ ہم پچھلے دو دن سیاست سے لے کر غیبت تک بہت سی باتیں کرتے رہے اور ہر وقت ہمارے قہقہے گونجتے رہے۔

میں اس دن کو یاد کر رہا ہوں جب میں آج سے پندرہ سال پہلے اس کے اپارٹمنٹ میں سہما سا بیٹھا تھا اور وہ مجھے لذیذ کھانے پیش کر رہا تھا۔ میں کینیڈا میں تین سال رہا۔ وہ اکثر میرے پاس آجاتا۔ اسے ڈیرہ کا مشہور پلاؤ بہت پسند تھا اور ہم مل کر پلاؤ تیار کرتے اگر وہ ٹھیک سے نہ بنتا تو وہ مجھ کو ڈانٹنے لگتا تھا۔ ایک بار اسے کوئی انفیکشن ہو گیا اور موت کے قریب جا پہنچا۔ ڈاکٹر بھی نا امید ہو گئے تھے۔ میں اسے اسپتال میں دور سے مختلف نالیوں اور ڈرپوں کے بیچ بے ہوش پڑا نم آنکھوں سے دیکھتا اور ہاتھ اٹھا کر اللہ سے اس کی زندگی کی دعا کرتا تھا۔ اس کی بہنیں لندن سے اور بھائی آسٹریلیا سے آپہنچے تھے۔ کئی ماہ اسپتال میں رہا اور پھر موت کو شکست دے کر ہمارے درمیان بیٹھ کر قہقہے بکھیرنے لگا۔

شام ہونے لگی اور میں جمال کے اپارٹمنٹ سے نکل آیا۔ بادل چھائے ہوئے تھے مگر برس نہیں رہے تھے مگر ان کا رعب اور دبدبہ اتنا تھا کہ ہر بندہ سر سے پاؤں تک گرم کپڑوں میں لپٹا بھاگا چلا جا رہا تھا۔ مجھے زیادہ زحمت نہ ہوئی اور چند منٹ میں وکٹوریہ سب وے پہنچ گیا۔ سردی سے ہر ایک کے منہ سے دھواں نکل رہا تھا۔ سردی کچھ نہ بگاڑتی تھی پر سردی سے اٹھتی تنہائی کاٹتی تھی۔ اس موسم سے یہ احساس بڑھ رہا تھا کہ میں کہیں بہت دور نکل آیا ہوں۔ میں اسی ذہنی آزردگی میں اپنے اپارٹمنٹ پہنچ گیا۔

مفتی اپنے مخصوص انداز میں اپنے چوڑے میٹرس پر چوڑا ہو کر لیٹا کوئی عجیب و غریب پروگرام دیکھ رہا تھا۔ میری جانب اس نے کوئی خاص توجہ نہ دی۔ میں کمرے میں گیا تو شہباز اپنے مختصر میٹرس پر بھنایا ہوا پڑا اپنے آپ کو اور مفتی کو کوس رہا تھا۔ میں نے پوچھا تو کہنے لگا۔ ”یار کیا سیاپا ہے؟ مفتی ٹی وی سے نظریں نہیں ہٹا رہا۔ دیکھو دیکھو کیسے یہ غیر اخلاقی شو دیکھ رہا ہے اور تم...... تم صبح کے گئے ابھی آرہے ہو اور خالہ مسز ساگا نے پھر فون نہیں اٹھایا تھا۔ میں گھر میں پڑا

پھر؟؟؟

1921 کی بات ہے میں نئی دہلی میں ایک لنچ کے موقع پر قائد اعظم محمد علی جناح اپنی بیگم رتی جناح کے ساتھ مدعو تھے۔ لارڈ ریڈنگ مسز جناح سے باتیں کرتے ہوئے کہنے لگے۔ ”مسز جناح میں آپ کو کیسے بتاؤں کہ مجھے جرمنی جانے کی کتنی تمنا ہے مگر افسوس میں نہیں جاسکتا۔“

مسز جناح نے پوچھا۔ ”آخر آپ وہاں کیوں نہیں جاسکتے؟“

لارڈ ریڈنگ نے جواب دیا۔ ”اصل بات یہ ہے کہ جرمن، ہم برطانوی لوگوں کو پسند نہیں کرتے۔“

رتی جناح فوراً بولیں۔ ”پھر آپ ہندوستان کیسے چلے آئے؟“

مرسلہ: نجمی رحمن۔ برٹ لیٹ U.S.A

خوار ہوتا رہا۔“

شہباز جب سیاپا کہتا تو کوئی نہ کوئی پنجابی کی بھاری بھر کم گالی بھی ساتھ دیتا تھا۔ پڑھنے والے اگر چاہیں تو اپنے مطلب کی گالی یہاں فٹ کرلیں۔ گالی تو گالی ہوتی ہے جس کا بظاہر کوئی مطلب نہیں ہوتا اور جو دوستوں کے درمیان بلا روک ٹوک چلتی رہتی ہے۔

میں نے شہباز سے کہا کہ چلو ذرا ہم بھی یہ شو دیکھیں کہ کیا چیز ہے اس میں جس نے مفتی کو باندھ کر رکھا ہے۔

شہباز کچن میں چائے بنانے چلا گیا اور میں اپنا تکیہ سنبھال کر ٹی وی کے سامنے کارپٹ پر ڈھیر ہو گیا۔ مفتی نے مڑ کر ایک بار مجھے دیکھا اور پھر سے اپنے شو میں کھو گیا۔ اب ہم گرم چائے کے گھونٹ بھر رہے تھے اور شو دیکھ رہے تھے۔ اس سارے عرصے مفتی نے ایک جنبش بھی نہ لی۔ اس شو کا نام Heart Changing تھا۔ کئی لڑکے اور لڑکیاں جو پہلے ایک دوسرے کے گرل اور بوائے فرینڈز تھے اور آج کل کسی دوسرے کی زمین کو ہرا کر رہے تھے، وہ اپنی خلوت کی باتیں بتا رہے تھے۔ پھر ان سے سوال پوچھا جاتا کہ کیا وہ اب بھی ایک دوسرے کے ساتھ رہنا پسند کرتے ہیں تو اکثر اپنے ساتھی کو چھوڑ کر دوبارہ سے ساتھ رہنے پر راضی ہو جاتے اور ان کے ساتھی بھی انہیں خوش و خرم جانے کی اجازت دے دیتے اور پھر اسی شو میں اپنے لیے کوئی اور ساتھی تلاش کر لیتے۔

میں اپنے طور پر شرم سے ڈوب گیا مگر اب اپنے ملک پاکستان کی حالت زار دیکھتا ہوں تو اندازہ ہو جاتا ہے کہ کس طرح ایک طریقے سے وہی کلچر پاکستان میں بھی فروغ دیا جا رہا ہے۔ کچھ دیسی لبرل جن کو ہم بچپن میں کالا انگریز کہتے تھے وہ کس طرح میڈیا پر قبضہ کر کے اس کلچر کی راہ ہموار کر رہے ہیں۔ ہمارے حکمران مغرب کے ڈر سے ان چند لوگوں کی پشت پناہی کر رہے ہیں۔ مردوں کو ظالم دکھلا کر عورت کو بدراہ کرنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ نکاح کو تہمت بتایا جا رہا ہے۔ جنسی آزادی کو بنیادی حق کہا جا رہا ہے۔ جس طرح سے نئے قانون لائے جا رہے ہیں، ان سے عورت کے مسائل تو حل نہ ہوں گے بلکہ ہر دوسرے گھر میں کوئی نہ کوئی طلاق ہوگی اور پھر بے راہ روی کا طوفان اٹھے گا۔ شادی کو لوگ ایک عذاب سمجھیں گے اور بغیر شادی کے ساتھ رہنے کو آسان نسخہ سمجھا جائے گا۔ والدین بے بس ہو جائیں گے اور ان دیسی لبرل کا مذموم مقصد پورا ہو جائے گا۔ یہ ہے اصل منصوبہ جو مغرب سے درآمد کیا گیا ہے جہاں بچے ہونے کے بعد یہ فیصلہ کیا جاتا ہے کہ ہم ایک دوسرے کے لیے موزوں ہیں تو شادی کر لیتے ہیں ورنہ راستے جدا ہو جاتے ہیں۔ ان دیسی لبرل کو یہ معلوم نہیں کہ پاکستانی معاشرے کا ایسا کوئی مزاج نہیں اور یہ پلٹ کر ایک دن اپنا وار کرے گا۔ اس سے انتہا پسندی بڑھے گی۔ جب کسی قوم میں یہ احساس آجائے کہ ان کی تہذیب اور روایات کو روندا جا رہا ہے تو یہی لوگ انتہا پسند ہو جاتے ہیں۔ یہ بات ہمارے حکمران اور مغرب نہیں سمجھنا چاہتا۔ میں ایسے کچھ لوگوں سے ملا ہوں جنہوں نے ناجائز بیٹیاں جنم دیں اور پھر ان لوگوں کے بھائیوں نے انہیں گرل فرینڈ بنایا ہوا ہے۔ عورت کو یہاں عبرت کا نشان بنا دیا گیا ہے اور ہم اس کلچر کو اپنانے کی جدوجہد میں سرگرداں ہیں۔

کسی نے بتایا کہ تم اتنا دور HRDC سینٹر جاب کی تلاش میں کیوں جاتے ہو۔ ہم مارٹن گرو (MartinGrove) روڈ پر رہتے تھے اور اس پر شمالی سمت پر ایک ہیومن ریسورس سینٹر ہے۔ جہاں ہر طرح کی سہولت موجود ہے۔ کمپیوٹر، انٹرنیٹ، فوٹو کاپی، فیکس اور جاب ڈھونڈنے کی سہولتوں کے علاوہ اور بھی ضروری تربیت مفت میں مہیا کی جاتی ہے۔ اس سینٹر کا نام میکرو سکل (Microskill) تھا وہ ہمارے اپارٹمنٹ سے پانچ کلو میٹر دور تھا۔ گلاٹی اسٹور ایک کلو میٹر اور آگے چار کلو میٹر کا راستہ تھا۔ بس دس منٹ میں پہنچا دیتی تھی۔ میں نے دو ڈالر کا بس ٹکٹ بچانے کے لیے وہ راستہ ناپا تو معلوم ہوا کہ پچاس منٹ کی پیدل واک ہے۔ میرے پاس وقت کی کمی نہ تھی اور دو ڈالر بھی بچ رہے تھے۔

اگلے دن میں اور شہباز اپنے کندھوں پر بیگ لٹکائے بس سے ہیومن ریسورس سینٹر پہنچ گئے۔ دسمبر کا پہلا ہفتہ چل رہا تھا۔ ٹورنٹو کی سردی دنیا میں مشہور ہے اور میں گرم ریتیلے علاقوں کا رہنے والا یہاں آکر ٹھٹھر کر منجمد ہو گیا تھا۔ جسم کے ساتھ دماغ بھی سن ہو گیا تھا۔ لاہور کے پینوراما سینٹر سے خریدی گئی گرم ٹوپی اور لنڈے سے خریدی گئی گرم اونی جرابیں اور مفلر کام آرہے تھے۔ شہباز کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ وہ تو میرے چہرے پر بھی تھیں مگر اپنا چہرہ نظر کہاں آتا ہے۔ سینٹر ایک بڑے ہال میں بنا تھا۔ چالیس فٹ کے قریب لمبے ہال میں دیواروں کے ساتھ ساتھ کاؤنٹر بنے تھے اور کئی ایک کمپیوٹر رکھے تھے۔ ہر کمپیوٹر کے سامنے آرام دہ کرسیاں تھیں۔ درمیان میں بھی میزیں اور کرسیاں تھیں اور وہاں بھی کمپیوٹر پر نئے تارکین وطن بیٹھے جاب سرچ کر رہے تھے۔ سب کمپیوٹر ایک بڑے پرنٹر سے جڑے تھے اور وہاں سے اپنے Resume پرنٹ کرتے اور کسی نہ کسی جگہ فیکس کر رہے تھے۔ مرکزی دروازے میں داخل ہوتے ہی کافی اور ہاٹ چاکلیٹ کی مشینیں لگی تھیں جہاں آپ کو یہ سب فری میں دستیاب تھیں۔ سینٹر کا مینیجر ایک ایرانی تھا۔ اس کا قد چھوٹا اور سر گنجا تھا۔ پاکستانیوں کا بہت خیال کرتا تھا۔ مجھے انٹرنیٹ کا زیادہ علم نہیں تھا مگر وہ میری مدد کرتا رہا۔

ٹورنٹو میں جاب پوسٹ کرنے کا ایک مرکزی نظام تھا۔ جس کمپنی کو کوئی ورکر چاہیے ہوتا ہے تو وہ اس سائٹ پر جاب پوسٹ کر دیتی ہے۔ آپ جاب کے کوائف پڑھنے کے بعد اس کمپنی کو اپنا Resume فیکس کر دیتے ہیں اور ننانوے فیصد جواب نہیں ملتا۔ میں اور شہباز صرف نچلی سطح کی جاب تلاش کرتے تھے۔ ہمارا ٹارگٹ صرف سیکیورٹی گارڈ کی جاب تھی مگر ہم اس کے علاوہ کسی فیکٹری میں لیبر یا کسی بھی قسم کی نوکری کے لیے تیار تھے۔ ہمیں ایک تو یہ فراغت مارے جا رہی تھی بلکہ ہم پاکستان سے لائے گئے روپے ڈالر میں منتقل کر کے خرچ کر رہے تھے۔ اس دن ہم دونوں نے درجنوں جگہ Resume فیکس کیے اور پھر پہلے بور ہوئے اور بعد میں ڈپریشن کا شکار ہوتے چلے گئے۔ پاکستان میں اپنی باعزت جاب کے علاوہ گھر یاد آتا تھا۔ ان دنوں میرے کسی جاننے والے کا ای میل ایڈریس بھی نہ تھا جن کو میں ای میل کر کے

خیریت دریافت کرتا۔ شہباز کے ایک دو دوست تھے جن کو وہ ای میل کرتا تھا اور میں اسے خوش نصیب سمجھتا تھا کہ ہر ایک دن اس کو اپنے کسی دوست کی ای میل آتی ہے اور تو اور اس کی والدہ اس کے کسی دوست کے ذریعے اپنے ہاتھ سے لکھا خط اسکین کر کے ای میل سے بھیج دیتی تھیں۔ یہ میرے لیے انوکھی بات تھی کہ ایک لمحے میں آپ کو خط بھی مل سکتا ہے۔

ہم کئی گھنٹے یہ شغل کرتے رہے۔ اسی دوران گرم کافی یا ہاٹ چاکلیٹ پی کر اپنے آپ کو تازہ دم رکھتے رہے۔ ہم نے بھوک مٹانے کے لیے آلو ابال کر بیگ میں رکھ لیے تھے۔ درمیان میں یہی ابلے آلو چھلکوں سمیت کھا کر اپنی بھوک مٹاتے۔

باہر نکلے تو یخ بستہ ہوا چل رہی تھی۔ جب سے میں آیا تھا اس دن سے ابھی تک میں نے آسمان کی شکل تک نہ دیکھی تھی۔ ہر وقت بادل چھائے رہتے تھے۔ ایک عجیب سی کیفیت میں، میں دوچار تھا۔ اداسی، بے وطنی، نوکری کی تلاش، کھانے کی فکر اور بچوں سے دوری ان سب نے مل کر مجھے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ واپسی میں ہم دو ڈالر بچانے کے لیے ایک گھنٹا اس سردی میں پیدل چل کر آئے۔ شہباز کی آنکھوں کے کونے نم تھے اور میں اپنا درد اس سے چھپا رہا تھا۔

یہاں ہمیں اپنی بقا کے لیے لیبر کی جاب کرنی تھی۔ سیکیورٹی گارڈ کی جاب نچلی نوکریوں میں سب سے بہتر تھی مگر ہم دونوں کو ابھی لیبر کی جاب بھی نہ مل سکی تھی۔ جتنے Resume ہم نے بھیجے تھے۔ ان میں سے کسی کا بھی جواب نہ آیا تھا اور نہ مجھے جواب آنے کی اُمید تھی۔ شہباز نے آج سیکیورٹی گارڈ کی جاب کے لیے اپنا Resume بنایا تھا اور اسے پڑھ کر وقتی طور پر میری اداسی کم ہوگئی۔ اگر اب وہ Resume میرے پاس ہوتا تو من وعن اسے چھاپ دیتا۔ ایسا دلچسپ Resume شاید ہی کسی نے بنایا ہو۔ اسے پڑھ کر ہنس ہنس کر میرا اور مفتی کا برا حال ہوگیا۔ اس نے لکھا تھا کہ وہ پاکستان میں ایئر پورٹ پر سیکیورٹی گارڈ تھا۔ پھر ذکر کیا تھا کہ وہ کون کون سی گن چلانا جانتا ہے۔ ضرورت پڑنے پر کسی کی ٹھکائی بھی لگا سکتا ہے۔ سات میل فی گھنٹے کی رفتار سے دو گھنٹے تک دوڑ سکتا ہے اور اس نے فوجی ٹریننگ بھی لی ہے۔ پوری رات جاگ سکتا ہے اور وہ بھی کھڑے ہو کر۔

میں شہباز کی جسامت دیکھتا، پھر اس کے Resume کو پڑھتا اور میرے قہقہے تھمتے نہ تھے۔ شہباز میرے ہنسنے پر خفا تھا اور متواتر کہے چلا جا رہا تھا۔ ”یار! کیا سیاپا مچا رکھا ہے۔“ جو بندہ بس اسٹاپ تک جانے پر ہانپنا شروع کر دیتا تھا اور یہاں لکھ ڈالا تھا کہ وہ سات میل فی گھنٹے کی رفتار سے بھاگ سکتا ہے۔

دیکھا جائے تو مجھے آئے بارہ دن ہی ہوئے تھے مگر محسوس یہ ہو رہا تھا کہ بارہ مہینے ہو گئے ہوں۔ دراصل زندگی میں کبھی فارغ نہیں رہا تھا۔ ہمیشہ کچھ نہ کچھ کرتا رہا تھا۔ میں یہاں چھٹیوں پر نہ تھا کہ گھومتا پھرتا۔ مجھے جلد سے جلد کہیں نہ کہیں جاب ڈھونڈنی تھی تاکہ اپنا خرچا تو نکل آئے اور پھر ہر وقت ایک ہی سوچ کی قید میں رہتا کہ جاب کب ملے گی؟ یہ ایک تکلیف دہ مرحلہ تھا۔ ہمیں کہیں سے بھی کوئی ایک اشارہ بھی ملتا کہ یہاں جاب نکل سکتی ہے تو ہم اُمید اور نااُمیدی کے عالم میں اپنا Resume فیکس کر دیتے تھے اور پھر ایک لمبے انتظار میں فون کے سامنے بیٹھے رہتے۔

ہم اپارٹمنٹ میں کارپٹ پر لیٹے شدید بیزارگی سے دوچار تھے کہ مفتی کا فون آگیا۔ فون میں نے اٹھایا تو مفتی کہہ رہا تھا کہ ارلنگٹن سب وے کے باہر ایک عمارت میں مین پاور کے نام سے ریکروٹنگ ایجنسی ہے۔ ان کے پاس مختلف قسم کی جاب موجود ہیں اور مفتی نے ہمیں تاکید کی کہ آج ہی ان سے مل لو اور اپنا Resume بھی ان کو دے دو۔ پھر ہم ایسے تیار ہوئے کہ جیسے آج نوکری کا پہلا دن ہو۔ شہباز ٹائی لگا کر بولا۔ ”یہ کہیں مفتی کا سیاپا ہی نہ ہو؟“ میں نے کہا۔ ”اگر گھر پر ہی بیٹھے رہے تو میرے دماغ کی رگیں کہیں پھٹ نہ جائیں؟ اس لیے باہر تو نکلنا ہی ہوگا۔“

کپلنگ کے بعد ارلنگٹن کا سب وے ہے۔ ہم وہاں سے باہر نکلے تو چاروں طرف چالیس چالیس منزلہ شیشوں والی عمارتیں سر اٹھائے کھڑی تھیں۔ صاف ستھری سڑکوں پر نئی نکور گاڑیاں دوڑ رہی تھیں۔ ہر عمارت کا عکس دوسری عمارت کے شیشوں میں نظر آ رہا تھا۔ شہباز کہنے لگا۔ ”جب جاب ہو جائے گی تو یہاں گھومنے ضرور آئیں گے!“

نکمے دماغ کو کوئی چیز نہیں بھاتی ہے۔ یہی ہمارا حال تھا۔ ٹورنٹو کی خوب صورتی اس سردی میں بھی بڑی دلکش تھی۔ جیسے خالی پیٹ عشق نہیں ہوتا ایسے ہی بے روزگاری میں کوئی بھی منظر اچھا نہیں لگتا ہے۔

ان سب عمارتوں میں ایک بلڈنگ کلیریکا (Clarica) کے نام سے تھی، ہمیں اسی میں جانا تھا۔ ہم اپنے شولڈر بیگ لٹکائے، اس بلڈنگ کا جائزہ لیتے شیشے کے دروازوں سے ہو کر اندر جا گھسے۔ باہر کی سردی باہر رہ گئی اور ہم

جیسے کسی ایئرپورٹ کے ٹرمینل میں آ کھڑے ہوئے۔ اردگرد شاندار ریسٹورنٹ اور مختلف شاپس تھیں جیسے ہمارے ہاں جنرل اسٹور ہوتے ہیں۔ چمکتے فرش اور آتے جاتے اجلے چہرے۔ ہم ایک لمحے کو ٹھٹک سے گئے کہ باہر سے تنہا لگتی عمارت میں اتنا ہنگامہ کیسے ہوسکتا ہے؟ ہم تو کسی خاموش اور نیم تاریک ماحول کو ذہن میں رکھ کر اندر داخل ہوئے تھے اور یہاں ایک روشن اور زندگی سے بھرپور ماحول تھا۔

ہم چکر کھاتے وسیع برآمدوں سے گزرتے اور رونق میلہ دیکھتے دیکھتے ایک کھلی جگہ آئے تو سامنے متعدد کاؤنٹر تھے اور ان کے آگے ترتیب سے کرسیاں لگی تھیں۔ معلوم ہوا کہ یہ ہیلتھ کینیڈا کا دفتر ہے۔ یہاں تارکین وطن ہیلتھ کارڈ کے لیے درخواست جمع کرواتے ہیں۔ کینیڈا میں ہیلتھ کارڈ آپ کا بہت بڑا اثاثہ ہوتا ہے۔ یہاں علاج مفت مہیا کیا جاتا ہے اور یہ تب ہی ممکن ہے جب آپ کے پاس ہیلتھ کارڈ ہو ہم مین پاور کو بھول کر ہیلتھ کارڈ کی لائن میں لگ گئے۔ درخواست جمع کروانے کے لیے آپ کو پاسپورٹ، لینڈنگ کے کاغذات، SIN کارڈ اور آپ کی رہائش کا ثبوت چاہیے ہوتا ہے۔ رہائشی پتے کے لیے بینک سے آیا لیٹر دکھانا پڑتا ہے جو اس بات کا ثبوت ہوتا ہے کہ یہ آپ کی رہائش ہے۔ میرے پاس ابھی SIN کارڈ بھی نہ تھا اور نہ ابھی بینک سے اسٹیٹمنٹ آئی تھی۔ پھر بھی میں کاؤنٹر کے آگے کھڑا ایک اہلکار سے بات کر رہا تھا۔ اس نے مجھے فارم دے دیا اور انتظار کرنے کو کہا۔ میرا نمبر آیا تو بلوایا گیا۔ ایک سیاہ فام لڑکی منہ میں پینسل دبائے میرا فارم بغور دیکھتی رہی۔ پھر کاغذات مانگے۔ میرے ادھورے کاغذات پر نہ چہرہ بگاڑا اور نہ منہ چڑھایا۔ بہت خوشگوار لہجے میں فارم پر لکھ کر بتایا کہ جب یہ سب کاغذات مکمل ہوجائیں تو آ کر فارم جمع کروا دینا۔

شہباز اور میں حیران تھے کہ نہ اس نے بدتمیزی کی اور نہ جھاڑا کہ نامکمل کاغذات کے بغیر آپ لوگ آئے کیوں؟ مگر نہایت شائستگی سے مسکرا کر مجھے سمجھایا اور سلیقے سے ہمیں رخصت کیا۔

ان باتوں سے میری ٹریننگ ہو رہی تھی کہ کس طرح مجھے دوسرے لوگوں سے بات کرنا ہوگی۔ کس طرح سے خلق خدا کی مدد کرنا ہوگی۔ یہاں جھوٹ اور شارٹ کٹ نہیں چلتا۔ ایک بار تکا لگ سکتا ہے مگر بار بار نہیں۔ کسی سے تڑاخ کر بات نہیں کرنی۔ ہر ایک سے مسکرا کر ملنا ہے۔ کسی کو گھورنا بھی نہیں اور کسی کے لباس، زبان اور مذہب پر کوئی تبصرہ بھی نہیں کرنا۔ نہ تو کسی انسان کو چھونا ہے اور نہ کسی اور کی چیز کو۔ آپ کی یہ ٹریننگ یہاں کا معاشرہ کرتا ہے اور لوگ آپ کے رہبر بن جاتے ہیں۔ میں بھی آہستہ آہستہ سیکھ رہا تھا۔ یہاں نہ میں نے کسی گاڑی کا ہارن سنا اور نہ کسی کو پیچھے سے آواز کستے یا بلاتے سنا۔

ہمیں اب خیال آیا کہ ہم تو مین پاور ایجنسی میں اپنا Resume دینے آئے تھے۔ پوچھتے پوچھتے ہم ایک لفٹ سے دسویں فلور پر چند سیکنڈ میں کھڑے تھے۔ ایسی برق رفتار لفٹ ہم نے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ سامنے ایک دروازے کے باہر مین پاور کی تختی لگی تھی۔ ہم دروازہ کھول کر ایک بڑے ہال نما اور روشن کمرے میں داخل ہوئے، جس کے اردگرد چھوٹے چھوٹے کمرے تھے جن کو دفاتر کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ ہمارے علاوہ وہاں کوئی اور موجود نہ تھا۔ ہم کھڑے کسی انسانی شکل کا انتظار کر ہی رہے تھے کہ اسی لمحے ایک لڑکی ٹک ٹک کرتی آئی۔ اس نے اپنے آپ کو بنا جوڑ کے سنبھالا ہوا تھا ورنہ کسی کے لیے اتنی زیادہ پرکشش نہ ہوگی۔ وہ مسکراتی ہوئی ہمارے سامنے آ کر کھڑی ہوگئی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بات کہاں سے شروع کروں کہ اسی دوران شہباز نے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ میں اور وہ لڑکی گھبرا سے گئے مگر پھر مجھے اندازہ ہوا کہ شہباز ہاتھ ملا رہا ہے اور اس کی باچھیں پوری کی پوری کھلی ہوئی تھیں۔ لڑکی نے ہاتھ چھڑوا کر ہمارے آنے کا مقصد پوچھا جو ہم دونوں نے ایک دوسرے کی مدد کر کے بیان کر دیا۔ وہ کند ذہن پھر بھی نہ سمجھی اور شش و پنج میں ہمیں دیکھتی رہ گئی۔

وہ الجھی ہوئی ہمیں اپنے دفتر میں لے گئی۔ وہ یہ تو سمجھ گئی تھی کہ ہم جاب ڈھونڈتے ڈھونڈتے اس کے دروازے پر آ بھٹکے ہیں۔ اس نے ہمیں پہلے تو بٹھایا اور پھر اپنی نشست سنبھالی دوبارہ سے سنبھل کر اپنی کہنیاں میز پر رکھے ہمیں سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی کہ میں آپ کی کیا مدد کر سکتی ہوں؟ میں نے ایک بار پھر فقرے جوڑے اور اس کو اپنے آنے کا مقصد بتایا۔ تو اس کی سمجھ میں کچھ آیا اور سکون سے اس نے اپنی کرسی پر ٹیک لگالی۔ پہلے ہمارے Resume لیے اور کہنے لگی کہ کس قسم کی جاب آپ کو پسند ہے۔ شہباز نے کچھ کہا جو مجھے یاد نہیں، البتہ مجھے اپنا کہا یاد ہے۔ ”میں بار اور کلب کے علاوہ کہیں بھی کام کر لوں گا۔“

میرے جواب پر وہ ایک بار پھر بے یقینی اور الجھن میں پڑ گئی۔ کچھ سوچا اور پھر سر جھٹک کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”ٹھیک ہے جب کوئی جاب آئی تو آپ لوگوں کو فون کر لوں گی۔“

اس کے اچانک اٹھنے کا مقصد ہماری سمجھ میں آگیا اور ہم بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ ہم نے مسکرا مسکرا کر اس کا شکریہ بار بار ادا کیا اور پھر شرمندگی سے منہ لٹکائے باہر نکل آئے۔

ہم مضمحل قدموں پر چلتے عمارت سے باہر نکل آئے۔ آج سردی بہت زیادہ تھی۔ درجۂ حرارت منفی سے کئی درجے نیچے تھا۔ ہم دونوں خاموش تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ ہم لاحاصل جستجو کررہے ہیں۔ ہم بہت سی جگہوں پر جاب کے لیے Resume بھیج چکے تھے مگر ابھی تک کسی جانب سے کوئی کال نہیں آئی تھی۔ باہر تھینچ پڑے تھے۔ میں نے شہباز سے کہا کہ کچھ دیر یہیں باہر بیٹھتے ہیں۔ پھر وہ ایک بھاری بھرکم گالی دے کر بولا۔ ”لگتا ہے جاب کا سیاپا ختم نہیں ہونے والا ہے۔“ اور ساتھ ہی بینچ پر گر پڑا۔

میں نے سگریٹ سلگائی اور دھواں سرد ہوا میں چھوڑا پھر بولا۔ ”شہباز! آخر ہم یہاں کیوں آگئے ہیں؟ یہاں تو ان بلند عمارتوں اور صاف شفاف سڑکوں کے علاوہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔ ہم کیا کیا خواب سجا کر آئے تھے۔ لوگ ہمیں خوش قسمت سمجھتے تھے۔ ہم بھی فخریہ چلتے تھے۔ سوچتے تھے کہ آتے ہی گھر، گاڑی اور نوکری ہمارے سامنے ہوں گی۔ ایک شاندار زندگی کا آغاز ہوگا۔“

میں خاموش ہوگیا۔ سردی سے دھواں میرے منہ سے نکل رہا تھا مگر شہباز کے چہرے پر پسینا تھا۔

ہم ارلنگٹن سب وے پر ٹکٹ بوتھ پر آئے تو آگے ایک پاکستانی کھڑا ٹکٹ کلرک کی منتیں کررہا تھا۔ ”میرے پاس کھانے کے پیسے بھی نہیں ہیں اور نہ ٹکٹ کے لیے کچھ ہے۔ میں غریب آدمی ہوں اور مجھے فری میں جانے دو۔“

میں اور شہباز ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہے تھے۔ شرم اور افسوس سے ہمارے سر جھک گئے۔ کلرک کچھ دیر اسے غور سے دیکھتا رہا اور پھر اس نے بٹن دبا کر اس کے لیے راستہ کھول دیا۔ وہ ہمیں دیکھ کر اپنا چہرہ چھپاتا ہوا نکل گیا۔

واپسی پر شہباز اپارٹمنٹ پر اتر گیا اور میں میکرو سکل سینٹر آگیا۔ میں نے کل گلاٹی سپر اسٹور کے ساتھ کینیڈا کی مشہور فارمیسی چین ”شاپر ڈرگ مارٹ“ کے دروازے پر ضرورت برائے فارمیسی ٹیکنیشن کا اشتہار دیکھا تھا۔ اس کے لیے Resume بنایا اور واپس پانچ کلومیٹر پیدل چل کر وہاں اپنا Resume ڈراپ کیا اور بوجھل قدموں سے اپارٹمنٹ آکر سوگیا۔ نیند بہت دور تھی۔ میں کمرے میں پڑا تھا اور لاؤنج میں مفتی، شہباز کی مدد سے اپنا سامان پیک کررہا تھا۔ چند دنوں میں وہ پاکستان جارہا تھا۔ میں اس کے سامان کو دیکھ کر آیا تھا اور بار بار اسے دیکھتا رہا تھا کہ یہ پاکستان کی فضاؤں کو چھوئے گا اور یہ احساس بھی میرے لیے خوش گوار تھا۔ مفتی دنیا کا خوش نصیب انسان لگ رہا تھا۔ کچھ دیر پہلے اس کا ایک دوست اس سے ملنے آیا تھا۔ وہ قدرے بلند آواز میں باتیں کررہا تھا۔ وہ بھی مفتی کی طرح پشاور کا رہنے والا تھا۔ مفتی سے کہہ رہا تھا۔ ”پشاور میں دوستوں سے ملو تو کہنا کہ تم تو آزاد فضاؤں کے پنچھی ہو اور کہنا کہ تمہارا ایک دوست دور، پار سمندروں کے آگے ایک ملک میں طوطے کی طرح قید ہے۔“

میں نے پوچھا کہ کام کیا کرتے ہو تو بولا۔ ”پشاور میں چیف انجینئر تھا اور یہاں سیکورٹی گارڈ کی جاب دو سال سے کررہا ہوں۔“

اس کا جواب سن کر مجھے غشی کے دورے پڑنے لگے۔ ایک انجینئر دو سال سے دھکے کھا رہا ہے اور معلوم نہیں میرا کیا

ڈیزی کلسٹر بم

انتہائی طاقت ور بم، اسے امریکا نے ویت نام اور خلیج کی جنگوں میں بھی استعمال کیا۔ ازاں بعد اس میں یہ تبدیلی کی گئی کہ اس کی نوک پر جست کی جگہ یورینیم کے ذرات لگادیے گئے۔ جس کے باعث بم کی تباہی پھیلانے کی صلاحیت میں کئی گنا اضافہ ہوگیا۔ یہ بم نومبر 2001ء کو افغانستان میں اس لیے استعمال کیے گئے، تاکہ طالبان اور اسامہ بن لادن کے زیر زمین بنکروں کو تباہ کیا جاسکے۔

یہ بم صرف 200 گز کے اندر اندر تباہی پھیلا سکتا ہے، لیکن یورینیم کے ذرات کے لگانے سے 200 سے 400 میل کے دائرے کے اندر پھیل سکتا ہے اور اس کی زد میں آنے والی تمام چیزیں، مثلاً فضا اور پانی وغیرہ انتہائی آلودہ ہوجاتیں جہاں تک یورینیم کے ذرات کا تعلق ہے، یہ اگر ہوا یا پانی کے ذریعے انسانی جسم میں داخل ہوجائیں تو اس کے اثرات انتہائی مہلک اور دیرپا ہوتے ہیں۔ یہ نہ صرف انسان کے نروس سسٹم کو بری طرح متاثر کرسکتے ہیں۔ بلکہ یہ انسانی خون میں گھل مل جاتے ہیں اور پھر انہیں علیحدہ کرنا بہت مشکل ہوجاتا ہے۔ یورینیم کے اثرات سے بچے اپاہج ہوجاتے ہیں اور اس سے پیدا ہونے والی تقریباً تمام بیماریوں کا کوئی علاج نہیں۔

مرسلہ: مراد علی وڑائچ، لاہور

حال ہونے والا ہے؟ یہی سوچ کر میں ذہنی دباؤ میں آگیا اور اپنا صدمہ چھپانے کے لیے کمرے میں لیٹ گیا۔

دن چڑھا تو دیکھا کہ شہباز اپنے ہی خراٹوں سے بے آرام ہو رہا تھا۔ میں صبح کی نماز پڑھ کر دوبارہ سو گیا۔ دوبارہ بیدار ہو کر کچھ دیر کچھ سوچتا رہا۔ آج کہیں جانے کی طبیعت نہ تھی مگر ایک دم خیال آیا کہ آج تو جمعہ مبارک ہے اور نماز کے لیے جانا ہے۔ میکرو سکل سینٹر کے ذرا بعد مارٹن گرو پر ایک سڑک ریکس ڈیل اسے چیرتی ہوئی گزرتی ہے۔ اسی پر مشرقی سمت میں دیسیوں کا بازار ہے۔ کالنگ کارڈ، گروسری کی دکانیں، حلال گوشت کے علاوہ دوسری کئی ایک دکانیں ہیں۔ یہاں مسلمانوں کا ہجوم اس لیے بھی رہتا ہے کہ سامنے علاقے کی سب سے بڑی مسجد IMO ہے۔

میں تیار ہوا۔ مفتی جاب پر جا چکا تھا۔ شہباز بھی بیدار ہو کر دوبارہ لاؤنج میں مفتی کے میٹرس پر سویا ہوا تھا۔ میں نے جگایا تو خرافات بکنے لگا۔ پھر جب یہ کہا۔ ''ابھی مفتی کو فون کرتا ہوں کہ تو اس کا بستر میلا کر رہا ہے۔''

وہ ایک دم سے چھلانگ لگا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اسے معلوم تھا کہ مفتی اپنے میٹرس پر کسی اور کا بیٹھنا بھی پسند نہیں کرتا ہے۔

ہم ایک دوسرے کے مزاجوں سے واقف ہوتے جا رہے تھے۔ سب میں اچھی اور ناپسندیدہ عادتیں کسی بھی عام آدمی کی طرح بدرجہ اتم موجود تھیں۔ اسی لیے ہم ایک دوسرے کا خیال رکھتے تھے۔ شہباز ہمیشہ بڑبڑاتا رہتا تھا مگر مفتی کے سامنے اس کی گھگھی بندھ جاتی تھی لیکن ہم نے اپنا ماحول نہایت دوستانہ رکھا ہوا تھا۔

ہماری خوراک میں آلو اور انڈوں کا ابھی تک بہت دخل تھا۔ صبح ناشتے میں انڈے اور خمیری روٹیاں ہوتی تھیں۔ دوپہر میں ابلے آلو اور رات میں آلو انڈے کا سالن۔ ذرا اچھے موڈ میں ہوئے تو چکن بنالی۔ شہباز صرف پیاز اور ٹماٹر کاٹ سکتا تھا۔ میں کھانا بناتا تو شہباز سے شرارت میں سارا کچن صاف کرواتا اور برتن بھی دھلواتا۔ وہ برتن دھوتے ہوئے عین عادت کے مطابق زیرِ لب بڑبڑاتا رہتا۔ ''کیا سیاپا ہے یہاں، کھانے میں کچھ ڈھنگ کا ملتا ہی نہیں اور ساری صفائی بھی مجھ سے کرواتے ہیں۔''

ہمیشہ کی طرح آج کا بھی اپنا روایتی ناشتا کیا۔ شہباز پھر سے سو گیا اور میں جمعہ کی نماز پڑھنے باہر کے فریزر میں آگیا۔ ایک بس تبدیل کر کے میں مسجد کے سامنے اترا۔ نمازی جوق در جوق مسجد کی طرف بھاگے چلے جاتے تھے۔ یہاں پاکستان والا حساب نہیں ہوتا کہ گھر سے نکلے اور پیدل چل کر گلی کے کونے میں جمعہ کی نماز ادا کر لی۔ یہاں میں بس پر آیا تو پینتالیس منٹ لگ گئے۔ لوگ گاڑیوں میں دور دور سے نماز پڑھنے آتے ہیں۔ تقریر اور خطبہ سنتے ہیں اور پھر اتنی ہی ڈرائیو کر کے واپس گھروں کو یا جاب پر پہنچتے ہیں۔

کئی ایک مقامات پر اگر مسجدیں قریب نہ ہوں تو حکومت کی اجازت سے کسی لائبریری یا کمیونٹی ہال میں جمعہ کی نماز ہوتی ہے۔ پچھلے جمعہ کو میں مفتی کے ساتھ ایک لائبریری میں نماز پڑھنے گیا۔ صفیں بچھائیں اور تیس چالیس نمازی بیٹھ گئے۔ مجھے امام صاحب کا انتظار تھا۔ ایک صاحب آئے۔ انہوں نے تھری پیس سوٹ پہنا ہوا تھا اور ٹائی لگائی تھی۔ کلین شیو بھی تھے۔ انہوں نے تقریر شروع کی تو مفتی میرے کان میں بولا کہ یہی امام صاحب ہیں۔ میں بھونچکا رہ گیا۔ یہ کیسے امام صاحب ہو سکتے ہیں؟ میں تردد میں پڑ گیا کہ کیا ان کے پیچھے نماز ہو سکتی ہے؟ میں نیا نیا کسی مغربی ملک میں آیا تھا اور اس لیے ایسے گمان اٹھ رہے تھے۔ وہ امام صاحب کیا کہہ رہے تھے، مجھے کوئی اندازہ نہ تھا اور نہ میں دھیان دے رہا تھا۔ میری نظر میں تو اگر ایسے لوگ پاکستان میں کسی چھوٹے شہر کی مسجد میں بھی آجائیں تو سب خطبہ چھوڑ کر انہیں دیکھنے لگیں مگر یہاں ایسے صاحب ہمارے امام تھے جن کا نہ رنگ اور نہ ڈھنگ ہمارے مولویوں والا تھا۔ دل نہ مانتا تھا مگر پھر بھی بیٹھا رہا۔ وہ مصر سے تعلق رکھتے تھے۔ ایک کاغذ نکال کر تقریر شروع کی۔ پانچ منٹ میں خطبہ، پھر نماز اور بس...... پھر صفیں لپیٹیں اور گھروں کو واپس۔

میں نے تہیہ کیا کہ اب کے نماز کسی باقاعدہ مسجد میں پڑھوں گا۔ اسی لیے IMO میں داخل ہوا۔ پاکستان میں اتنی بڑی مسجد بہت کم ہوں گی۔ مسجد نمازیوں سے بھری تھی۔ ہر مسلک کا بندہ ساتھ ساتھ کھڑا تھا۔ کوئی شیعہ تھا کوئی سنی تھا۔ کوئی دیوبندی تھا، کوئی بریلوی تھا۔ کسی نے ہاتھ چھوڑے تھے اور کوئی باندھے کھڑا تھا۔ ایک اللہ کو سجدہ کرتا تھا اور سب نے کیا۔ اس ماحول نے مجھ پر خاص اثر کیا۔ عبادت کا خاص لطف آیا اور میں نے گڑگڑا کر اللہ سے دعا مانگی کہ کوئی نہ کوئی جاب مل جائے۔ روڈ کے پار دیسی دکانیں تھیں اور ان کے پیچھے کچھ فاصلے پر صنعتی علاقہ تھا۔

میں سر اور منہ لپیٹے لیبر کی جاب ڈھونڈنے ایک ایک فیکٹری کے اندر جاتا اور سوال کرتا اور اپنا بوجھل دل لے کر باہر آجاتا۔ معلوم نہیں کتنی فیکٹریوں میں گیا تھا آخر کار ایک جگہ

رک گیا۔ سرخ اینٹوں کی ایک منزلہ عمارت تھی جس کی چھت پر بڑا بڑا لکھا تھا کسٹم ووڈ انڈسٹری اور باہر شیشے پر لکھا تھا Job Wanted۔ میں نے یہ روحانی الفاظ بار بار پڑھے اور اللہ کا نام لیتا شیشے کا دروازہ کھول کر اندر جا گھسا تو اپنے آپ کو ریسپشن پر پایا۔ ڈیسک کے پیچھے ایک لڑکی سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ میں انکار کے ڈر سے تذبذب میں تھا کہ جاب کا پوچھوں یا نہیں۔

پھر وہ گویا ہوئی۔ ”میں کیا خدمت کر سکتی ہوں؟“

میں اپنے لہجے کو نرم رکھتے ہوئے کسی جاب کا سوال کیا تو اس نے مجھے بغور دیکھا جیسے بقر عید پر قسائی بکرے کا جائزہ لیتا ہے۔ پھر بولی۔ ”کوئی تجربہ ہے کسی فیکٹری میں کام کرنے کا؟“

میرے انکار پر اس نے مجھے دیکھتے ہوئے اپنی آنکھیں سکیڑیں اور ہونٹ بھینچ کر انکار میں سر ہلا دیا۔ کینیڈا میں نئے آنے والوں کے ساتھ یہ مسئلہ رہتا ہے کہ جب بھی کسی جاب کے لیے آپ اپنے آپ کو پیش کرتے ہیں تو ان دو سوالوں کا جواب مانگا جاتا ہے کہ کینیڈا میں کام کرنے کا تجربہ ہے یا یہاں کی کوئی تعلیم ہے؟ اگر دونوں نہ ہوں تو نوّے فیصد انکار ہی سمجھیں۔ ہم چیختے رہ جاتے ہیں کہ جب تک کوئی کام شروع نہیں کریں گے تو تجربہ کیسے ہوگا مگر آپ کی آہ و بکا کوئی نہیں سنتا۔ یہ تو اچھا ہوا کہ میرے جانے سے پہلے ایک عمر رسیدہ شخص پچھلے دروازے سے اندر داخل ہوا۔ سر پر چھجے دار ٹوپی اور آنکھوں پر نظر کا چشمہ تھا۔

اس نے میرا جائزہ لیا جس طرح لڑکی نے لیا تھا۔ مجھے اشارے سے اپنے قریب بلایا اور میں کھنچا چلا آیا۔ پوچھا۔ ”جاب چاہیے؟“

میں نے اثبات میں سر ہلایا تو اس نے کہا کہ سوموار کو کام کے لیے صبح آٹھ بجے پہنچ جانا اور پھر جاتے جاتے یہ کہا کہ سیفٹی شوز پہن کر آنا۔ یہ کہتا ہوا وہ پھر اسی دروازے کے اندر کسی جن کی طرح غائب ہوگیا۔ لڑکی نے پھر مجھ سے پوچھا کہ SIN کارڈ تو ہوگا؟

کارڈ مجھے دو دن پہلے مل چکا تھا اور اب میں قانونی طور پر جاب کا اہل بن چکا تھا۔ میں نے ہاں میں جواب دیا تو اس نے ایک فارم میرے سامنے رکھ دیا۔ اس فارم میں اپنے کوائف لکھنے تھے اور اہم جزئیات میں نام، ایڈریس، فون نمبر اور SIN کارڈ نمبر تھا۔ نہ یہ تھا کہ تاریخ پیدائش کیا ہے، مذہب یا سیکس کیا ہے۔ بعد میں تجربہ ہوا کہ ایسی باتیں پوچھنا قانون کے خلاف ہے۔ میں نے سرشاری سے فارم پُر کیا۔ تنخواہ پوچھی تو بتایا کہ نو ڈالر ایک گھنٹے کے ملیں گے۔ آٹھ سے پانچ بجے تک جاب ہوگی جس میں ایک گھنٹا آرام کا ہوگا جس کے پیسے نہیں ملیں گے۔ میں نے دل ہی دل میں حساب لگایا تو ایک دن کے بہتر ڈالر نکلے۔ پھر یہ حساب بھی لگایا کہ ایک ہفتہ بھی کام کروں تو مہینا گزر سکتا ہے اور باقی کے تین ہفتے کا کام نری بچت ہے۔

میں خوش و خرم باہر آیا تو خوشی سے پھولا نہیں سما رہا تھا۔ میں پاتال سے اٹھ کر رفعت کے مقام پر آ بیٹھا تھا۔ یہ سوچ رہا تھا کہ اب میں بچوں کو جلد از جلد بلوا سکوں گا۔ مجھے اندازہ ہی نہ تھا کہ میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ زندگی کیسے گل کھلانے والی ہے۔

میری سرشاری برقرار تھی میں خوشی خوشی گھر پہنچا تو شہباز کو اونگھتے پایا۔ اسے یہ خبر دی تو وہ مبارکبادیں نچھاور کرنے لگا پھر بولا کہ اسی طرح میری جاب بھی کروا دو۔ میں نے افسرانہ شان سے جواب دیا۔ ”ٹھیک ہے بات کروں گا۔ پہلے چائے پلواؤ۔“ وہ بڑبڑاتا ہوا چائے بنانے چلا گیا۔

اتنے میں مفتی آ پہنچا۔ میں نے اسے بھی یہ خوش خبری سنائی تو اس نے فیکٹری میں کام کی نوعیت پوچھی۔ میں کیسے بتاتا کیونکہ وہ تو مجھے خود بھی معلوم نہیں تھی۔ میری خاموشی سے نتیجہ اخذ کر کے وہ بھی خاموش ہوگیا۔

اسے افسردہ سی خاموشی میں ڈوبا دیکھ کر میں نے پوچھا۔ ”یہ سیفٹی شوز کیا ہوتے ہیں۔“

وہ ہنس کر بولا۔ ”وہی جو یہاں کے قانون کے مطابق ورکر کو فیکٹری میں کام کے دوران پہننے ہوتے ہیں۔ ان کے آگے اندر سے اسٹیل کی ٹوپی لگی ہوتی ہے تاکہ اگر پاؤں پر کوئی چیز گرے تو چوٹ نہ آئے۔“ میں نے پوچھا۔ ”کہاں سے ملیں گے۔“ تو جواب دیا کہ ابھی کچھ دیر میں جا کر خرید لیتے ہیں۔ شہباز اپنے زرد اور پسینے بھرے چہرے سے ہمیں باتیں کرتے دیکھ رہا تھا۔

مارننگ وورڈ روڈ پر شمال کی جانب جاتے ہیں تو پانچ کلومیٹر بعد میکرو سکل سینٹر کے بعد ریکس ڈیل روڈ آتی ہے۔ دائیں جانب مشرقی سمت میں مسجد ہے جہاں آج میں نے جمعہ کی نماز پڑھی تھی اور مغربی جانب بائیں طرف آگے جا کر ہائی وے 27 کے کونے پر ووڈ باین مال ہے۔ یہ ایسا مال ہے جیسے سب ہوتے ہیں۔ وہی دو منزلہ دو کلومیٹر سے زائد کے رقبے میں پھیلی عمارت جس میں بڑے بڑے، چمکتے دمکتے اسٹور، تفریح

کی جگہیں، جھولے، بچوں کے لیے چلتی ٹرین، فوڈ کورٹ اور آرام دہ کرسیاں اور چمکتے چہرے۔ بعد میں جب میرے بچے آگئے تو میں اکثر انہیں لے کر یہاں آجاتا تھا اور وہ پورا دن ہم بھرپور طریقے سے گزارتے تھے۔ میں خود کبھی مالز کا شوقین نہیں رہا۔ ایک بار تجربے کے لیے اپنے شوق سے چلا گیا اور پھر بمشکل جاتا تھا۔ بچوں کے اصرار پر یا بیوی کے جھگڑنے پر چلا جاتا تھا۔ ابھی تک میری یہی حالت ہے۔ زیادہ ہجوم اور شور مجھے کاٹنے کو دوڑتا ہے۔ کوئی جنگل ہو یا کسی جھیل کا کنارہ۔ وہاں میں پورا دن بخوشی گزار سکتا ہوں۔ کیا خریدنا ہے اور کیا پہننا ہے۔ اس کا مجھے کوئی تجربہ نہیں اور تو اور یہ کہ بیوی نے آج کون سا لباس پہنا ہے۔ اس کی بھی میں نے کبھی خبر نہیں رکھی۔ اس بات پر کئی بار جھگڑا بھی ہوا مگر میرا اپنا دھیان ان چیزوں پر نہیں جاتا۔ میں آسمان کے رنگ دیکھ سکتا ہوں مگر کسی کا لباس تو کبھی بھی نہیں۔ کسی کا کتنا بڑا گھر ہے اور گھر میں کیا کیا چیز موجود ہے اس سے مجھے کوئی سروکار نہیں۔ مجھے دلچسپی کسی گھر سے اتنی ہی ہوسکتی ہے کہ کھڑکی سے باہر کا منظر کیا ہے۔

ہم تینوں اس مال میں پہنچے تو میں خوب چہک رہا تھا کیونکہ اب میں صاحب حیثیت ہوگیا تھا۔ میری نوکری دو دن بعد شروع ہو رہی تھی۔ مگر مجھے آنے والے وقت کا پتا نہ تھا کہ وقت کی مٹھی میں کیا۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو مستقبل سے بے خبر رکھ کر احسانِ عظیم کیا ہے ورنہ تو انسان سوچ سوچ کر فکر کے ہاتھوں وقت سے پہلے مر جاتا۔ مجھے بھی اگر اس نوکری کے بعد میرا کیا حشر ہونے والا ہے یہ پتا لگ جاتا تو میں اتنا خوش کبھی نہ ہوتا۔ خوشی میں چہلیں کرتا میں اس دکان میں داخل ہوا اس دکان کا نام Payless Shoes تھا۔ یہ نارتھ امریکا میں ایک بڑی چین ہے۔ یہاں ارزاں قیمت پر اچھے جوتے مل جاتے ہیں۔ یہیں سے مجھے سیفٹی شوز مل گئے۔ یہ بالکل فوجیوں کے جوتوں کی مانند بھاری بھرکم تھے۔ مفتی نے پتے کی بات کی کہ چند دنوں میں برف پڑنے والی ہے۔ برف باری میں مضبوط جوتے چاہیے ہوتے ہیں کیونکہ پھسلن پر توازن یہی جوتے قائم رکھ سکتے ہیں۔ وہ بتا رہا تھا کہ برف باری کے بعد درجہ حرارت جب گرتا ہے تو زمین پر پڑی برف سخت ہو جاتی ہے اور اگر کوئی پھسل کر اپنے آپ کو زخمی کر بیٹھا تو کام کرنے سے رہ جاتا ہے اور جس کا نتیجہ فاقے ہوتے ہیں۔ خدانخواستہ معذور شخص گھر والوں پر بھی بوجھ ہوتا ہے اور کسمپرسی کی زندگی گزرتی ہے۔ مفتی نے ایسی بھیانک تصویر کشی کی کہ شہباز نے بھی اپنے لیے خرید لیے۔

مفتی کی بات سو فیصد صحیح تھی۔ اگر کسی اسٹور کا فرش ذرا سا بھی گیلا ہو تو وہاں زمین پر تختیاں لگا دی جاتی ہیں کہ فرش گیلا ہے، آرام سے چلیں۔ میں نے یہ دیکھ کر کسی سے کہا کہ کتنی عظیم قوم ہے جو اپنے گاہکوں کا اتنا زیادہ خیال کرتی ہے۔ سننے والا میری بات پر ہنس پڑا تھا۔ کہنے لگا کہ اگر کوئی کسی اسٹور میں پھسلن کی وجہ سے گر پڑے تو گرنے والے کی چاندنی ہو جاتی ہے۔

''وہ کیسے۔'' میں نے پوچھا تو بتانے والا بولا۔

''گرنے والا فوراً مقدمہ دائر کر دیتا ہے اور وہ کمر کے درد کا بہانہ بنا کر وہیں لیٹ جاتا ہے۔ ایمبولینس لے جاتی ہے اور کمر درد کی تشخیص بھی کوئی نہیں ہے۔ اسٹور کی انشورنس کمپنی بھاری معاوضہ بھی دیتی ہے اور اگر گرنے والے کا تمام عمر کام کرنے کا ارادہ نہ ہو تو باقی کی ساری زندگی حکومت اس کو گزارہ الاؤنس دیتی رہتی ہے مگر اس اسٹور کی انشورنس کا پریمیئم بہت بڑھ جاتا ہے۔''

میں ایک بار امریکا میں ہائی وے پر گاڑی میں جاب پر جا رہا تھا۔ ٹریفک مکمل جام تھا۔ میری گاڑی بھی پھنسی تھی اور مجھے جاب پر صبح آٹھ بجے پہنچنا تھا۔ اتنے میں ایک اور گاڑی نے میری کار کو پیچھے سے ٹکر ماری اور ڈگی اندر تک دھنس گئی۔ مجھے ایک زوردار جھٹکا سا لگا۔ میں نے گاڑی سائیڈ پر کی اور پچھلی گاڑی بھی رک گئی۔ میری گردن میں ہلکا سا جھٹکا لگا تھا۔ پھر بھی میں نے پولیس کو کال کر دی۔ اسی دوران میں نے اپنے سپروائزر کو فون کیا اور اپنے ایکسیڈنٹ کی اطلاع دی تو وہ کہنے لگا کہ پولیس کی کارروائی کے بعد اسپتال میں چیک اپ کروا لینا تاکہ کوئی چوٹ نہ لگی ہو۔ میں کہتا رہا کہ نہیں میں بالکل ٹھیک ہوں مگر وہ اصرار کرتا رہا اور کہنے لگا کہ جاب پر آج آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کا لہجہ کچھ ایسا تھا جیسے میں نوکری پر پہنچا تو وہ مجھے برخواست کر دے۔ اس لیے میں ڈر گیا۔

پولیس فوراً ہی آگئی تھی۔ ان میں ایک نوعمر سا کھلنڈرا جوان بھی تھا۔ اس نے کارروائی کے دوران قریب آکر آنکھ مار کر کہا۔ ''مبارک ہو۔''

مجھے غصہ بھی آیا اور حیرت بھی ہوئی کہ یہ میری گاڑی کا ستیاناس ہوگیا ہے اور یہ مذاق اڑا رہا ہے۔

پولیس مجھے زبردستی اسپتال بھیجنے پر مصر تھی۔

پولیس کی کارروائی کے بعد میں جیسے اسپتال کی ایمرجنسی پہنچا تو ایسا لگا جیسے میں ایک لمحے میں وی آئی پی پرسن بن گیا ہوں۔ انہوں نے مجھے ہاتھوں ہاتھ لے کر گردن پر ایک

خول چڑھا دیا کیونکہ میں نے کہا تھا کہ گردن میں جھٹکا لگا ہے۔
وہ کئی گھنٹے ایکس رے، MRI، سی ٹی اسکین اور نہ جانے کیا کیا کرتے رہے۔ پھر مجھے اپنے فیملی ڈاکٹر کے پاس بھیج دیا۔ اسپتال والوں نے بات بڑھا دی تھی۔ مجھے کوئی اندازہ نہ ہو رہا تھا کہ بات کا بتنگڑ کیوں بنا رہے ہیں۔ میں فیملی ڈاکٹر کے پاس گیا تو اس نے بھی کئی مشینوں سے مجھے پرکھا اور درد کی میڈیسن دینے کے بعد دو ہفتے کا آرام لکھ دیا۔ میں نے اپنے سپروائزر کو مطلع کر دیا۔ ان دو ہفتوں میں مجھے پوری تنخواہ بھی ملنی تھی۔ میں بھی جاب سے تھکا ہوا تھا اور گھر میں آرام سے بیٹھ گیا۔

کہانی یہاں ختم نہ ہوئی تھی۔ دوسرے دن کسی وکیل کے دفتر سے فون آ گیا۔ کہنے لگے کہ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ آپ کا ایکسیڈنٹ ہوا ہے اور ہم آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ ابھی وکیل سے جان چھڑانے کے لیے آنے کا وعدہ کر کے ریسیور کریڈل پر رکھا ہی تھا کہ پولیس والوں کا فون آیا کہ آپ کے ایکسیڈنٹ کی رپورٹ تیار ہے اور آپ آ کر لے جائیں۔ میں پریشان ہونے لگا تھا کہ سب کچھ کس چکر میں ہو رہا ہے۔ پولیس والوں نے یہ بھی بتایا کہ ہم نے اس حادثے کی رپورٹ اس گاڑی والے کی انشورنس کمپنی کو بھی بھیج دی ہے جس نے تمہیں ٹکر ماری تھی۔

میں اب باقاعدہ سوچنے لگا تھا کہ کہیں میں نے پولیس کو حادثے کی خبر دے کر کہیں غلطی تو نہیں کر دی ہے۔ میں بھی کیا کرتا کیونکہ میری گاڑی پیچھے کی جانب سے پچک گئی تھی۔

دوسرے دن خوب آرام کرنے کے بعد میں پہلے پولیس اسٹیشن پہنچا۔ ریسپشن پر ہی مجھے رپورٹ کی کاپی دے دی گئی اور ایک پولیس افسر نے اپنا کارڈ دیا کہ اگر میری ضرورت پڑے تو کسی بھی وقت میں اسے فون کر سکتا ہوں۔ میں وہ رپورٹ لے کر اس لا فرم کے دفتر آیا جس نے کل فون کر کے مجھے بلوایا تھا۔ ایک بلند و بالا عمارت کی سولہویں منزل پر آدھا فلور اسی لا فرم کا تھا۔ لگتا تھا کہ پورا اسٹاف میرے ہی انتظار میں تھا۔ میں جیسے ہی پہنچا تو مجھے بہت سے لوگوں نے جیسے پکڑ لیا ہو۔ زیادہ تر لڑکیاں تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا وہ سب واری صدقے جانے پر کمر بستہ ہیں۔ مجھے نہایت عزت سے بٹھایا گیا۔ کافی کا پوچھا گیا تو میں نے انکار کر دیا اور پھر ایک بہت لمبے چوڑے کمرے میں بٹھا دیا گیا جہاں قیمتی فرنیچر رکھا تھا۔ کھڑکیوں سے باہر کی بلند عمارتیں نظر آ رہی تھیں اور میں بوکھلایا ہوا بیٹھا تھا۔ پھر تین یا چار وکیل میرے آس پاس آ بیٹھے۔ پہلے حادثے پر افسوس کیا اور میری طبیعت کا پوچھا اور کہا کہ چوٹ کی نوعیت کیا ہے؟ میں تو اسی دوران اپنی کسی بھی چوٹ کو بھول چکا تھا جلدی سے بولا۔ ”کون سی چوٹ؟“

وہ حیران ہو کر ایک دوسرے کو تکنے لگے۔ پھر مجھے یاد دلایا کہ کل جو حادثہ ہوا تھا اور آپ کو اس میں گردن اور ریڑھ کی ہڈی پر چوٹ آئی تھی۔ میں نے کہا۔ ”نہیں ریڑھ کی ہڈی بھی ٹھیک ہے اور گردن میں ذرا سا درد ہے جو ایک دو دن میں ٹھیک ہو جائے گا۔“

وہ بہت دیر اس حادثے پر بات کرتے رہے اور مجھے سمجھاتے رہے کہ واقعی تمہیں شدید چوٹیں آئی ہیں۔ میں مسلسل کہتا رہا کہ مجھے کسی وکیل کی ضرورت نہیں کہ میں کسی پر کیس کیوں کروں اور نہ میرے پاس اتنے پیسے ہیں کہ وکیلوں کی مہنگی فیس ادا کروں۔

یہ سن کر سب مل کر ہنسے اور بولے۔ ”ہم تو کوئی فیس بھی نہیں لیں گے بلکہ پیسے تو آپ کو ملیں گے اور ہمیں اس میں سے کچھ اپنا حصہ چاہیے ہوگا۔“

ایک گھنٹے کی گفتگو کے بعد یہ عقدہ کھلا کہ وہ مجھے تین لاکھ ڈالر دلوا سکتے ہیں مگر مجھے ڈاکٹر کو یہ بتانا ہوگا کہ نہ میری گردن مڑ سکتی ہے اور کمر کے درد کی وجہ سے میں اب کام بھی نہیں کر سکتا۔

تین لاکھ ڈالر ایک خطیر رقم تھی۔ بہت سے کام نمٹ سکتے تھے۔ اس رقم کو پاکستانی کرنسی میں ڈائیورٹ کرتا تو سوچ لیں کتنی بنتی۔

سارے وکیل مجھے گھیرے بیٹھے تھے اور وہ مسلسل مجھے سمجھا رہے تھے کہ جب تک کیس چلے گا، ایک یا دو سال، اتنے عرصے میں مجھے انشورنس کمپنی پوری تنخواہ بھی دے گی اور کیس کے اختتام پر اکٹھی رقم بھی ہرجانے کے طور پر ملے گی۔ ان کو اس کا تیس فیصد چاہیے تھا اور وہ بھی تب جب وہ رقم مجھے مل جاتی۔

اب مجھے یہ سب کہانی سمجھ میں آ گئی۔ اس پر مجھے تمام عمر سوشل سیکورٹی سے وظیفہ بھی مل سکتا تھا اور مجھے کوئی کام کرنے کی ضرورت بھی نہ تھی۔ میں مخمصے میں تھا۔ ضمیر روک رہا تھا اور وکلاء آگے کی جانب دھکیل رہے تھے۔ وہ سب اُمید بھری نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے کہ میں انکار میں سر ہلانے ہی والا تھا کہ وکلاء میں ان کا جو سربراہ تھا اس نے پینترا بدلا، اس کے چہرے کی رنگت اور لب و لہجہ بھی بدل گیا تھا۔

(جاری ہے)

سراب

راوی : شہباز ملک

قسط: 112

وہ پیدائشی مہم جو تھا۔ بلند وبالا پہاڑ، سنگلاخ چٹانیں، برف پوش چوٹیاں اور نگاہ کی حدوں سے آگے کی بلندیاں اسے پیاری تھیں۔ اسے ان میں ایک کشش اور ایک للکارسی ابھرتی محسوس ہوتی که آؤ ہمیں دیکھو، مسخر کرو اور ہمارے سحر میں مسحور ہو کر اپنا آپ مٹا ڈالو۔ اسے یہ سب حقیقت لگتا مگر کیا واقعی یہ حقیقت تھا یا محض سراب...... ایسا سراب جو آنکھوں کے راستے ذہن ودل کو بھٹکاتا ہے، جذبوں کو مہمیز دیتا ہے مگر اسودگی اور اطمینان چھین لیتا ہے۔ سیرابی لمحوں کے فاصلے پر دکھائی دیتی ہے مگر وہ لمحہ حقیقت میں کبھی نہیں آتا۔ اس کی زندگی بھی سرابوں کے ایسے دائروں میں گزری اور گزرتی رہی۔ وقت کے گرداب میں ڈوبتے ہوئے نوجوان کی سنسنی خیز اور ولولہ انگیز داستان حیات۔

بلند حوصلوں اور بے مثال ولولوں سے گندھی ایک تہلکہ خیز کہانی

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

میری محبت سویرا، میرے بھائی کا مقدر بنادی گئی تو میں ہمیشہ کے لیے حویلی سے نکل آیا۔ اسی دوران میں نادر علی سے ٹکراؤ ہوا، اور یہ ٹکراؤ ذاتی انا میں بدل گیا۔ ایک طرف مرشد علی، فتح خان اور ڈیوڈ شا جیسے دشمن تھے تو دوسری طرف سفیر، ندیم اور وسیم جیسے جاں نثار دوست۔ پھر ہنگاموں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوگیا جس کی کڑیاں سرحد پار تک چلی گئیں۔ فتح خان نے مجھے مجبور کردیا کہ مجھے ڈیوڈ شا کے ہیرے تلاش کرنے ہوں گے، میں ہیروں کی تلاش میں نکل پڑا۔ میں شہلا کے گھر کی تلاشی لینے پہنچا تو باہر سے گیس بم پھینک کر مجھے بے ہوش کردیا گیا۔ ہوش آنے کے بعد میں نے خود کو انڈین آرمی کی تحویل میں پایا مگر میں ان کو ان کی اوقات بتا کر نکل بھاگا۔ جیپ تک پہنچا ہی تھا کہ فتح خان نے گھیرلیا۔ میں نے کرنل زروسکی کو زخمی کرکے بساط اپنے حق میں کرلی۔ میں دوستوں کے درمیان آکر ٹی وی دیکھ رہا تھا کہ ایک خبر نظر آئی۔ مرشد نے بھائی کو راستے سے ہٹانے کی کوشش کی تھی۔ ہم مانسہرہ پہنچے۔ وہاں وسیم کے ایک دوست کے گھر میں ٹھہرے۔ اس دوست کے بیٹے نے ایک خانہ بدوش لڑکی کو پناہ دی تھی وہ لڑکی مہرو تھی۔ وہ ہمیں بریف کیس تک لے گئی مگر وہاں بریف کیس نہ تھا۔ کرنل زروسکی بریف کیس لے بھاگا تھا۔ ہم اس کا پیچھا کرتے ہوئے چلے تو دیکھا کہ کچھ لوگ ایک گاڑی پر فائرنگ کررہے ہیں۔ ہم نے حملہ آوروں کو بھگا دیا۔ اس گاڑی سے کرنل زروسکی ملا۔ وہ زخمی تھا۔ ہم نے بریف کیس لے کر اسے اسپتال پہنچانے کا انتظام کردیا اور بریف کیس کو ایک گڑھے میں چھپادیا۔ واپس آیا تو فتح خان نے ہم پر قابو پالیا۔ پستول کے زور پر وہ مجھے اس گڑھے تک لے گیا مگر میں نے جب گڑھے میں ہاتھ ڈالا تو وہاں بریف کیس نہیں تھا۔ اتنے میں میری امداد کو انٹیلی جینس والے پہنچ گئے۔ انہوں نے فتح خان پر فائرنگ کردی اور میں نے ان کے ساتھ جاکر بریف کیس حاصل کرلیا۔ وہ بریف کیس لے کر چلے گئے۔ ہم واپس عبداللہ کی کوٹھی پر آگئے۔ سفیر کو دبئی بھیجنا تھا اسے ائرپورٹ سے سی آف کرکے آرہے تھے کہ راستے میں ایک چھوٹا سا ایکسیڈنٹ ہوگیا۔ وہ گاڑی ممتاز حسن نامی سیاست داں کی بیٹی بنٹی کی تھی وہ زبردستی ہمیں اپنی کوٹھی میں لے آئی۔ وہاں جو شخص آیا اسے دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ وہ میرے بدترین دشمنوں میں سے ایک تھا۔ وہ راج کنور تھا۔ وہ پاکستان میں اس گھر تک کس طرح آیا اس سے میں بہت کچھ سمجھ گیا۔ اس نے مجبور کیا کہ میں ہر روز نصف لیٹر خون اسے دوں۔ بحالتِ مجبوری میں راضی ہوگیا لیکن ایک روز ان کی چالاکی کو پکڑلیا کہ وہ زیادہ خون نکال رہے تھے۔ میں نے ڈاکٹر پر حملہ کیا تو نرس مجھ سے چمٹ گئی پھر میرے سر پر وار ہوا اور میں بے ہوش ہوگیا۔ ہوش آیا تو میں انڈیا میں تھا۔ بانو بھی اغوا ہوکر پہنچ چکی تھی۔ وہ لوگ ہمیں گاڑی میں بٹھا کر.... آگے بڑھے تھے کہ ہماری گاڑی کو دو طرف سے گھیرلیا گیا۔ وہ فتح خان تھا، اس نے ڈیوڈ شا کے اشارے پر مجھے گھیرا تھا۔ میں اس کے ساتھ ڈیوڈ شا کے پاس پہنچا۔ ڈیوڈ نے پراسرار وادی میں چلنے کی بات کی۔ اس نے ہر کام میں مدد دینے کا وعدہ کیا۔ سعدیہ کو کنور پیلس سے آزاد کرانے کی بات بھی ہوئی اور اس نے بھرپور مدد دینے کا وعدہ کیا۔ ہماری خدمت کے لیے پوجا نامی نوکرانی کو مقرر کیا گیا تھا۔ وہ کمرے میں آئی تھی کہ اس کے مائیکروفون سے منشی دل جی کی آواز سنائی دی "شاجی، شہباز ملک کسی عورت کو چھڑانے آیا ہے۔" ڈیوڈ شا کا جواب سن نہیں پایا کیونکہ پوجا نے مائک بند کردیا تھا۔ اس دن کے بعد سے پوجا کی ڈیوٹی کہیں اور لگادی گئی۔ میں ایک جھاڑی کی آڑ میں بیٹھ کر موبائل پر باتیں کررہا تھا کہ کسی نے پیچھے سے وار کرکے بے ہوش کردیا اور محل میں پہنچادیا۔ مجھے پتا تھا ہر جگہ ڈیکٹا فون لگا ہوا ہے۔ تبھی فائرنگ شروع ہوئی اور میں نے چیخ کر کہا "کنور ہوشیار" سادی کو لے کر چیمبر ...... "مگر جملہ ادھورا رہ گیا اور سادی کی چیخ سنائی دی پھر منشی دل نظر آیا۔ اس کے آدمیوں نے بڑے کنور کے وفاداروں کو ختم کرنا شروع کردیا تھا۔ میں اس سے نمٹ رہا تھا کہ فتح خان نے آکر مجھے اور سادی کو نشانے پر لے لیا۔ تبھی راج کنور آگیا۔ اس نے گولی چلائی جو بیتو کی گردن میں لگی۔ میں نے غصے میں پورا پستول راج کنور پر خالی کردیا، بیتو مرچکا تھا۔ اس کی لاش کو ہم نے چتا کے حوالے کیا اور ایک ہیلی کاپٹر کے ذریعہ سرحد تک پہنچے۔ وہاں سے اپنے شہر۔ وہاں پہنچا ہی تھا کہ ڈیوڈ کی کال آگئی اس نے تصفیہ کرانے کی بات کی اور کال کٹ گئی۔ ہم بنگلے میں بیٹھے باتیں کررہے تھے کہ گیس پھینک کر ہمیں بے ہوش کردیا گیا اور جب ہوش آیا تو میں قید میں تھا۔ شا کی قید میں شا نے مجھے کہا کہ میں فاضلی کی مدد کروں کیونکہ میرے ہاتھوں میں ایک ایسا کڑا پہنا دیا گیا تھا جو فاضلی سے 500 میٹر دور جاتے ہی زہر انجیکٹ کر دیتا، میں حکم ماننے پر تیار ہوگیا فاضلی نے مرشد کی جعلی خانقاہ پر حملے کا پروگرام بنایا۔ ہم نے فاضلی کے آدمیوں کے ساتھ مل کر حملہ کیا۔ حملہ کامیاب رہا فاضلی مارا گیا اور مجھے سانپ نے ڈس لیا مگر سانپ کا زہر مجھ پر کارگر نہ ہوا۔ فاضلی نے جو کڑا مجھے پہنایا تھا اس کا الٹا اثر ہوا اور وہ خود کڑے میں چھپے سائینائیڈ زہر سے مارا گیا۔ میں مرشد کی خانقاہ سے نکل کر دوستوں کے پاس پہنچا پھر راجا صاحب سے ملنے جیپ کے ذریعے ان کے علاقے کی طرف چل پڑا۔ راستے میں وہ علاقہ بھی تھا جہاں برٹ شا نے ہیرے چھپائے تھے۔ میں اسے تلاش کرنے کے لیے پیڑ پر چڑھا تھا کہ فائر ہوا اور میں پھسل کر نیچے گرا ہی تھا کہ فتح خان کی آواز آئی کہ تم ٹھیک تو ہو پھر وہ مجھے قید کرکے لے چلا۔ راستے میں اس کے ساتھیوں نے غداری کی مگر میری مدد سے فتح خان فتح یاب ہوگیا۔ مگر آگے جاکر میں نے فتح خان کو گولی ماردی اور واپس وہاں آیا جہاں گاڑی کرکے گیا تھا۔ وہ لاش پڑی تھی۔ ابھی میں اسے دیکھ ہی رہا تھا کہ پولیس والے آگئے اور مجھے تھانے لے آئے۔ وہاں سے رشوت دے کر چھوٹا پھر راجا صاحب کے محل پہنچا مگر وہاں کے حالات بدل چکے تھے۔ میں واپس ہوگیا کہ راستے میں ایک عورت اور دو نوجوانوں نے مجھے گھیرلیا اور میرے سر پر کسی چیز سے وار ہوا۔ میں بے ہوش ہوکر گرپڑا۔ ہوش آیا تو میں شیر خان کی قید میں تھا۔ وہ لوگ مجھے افغانستان کے راستے بھارت لے آئے تب پتا چلا کہ وہ لڑکی ڈیوڈ کی کارندہ ہے لیکن اس نے ڈیوڈ شاہ کے گلے لگ کر کہا "پاپا" تو میں حیران رہ گیا۔ میں نے خواب میں بھی ایسا نہیں سوچا تھا ڈیوڈ نے اوشا کو بھی وہیں قید کررکھا تھا۔ وہیں میری ملاقات ایک نیپالی سے ہوئی جو انہیں کا کارندہ تھا اس نے مجھے ایک موبائل فون دیا جس سے میں نے ایمن سے باتیں کیں مگر اس کا راز کھل گیا اور شا نے اسے قتل کردیا۔ دو دن کے بعد تاریک وادی کا سفر شروع ہوگیا۔ ہم ... چلے جارہے تھے کہ باسو کا پیر پھسلا اور وہ ایک کھڈ میں گرنے لگا۔ ہم سب برف پوش پہاڑوں پر چڑھنے کے لیے ایک ہی رسی میں خود کو باندھے ہوئے تھے اس لیے میرا توازن بگڑا اور میں آگے کی سمت گرا تھا کہ تریفی نے سنبھال لیا۔ کرنل نے باسو کو رسی پھینک کر بچالیا۔ ہمارا سفر جاری رہا۔ ایک جگہ برفانی آدمیوں کے ایک غول نے گھیرلیا۔ ان سے بچ کر نکلا تو راستہ بھٹک گیا اور ایک سرنگ میں پہنچ گیا جو برف والے آدمی کی تھی۔ برف والے سے ملاقات ہوئی برف والے نے مجھے کنپٹی دبا

کر بے ہوش کر دیا جب ہوش آیا تو میرے سر پر تیر کمان سے لیس کچھ سپاہی کھڑے تھے۔ وہ مجھے گرفتار کر کے وادی کے حکمران ریناٹ کی قید میں پہنچا دیا، وہاں ایک ہمدرد گیرٹ نے مجھے فرار میں مدد دی اور میں برف والے کے کہنے کے مطابق سامیرا کی فوج کی مدد کرنے کے لیے اس کے علاقے میں پہنچ گیا۔ میں نے فوج کو ازسر نو تیاری کرانا شروع کر دی تھی کہ ریناٹ کے قلعہ آرگون کی طرف سے قرنا پھونکے جانے کی آواز بلند ہوئی سامیرا کا چہرہ زرد ہو گیا اور اس نے زیرلب کہا ''اعلانِ جنگ'' میں نے فوراً ہی سامیرا کی فوج کو منظم کرنا شروع کر دیا۔ فوج کو رسد کی اشد ضرورت رہتی ہے۔ رسد کے لیے مناسب انتظام کیا۔ ایک روز معائنہ کے بعد واپس لوٹ رہا تھا کہ ایک بچے کے منہ سے برف والے کا پیغام ملا کہ رات سے پہلے ٹھکانے پر لوٹ آیا کرو۔ رات باہر نہ گزارنا۔ میں روبیر کے ساتھ علاقے کو دیکھنے کے لیے نکلا تو پہاڑیوں کے درمیان مجھے کچھ ایسے گول پتھر نظر آئے جنھیں اسلحہ کے طور پر استعمال کر سکتا تھا۔ ابھی میں اسے دیکھ رہا تھا کہ خونخوار اسمار نے گھیر لیا اور میں روبیر کے ساتھ ایک پہاڑی غار میں گھس گیا۔ پھر اسمار اور بندر نما جانور کے علاوہ ہارن سے بھی مڈ بھیڑ رہی مگر اگلی صبح ہم بخیریت واپس سامیرا کے پاس آ گئے۔ سامیرا نے کہا کہ یہ بہت برا ہوا ہے۔ تبھی سومرو چند سپاہیوں کے ساتھ میرے کمرے میں داخل ہوا اور مجھے جکڑ لیا۔ مجھے ملزم قرار دے کر آبادی سے نکال دیا گیا۔ سامیرا کو بھی نہیں تھی کہ یہ میرے خلاف سازش ہے۔ اس لیے اس نے خفیہ طریقہ زادِ راہ کے علاوہ ایک رہبر کو بھی ساتھ کر دیا۔ پھر مجھے روبیر مل گئی جسے میری طرح علاقہ بدر کیا گیا تھا۔ ہم ایک ٹیلے پر آ گئے۔ سامیرا نے وینک کے ساتھ کچھ سپاہیوں کو بھی بھیجا تھا۔ ایک دن آرگون کے سپاہیوں نے حملہ کیا اور روبیر کو اٹھالے گئے۔ اس کی تلاش میں گئے تھے کہ ... ساشا ملی جو گیرٹ کی بیٹی تھی۔ گیرٹ کو سزائے موت دی گئی تھی اور ساشا اس کی موت کا ذمے دار مجھے ٹھہرا رہی تھی۔ پھر بھی اسے ہم نے ساتھ رکھ لیا۔ ہم سب مل کر آرگون پر حملہ کرنے کے لیے چھاپہ مار جنگ کی تیاری کر رہے تھے کہ قرنوں کی آواز گونج اٹھی۔ آرگون والوں نے اعلان جنگ کر دیا تھا۔ گو کہ میں سامیرا کے قلعے میں جا نہیں سکتا تھا مگر برف والے کی منشا یہی تھی کہ میں سامیرا کی مدد کروں، میں نے اپنے ساتھیوں کو تیاری کا حکم دے دیا اور چھاپہ مار جنگ پر تیار ہو گیا۔ آرگون کی فوج نے آ کر سامیرا کے قلعوں کا محاصرہ کر لیا تھا۔ ہم نے فوج کے عقب میں کھڑی فصلوں کو آگ لگا دی جس کی وجہ سے فوج کو کافی نقصان پہنچا۔ اب میں نے فیصلہ کیا کہ آرگون میں داخل ہو جاؤں اور میں اپنے ساتھیوں سمیت شہر میں داخل ہو گیا۔ ایک جگہ دیکھا کہ ایک مرد پر سپاہی تشدد کر رہے ہیں۔ اس مرد، عورت اور بچے کو بچا کر اس کے گھر پہنچایا تھا کہ سپاہیوں کے دوسرے دستہ نے مکان کو گھیر کر گھر والوں پر تشدد شروع کر دیا۔ حملے کا سن کر میں نے لائحہ عمل تبدیل کر دیا۔ ایزارٹ نے نیا دستہ تیار کرا دیا پھر ہم خفیہ راستے سے اندر داخل ہوئے اور ریناٹ کے محل پر قابض ہو گئے۔ اندر پہنچ کر معلوم ہوا کہ ریناٹ اپنے آدمیوں کے ساتھ تہ خانے میں جا چھپا ہے اور ڈیوڈ شا باسو کے ہمراہ معبد میں چلا گیا ہے۔ اس کے تعاقب میں ہم نکلے تو ایک جگہ فصیل ٹوٹی ہوئی تھی جس سے ہارن اندر آ گیا تھا۔ ہم ایک درخت پر چڑھے ہوئے تھے کہ دیکھا کرنل نے ڈسک بچا کر جلتی بجھتی روشنی پیدا کر دی۔ گویا مصنوعی رن وے بنا دیا تھا۔ تبھی ایمار کے ہاتھ سے کوئی چیز چھوٹ کر گری اس کی آواز سے ہارن بڑھ کے اور درخت یوں ہلا جیسے کوئی چیز اس سے ٹکرائی ہو ایمار پکڑ مضبوط نہ رکھ سکا اور نیچے گرتا چلا گیا۔ مگر اس کی قسمت اچھی تھی کہ نچلی شاخوں میں اٹک گیا پھر ہم نے حملہ کر کے ہارن کو بھگا دیا۔ وہاں سے ہم واپس اسی عمارت میں آئے روبیر اندر کے حالات پتا کرنے چلی گئی ہم ابھی معبد پر نظریں جمائے کھڑے تھے کہ دیکھا کہ ایک ہاتھ گاڑی میں کسی عورت کی لاش کو باہر لایا جا رہا تھا۔ حالات سنگین ہو گئے تھے کیونکہ ایرٹ روبیر کی محبت میں باہر نکل گیا تھا۔ اسی وقت میدان میں کرنل اور باسو نکل آئے۔ وہ ہماری طرف آ رہے تھے انہیں دیکھ کر میں بھی پریشان ہوا تھا مگر حوصلے سے کام لیا اور میں ایک باتھ روم میں چھپ گیا۔ کرنل پتا کرنے آیا تھا کہ قیدی عورت باہر کیسے نکلی۔ پہرے دار کو ڈانٹ کر وہ لوگ چلے گئے۔ میں روبیر کی تلاش میں معبد میں گھس گیا اور روبیر کو تلاش بھی کر لیا۔ اس دوران ڈیوڈ شا کی ایک گن بھی ہاتھ لگ گئی۔ میں گن کے ساتھ ایک کمرے میں مقید ہو گیا تھا کہ ڈیوڈ شا نے ایک گیس بم اندر پھینکا۔ میں چکرا کر گر پڑا۔ باسو مجھے کھینچ کر باہر لے آیا۔ میں ڈیوڈ شا سے بحث کر رہا تھا کہ شامین اندر آ گیا۔ اس نے بتایا کہ کچھ اور لوگ آ گئے ہیں۔ ان کے پاس بھی آتشی اسلحہ ہے اور وہ ہمارے آدمیوں کو مار رہے ہیں۔ ڈیوڈ شا باہر نکلا تھا کہ شامین نے مجھ پر حملہ کر دیا۔ میں نے چاقو سے اسے ختم کر دیا۔ ڈیوڈ شا لوٹا تو شامین مر چکا تھا۔ ڈیوڈ نے باسو کو حکم دیا کہ مجھے گولی مار کر باہر آ جائے اسی وقت سلوپ کی طرف سے کسی نے باسو پر فائر کیا۔ باسو اسی کمرے کی طرف دوڑ گیا۔ میں سلوپ پر اترا، سامنے والی عمارت سے فائرنگ ہو رہی تھی۔ بعد میں پتا چلا کہ اس عمارت میں سفیر تھا۔ سفیر نے بتایا کہ ہماری پوری ٹیم وادی میں آ چکی ہے، ہم سب کو راجا عمر دراز لے کر آئے ہیں اور سامیرا جلد حملہ کرنے والی ہے۔ میں نے اسے واپس سامیرا کے پاس بھیج دیا اور ریناٹ کو تہ خانے سے جبراً نکالنے کے لیے محل پہنچا۔ میں نے آگ لگانے والے روغن کے ڈرم منگوا لیے تھے کہ تہ خانے میں گرا کر ان سب کو خوفزدہ کروں گا لیکن عین وقت پر زیلی نمودار ہو گئی۔ اس نے ہمیں گن کے نشانے پر لے لیا تھا۔ اس وقت سفیر امداد غیبی بن کر آ گیا۔ اس کے ساتھی نے زیلی کو نشانہ بنا دیا۔ وہاں سے ہم نکلے اور سامیرا کی مدد کرنے میدان جنگ میں پہنچے۔ جنگ شروع ہوئی اور میں نے ساتھیوں کے ساتھ مل کر ریناٹ کو شکست دے دی۔ اور برف والے سے استدعا کی کہ ہمیں واپس ہماری دنیا میں بھیج دیا جائے۔ راجا عمر دراز اسی دنیا میں رہ گئے۔ ہم سب برف والے کے غار میں جا کر سو گئے۔ آنکھ کھلی تو بلتستان کے غار میں تھے۔ اس غار سے باہر نکل کر دیکھا۔ حدِ نظر تک برف ہی برف تھی۔ سفیر، عبداللہ اور وسیم کو غار میں چھوڑ کر میں راستہ تلاش کرنے باہر نکلا تو کچھ لوگوں نے قید کر لیا۔ قید کرنے والے ریاست خان کو کسی سے ملنا تھا۔ ہم نے پہچان لیا کہ وہ انڈین بندہ ہے۔ ریاست خان کو حقیقت کا پتا چلا کہ وہ نادانستگی میں انڈین کا ساتھ دے رہا ہے۔ وہ محبِ وطن تھا اس نے میرا ساتھ دیا اور اس بندے کی خوب دھنائی کی اور اسے انڈیا میں دھکیل دیا۔ پھر ہم سب پیدل کسی آبادی کی تلاش میں نکلے۔ ایک چھوٹی سی آبادی نظر آ گئی۔ وہ لوگ مہمان نواز تھے۔ انہوں نے ایک گاڑی جو نگر جا رہی تھی اس میں میرے ساتھیوں کو بھیج دیا کہ وہ جا کر نگر سے گاڑی لے آئیں۔ میں اسی آبادی میں تھا کہ امداد شاہ نامی بندے سے ملاقات ہوئی جو گاڑی لے کر آیا تھا۔ اس نے مجھے ساتھ لے لیا۔ ہم ریاست خان اور اس کے دستوں کے ساتھ چل پڑے۔ امداد شاہ نے دھوکے سے مجھے اور ریاست خان کو قید کر لیا اور تشدد کرنے لگا۔

(اب آگے پڑھیں) ....

"میں سب کچھ بتادوں گا۔ پہلے مجھے کھولو۔"

"یہ ہوئی نا بات۔" امداد شاہ نے مسکراتے ہوئے کہا "احمق خود کو عقلمند سمجھ کر اکڑ دکھاتا ہے جس کا نتیجہ ہمیشہ نقصان کا باعث بنتا ہے۔ تم نے عقل مند ہونے کا ثبوت دیا ہے ورنہ مار کھاتے رہتے اذیت سہتے رہتے اور پھر ایک وقت وہ آجاتا کہ تم بولنے پر مجبور ہو جاتے لیکن تب تک تم ٹوٹ پھوٹ کا بری طرح شکار ہو چکے ہوتے۔" پھر وہ اپنے ایک ساتھی کی طرف مڑ کر بولا۔ "اسے ہولی کراس سے اتارو۔"

میری حالت کو ہولی کراس لگا۔ صلیب سے تشبیہہ دینا کوئی عام بندہ نہیں ہوسکتا۔ اب مجھے سو فیصد یقین ہو چکا تھا کہ یہ بندہ وہ نہیں ہے جو نظر آرہا ہے۔ خاص الخاص بندہ ہے۔ ٹیکسی چلانے والا بندہ ہولی کراس نہیں بول سکتا۔ یہ تشبیہ ایسا ہی بندہ دے سکتا ہے جو پڑھے لکھے لوگوں یا غیر ملکیوں کے ساتھ تعلقات رکھتا ہو۔ یہ بات صحیح ہے کہ اس نرالے تشدد نے مجھے اذیت میں مبتلا کر دیا تھا لیکن ابھی مجھ میں اتنی جان ضرور تھی کہ میں اکیلے ان سب کا مقابلہ کر سکتا۔ اس نے جو کچھ میرے ساتھ روا رکھا تھا اس کا حساب کرنا بھی ضروری تھا۔

میں سوچ کے سمندر میں غلطاں تھا کہ امداد شاہ کی آواز نے خیالات کو چور چور کر دیا۔ وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا "ابے اتنی دیر جلدی کر۔ اسے کھول ورنہ یہ لولا لنگڑا ہو جائے گا۔"

اس کے ساتھی نے پہلے میرے دونوں پیروں کی رسی ڈھیلی کی پھر ہاتھوں کو آزاد کیا۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں بہت ہلکا ہو گیا ہوں لیکن اب تک ہاتھ پیروں پر رسی کی چبھن محسوس ہو رہی تھی۔ پیروں اور ہاتھوں میں اکڑن بھی باقی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ میں دماغی طور پر ابھی تک بندھن سے آزاد نہیں ہوا تھا۔ جلد پر رسی کا لمس باقی تھا۔ رگوں میں پوری طرح لہو کی روانی جاری ہو نہیں پائی تھی۔ میں نے اس لیے ہاتھ پیروں کو جھٹک کر خون کی روانی درست کی اور پھر کہا "ہاں اب پوچھو کیا پوچھنا چاہتے ہو؟"

"تم کون ہو۔ کس ایجنسی سے تعلق ہے؟" امداد شاہ نے پوچھا۔

"یقین کرو کہ میرا تعلق کسی ایجنسی سے نہیں ہے لیکن اتنا سمجھ چکا ہوں کہ تمہارا تعلق ضرور غیر ملکی ایجنسی سے ہے۔" یہ کہتے ہی میں نے اس کے ساتھی کو گریبان سے پکڑا اور اس پر اچھال دیا۔ یہ وار یکا یک ہوا تھا۔ شاید اسے بھی اُمید نہ ہو کہ میں جو اس کی مار کھا کھا کر ادھ مرا ہو چکا تھا اتنی جلدی پہل کر دوں گا۔ جنگ کی ابتدا ہو چکی ہے یہ سمجھنے سے پہلے ہی وہ الٹ کر گرا تھا کہ میں نے تیسرے ساتھی کو گردن سے پکڑا اور اسے بھی امداد شاہ پر اچھال دیا۔ تینوں ابھی اٹھنے کی کوشش کر ہی رہے تھے کہ میں نے ان پر چھلانگ لگا دی اور بوٹ سمیت امداد شاہ کے سینے پر کودا۔ وہ دوبارہ سے چت ہو گیا۔ میں نے اسی پر بس نہیں کیا۔ مشینی انداز میں ان دونوں ساتھیوں پر ٹھوکریں مارنے لگا۔ جس طرح سے پسٹن آگے پیچھے ہوتا ہے اسی طرح سے میری لات آگے پیچھے ہو رہی تھی۔ ہر چوٹ پر ان کی کراہ گونجتی۔ درمیان درمیان میں امداد شاہ کو بھی ایک دو ٹھوکر لگا دیتا تھا۔ اس وقت اگر کوئی مجھے دیکھتا تو یہی سمجھتا کہ میں پاگل ہو گیا ہوں۔ یہ صحیح بھی تھا۔ اس لیے کہ میں لاکھ برا صحیح لیکن جب وطن کی حرمت پر بات آتی ہے تو میں پاگل ہی تو ہوا اٹھتا ہوں۔ اگر میری ٹھوکروں سے وہ مر بھی جاتے تو مجھے افسوس نہ ہوتا اس لیے کہ غیر ملکی ایجنٹ سے زیادہ قابل نفرت مقامی ایجنٹ ہوتے ہیں۔ ان کو جینے کا کوئی حق نہیں ہے، اس لیے کہ وہ نمک حرام کہلاتے ہیں۔ غدار کہلاتے ہیں اور غداروں کو زندہ رکھنا وطن دشمنی ہے۔ کیونکہ وطن کا سودا کرنے والے سے زیادہ برا اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔

اسی بات نے میرے اندر بجلی سی بھر دی تھی اور میں مشینی انداز میں لات اور گھونسے کا استعمال کر رہا تھا۔ کچھ ہی دیر میں امداد شاہ کے تینوں ساتھی انٹا غفیل ہو گئے۔ ان کے ناک منہ سے خون جاری ہو چکا تھا۔ ان میں کون زندہ ہے کون مر گیا یہ دیکھنے کا وقت نہیں تھا۔ لیکن ایک بندہ تھا جو اتنی مار کھانے کے بعد بھی بے ہوش نہیں ہوا تھا۔ وہ تھا امداد شاہ۔ گو کہ وہ بھی زخمی تھا۔ اس کے منہ کا بھرتا بن چکا تھا لیکن اس میں بڑی جان تھی۔ اس نے کئی بار مدافعت کی تھی۔ کئی بار میری لات کو پکڑنے کی کوشش کی تھی لیکن ناکام رہا تھا۔ اگر وہ کامیاب ہو جاتا تو شاید اس وقت میں بھی انہی کی طرح پڑا ہوا ہوتا۔ میں نے اب پوری توجہ اس کی جانب مبذول کی۔

وہ دو آدمیوں کے نیچے تھا۔ یہ سب کچھ بس دس بارہ منٹ میں ہوا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوگا کہ جس کے ہاتھ پیر اتنی دیر تک جکڑے رہے ہوں وہ اس طرح حملہ کرے گا۔ اس نے اب تک صرف عام لوگوں کو دیکھا اور ان کا سامنا کیا ہوگا جو مرنا مارنا جانتے ہوں گے لیکن میری طرح اذیت سہہ کر کندن بن جانے والے سے وہ پہلی بار مل رہا ہوگا۔ اکرم چشتی سے زیادہ اذیت دینے والا کون ہو

گا۔ جب اس کی اذیت میرا کچھ بگاڑ نہ سکی تھی تو یہ کس زمرے میں آتا تھا۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اپنی جانب کھینچ لیا۔ وہ بڑی آسانی سے باہر آ گیا لیکن اگلے ہی پل مجھے احساس ہو گیا کہ میں نے اس کے بارے میں غلط اندازہ لگایا تھا۔ اس نے خود کو پھرتی سے سنبھالا تھا اور بام مچھلی کی طرح میرے ہاتھوں سے پھسل گیا تھا۔ وہ فرش پر پھسلتا ہوا دیوار تک چلا گیا تھا اور نہایت تیزی سے کھڑا ہوا تھا۔ اس کی چستی و چالاکی نے مجھے متاثر کیا تھا مگر یہ وقت ان باتوں پر غور کرنے کا نہیں تھا۔ اس نے کھڑے ہوتے ہی ہوا میں اچھال بھری تھی۔ تیر کی طرح ہوا میں تیرتا ہوا میری طرف آیا تھا مگر میں ہوشیار تھا۔ لمحے بھر میں فیصلہ کر لیا اور جیسے ہی اس نے آدھا فاصلہ طے کیا، میں نے اپنی جگہ چھوڑ دی۔ وہ اڑتا ہوا دوسری جانب کی دیوار سے ٹکرایا اور وہیں پر دھپ سے گرا۔ ابھی میں اس کی طرف بڑھتا کہ اس نے خود کو سنبھال لیا۔ وہ اسپرنگ کی طرح اچھلا تھا اگر میں نے خود کو درمیان میں روک نہ لیا ہوتا تو اس کے شکنجے میں آ جاتا۔ مجھے رکتا دیکھ وہ بھی رک گیا تھا۔ اس مظاہرے نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کہ اس نے اپنے جسم پر بہت محنت کی ہے۔ وہ اپنے جسم پر پوری طرح قابو کر سکتا تھا۔ میں جان چکا تھا کہ وہ جمناسٹک میں بھی دخل رکھتا ہے تبھی تو وہ اتنی آسانی سے جسم کو موڑ لیتا ہے۔ یقیناً وہ جوڈو کراٹے بھی جانتا ہو گا لیکن ابھی تک اس نے ایسا کوئی وار نہیں کیا تھا جس سے پتا چلتا کہ وہ کراٹے کا ماہر ہے۔ وہ فلائنگ کک پر کک چلا تو رہا تھا لیکن عام سے انداز میں۔ اس کے لڑنے کی تکنیک کو میں باریکی سے جانچ رہا تھا اسی لیے جیسے ہی اس نے فلائنگ کک چلائی میں نے سر کو ستر کے زاویے سے موڑا اور کچھ آگے سرک کر گھونسا چلا دیا، میرا نشانہ ایسی جگہ تھا کہ وہ پہلے ہی وار پر چوکڑیاں بھول گیا۔ دونوں ہاتھوں کو رانوں کے درمیان چوٹ کی جگہ پر رکھ کر دوہرا ہو گیا تھا۔ تکلیف اس کے چہرے سے ہویدا تھی۔ اس نے مجھے جس طرح ایذا پہنچائی تھی اس کے مقابلے میں ابھی میں نے کچھ بھی نہیں کیا تھا، صرف پہلا ہاتھ دکھایا تھا۔

عام طور سے یہ وار میں کسی دشمن پر نہیں کرتا کیونکہ اس کی اذیت کئی دن تک بے چین رکھتی ہے لیکن اس نے جس طرح مجھے ستایا تھا وہ اسی کا حقدار تھا۔ پھر اس میں ایک اور خرابی یہ تھی کہ وہ میرے ملک کے خلاف کام کر رہا تھا اور ایسے لوگ میری نظر میں زیادہ سزا کے مستحق ہیں اسی لیے میں متروک قرار دیے گئے ہتھکنڈے بھی آزما رہا تھا۔

وہ چوٹ پر ہاتھ رکھے کراہ رہا تھا کہ میں نے اس کے سر پر ایک اور ہاتھ مارا۔ یہ کھڑی ہتھیلی کا وار تھا۔ اس سے دماغ تک ہل گیا ہو گا۔ عام طور پر میں یہ وار کرتا نہیں ہوں کیونکہ دماغی چوٹ فال کا سبب بن جاتی ہے لیکن میں کیا کرتا۔ وہ مجسم میرے سامنے تھا لیکن پوری طرح نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کی جگہ مجھے پاگل کتا نظر آ رہا تھا۔ کتے کا کام ہے حفاظت کرنا لیکن جب وہ پاگل ہو جاتا ہے تو وہ مالک کو ہی کاٹنے دوڑتا ہے۔ وہ بھی ایسا ہی کتا بن گیا تھا۔ ملک کی حفاظت کرنے کی جگہ وہ دشمنانِ وطن کی اعانت کر رہا تھا۔ اس لیے اسے معاف کرنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ میں نے اسے مسلسل ٹھوکروں پر رکھ لیا تھا۔ پیروں میں بھاری بوٹ تھے۔ اس بوٹ کی مار بھی زبردست تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کے جسم پر زخموں کا گلشن کھل اٹھا۔ ہر زخم سے خون رس رہا تھا۔ زمین پر بھی جابجا خون کے دھبے نظر آنے لگے تھے۔ وہ بے جان مجسمے کی طرح ادھر سے ادھر لڑھک رہا تھا۔ جیسے اس میں مدافعت کی ذرا بھی قوت نہ ہو۔ کہیں مر تو نہیں گیا۔ یہ خیال ذہن میں آیا ہی تھا کہ میں نے خود کو روک لیا اور جھک کر سانس کی آمد و شد کی جانچ کی۔ سانس چل رہی تھی۔ لیکن ہوش اس سے روٹھ چکا تھا۔ ایک گدھے کی طرح پٹا تھا۔ اس حالت میں وہ کیسے ہوش میں رہتا؟

اسے اس کے حال پر چھوڑ کر اس کے باقی ساتھیوں پر نظر ڈالی۔ وہ سب بھی بے ہوشی کی دنیا میں کھوئے ہوئے تھے۔ میں نے اس رسی کو کھولا جس سے مجھے باندھا گیا تھا۔ پھر اسی رسی سے میں نے ان سب کے ہاتھ اور پیر باندھے لیکن اس بات کا خیال رکھا کہ ہاتھ پیچھے کی طرف ہوں اور بندھن زیادہ سخت نہ ہو۔ وہ اسے آسانی سے کھول بھی نہ سکیں اور انہیں زیادہ تکلیف بھی نہ ہو۔ یہ میری عادت بن چکی ہے کہ جب کوئی مقابلے پر آئے تو اسے چھوڑو نہیں اور جب کوئی لاچار پڑا ہو تو اسے چھیڑو نہیں۔ اس کو تکلیف بھی نہ دو۔

اس کام سے فرصت پا کر میں نے باہر کی جانب قدم بڑھا دیے۔ پہلے برابر والے کمرے میں جھانکا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ وہ کمرا کسی عاشق کے دل کی طرح خالی پڑا بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ اس خالی کمرے کا دروازہ بند کر کے دوسرے کمرے کے دروازے کو ہاتھ سے دباؤ ڈال کر کھولا۔

اس کمرے کے منظر کو دیکھتے ہی میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی اس لیے کہ اس کمرے میں ایک لالٹین سے صغیر، جیدے اور اللہ ڈینو بندھے پڑے تھے۔ وہ سب فرش

پر اس طرح لڑھکے ہوئے تھے۔ جیسے چاولوں کی بوریاں پڑی ہوں۔ ان کے ہاتھ پیر باندھ کر گول گٹھڑی کی شکل دی گئی تھی۔ منہ میں کپڑے ٹھنسے ہوئے تھے اور آنکھوں پر پٹی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر انہیں بندھن سے آزاد کرایا اور پھر آنکھوں کی پٹی کھولی۔ صغیر آزاد ہوتے ہی باضابطہ رونے لگا۔ اسے خاموش کرنے میں جتنا وقت لگا وہ الگ ہے مگر اسے چپ کرا ہی دیا پھر پوچھا کہ ریاست خان کو کہاں رکھا گیا ہے، کچھ اندازہ ہے؟

''ریاست خان کو بہت مارا۔ اس کی چیخ سن سن کر میں دہلتا رہا تھا کہ اسی طرح مجھے بھی پیٹا جائے گا۔'' صغیر نے آنسو پوچھتے ہوئے بتایا۔

''فکر نہ کرو اب اس کی پٹائی کا باب کھلنے والا ہے۔ پہلے تو میں اپنی پٹائی کا روزنامچہ کھولوں گا پھر ریاست خان کا۔ ایک ایک تمانچے کا اسے حساب دینا ہوگا۔ تم سب کے جسم پر جتنی چوٹ ہے اسے پانچ سے ضرب دے کر انہیں ماروں گا۔'' میں نے اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر تھپکی دی۔

''ہاں صاحب جی۔ اسے اتنا مارنا اتنا مارنا کہ وہ پھر کسی پر ظلم نہ کر سکے۔ بہت ظالم ہے وہ۔''

''بالکل ایسا ہی ہوگا۔ اب تم لوگ تیار ہو جاؤ' میں نے ان سب کو ایک کمرے میں بند کر دیا ہے۔ پہلے میں ریاست خان کو ڈھونڈ لوں پھر ان سے حساب لیتا ہوں۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا اور پھر اس کمرے کے برابر والے کمرے میں جھانکا۔ وہ بھی خالی تھا۔ اس کے برابر والا کمرا بھی خالی تھا۔ تبھی میری نظر کھلے ہوئے دروازے سے باہر گئی اور میں ادھر بڑھتا چلا گیا۔

دروازے سے نکلتے ہی میں نے خود کو آنگن میں پایا۔ خوب بڑا سا آنگن تھا۔ اس آنگن میں ایک چھدرا سا پیڑ تھا۔ اس پیڑ کی ایک ڈال سے ریاست خان کو الٹا لٹکا دیا گیا تھا۔ میں دوڑتا ہوا اس کے پاس پہنچا۔ وہاں ایسا کوئی ہتھیار یا اوزار نہیں تھا جس سے رسی کاٹ سکتا اس لیے پیڑ پر چڑھنا پڑا۔ رسی کھول کر میں نے ریاست خان کو نیچے اتارا۔ وہ بے ہوش تھا۔ اسے اٹھا کر میں اندر لے آیا۔ اس کی حالت خود بتا رہی تھی کہ اس پر بے تحاشہ تشدد کیا گیا ہے۔ میں اسے ہاتھوں میں سنبھالے ہوئے اندر لے کر آیا۔

ایک بے ہوش شخص کو گود میں اٹھا کر لانا آسان نہیں ہے پھر بھی میں اسے اٹھا لایا تھا۔ اس کو لٹانے کے بعد میں نے صغیر سے کہا ''اس کے زخموں پر مرہم لگاؤ۔''

''مرہم کہاں سے لاؤں؟'' وہ بے چارگی سے بولا۔

میں نے اس کمرے سے نکلتے ہوئے اپنا بیگ اٹھا لیا تھا۔ اس بیگ سے فرسٹ ایڈ کٹ نکالی اور مرہم کی ٹیوب اس کی طرف بڑھا دی۔ اس نے ٹیوب سے مرہم نکالی اور اس کے زخموں پر لگانے لگا۔ میں نے اپنے بیگ کی دوبارہ تلاشی لی کہ کچھ غائب تو نہیں ہے لیکن سب کچھ جوں کا توں موجود تھا۔ اس کی تلاشی تو لی گئی تھی جس کا اندازہ مجھے ہو چکا تھا کیونکہ شیونگ کا سامان میں بیگ کے..... سائیڈ پاکٹ میں رکھتا ہوں جو اس وقت اپر سائڈ پاکٹ میں نظر آ رہا تھا یعنی کسی نے نکالا تھا اور تمام چیزوں کو اسی طرح دوبارہ سے رکھ دیا تھا۔ یہ تو اچھا ہوا تھا کہ واکی ٹاکی نہیں تھا۔ سفیر کے بیگ میں رکھ دیا تھا ورنہ اسے دیکھ کر تو یہ لوگ واقعی مجھے ایجنسی کا بندہ سمجھنے لگتے۔ موبائل بھی موجود تھا جسے میں نے باہر نکالا اور سفیر کا نمبر ملایا۔ دوسری طرف بیل بجی اور فوراً ہی کال ریسیو ہوگئی۔ سفیر نے ہیلو کے جواب میں کہا ''آپ ہیں کہاں۔ ابھی ابھی وسیم وہاں سے واپس آیا ہے۔ میزبان نے بتایا کہ آپ جا چکے ہیں؟ کہاں پر ٹھہرے ہوئے ہیں۔''

''یقین کرو میں پھر اغوا ہو گیا ہوں؟'' میں نے ہنس کر کہا۔

''یوں کہیں کہ اغوا سیریز چل رہی ہے۔ ہر قدم پر اغوا ہو رہے ہیں۔'' سفیر نے شاید مائیک کھول رکھا تھا اس لیے کہ اس بار آواز وسیم کی آئی تھی۔ ''جلدی بتائیں کہ اس وقت آپ ہیں کہاں؟''

''یہی تو معلوم نہیں۔'' میں نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ یہ بات غلط بھی نہیں تھی میں نے ابھی تک باہر کا منظر دیکھا بھی نہیں تھا۔ آتے وقت باتوں میں اس نے مجھے الجھا لیا تھا اسی لیے میں اِدھر اُدھر دیکھ نہیں سکا۔ عقلمند ہمیشہ ہوشیار رہتے ہیں لیکن پتا نہیں کیا بات تھی کہ میں اس بندے پر اتنا اعتماد کیوں کر بیٹھا تھا۔ دراصل میرے ذہن میں خطرے کی کوئی بات آئی نہیں تھی۔ میں اسے ایک معمولی ڈرائیور سمجھا تھا جس کا خمیازہ بھگت چکا تھا۔

''کیا کسی کمرے میں قید ہیں؟''

''نہیں آزاد ہوں لیکن مقام نامعلوم ہے۔ پتا نہیں کون سی جگہ ہے۔ ابھی پوچھ کر بتاتا ہوں'' کہتے ہوئے میں اندر کی طرف بڑھا۔ ریاست خان کو ہوش نہیں آیا تھا۔ اس کے سر کو اپنی گود میں لیے ہوئے صغیر بیٹھا تھا۔ اس سے ظاہر تھا کہ صغیر واقعی اسے دل کی گہرائی سے دوست سمجھتا تھا۔ جیدے اور اللہ ڈینو کے چہروں پر بھی غم کی پرچھائیں

نظر آرہی تھی لیکن وہ اس قدر ٹوٹے ہوئے نظر نہیں آرہے تھے جتنا صغیر ٹوٹا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ بس سر جھکائے غمگین سے بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا "اس علاقے کا نام کیا ہے؟ کسی کو معلوم ہے؟"

"جی ہاں، یہ گلگت شہر سے تقریباً آٹھ کلو میٹر پہلے آنے والا قصبہ مینوار ہے۔ یہ گھر کسی شاہ کا ہے جسے انہوں نے کرایہ پر حاصل کیا ہوا ہے۔" جیدے نے سر اٹھا کر جواب دیا۔

میں نے فون پر بتایا۔ "آواز پہنچی؟ یہ مینوار ہے، ہم جس گھر میں رہتے ہیں یہ کسی شاہ کا ہے جسے ان لوگوں نے کرایہ پر حاصل کیا ہے۔"

"او کے ہم دس پندرہ منٹ میں پہنچ رہے ہیں۔ جس کی گاڑی حاصل کی ہے وہ ایک اچھا بندہ ہے اور صبح سے ساتھ ہے، وہ ہر علاقے سے واقف ہے۔" سفیر نے کہا۔

"میں نے بھی ایک ایسے ہی بندے پر یقین کرلیا تھا جس کی سزا بھگت لی ہے۔ آنکھیں کھلی رکھنا۔"

"اتفاق ہے کہ آنکھیں کھلی ہوئی ہیں اسی لیے اس بندے کو پہچان لیا۔ اس کی میں نے ایسے وقت مدد کی ہے جب موت اس کے شہ رگ کے قریب پہنچ چکی تھی۔ اگر میں مداخلت نہ کرتا تو وہ لاش میں تبدیل ہو جاتا۔ لمبی کہانی ہے۔ آپ آجائیں تو سناتا ہوں۔"

"یہ بتاؤ جہاں تم ٹھہرے ہو وہاں تفتیش کے لیے کوئی جگہ ہے؟"

"گویا کچھ قیدی بھی ساتھ ہیں۔ بے فکر ہو کر آجائیں۔ یہ اپنا مرجس شاہ ہے نا۔ بہت کام کا بندہ ہے۔ اس نے آپ کی بات سنتے ہی اشارے سے بتا دیا ہے کہ ایسی جگہ ہے۔"

"جلدی پہنچو اس لیے کہ قیدی ابھی بے ہوش ہیں، ان کے ہوش میں آنے سے پہلے میں انہیں یہاں سے منتقل کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے ذرا سخت لہجے میں کہا اور فون بند کردیا۔

مجھے پوری اُمید تھی کہ وہ میرے لہجے کو پہچانتے ہیں۔ لہجے نے بتا دیا ہوگا کہ میں جلد از جلد یہاں سے نکلنا چاہتا ہوں اور وہ ہوا میں اڑتے پرندوں کی سی تیزی سے آرہے ہوں گے۔ میں نے ایک بار پھر ریاست خان کو دیکھا۔ وہ اسی طرح بے ہوش پڑا تھا۔ شاید اس پر بہت زیادہ تشدد ہوا تھا۔ اس کی حالت درست نہیں تھی۔ اسے جلد کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھانا ضروری تھا۔ ابھی میں اسی بارے میں سوچ رہا تھا کہ باہر کسی گاڑی کے رکنے کی آواز آئی اور پھر دروازے پر دستک ہوئی۔ صغیر وغیرہ اس طرح دہل کر چونکے جیسے موت کے فرشتے نے دستک دی ہو۔ میں نے اللہ ڈینو سے کہا۔ "جا کر دروازہ کھولو۔ باہر میرے آدمی ہیں۔"

وہ کھڑا ہوا لیکن اس کے چہرے پر بے یقینی چھائی ہوئی تھی۔ لیکن میرا حکم تھا اس لیے وہ اٹھ گیا۔ ابھی وہ دروازے پر پہنچا بھی نہیں تھا کہ مجھے بھی دھڑکا ہوا کہ کہیں واقعی مجھے مغالطہ نہ ہوا ہو کہ میرے آدمی ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ وہ امداد شاہ کے آدمی ہوں۔ میں نے اللہ ڈینو کو رکنے کے لیے کہا اور خود دروازے کی جانب بڑھا۔ دروازے میں کوئی رخنہ نہ تھا کہ میں اس سے جھانک کر دیکھتا۔ اس لیے بحالتِ مجبوری دروازہ کھولنا پڑا۔ دروازہ میں نے یکا یک نہیں کھولا تھا بلکہ تھوڑا سا کھولا تھا اور داہنے پیر کو دروازے کے پلڑے سے اٹکا دیا تھا کہ اگر زورزبردستی ہو تو آسانی سے دروازہ نہ کھلے۔ لیکن دروازہ کھلتے ہی میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ اس لیے کہ میرے سامنے سفیر کا چہرہ تھا۔ میں نے دروازہ پورا کھول دیا۔ اس کے پیچھے وسیم تھا اور وسیم کے ساتھ ایک نیا بندہ تھا۔

"وقت کم ہے اور لوگ زیادہ ہیں۔ جلد انہیں یہاں سے منتقل کرنا ہے۔" میں نے کہا۔

"ابھی لیجیے۔" کہہ کر سفیر اندر داخل ہوا پھر بولا "لوڈ کرنے والا مال کس طرف ہے؟"

"ادھر والے کمرے میں۔" میں نے اشارے سے بتایا۔

وہ سب ادھر بڑھ گئے۔ امداد شاہ کو سفیر نے اکیلے اٹھایا۔ دوسرے کو وسیم اور نئے بندے مرجس نے مل کر اٹھایا۔ وہ شخص باڈی بلڈر تھا اس لیے وزن بھی زیادہ تھا۔ وسیم اور مرجس شاہ نے بدقت تمام اسے باہر لایا تھا اور اٹھا کر گاڑی میں ڈالا تھا۔

"ایک اور ہوگا۔ اسے بھی گاڑی میں ڈالو۔" کہہ کر میں جیدے والے کمرے میں داخل ہوگیا۔ ریاست خان اسی طرح بے ہوش تھا۔ میں نے صغیر کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا رہی تھیں۔ میں نے اس سے کہا۔ "فکر نہ کرو... ریاست خان کو کچھ نہیں ہوگا۔ میرے آدمی پہنچ گئے ہیں۔ ہم اسے ڈاکٹر کے پاس لے جائیں گے۔ اچھے سے اچھے ڈاکٹر کو دکھائیں گے۔ ضرورت پڑی تو اسے سی ایم

اہچ تک لے جائیں گے۔"

"صاحب جی کچھ بھی کریں میرے یار کو بچالیں۔ یہ بہت نائیس بندہ ہے۔ نماز بالکل قضا نہیں کرتا۔ آپ اس پر رحم کریں۔ اللہ اجر دے گا۔" وہ منتیں کرنے لگا۔

"ارے بے وقوف۔ وہ میرا بھی یار ہے۔ میری وجہ سے وہ اس مصیبت میں پھنسا ہے۔ ہم اسے ہر حال میں ٹریٹ مینٹ دلائیں گے۔" میں نے اسے تسلی دی۔ "اب اسے لے جانا ہے۔" پھر جیدے کی طرف مڑ کر کہا "اسے اٹھاؤ تاکہ باہر لے جاسکوں۔"

جیدے، صغیر اور اللہ ڈینو نے اسے ہاتھوں پر اٹھا لیا اور ہم باہر پہنچے۔ اتنی دیر میں قیدیوں کو بھی گاڑی میں بھرا جا چکا تھا۔ بڑی سیٹ پر ریاست خان کو لٹا دیا گیا۔ صغیر نے اس کے سر کو اپنی گود میں لے رکھا تھا۔ اس وقت ہائی روف کی حالت اگر کمپنی والے دیکھ لیتے تو مارے خوشی کے بے ہوش ہو جاتے۔ انہوں نے سوچا بھی نہیں ہوگا کہ ہائی روف میں اتنے سارے بندے "ٹھونسے" جاسکتے ہیں۔ مرجس گاڑی چلا رہا تھا۔ سڑک بھی ہموار تھی اس لیے سفر کا پتا ہی نہ چلا اور ہم گلگت کے اس مکان میں پہنچ گئے جو سفیر نے عقلمندی دکھاتے ہوئے کرایہ پر حاصل کر لیا تھا۔ اگر کسی ہوٹل میں ٹھہرتا تو وہاں یہ سرگرمی ممکن نہ ہوتی۔

مکان کے احاطے میں ہائی روف کو روک کر مرجس اترا۔ اس نے پچھلا دروازہ اوپر اٹھا کر کہا "ان حرام خوروں کو کیسے اتارا جائے۔ سب کے سب بے ہوش ہیں۔"

"میں ہوں نا۔" وسیم نے آگے بڑھ کر کہا اور امداد شاہ کو کھینچ کر کندھے پر اٹھا لیا پھر اندر کی طرف بڑھا۔ عبداللہ نے جیدے کے ساتھ مل کر باڈی بلڈر کو اٹھایا۔ تمام قیدیوں کو اندر پہنچانے کے بعد وہ ریاست خان کی طرف بڑھے تھے کہ میں نے مرجس سے کہا "بھائی میاں، کوئی اچھا ڈاکٹر مل جائے گا؟"

"کیوں نہیں... یہاں بلانا ہے یا اسے لے جانا ہے؟" اس نے سوال کیا۔

"اگر کوئی قائدے کا اسپتال ہے تو وہیں لے چلو۔"

"میرے خیال میں بندے کی حالت بتا رہی ہے کہ اسے اسپتال لے جانا بہتر ہے۔" وسیم نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

"شاہرہ قائداعظم پر فیملی اسپتال ہے۔ وہاں میرے جاننے والے اسٹاف ہیں۔ وہیں چلتے ہیں۔" مرجس نے کہا۔

"وہاں فیسلٹی تو ہے نا؟" میں نے پوچھا۔

"جی ہاں کسی بھی بڑے اسپتال کے مقابلے میں اچھا اسپتال ہے۔" مرجس نے کہا "اہم بات یہ ہے کہ وہاں کے کئی ڈاکٹر میرے جاننے والے ہیں۔ ان کی وجہ سے ہمیں آسانی ہوگی۔"

"اس کے بارے میں کوئی تفتیش تو نہیں کرے گا کہ یہ زخمی کیسے ہوا۔ پہلے پولیس میں رپورٹ درج کرائیں۔" میں نے مرجس کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ یہ سوال یوں بھی ضروری تھا کہ اس دور میں کون خواہ مخواہ کی سردردی مول لیتا ہے۔ سب کو اپنی پڑی ہے۔ ایک ذرا سی الجھن بڑی مصیبت کا پیش خیمہ بن جاتی ہے۔ پھر پولیس والے بھی تاک میں رہتے ہیں کہ ان کو کوئی ایسا کلیو ملے۔ ایسا سرا نظر آئے جو ان کی جیب کا ابھار بڑھا دے۔ وہ ڈاکٹر سے باز پرس کر سکتے تھے کہ اس نے ایسا کیوں کیا۔ بغیر پولیس میں اندراج کرائے میڈیکل ٹریٹمنٹ دی۔ اگر وہ پولیس کو خبر دے دیتے تو ان کا تو کچھ جاتا نہیں لیکن پولیس والوں کی جیب کا بھلا ہو جاتا خبر نہ دینے کی صورت میں پولیس والوں کے نقصان کی بھرپائی ڈاکٹر کے ذمے ہوتی کہ وہ اس ناشتا پانی کے لیے کچھ دیں۔ اپنی جیب کو ہلکا کرنا کسے پسند ہے اس لیے ڈاکٹر صاحبان کیس درج کروانے کے فرائض خود ہی انجام دیتے ہیں اور میں اس الجھن سے بچنا چاہتا تھا۔ میری الجھن مرجس نے دور کر دی "نہیں جناب، میں ہوں نا۔ پولیس تک بات نہیں پہنچے گی۔"

مرجس پھر سے ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھا اور ہم اسپتال کی طرف چل پڑے۔ وہاں پہنچ کر احساس ہوا کہ مرجس کی واقفیت بہت لوگوں سے ہے۔ اس کے کہنے پر فوراً ٹریٹمینٹ دیا جانے لگا۔ ڈاکٹروں نے بتایا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ ایکسرے میں سب خیریت ہے۔ شاید اندرونی چوٹ آئی ہے جس کی وجہ سے یہ بے ہوش ہوا ہے۔ ہم اپنی سی کوشش کر رہے ہیں۔ جلد ہوش آ جائے گا۔ مگر اتنی چوٹیں آئیں کیسے؟

"اسے کچھ غنڈوں نے لوٹنے کے لیے الٹا لٹکا دیا تھا۔" میں نے جواب دیا۔

ڈاکٹر نے مسکرا کر کہا "ہم نے یہ بات پہلے ہی جان لی ہے۔ اس لیے کہ اسکینگ میں غذا کی نالی میں کچھ مواد نظر آیا ہے جسے ہم نے صاف کر دیا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ اس کے گردے پر چوٹ لگی ہے جس کا اثر اچھا نہیں ہے ویسے ہم

نے اس کے لیے بھی انجکشن لگا دیا ہے۔ آرام آچکا ہوگا۔"

"کیا اسے رات بھر یہیں رکھنا پڑے گا؟"

"یہ زیادہ بہتر ہے لیکن آپ اگر گھر لے جانا چاہیں تو لے جاسکتے ہیں لیکن دو تین گھنٹے کے بعد۔" ڈاکٹر کی باتوں سے اندازہ ہوگیا کہ معاملہ زیادہ سیریس نہیں ہے۔ میں بھی مطمئن ہوگیا۔ صغیر کو وہیں چھوڑا اور واپسی کے لیے نکل پڑا لیکن انہیں سمجھا دیا تھا کہ جو کوئی بھی پوچھے تو یہی بتانا ہے کہ کچھ لوگوں نے لوٹنے کے لیے اسے زدوکوب کیا ہے اور وہ سب ٹریکنگ کے لیے آئے ہیں۔

واپس آیا تو وسیم بے چینی سے منتظر تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی بولا "اندر موجود صاحب بے چینی سے منتظر ہیں کہ آپ آجائیں تاکہ ان کی خاطرداری ہوسکے۔"

"اسے ہوش آگیا؟"

"جی ہاں... وہ چیخنے کی کوشش متواتر کررہا ہے۔"

"چلو دیکھتے ہیں۔" کہہ کر میں نے اندر قدم بڑھا دیا۔ وہ کمرا ساؤنڈ پروف نہیں تھا اس لیے اس کی چیخ باہر تک سنی جاتی اس خطرے کے پیشِ نظر میں نے اندر جاتے ہی دروازہ بند کیا پھر امداد شاہ کی طرف دیکھا۔ وہ کینہ توز نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس کے پاس بیٹھ کر کہا "امداد شاہ یا جو بھی تمہارا نام ہے۔ غور سے سن لو۔ اگر تم نے میرے سوالوں کا جواب نہیں دیا تو میں الگ ہٹ جاؤں گا اور باقی کے سوالات میرا یہ ساتھی کرے گا۔" کہہ کر میں نے میرے بعد اندر آنے والے عبداللہ کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ بندہ تھرڈ ڈگری کا ماہر ہے۔ اس کی مار کا جواب نہیں۔ جسم سے ایک قطرہ خون نہیں نکلتا اور اندرونی حالات خستہ تر ہو جاتی ہے جسے کوئی ڈاکٹر تشدد ثابت نہیں کر پاتا۔ اب سوچ لو۔ میرے سوالات کا جواب سیدھے سیدھے دوگے یا اس کا سامنا کروگے۔"

امداد شاہ کا منہ بند تھا۔ وہ بولنا چاہتا بھی تو بول نہ پاتا لیکن اس کی آنکھیں بول رہی تھیں۔ آنکھوں میں نفرت کی لہریں ہلکورے لے رہی تھیں۔ میں نے سفیر کو آواز دی۔ وہ کسی جن کی طرح فوراً حاضر ہوگیا۔ شاید وہ دروازے سے لگا کھڑا تھا تاکہ ضرورت پڑنے پر مدد دے سکے۔ اس نے اندر آتے ہی ایک نظر امداد شاہ پر ڈالی پھر منہ دوسری طرف کرکے تھوکا اور پھر جیب سے قلم تراش نکال کر "کی رنگ" سے اسے الگ کیا۔ وہ چھوٹا سا چاقو کتنا دھاردار ہے اس کا مجھے اندازہ تھا۔ اس نے چاقو کی دھار پر انگلی پھیری پھر مجھ سے مخاطب ہوا "جی فرمائیں... پہلے کہاں سے ابتدا کروں... کس جگہ کی چمڑی پہلے چھیلوں؟"

"کچھ توقف کرو... ایک دو سوال تو کرلوں۔ اگر جواب نہیں دے گا تو میں تمہاری مدد ضرور لوں گا۔ ابھی تو اس لیے بلایا ہے کہ اس کی ہلکی سی خاطرداری کرنی ہے۔"

"ارے جناب ہلکی خاطرداری کے لیے میں ہوں نا۔" وسیم نے آگے بڑھ کر کہا "چھوٹے کام میں تو کرتا رہا ہوں پھر انہیں کیوں تکلیف دے رہے ہیں۔" کہہ کر اس نے وہیں قریب رکھی ایک بالٹی اٹھالی۔ ٹین کی چادر سے بنی یہ بالٹی کسی اور کام کے لیے تھی۔ عام طور سے اب ٹین کی بالٹیاں کم کم ہی استعمال ہوتی ہیں۔ پلاسٹک کی بالٹیاں ہی پسند کی جاتی ہیں۔ اس ٹین کی بالٹی کو وسیم نے الٹی کرکے اس کے سر پر رکھ دی۔ اس کے دونوں ہاتھ پیچھے بندھے تھے اور سفیر نے اسے اٹھا کر بٹھا دیا تھا۔ اس کی پیٹھ دیوار سے لگی ہوئی تھی۔ بالٹی سر پر آجانے سے اب وہ کچھ دیکھ بھی نہیں پا رہا ہوگا۔ وسیم نے بالٹی اوڑھانے کے بعد وہیں رکھی ہتھوڑی کو اٹھایا اور اس بالٹی پر چوٹ ماری۔ اس کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی تو میرا منہ بن گیا۔ عجیب سی کراہیت آمیز آواز تھی۔ ابھی گونج ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ اس نے پھر ہتھوڑی کا وار کیا۔ پھر وہی آواز۔ میں سمجھ رہا تھا کہ جب کھلی سماعت سے ایسی آواز کراہیت شدہ ہے تو بالٹی کے اندر کانوں کے اتنے نزدیک وہ گونجتی آواز کیسی لگ رہی ہو گی۔ اس کے کان جھنجنا جاتے ہوں گے۔ اسے ہی کہتے ہیں سماعت شکن آواز۔ اس کے کانوں کے پردے پھٹ رہے ہوں گے۔ میں وسیم کا یہ کھیل دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ وہ ہر منٹ کے بعد ایک چوٹ مارتا۔ پانچویں چھٹی چوٹ پر امداد شاہ نے خود کو زمین پر گرا دیا۔ میں سمجھ گیا کہ اب وہ اذیت برداشت نہیں کر پا رہا ہے۔ اس عجیب و غریب ایذا نے اسے توڑ دیا ہے۔ میں نے مسکراتے ہوئے وسیم کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر کہا "بس اب بالٹی کو اتار لو۔"

وسیم نے بالٹی اتاری تو امداد شاہ کا چہرہ نظر آیا۔ چہرے پر اذیت سہنے کا ملمع صاف نظر آرہا تھا۔ میں نے اس کے منہ پر بندھی پٹی کو ہٹایا ہی تھا کہ وسیم نے اس سے کہا "کیا حال ہے جناب کا؟ کیا اب جواب دینا پسند کریں گے یا دوبارہ سے بالٹی سر پر رکھوں؟"

بالٹی کا نام سنتے ہی اس کی آنکھوں میں خوف تیر گیا۔ اس نے ڈر کر بالٹی کو دیکھا۔

"یار دلدار اگر جواب دینے پر راضی ہو تو شروع ہو جاؤ ورنہ میرے پاس ابھی اور بھی طریقے ہیں۔ ایسے ایسے

طریقے کہ تمہاری آنے والی نسلیں بھی میرا نام سن کر تھر تھر کانپیں گی۔ یہ سمجھ لو کہ جو کچھ میں نے کیا یہ ہلکی خاطر داری تھی۔ ابھی مجھ سے زیادہ آزمودہ طریقہ جاننے والے لائین میں اپنی باری کے منتظر کھڑے ہیں۔'' اس نے عبداللہ اور سفیر کی طرف اشارہ کر کے کہا ''یہ سفیر الملک ہیں۔ ان کا کام ہے انسانی جسم کی کھال کو اس انداز میں تراشنا کہ وہ ملک ملک کا نقشہ نظر آئے۔ یقین کرو اس نقشے کی تصویر اتار کر لوگ گوگل پر سیو کر دیتے ہیں تا کہ لوگوں کو ابہام نہ لگے۔'' پھر اس نے عبداللہ کی طرف اشارہ کیا ''یہ عبدِ رب ہے دن بھر اپنے معبود کا شکر ادا کرتا رہتا ہے کہ اس کی ہاتھ میں میں وہ قوت ہے کہ یہ ایک ہی بار میں انگلی توڑ دیتا ہے۔ راہ چلتے انگلی توڑتا ہے اور انگلی والے کو پتا بھی نہیں چلتا۔ یہ کام اتنی پھرتی سے یہ کرتا ہے کہ دس منٹ میں بیس انگلیاں چور چور ہو جاتی ہیں۔ ابھی اس کا پریکٹیکل مظاہرہ ہو گا۔ عملی مظاہرہ۔ دیکھو گے نا؟''

وسیم کا انداز کچھ ایسا تھا جیسے وہ امداد شاہ سے دوستانہ نبھا رہا ہو۔ ہنسی مذاق کر رہا ہو۔ اس کی باتوں پر سب کے چہرے پر شگفتگی آگئی تھی صرف امداد شاہ کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔

اس کے ستے ہوئے چہرے کو دیکھ کر سفیر آگے بڑھا۔ اس نے امداد شاہ کی تھوڑی کو پکڑ کر اوپر اٹھایا اور پھر کہا ''تم نے سپاہی نمبر 9 3 1 5 3 3 کا نام سنا ہے؟ ان کا نام تھا سپاہی مقبول حسین۔ وہ 1965 کی جنگ کے شروع میں زخمی ہو کر انڈین قید میں چلے گئے۔ ان پر انڈین نے کیسے کیسے ظلم نہ کیے ان کی زبان تک کاٹ دی لیکن وہ پاکستان زندہ باد کہتے رہے۔ ان پر جتنے ظلم ہوئے تھے اس کا حساب لینا ابھی باقی ہے۔''

سفیر کی باتوں نے اس کو چہرے پر خوف کے سائے مزید گہرے کر دیے۔ وہ بہت زیادہ خوفزدہ نظر آ رہا تھا۔ اتنے میں عبداللہ آگے بڑھا اس کے ہاتھ میں پلاس تھا۔ اس نے پلاس بجاتے ہوئے کہا ''آج کئی دن ہو چکے ہیں مجھے دلی خوشی نہیں ملی۔ جانتے ہو مجھے خوشی کس بات سے ملتی ہے؟ جب میرے پلاس کی جکڑ میں آکر کسی کی انگلی چرچراتی ہے تو مجھے بہت خوشی ہوتی ہے۔ دل میں ٹھنڈی سی پڑ جاتی ہے۔''

وہ سب مل کر اسے نفسیاتی طور پر اتنا زیادہ خوفزدہ کر چکے تھے کہ مجھے اس پر محنت کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر پوچھا ''بولو' کیا تم میرے سوالوں کا جواب دینا پسند کرو گے؟''

اس نے خوفزدہ نظروں سے پہلے عبداللہ کے پلاس کو دیکھا پھر میری طرف دیکھتے ہوئے اثبات میں سر ہلانے لگا۔ اس کی آنکھوں میں خوف بس ... گیا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ اب یہ اندر سے ٹوٹ چکا ہے، میں نے پوچھا ''تم نے ریاست خان پر تشدد کیوں کیا؟''

اس نے جواب دینے کی بجائے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ اس کی آنکھوں میں خوف تھا لیکن جواب دینے سے بھی انکاری تھا۔ میں نے اس سے پھر پوچھا ''اگر تم جواب نہیں دو گے تو میں ان دونوں سے تمہیں بچا بھی نہیں پاؤں گا۔''

''کیا آپ کا تعلق آئی ایس آئی سے ہے؟'' اس نے جواب دینے کی بجائے سوال کر دیا۔

''ہم کون ہیں یہ بھول جاؤ' صرف سوالوں کا جواب دو۔'' میں نے تنبیہہ کی۔ ''ریاست خان پر تشدد کس وجہ سے کیا؟''

''اسے ایک کام دیا گیا تھا وہ اس نے نہیں کیا۔'' امداد شاہ نے سر جھکا کر جواب دیا۔

''وہ کام کیا تھا؟''

''مجھے خود نہیں پتا؟'' اس نے زمین کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔

میں نے سفیر کی طرف دیکھ کر کہا ''ایک کام کرو۔''

''کیا کرنا ہے؟ چمڑی چھیلنا شروع کر دوں؟'' سفیر نے جیب سے قلم تراش نکالتے ہوئے جواباً کہا۔

''نہیں ایسا کرو ایک موم بتی لے آؤ۔''

''جی ابھی لایا۔'' کہتے ہوئے سفیر باہر نکل گیا۔ جتنی تیزی سے وہ گیا تھا اسی تیزی سے وہ لوٹ آیا۔ میں نے وسیم سے کہا:

''اس والی رسی کو لے کر اسے کھڑکی کے ساتھ باندھ دو، سلاخیں مضبوط ہیں۔ اس لیے بندھن سخت ہونا ضروری ہے تا کہ یہ ہل نہ سکے۔ اس طرح سے باندھنا کہ یہ بیٹھا رہے۔''

وسیم نے رسی اٹھائی اور اس بندھے ہوئے بندے کو دوبارہ سے باندھ دیا۔

''اب اس کے داہنے پیر کو اٹھا کر اس کرسی سے باندھو تا کہ پیر نیچے نہ گرے۔''

اس نے یہی کیا۔ اس کے داہنے پیر کو کرسی سے باندھ دیا۔ اب وہ عجیب حالت میں بندھا ہوا تھا۔ میں نے اس کی

پنڈلی کے نیچے لے جا کر موم بتی کو جلا کر رکھ دیا۔ موم بتی کی لو اس کی پنڈلی سے ٹکرا رہی تھی۔ جلا رہی تھی۔ گو کہ لو اتنی اونچی نہیں تھی کہ فوراً گوشت کو جلانے لگتی لیکن اس کی تپش پہنچنا شروع ہو چکی تھی۔ اس نے جس طرح مجھے اذیت دی تھی اسی کے مقابلے کی اذیت میں اسے دے رہا تھا۔ میں نے مڑ کر عبداللہ سے کہا ”ایسا کرو کہ چل کر باہر ہوا میں بیٹھتے ہیں۔ جب اس کا دل چاہے گا ہمیں آواز دے لے گا۔“

”ہاں ہاں کیوں نہیں۔ ایسا کرتے ہیں کھانا آ گیا ہے ہم سب باہر ہوا میں بیٹھ کر کھا لیتے ہیں۔“ وسیم نے جواب دیا اور ہم سب باہر کی طرف بڑھنے لگے۔ دروازے پر پہنچ کر میں نے امداد شاہ سے کہا ”جب صحیح جواب دینے کا موڈ ہو مجھے آواز دے لینا۔“

یہ وہی جملہ تھا جو اس نے مجھ سے کہا تھا اور وقت نے وہی جملہ میری زبان سے کہلوا دیا۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ خود کو کبھی قوی مت سمجھو۔ صرف حق ہی فتح پاتا ہے۔ اس نے غرور میں یہ سمجھ لیا تھا کہ وہ بہت قوی ہے لیکن وقت نے اس کی اوقات دکھا دی۔ اب میری باری تھی کہ میں اسے اس کی اوقات بتا دوں کہ ابھی وطن کے سپوت زندہ ہیں۔ ابھی بھی دشمنانِ وطن کی آنکھوں میں سلائی پھیرنے کے لیے معمولی لوگ کافی ہیں۔ مجھے یقین تھا کہ یہ زیادہ دیر موم بتی کے شعلے کو سہہ نہیں پائے گا۔ بس کچھ دیر کی بات ہے کہ اس کا حوصلہ جواب دے جائے گا۔

باہر آتے ہی میں نے کہا ”وسیم تم ایسا کرو کہ ریاست خان کے پاس چلے جاؤ۔ اسپتال میں کسی ایک اہم شخص کا رہنا ضروری ہے۔“

”میں چلا جاتا ہوں۔“ سفیر نے خود کو پیش کیا۔

”اگر تم جانا چاہو تو بہتر ہے۔ حالات کو دیکھتے ہوئے فیصلہ بھی کر سکتے ہو۔ اس بندے کو کچھ نہیں ہونا چاہیے۔ وہ ایک معصوم شخص ہے۔“

”آپ بے فکر رہیں میں سب سمجھ گیا ہوں۔“ کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔ مجھے اُمید تھی کہ امداد شاہ سے بہت کچھ معلوم ہو جائے گا اس لیے کہ وہ یقیناً کوئی اہم بندہ ہے۔ اس علاقے میں ایسا بندہ بلاوجہ نہیں رہ سکتا۔ اس کی باتوں سے بھی یہی ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کسی خاص مشن پر اس علاقے میں آیا ہے۔ اس نے اپنا جال کہاں تک پھیلایا ہے۔ یہ معلوم کرنا بہت ضروری تھا۔ میری قوت سماعت مکمل طور پر کمرے پر مرکوز تھی۔ اس کی قوت برداشت جواب دیتی تو وہ خود مجھے آواز دیتا۔ اس لیے کہ جس حالت میں اس کے پیر بندھے تھے اس حالت میں اس کے پیروں کے مسلز اکڑتے اور اس پر موم بتی کا شعلہ اس کے گوشت کو جلاتا اور وہ ہل بھی نہیں پاتا۔ یہ اذیت اس کے لیے عذاب ثابت ہوتی۔ وہ اس عذاب کو زیادہ جھیل نہیں پاتا۔ اسے میرے آگے جھکنا ہی تھا۔ لیکن ابھی تک اس نے آواز نہیں دی تھی۔ اس لیے میں دوسرے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ اس کمرے میں اللہ ڈینو اور جیدے بستر پر بیٹھے تھے۔ وہ بالکل خاموش تھے جیسے سب مل کر کچھ سوچ رہے ہوں۔ میں نے کمرے میں داخل ہوتے ہی کہا ”اور بھائیو کیا حال ہے؟“

”سر، ریاست خان کی طبیعت اب کیسی ہے؟“ جیدے نے پوچھا۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ فکر مند ہے۔ واقعی وہ ریاست خان سے محبت رکھتا تھا۔ ورنہ وہ اتنا پریشان کیوں ہوتا۔ اس کی پریشان صورت دیکھ کر میں نے اس کی پیٹھ پر تھپکی دے کر کہا:

”سب خیریت ہے۔ شام تک وہ آ جائے گا۔“

”اس کو اندر کی مار بہت پڑی ہے۔ اندر کچھ خرابی نہ آ گئی ہو۔“

”نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”صرف سر پر ایک چوٹ ایسی ہے جس نے مجھے پریشان کر دیا تھا۔ لیکن ڈاکٹر نے بتایا کہ وہ بھی معمولی ہے۔“

”اللہ کرے ایسا ہی ہو۔“ صغیر نے خوش ہو کر کہا۔

ابھی میں اس سے بات ہی کر رہا تھا کہ میری جیب میں موبائل کی بیل بجی اور میں نے جلدی سے نکال کر دیکھا۔ سفیر کی کال تھی۔ میں نے بٹن پش کیا اور کان سے لگا لیا۔

”ڈاکٹر نے اسے وارڈ میں منتقل کر دیا ہے۔“

”یہ تو اچھی خبر ہے۔“ میں نے کہا۔

”ایک بات میں نے محسوس کی ہے۔ ابھی کنفرم نہیں ہوں۔ آپ وسیم کو بھیج دیں۔“

”کیوں، خیریت تو ہے؟“

”مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ ایک آدمی مسلسل ریاست خان پر نظر رکھے ہوئے ہے۔“

”اگر ایسی بات ہے تو پوری طرح ہوشیار رہنا۔ میں ابھی عبداللہ اور وسیم کو بھیج رہا ہوں۔“

”دونوں کو بھیجنے کی ضرورت نہیں۔ وسیم کافی ہے۔“

”وسیم کو تو بھیجوں گا ہی۔ اس کے پیچھے عبداللہ جائے گا تاکہ کور دے سکے۔ وہ تم دونوں سے دور رہ کر نظر رکھے گا۔“

"جیسا مناسب سمجھیں۔" اس نے کہہ کر کال کاٹ دی۔

اب مجھے یقین سا ہو چلا تھا کہ یہ کوئی لمبا چکر ہے اور امداد شاہ کوئی بڑا کھلاڑی ہے۔ اس سے سچ اگلوانا ضروری ہو گیا تھا۔ اس سے نمٹنے کے لیے ضروری تھا کہ میں ان لوگوں کو یعنی ریاست خان اور اس کے ساتھیوں کو یہاں سے چلتا کر دوں۔ یہی کچھ سوچتا ہوا میں امداد شاہ والے کمرے کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ اس طرف جانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ اب پھنسی پھنسی آواز میں مجھے پکار رہا تھا۔ آواز لگا رہا تھا کہ جو بھی ہے جلد آئے۔ میں ٹہلنے کے انداز میں اس کمرے میں داخل ہوا۔ شمع نے اپنا کمال دکھا دیا تھا۔ کمرے میں گوشت جلنے کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر موم بتی کو بجھا دیا۔ اگر اس کا سر بندھا نہ ہوتا تو یہ کام وہ کب کا کر چکا ہوتا۔ میں نے اس سے پوچھا "اب بتاؤ کیسا محسوس کر رہے ہو؟ میرے سوالوں کے جواب دو گے یا مزید موم بتیاں جلا کر باہر چلا جاؤں؟"

"ہم ہر سوال کا جواب دیں گے۔" اس نے کراہنے کے انداز میں جواب دیا۔

"تم نے ریاست خان کو کون سا کام دیا تھا جو وہ کر نہیں سکا؟"

"ہمارا ایک مہمان آنے والا تھا اسے تم نے پریشان کر کے بھگا دیا۔ تم ہو کون؟"

"میں خدائی فوجدار ہوں۔ یہ بتاؤ کہ وہ مہمان کون تھا؟"

"وہ ہمارے گروپ کو امداد دینے والے کا نمائندہ تھا۔ اس کو یہاں کوئی کام انجام دینا تھا۔"

"کون سا کام؟" میں نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"اس بارے میں ہمیں بھی نہیں معلوم۔" اس نے اپنے پیر کی طرف دیکھ کر کہا۔

"تو میں ایسا کرتا ہوں کہ اپنے ساتھی کو بلاتا ہوں وہ خود پلاس سے ناخن کھینچ کر پوچھ لے گا کہ تمہیں معلوم ہے یا نہیں۔"

"یقین کرو کہ مجھے اس بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں۔" اس کی آواز میں کرب ہی کرب تھا۔ میں نے محسوس کر لیا کہ وہ سچ بول رہا ہے۔ اس لیے اس سوال کو چھوڑ دیا اور نیا سوال کیا:

"اچھا یہ بتاؤ کہ تمہارا تعلق کس گروپ یا لوگوں سے ہے؟"

"ہمارا کوئی گروپ نہیں۔ میں بھی ریاست خان کی طرح حضرت جی کا مرید تھا۔"

"کون حضرت جی... اس ملک میں کئی کروڑ حضرت جی ہوں گے۔ ان میں سے کس کی بات کر رہے ہو۔"

"میں حضرت مرشد جی کا مرید تھا۔ ان کا ایک اور مرید ہے، ناصر شاہ۔ وہ مجھ سے کام لیتا رہتا ہے۔ ہر کام کے الگ پیسے ملتے ہیں۔ اس بار اس نے مجھے یہ کام سونپا تھا کہ میں ریاست خان پر نظر رکھوں۔ اس سے کوئی شخص ملنے آئے گا۔ وہ اسے کوئی کام سونپے گا۔ اگر ریاست خان وہ کام نہیں کر سکے تو اس پر میں دباؤ ڈالوں۔"

"دروغ گو را حافظہ نباشد..... تم نے خود کہا تھا کہ مرشد جیسے لوگوں سے تم خود کام لیتے ہو اور اب کہہ رہے ہو کہ تم اس کے مرید تھے..... اس دروغ گوئی کی وجہ بھی بتاتے چلو۔"

"جو ہم نے پہلے کہا تھا وہ بھی صحیح تھا اور جواب کہہ رہا ہوں وہ بھی صحیح ہے۔ پہلے میں نے مرشد کے ہاتھ پر بیعت کی ان کا مرید بنا لیکن بعد میں جب ناصر شاہ کے ساتھ کام کرنے لگا تو سمجھ آئی کہ مرشد تو ایک کھلاڑی ہے۔ اپنے چہرے پر تقدس کا ملمع سجائے ہوئے ہے۔ اس لیے اس کی قدر میری نظروں میں کم ہو گئی اور میں نے اس بیعت کو بھلا دیا اور ناصر شاہ کے ساتھ کام کرنے لگا۔"

"گویا تم سے کام لیتا ہے ناصر شاہ۔ اسی نے حکم دیا تھا کہ ریاست خان پر دباؤ ڈالو؟"

"جی ہاں!"

"دباؤ ڈالنے کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ اسے ختم کر دو۔"

"اس کے بارے میں نئی ہدایت مجھے فون پر ملی کہ ریاست خان نے غداری کی ہے اور ایجنسی والوں سے مل گیا ہے۔ اس نے کس کس ایجنسی کو کیا کیا بتایا ہے۔ یہ مجھے معلوم کرنا تھا اسی وجہ سے میں نے اس پر سختی کی تھی۔ اس کی غداری کی وجہ سے ہم سب خطرے میں آ گئے ہیں اسی کا مجھے غصہ تھا۔"

"تمہارے ساتھ جو لوگ ہیں کیا یہ بھی ناصر کے آدمی ہیں؟"

"جی ہاں۔"

"ناصر رہتا کہاں ہے؟"

"پنڈی میں۔"

''ٹھیک ہے اب آرام کرو۔ جلد ہم سفر پر چلیں گے۔ تم بھی میرے ساتھ ہو گے؟''

اسے ہدایت دے کر میں باہر آ گیا۔ اب مجھے سفیر وغیرہ سے مشورہ کرنا تھا۔ حالانکہ سفیر ہو یا وسیم یا عبداللہ میرے فیصلے سے کوئی بھی انحراف نہیں کرتا لیکن پھر بھی میں ان سے مشورہ ضروری سمجھتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میرے ساتھی میرے لیے سب کچھ تھے۔ عبداللہ کے کمرے میں آیا تو وہ نیٹ پر چیٹنگ کر رہا تھا۔

''یہ بچوں والا شوق کب سے شروع کر دیا۔'' میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''مانی کا پیدا کردا شوق مانی کے کام آ رہا ہے۔ اسی سے باتیں ہو رہی ہیں۔''

''اچھا.... وہ اس وقت کہاں ہے؟''

''وہیں... دبئی میں... اسے فلیٹ راس آ گیا ہے۔ اس نے اپنا سب کچھ وہیں منتقل کرا لیا ہے۔ شاید آپ کو بتایا بھی تھا کہ وہ جس کے لیے مرا جا رہا تھا، جس سے باتیں بھی سرگوشیوں میں کیا کرتا تھا اب اس سے زور زور سے باتیں کرتا ہے۔ بس شرعی تقاضا پورے کرنے کے لیے ہمارا انتظار کر رہا ہے تاکہ ہم جا کر اسے مزید عذاب میں ڈالنے کے لیے لاہور سے اس کی جان کو دبئی پرواز کرائیں۔'' عبداللہ نے ہنستے ہوئے بتایا۔

''ارے بات یہاں تک پہنچ گئی... چلو اچھا ہوا.... بیتو کا زندگی بھر افسوس رہے گا۔ کاش اسے بھی اس کی محبت سے ملا سکتا۔'' میں نے افسوس بھرے انداز میں کہا اور قریب رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''آپ کو حیرت نہیں ہے کہ مانی جیسا کم گو اور معصوم بچہ ایک لڑکی کے لیے اس طرح پاگل ہوا تھا ہے۔''

''جی ہاں یہی بات مانی بھی کہتا تھا لیکن ذرا آہستہ سے اس لیے کہ وہ بڑوں کے پیار میں مداخلت نہیں کرتا تھا۔'' وسیم نے اندر آتے ہوئے کہا۔ اس چوٹ پر عبداللہ تلملا گیا لیکن کچھ بولا نہیں۔ وہ بولتا بھی کیسے اس لیے کہ وسیم نے حقیقت بیان کی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ بھی عشق کی ان دیکھی آگ میں تپ رہا ہے۔ بھلے ہی وہ اسے مظلوم لڑکی سمجھ کر آگے بڑھا ہو لیکن وہی چنگاری آگ بن چکی تھی، اسی طرح جیسے وسیم سعدیہ کے لیے رحم کے جذبے سے بڑھا تھا لیکن بعد میں وہی اس کے لیے سب کچھ ہو گئی۔ اگر میری زندگی بھی معمول پر آ گئی تو میری کوشش ہو گی کہ ہم سب ایک جگہ رہیں۔ پاس پاس گھر ہو۔ ایک میں مونا کے ساتھ سفیر دوسرے میں وسیم اور سعدیہ۔ تیسرے میں عبداللہ اور بانو چوتھے میں مانی اور شازیہ پانچویں میں ایاز اور شاہین خواب دیکھنے پر کوئی پابندی نہیں ہے اور میں خواب دیکھ رہا تھا کہ وسیم کی آواز نے حال میں کھینچ لیا۔

''اس بدبخت نے کچھ اگلا یا ابھی کچھ اور خاطر داری کرنی ہے؟''

وسیم کے سوال پر میں نے جواب دیا۔ ''اس نے بہت کچھ بتایا ہے۔ اس کی تصدیق کے لیے ہمیں پنڈی جانا ضروری ہے۔ تمام کڑیاں مرشد کی خانقاہ سے مل رہی ہیں۔ جسے ہم نے اجاڑ دیا تھا وہ اب ایک نئے انداز میں سامنے آئی ہے۔''

''چلیں اس بہانے مجھے بھی اپنا کچھ پرانا حساب چکتا کرنا ہے۔'' وسیم نے عادت کے مطابق مزاح کا انداز اختیار کیا۔

یہ میرے دوست، میرے غمخوار، میری جان۔ میں وسیم کو محبت پاش نظروں سے دیکھنے لگا کہ یہی تو وہ لوگ ہیں جن کی وجہ سے میری زندگی میں بہار ہے۔ کچھ بھی ہو جائے، حالات کیسے ہی کیوں نہ ہوں۔ ان کی شوخی ان کی شگفتہ بیانی میں کمی نہیں آتی۔ اگر یہ نہ ہوتے تو میں کب کا حوصلہ ہار چکا ہوتا۔ میں نے اس سے کہا ''یہ مرجس کیسا بندہ ہے؟''

''اسے ہم نے موت کے منہ سے چھینا ہے اس لیے نمک حلالی تو کرے گا ہی... آگے اللہ جانے۔''

''حالات ایسے الجھ رہے ہیں کہ ہر ایک پر یقین کیا نہیں جا سکتا۔ اب یہی دیکھو جس بندے کو میں نے معمولی ڈرائیور سمجھا تھا وہ ایک بڑا مہرہ نکلا۔''

''یہ ہمیں کن حالات میں ملا پہلے یہ سمجھ لیں۔ پھر آپ کا جو فیصلہ ہو گا اسی کے مطابق اس کے ساتھ سلوک کریں گے۔'' وسیم نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

وہ کمرا اگرچہ چھوٹا تھا لیکن درمیان میں تھا اس لیے ہم نے اس کو اہمیت دی تھی۔ میں اسی کمرے میں ٹھہرا ہوا تھا تاکہ ضرورت پڑنے پر ایکشن لیا جا سکے۔ ایک کمرا دائنی جانب تھا اور دوسرا بائیں۔ ایک میں باڈی بلڈر اور اس کے ساتھی کو رکھا تھا اور دوسرے میں صغیر اور اس کے ساتھی تھے۔ اس درمیانی کمرے میں ہم آرام سے میٹنگ کر سکتے تھے اسی لیے میں وسیم کو کرید رہا تھا۔ عبداللہ بھی میری طرف متوجہ تھا۔

''ہم تینوں جہاں اترے تھے وہاں سے بس اسٹاپ

کی طرف جارہے تھے۔ وہ راستہ کچھ سنسان تھا۔ دور دور تک میدان تھے۔ کہیں کہیں گھنی جھاڑیاں بھی تھیں۔ اس ویران راستے میں انسانی شکل دیکھنے کو ہم ترس گئے۔ یوں بھی یہاں لاہور کراچی کی طرح ہر گلی کوچے میں بھیڑ تو ہوتی نہیں ہے۔ ابھی ہم کچھ ہی آگے گئے تھے کہ مجھے ایسی آواز سنائی دی جیسے کوئی کسی کا گلا دبا رہا ہو اور وہ جکڑ سے نکلنے کے لیے کوشش کررہا ہو۔ یہ آواز سفیر نے بھی سنی تھی؟ وہ بھی چونکنا ہو گیا۔ اس نے اشارے سے مجھے رکنے کو کہا اور ان جھاڑیوں کی طرف بڑھا جدھر سے آواز آئی تھی۔ نزدیک پہنچتے ہی اس نے للکارا۔ للکار سنتے ہی اندر سے کسی نے آواز دی ”کون ہے۔ اپنا راستہ لے ورنہ بے موت مارا جائے گا۔“

اتنی دیر میں ہم سب نے جھاڑیوں کو گھیر لیا تھا۔ اس دھمکی نے سفیر پر جنون سا طاری کردیا۔ اس نے بغیر ایک لمحہ ضائع کیے ان میں سے ایک کو لات ماری۔ وہ تین تھے اور ہم بھی تین۔ جسے لات پڑی تھی وہ اچھل کر دور جا گرا تھا۔ اس کے ساتھی کے ہاتھ میں کھلا ہوا چاقو تھا۔ اس نے چاقو لہراتے ہوئے سفیر پر حملہ کیا تھا کہ میں نے اس کی کمر پکڑ لی اور عبداللہ نے تابڑ توڑ دو پنچ مارے۔ اس کی ناک کا بھرتا بنا اور وہ لہراتا ہوا گرا۔ اتنی دیر میں نیچے دبا ہوا بندہ اٹھ گیا تھا۔ اب وہ بھی ان کی پٹائی میں شامل ہوگیا تھا۔ بس دس منٹ کی دیر لگی اور وہ سب لمبے لمبے ہوگئے۔ تب ہم نے اس بندے سے پوچھا کہ بات کیا تھی۔ اس نے بتایا کہ یہ لوگ اسے قتل کرنے لائے تھے۔ قتل کرنے کی وجہ کیا تھی یہ پوچھنے پر وجہ جو اس نے بتائی اسے سن کر مجھے حیرت ہوئی۔ وہ تینوں باہر کے تھے۔ افغانستان میں جب افراتفری پھیلی اور وہاں سے آنے والے پناہ گیروں کو حکومت نے اس علاقے میں ایک کیمپ بنا کر رکھا۔ یہ تینوں اسی کیمپ میں رہنے والے تھے اور اس بندے کے ساتھ ڈرائیوری کرتے تھے۔ انہوں نے ایک لڑکی کے ساتھ زیادتی کی کوشش کی تھی۔ وہ لڑکی اس بندے کی محبوبہ ہے۔ اس لیے اس نے احتجاج کرتے ہوئے دھمکی دی تھی کہ ان سے نمٹ لے گا۔ اسی بات پر وہ تینوں اسے بس اسٹاپ سے اغوا کرکے لائے اور اب قتل کرنے والے تھے۔ اس پورے معاملے کو ہم ختم تو نہیں کرسکتے تھے۔ اس لیے مرجس کو ساتھ لے کر وہاں سے نکل پڑے۔ اس نے جب بتایا کہ اس کی اپنی سوزوکی ہے اور وہ ڈرائیوری کرتا ہے تو ہم نے ساتھ رکھ لیا۔ آدمی ایماندار ہے۔ پھر ڈرا ہوا بھی ہے کہ وہ لوگ اسے چھوڑیں گے نہیں اس لیے ہمارے ساتھ ہے۔

”اس سے پوچھو اگر یہ ہمارے ساتھ پنڈی جانا چاہے تو اس کی سوزوکی پر ہی ہم چل دیتے ہیں۔ راستے میں پریشانی تو ہوگی مگر مجبوری ہے کیونکہ ہمیں بائی روڈ ہی جانا پڑے گا۔ امداد شاہ کو ساتھ لے کر ہم بائی ائر جانے سے تو رہے۔“

”یہ خود بھی پنڈی یا لاہور جانے کا سوچ رہا ہے۔ تاکہ وہاں سے پیسے کما کر لائے اور نکاح کرسکے۔“

”پھر تو ضرور بات کرو۔“

”جی میں ابھی بات کرتا ہوں کہ وہ ہمارے ساتھ چلے گا یا نہیں۔“ پھر اس نے سوال کیا۔ ”لیکن اس زخمی بندے کا کیا کرنا ہے؟“

”ریاست خان بھی ہمارا سر درد نہیں ہے۔ انسانیت کے ناتے ہم اس کی اتنی مدد کردیتے ہیں کہ اس کا علاج ہوتا رہے۔ یقیناً تم لوگوں کے پاس بھی اے ٹی ایم کارڈ ہو گا۔ میرے پاس بھی ہے۔ بیگ میں سب کچھ محفوظ ملا ہے۔ اے ٹی ایم کارڈ پورے پاکستان میں کارآمد ہے۔ اچھی خاصی رقم نکال کر اسے دے دیں گے۔ ویسے بھی دو چار دن سے زیادہ وہ اسپتال میں رہے گا نہیں۔ صحت مند ہوتے ہی بائی ائر کراچی یا جہاں جانا چاہے گا چلا جائے گا۔“ میں نے جواب دیا اور باہر نکلنے کے لیے کھڑا ہو گیا۔ اب مجھے سفیر سے بات کرنی تھی۔ اس لیے کہ زیادہ دیر کرنا مناسب بھی نہیں تھا۔ امداد شاہ کے اور بھی ساتھی ہوں گے۔ وہ ہوشیار ہوگئے ہوں گے۔ پھر مجھے جلد سے جلد مرشد سے بھی دو دو ہاتھ کرنا تھا۔ اس لیے یہاں وقت برباد کرنا ضروری نہیں تھا۔

میں اسپتال کے لیے نکل پڑا۔ اسپتال زیادہ دور بھی نہیں تھا۔ میں ٹہلتا ہوا ادھر بڑھتا جارہا تھا۔ شہر چھوٹا سا ہو تو آنے جانے میں آسانی بھی ہوتی ہے اور بھیڑ بھاڑ ٹریفک کے شور سے بھی نجات ملی ہوتی ہے۔ گو کہ یہ سڑک مرکزی حیثیت کی تھی لیکن گاڑیاں برائے نام چل رہی تھیں۔ میں ٹہلنے کے انداز میں چلتا ہوا اسپتال کی جانب بڑھ رہا تھا۔ میرے قبضہ میں امداد شاہ جیسا بندہ تھا۔ میں اسی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اب تک یہ بات سامنے نہیں آئی تھی کہ وہ ہے کیا۔ اس کی اہمیت کیا ہے۔ لیکن یہ بات ثابت ہو چکی تھی کہ وہ غداروں کے گروپ سے تعلق رکھتا تھا۔ اب اس سے مزید راز اگلوانا تھا جو میں یہاں نہیں، پنڈی پہنچ کر اس سے اگلواتا۔ تب تک اسے قبضہ میں رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ ہر طرف سے ہوشیار رہوں۔ سفیر بتا چکا تھا کہ

کوئی مشکوک شخص ریاست خان کی نگرانی کر رہا ہے اس سے یہ بات صاف تھی کہ امداد شاہ کا نیٹ ورک بڑا ہے۔ شہر میں اس کے بندے موجود ہیں۔ کہیں اس کا کوئی ساتھی مجھے ہی شکار نہ کرلے۔ اس خیال کے آتے ہی میں نے اِدھر اُدھر ناقدانہ انداز میں نظر ڈالی۔ مگر اِدھر اُدھر کوئی بھی مشکوک بندہ نظر نہیں آیا جو مجھ پر نظر رکھے ہوئے ہو۔ میں نے اپنی رفتار تیز کردی اس لیے کہ اب اسپتال بھی نزدیک آرہا تھا۔

اسپتال گو کہ چھوٹا تھا لیکن صاف ستھرا اور جدید سہولیت سے مزین تھا۔ کمپاؤنڈ میں قدم رکھتے ہی ایک خوشگوار سا احساس ہوا۔ سبزے کی چادر دور تک بچھی ہوئی تھی۔ میں آہستہ روی سے اندر کی طرف بڑھا۔ تبھی میری نظر مرجس پر پڑی۔ وہ ٹھنڈی بوتل لیے اس کمرے کی طرف جا رہا تھا جدھر ریاست خان کو رکھا گیا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے سلام کیا۔

''اب بیمار کی طبیعت کیسی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''اب تو وہ پٹاپٹ بول رہا ہے۔ لگ ہی نہیں رہا کہ اس کی حالت کبھی اتنی خراب تھی۔'' مرجس نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

''چلو یہ اچھا ہی ہوا۔'' میں نے اس کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے جواب دیا۔

کمرے میں داخل ہوا تو ریاست خان بیڈ پر نیم دراز تھا۔ میں نے اس کے چہرے پر نظر ڈالی۔ بشاشت لوٹ آئی تھی۔ ان کے سامنے بچھی کرسی پر سفیر بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں موبائل تھا۔ شاید وہ کسی سے بات کر رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے کہا۔ ''ابھی میں نے وسیم کو کال کیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ ریاست خان کو ریلیز کرا لیا جائے۔'' اس نے یہ جملہ ریاست خان کی طرف دیکھ کر کہا تھا۔

''کیوں بھائی' کیا اس کا خیال صحیح ہے؟'' میں نے ریاست خان کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''خود میرا بھی یہی خیال ہے۔ مجھے اب ذرا بھی کمزوری محسوس نہیں ہورہی ہے۔ بس کمر سے ذرا نیچے ہلکی سی چبھن ہے۔ ڈاکٹر نے بتایا ہے کہ انجکشن دیا جاچکا ہے۔ یہ درد بھی کم ہوجائے گا۔ اب میں خود کو بالکل فٹ محسوس کر رہا ہوں۔''

''یار سفیر میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ واپس پنڈی کے لیے نکل لوں۔'' میں نے سفیر کی طرف دیکھ کر کہا۔

''تو کیا آپ کا خیال ہے کہ میں یہاں ٹریکنگ کے لیے آیا ہوں؟ یا نانگا پربت پر چڑھنے والا ہوں؟ کے ٹو سر کرنے والا ہوں۔'' اس نے ہنستے ہوئے کہا ''میں تو خود جلد واپسی کی سوچ رہا ہوں۔''

''لیکن میں سوچ رہا ہوں کہ بائی روڈ جایا جائے؟''

''یہ خیال بھی برا نہیں ہے۔ میں آپ کو پنڈی تک پہنچا سکتا ہوں۔ کئی بار مسافر لے کر جاچکا ہوں۔'' مرجس بولا۔

''لیکن تمہاری سوزوکی اتنی اعلیٰ تو ہے نہیں کہ اس پر اتنا لمبا سفر کیا جائے۔'' سفیر نے دخل دیا۔

''میں نے یہ کب کہا ہے کہ میں سوزوکی پر جاؤں گا۔ میرے ایک جاننے والے ٹرانسپورٹر کے پاس ہائی لیکس ہے۔ وہ میں اکثر کرایہ پر لیتا رہتا ہوں۔''

"تمہارے گھر والے؟" میں نے اس کی باتوں میں دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

"ایک ماں تھی اس کا بھی پچھلے دنوں انتقال ہو گیا۔ گویا میں اکیلا ہوں۔ شادی کے لیے ابھی ابھی ایک لڑکی دیکھی ہے۔ پیسا جمع ہوتے ہی اسے دلہن بنا کر لے آؤں گا۔"

"تو پھر تم ایسا کرو آج ہی جا کر اپنے دوست سے بات کرلو۔ اگر وہ پیشگی کرایہ مانگے تو دے دینا۔" کہہ کر میں نے ہزار ہزار کے دس نوٹ اس کی طرف بڑھا دیے۔

"اتنے روپے کی ضرورت نہیں۔ صرف تین ہزار دے دیں۔ وہی بہت ہوگا۔" اس نے ہاتھ بڑھائے بغیر کہا۔

"زیادہ رقم اس لیے دے رہا ہوں کہ ٹنکی بھی بھروالینا اور دیگر ضروری چیزیں بھی لے لینا۔" پھر میں نے گردن موڑ کر ریاست خان سے پوچھا۔ "تمہارا ارادہ کیا ہے؟"

اس نے دکھی لہجے میں جواب دیا "ابھی آپ لوگوں سے دل بھرا نہیں اور آپ جانے کی کہہ رہے ہیں۔ جانا تو مجھے بھی ہے۔ اگر مناسب سمجھیں تو اپنے ساتھ لے لیں۔"

"تمہارے ساتھی؟"

"وہ بھی ساتھ چلیں گے۔"

"چار ہم ہیں' چار تم اور تین وہ' یعنی ہمارے قیدی۔ ہائی لیکس میں اتنے آدمی اور سفر لمبا؟"

ریاست خان نے کہا "وہ موٹا باڈی بلڈر اور اس کے ساتھی کو میں جانتا ہوں۔ وہ دونوں مقامی غنڈے ہیں۔ ان کو ساتھ لے جانا ضروری بھی نہیں ہے۔ انہیں امداد شاہ نے پیسوں کے عوض بلایا ہوگا۔"

"جی ہاں۔ ان دونوں کو میں بھی جانتا ہوں۔ وہ دونوں بس اسٹاپ پر غنڈا گردی کر کے پیسے کماتے ہیں۔" مرجس نے بھی تائید کردی۔

"ڈن... تم لوگ بھی ہمارے ساتھ چلو گے۔ ہم یہاں سے صبح نماز کے بعد چلیں گے۔" میں نے ریاست خان کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر تھپکی دی۔ اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ گویا وہ میری اس فیصلے سے خوش تھا۔ سفیر لاتعلق سا بنا بیٹھا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ جا کر ڈاکٹر سے بات کرے۔ اگر ڈاکٹر اجازت دے دے تو اسے بھی ساتھ لے لوں گا۔ سفیر اٹھ کر چلا گیا۔ جب واپس آیا تو اس کے ساتھ ڈاکٹر بھی تھا اس نے کہا:

"اگر آپ لوگ ضد کریں گے تو میں اجازت دے دوں گا لیکن ایسا آپ کو اپنی ضمانت پر کرنا ہوگا۔ اس لیے کہ یہ اس وقت تو صحیح نظر آرہے ہیں لیکن ابھی کسی لمبے سفر پر انہیں لے جانا مناسب نہیں ہے۔ اندرونی چوٹ زیادہ ہے جو خطرے کا باعث بن سکتا ہے اس لیے میرا مشورہ ہے ابھی کم از کم ایک ہفتہ انہیں شہر سے باہر نہ لے جائیں۔ انہیں بیڈ ریسٹ کی بہت زیادہ ضرورت ہے۔"

ڈاکٹر کی باتوں نے ریاست خان کو اداس کر دیا۔ وہ مرجھا سا گیا تھا۔ میں نے اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر کہا "یوں سمجھ لو ہم چلتے چلتے تمہیں نظر آگئے تھے۔ ایسے لاکھوں لوگ راہ میں ملتے ہیں اور بچھڑ جاتے ہیں۔ اگر اللہ کو منظور ہوگا تو پھر ملاقات ہو جائے گی۔ جاتے وقت تمہارے اخراجات کے لیے میں صغیر کو پچاس ہزار روپے دے جاؤں گا۔ علاج ہو جائے تو پنڈی آجانا اگر قسمت میں ہوگی تو ملاقات بھی ہو جائے گی۔"

ریاست خان باضابطہ رونے لگا تھا۔ بڑی مشکل سے اسے چپ کرایا اور باہر نکل آیا۔ سفیر ساتھ تھا اس کے پیچھے مرجس تھا۔ ہم تینوں باہر نکلے تو مرجس نے کہا۔ "آپ یہیں ٹھہریں۔ میں سوزوکی لے کر آتا ہوں۔"

اس کی سوزوکی پر بیٹھ کر ہم اس مکان میں پہنچے جہاں صغیر وغیرہ منتظر تھے۔ وسیم میرے ہی انتظار میں بیٹھا تھا۔ میرے ساتھ مرجس کو دیکھ کر اس نے پوچھا "اس سے بات کرلی؟"

"ہاں بات ہوگئی ہے۔" میں نے ہنس کر کہا "اور ہم صبح ہی نکل رہے ہیں۔"

"گڈ... یہاں سے کہاں جانے کا ارادہ ہے؟"

"پنڈی لیکن اس سے پہلے میں چاہوں گا کہ تم ایاز کو پنڈی بلا لینا۔ گو کہ اس وقت ایاز کا متبادل ہمارے پاس ہے۔ یہ مرجس کام کا بندہ لگ رہا ہے لیکن ایاز کی بات ہی کچھ اور ہے۔ یوں بھی مرشد سے مقابلہ ہے تو ہمیں پوری طرح ہوشیار رہنا ہوگا۔" میں نے سفیر سے کہا۔

"او کے میں اسے کال کرتا ہوں۔ اسی بہانے مونا سے بھی باتیں ہو جائیں گی۔" سفیر نے ہنستے ہوئے کہا۔

"او بھائی! ایاز اپنے ورک شاپ پر ہوگا اور مونا حویلی میں۔"

"کیوں آپ کو بتایا نہیں تھا کہ ایاز اور شاہین کو انکل نے حویلی بلوالیا تھا۔ شاید اب بھی وہ وہیں ہو۔" سفیر نے کہا۔

"یوں کہتے ہوئے شرم آتی ہے کہ مونا سے بات

کرنے کا بہانا چاہیے۔'' وسیم نے چوٹ کی۔
''جل کیوں رہے ہو۔ تمہیں اس لیے نہیں کہا گیا کہ تم سادی سے گھنٹے بھر باتیں شروع کر دو گے۔'' سفیر نے وار کر دیا۔
''سادی سے میں نے ایک دو منٹ سے زیادہ کبھی بات ہی نہیں کی۔ جب کہ تم... دکھاؤں کال رجسٹر میں ٹائم!''
''ارے ارے تم دونوں تو لڑنے بیٹھ گئے۔'' میں نے مداخلت کی۔
''کیا کریں، ہم ایک دوسرے پر چوٹ کر کے یاد دلاتے ہیں کہ کوئی آپ کی کال کے انتظار میں بھی بیٹھا ہے۔ کبھی اسے بھی یاد کر لیا کریں۔'' وسیم نے کہا تو مجھے یاد آ گیا کہ ابھی تک میں نے سویرا سے بات نہیں کی ہے۔ مونا اور سعدیہ سے اسے معلوم ہو چکا ہوگا کہ میں وادی سے لوٹ آیا ہوں۔ یہ میری نا اہلی تھی کہ اب تک میں نے اسے کال نہیں کی۔ واقعی وہ کیا سوچتی ہوگی۔ ضرور ناراض ہو رہی ہو گی کہ میں نے اسے کال کیوں نہیں کیا۔ سویرا کا خیال آیا تو میں نے سفیر سے کہا ''ٹھیک ہے۔ تم دونوں لڑتے ہو۔ میں نہیں چاہتا کہ کوئی بات پیدا ہو اس لیے میں خود ہی کال کر لیتا ہوں۔''
''آمین..... پتھر میں جونک لگ ہی گئی۔ ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ آپ سو بار کال کریں۔ ہمارا کیا ہے۔ ہم غریب لوگ ہیں جب دل کرے گا دس بیس یونٹ خرچ کر دیں گے۔'' وسیم نے مسکرا کر جواباً کہا۔
انہیں ہنستا ہوا چھوڑ کر میں باہر نکل آیا۔ میرے موبائل میں وہ نمبر تھا جو وادی میں جانے سے پہلے سویرا نے دیا تھا کہ یہ نمبر اس کے پاس رہتا ہے۔ میں نے اس نمبر کو پش کیا اور موبائل کان سے لگا لیا۔ دوسری طرف بیل بج رہی تھی لیکن کال ریسیو نہیں ہو رہی تھی۔ میں مایوس ہو کر کال ڈسکنکٹ کرنے والا تھا کہ کال ریسیو ہو گئی۔ ''السلام علیکم۔'' ادھر سے آواز آئی تھی کہ میں نے کہا۔ ''کیا بات ہے اتنی دیر بعد کال ریسیو کی؟''
''میں کچن میں تھی اور وہاں امی بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان کے سامنے کال کیسے ریسیو کر لیتی۔''
''تو کیا انہوں نے بیل نہیں سنی ہو گی؟''
''سوال ہی نہیں ہے۔ میں نے بیل بند کر رکھی ہے۔ وائبریٹ سے پتا چلتا ہے کہ کال آ رہی ہے۔ جس دن سے مونا نے بتایا ہے کہ آپ واپس آ گئے ہیں میں اسی دن سے ہر وقت موبائل اپنے ساتھ رکھتی ہوں۔''
''یہ اچھی بات ہے۔'' میں نے جواب دیا۔
''اور یہ کون سی اچھی بات ہے کہ اتنے دن بعد کال کر رہے ہیں۔''
''اتنے دن بعد.... اللہ کا خوف کرو بی بی پرسوں تو وادی سے نکلا ہوں۔ وہاں سگنل نہیں تھا۔ کل کا دن کچھ مصروف گزرا اور آج موقع مل ہی گیا۔''
''سفیر اور وسیم کو کیسے موقع مل گیا کہ انہوں نے پہلی فرصت میں فون کر کے اطلاع دے دی۔''
''وہ لوگ یہاں مجھ سے ایک دن پہلے آ گئے تھے۔ میں صبح پہنچا ہوں۔ دن بھر بھاگ دوڑ رہی۔ اب جا کر موقع ملا ہے۔ وہاں کے حالات کیا ہیں؟''
''یہاں سب صحیح ہے۔ بابا نے حفاظتی انتظام انتہائی سخت کر رکھا ہے اس لیے اب تک کوئی بات ہوئی نہیں ہے... ویسے آپ آ کب رہے ہیں؟''
''بہت جلد اور ہمیشہ کے لیے؟''
''میں پھر کہوں گی کہ ان تمام جھگڑوں سے خود کو الگ کر لیں۔ یہاں آ کر بیٹھ جائیں۔ یہاں آپ کے دشمن تو کیا ان کے فرشتے بھی پہنچ نہیں پائیں گے۔ اگر آ بھی گئے تو بچ کر نہیں جائیں گے۔ الیکٹرونک آلات سے حویلی قلعہ میں تبدیل ہو گئی ہے۔''
''بہت جلد آنے والا ہوں۔ انشا اللہ جلد تم مجھے اپنے سامنے پاؤ گی۔''
''آپ کے پاس وعدوں کے علاوہ ہے ہی کیا۔'' سویرا کے لہجے میں ناراضگی کا عنصر در آیا تھا۔
''یقین کرو ان دنوں دل میں رہ رہ کر کسک سی ہو رہی ہے۔ کافی عرصہ سے ماں جی کی ڈانٹ نہیں کھائی اور نہ ان کے ہاتھ کا بنا ساگ ملا ہے۔''
''اور کوئی یاد نہیں آتا۔'' وہ روانی میں بول گئی۔ عورت خواہ کتنا ہی پڑھ لکھ لے۔ کتنا ہی ترقی کر لے لیکن اس کے اندر چاہے جانے کا جو جذبہ ہوتا ہے وہ کبھی مرتا نہیں ہے۔ موقع ملتے ہی باہر آ جاتا ہے۔ اس بات کا اثر میرے دل پر ہوا، میں کچھ بولتا مگر خود اسے احساس ہو گیا تھا کہ وہ کچھ غلط بول گئی ہے۔ اس نے فوراً تصحیح کی ''اس گھر میں بابا بھی ہیں جو منہ سے کچھ نہیں کہتے لیکن ان کی نگاہیں کہتی ہیں کہ وہ آپ کے آنے کی راہ دیکھ رہے ہیں۔''
اس کی بات سے میں نے بات نکالی ''ہاں بابا بھی یاد آتے ہیں ان کے علاوہ ایک اور ہستی بڑی شدت سے یاد

آتی ہے۔''

''کون؟'' اس نے چونک کر پوچھا۔

''ابھی اگر بتا دیا تو تم جل بھن کر کباب ہو جاؤ گی۔ اس کی یاد ہی تو میرا سرمایہ ہے۔ سوتے جاگتے میں بس اسے ہی یاد کرتا ہوں۔'' میں نے ڈرامائی انداز میں جواب دیا۔

میرا مفہوم وہ سمجھ گئی تھی پھر بھی وہ پوچھنے سے خود کو روک نہ سکی۔ اس نے کہا ''وہ ہے کون جس کے نام سے میں جل بھن سکتی ہوں۔''

''اگر نام بتا دیا تو انعام میں کیا دو گی۔''

''میں شرط لگانا پسند نہیں کرتی۔ اگر مجھے الجھن سے بچانا چاہتے ہیں تو نام بتا دیں۔ میں ماں جی سے کہہ کر اس کے لیے کوئی انتظام کرا دوں گی۔'' اس کے لہجے میں شوخی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ بات کی گہرائی تک پہنچ چکی ہے اسی لیے وہ اس بات کو اتنا ہلکا لے رہی ہے۔

''اچھا جب تم کہتی ہو تو میں نام بتا دیتا ہوں۔ وہ۔'' کہتے کہتے میں رک گیا۔

''جی بول ہی دیں۔'' اس نے شوخ لہجے میں دوبارہ کہا۔

''وہ تم ہو۔'' میں نے کہا تھا کہ وہ بولی:

''دل رکھنے کو ایسا کہنا آپ کی پرانی عادت ہے۔ اگر مجھ سے ملنے کی چاہ ہوتی تو اب تک میری بات مان چکے ہوتے۔ یہ سب کچھ چھوڑ کر گھر آ چکے ہوتے۔''

''یقین کرو سویرا میں دل سے یہی چاہتا ہوں لیکن مجبور ہوں۔ میرا حال یہ ہے کہ میں کمبل کو چھوڑنا چاہتا ہوں لیکن کمبل ہی مجھے نہیں چھوڑتا۔'' میں نے گہری سانس لی پھر کہا ''لیکن اب میں خود بھی یہی چاہ رہا ہوں۔ انشا اللہ بہت جلد یہ قصہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا پھر ہم ہوں گے اور تاروں بھرا آسمان ہوگا۔ کسی کا سر ہوگا اور میرا کاندھا ہوگا۔''

''بس بس آپ کچھ زیادہ نہیں بولنے لگے ہیں۔''

''اتنے دنوں سے جتنی باتیں میں سوچتا رہا ہوں وہ سب کہہ دیں۔ اب تم اسے جو سمجھو... لیکن یقین کرو کہ میں خود بھی اکتا چکا ہوں۔''

''اچھا اچھا اب میں فون بند کر رہی ہوں۔ کافی دیر سے ماں جی کچن میں اکیلی ہیں۔ اگر موقع ملے تو رات میں کال کر لیجیے گا۔'' کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔

کچھ دیر تک میں اس فون کو ہتھیلی پر رکھے دیکھتا رہا جیسے وہ پھر سے جاگ پڑے گا۔ سویرا کی آواز پھر سے آنے لگے گی۔ آج میں نے جس طرح کھل کر دل کی بات کہی تھی ایسا پہلے کبھی کہہ نہیں پایا تھا۔ شاید یہ سویرا سے دوری کا اثر تھا یا پھر وادی میں گزرے دنوں کا اثر تھا کہ میں یکایک بے باک ہو گیا تھا۔ پتا نہیں سویرا نے اسے کن معنوں میں لیا ہے، کہیں میری وقعت اس کی نظروں میں گر نہ گئی ہو، وہ سمجھی ہو کہ باہر کی ہوا مجھے بھی لگ گئی ہے' مزاجاً گراوٹ کا شکار ہو گیا ہوں۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ تیر کمان سے نکل چکا تھا اور مجھے خلجان میں مبتلا کر گیا تھا۔ میں نے ایک گہری اور ٹھنڈی سانس لی پھر ذہن کا رخ تبدیل کرنے کے لیے میں نے پنڈی کال کی۔ کچھ دیر تک گھنٹی بجتی رہی پھر ادھر سے آواز آئی ''ہیلو کون بول رہا ہے؟''

''تمہارا بخار.... کیا حال ہے؟''

ادھر سے جلے بھنے انداز میں جواب آیا ''یا اللہ خیر۔ میں تو فاتحہ پڑھ چکا تھا۔ بس دیگ منگوانی تھی لیکن کوئی تگڑا موکل پھنسا ہی نہیں ویسے تو بول کہاں سے رہا ہے؟ عدم آباد سے یا جہنم کے دروازے سے.... جو بولنا ہے جلدی بول اور میرا پیچھا چھوڑ.... تیری وجہ سے کسی کل آرام نہیں۔ خواب میں بھی اب تُو آنے لگا ہے۔ میں ایک کمزور دل آدمی ہوں۔ اس لیے میرا پیچھا اب چھوڑ ہی دے۔''

''بول تو رہا ہے.... خواہ مخواہ میرا بیلنس ضائع کر رہا ہے اور الزام مجھ پر رکھ رہا ہے۔ فون بند کرتے ہی میں دوسرا نمبر ڈائل کرنے والا ہوں۔ بیل تیرے گھر میں بجے گی اور فون ریسیو کرے گی شازیہ پھر کیا ہوگا اس کا اندازہ خود تجھے بھی ہے۔''

''مجھے دھمکی دے رہا ہے۔ جا میں اب تیرا کیس نہیں لے رہا ہوں۔ خود ہی پیشی بھگتنا۔ اتنی دوڑ بھاگ میں نے کی اس پر لعنت بھیجتا ہوں۔ ابھی میں اپنے اسسٹنٹ کو فون کر کے کہتا ہوں وہ وکالت نامہ واپس لے آئے۔''

''اور کیا کرے گا؟ یہ بھی تو بول۔''

''دیکھ اس وقت میں فش فرائی کھانے آیا ہوں تیری باتیں سن کر کانٹے بھی کھا جاؤں گا۔''

''ہوٹل کا نام بتا میں ابھی فون کر کے تیری بیوی کو بھیجتا ہوں۔ تیرے ساتھ جو بھی ہوگی وہ اس سے خود ہی نمٹ لے گی۔''

''میرا نام ندیم ہے۔ اتنی کچی گولیاں نہیں کھیلتا۔ ہوٹل کا نام معلوم کرنا ہے تو خود آ جا۔ پہلے یہ بول تو بول کہاں سے رہا ہے؟''

''منہ سے بول رہا ہوں... اب تو بول۔ فون

لگا دوں۔"

"تو مل جائے نا... اچھا یہ بول تو ہے کہاں؟"

"میں کل پنڈی آ رہا ہوں۔ ایک گھر کی ضرورت ہے۔ جتنی جلدی ممکن ہو انتظام کر لے۔"

"تو سمجھتا کیوں نہیں ہے۔ چشتی کے چاہنے والے ابھی بھی پولیس ڈپارٹمنٹ میں ہیں۔ اگر کسی نے دیکھ لیا نا تو سمجھ لے تیرا وہ حشر کریں گے کہ بیان نہیں کیا جا سکتا۔"

"مار دھاڑ اٹھا پٹخ کی مجھے پروا نہیں۔ قانونی پیچیدگی سلجھانے کے لیے تو موجود ہے۔ اس لیے جو میں کہہ رہا ہوں وہ کر ورنہ تیری بیوی کو کال لگا دوں گا۔"

"اچھا اچھا میں دیکھتا ہوں۔ کب تک تیری تشریف آئے گی؟"

"کل میں پنڈی میں ہوں گا۔ تیرے گھر کھانا کھاؤں گا۔ دس آدمیوں کا کھانا بنا کر رکھنا۔"

"او کے اب بس بھی کر دے۔ میں ایک ہوٹل میں بیٹھا ہوں۔"

"او کے بائی۔ اب کل ملاقات ہو گی۔" کہہ کر میں نے فون بند کر دیا۔ ندیم سے بات کر کے ذہن پر چھائی گرد صاف ہو گئی۔ میں نے گھر کی بات یوں ہی کہہ دی تھی ورنہ اس کام کے لیے عبداللہ اور وسیم کافی تھے۔ منٹوں میں وہ مکان تلاش کر سکتے تھے۔ میں ہنستا ہوا واپس کمرے میں آیا جہاں وسیم میرا منتظر تھا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا کہ دل ٹھنڈا ٹھار ہو گیا اب کسی اور بات کی ضرورت بھی نہیں۔ ایک میں ہی بدقسمت بندہ ہوں جس کو یہ تک نصیب نہیں کہ وہ اپنی قانونی بیوی سے دل کی کوئی بات کر لے۔

"ایسا کرنا۔" سفیر نے وسیم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "اس بار جب سعدیہ سے ملاقات ہو تو اسے ایک کمرے میں لے جا کر بیڈ پر بٹھا دینا اور دن بھر اس کے چہرے کو گھورتے رہنا۔ اتنا دیکھنا .... کہ آنکھوں کی روشنی جواب دے جائے۔"

"اچھا تو اس کام کا بھی تجربہ ہے۔ واہ۔ پہلے کیوں نہیں بتایا کہ ایسا کر چکے ہو۔" وسیم نے چوٹ کی۔

"مجھے کبھی مونا سے اتنی الفت محسوس ہی نہیں ہوئی ورنہ کر بیٹھتا۔"

"اچھا یہ بات ہے۔ میں مونا سے ضرور ذکر کروں گا کہ تم سے اسے الفت ہی نہیں۔"

"اور وہ تمہارے سر پر گومڑ ابھار کر کہے گی کہ مجھے تو ان سے الفت ہے تم چیک کرنے والے کون ہوتے ہو۔"

ان دونوں کی لایعنی بحث مزید طوالت اختیار کرے اس سے پہلے میں نے مداخلت ضروری سمجھی اور کہا۔ "اگر تم لوگ خاموش ہو جاؤ تو میں ایک بات کہوں۔"

"ارشاد ارشاد۔" وسیم نے جواباً کہا۔

"ہم انسان ہیں اور ہمارے لیے غذا ضروری ہے تو کیوں نا عبداللہ مرجس کے ساتھ جا کر کچھ کھانے پینے کا سامان لے آئے۔"

عبداللہ کھڑا ہو گیا۔ اس نے مرجس کی طرف دیکھا تھا کہ وسیم بولا "ایسا کرتا ہوں میں عبداللہ کے ساتھ چلا جاتا ہوں۔"

مرجس نے بغیر مانگے سوزوکی کی چابی اس کی طرف بڑھا دی۔ وسیم چابی لے کر عبداللہ کے ساتھ باہر نکل گیا۔ ان کے باہر نکلتے ہی میں نے کہا "کل ہم لوگ پنڈی میں ہوں گے۔"

"یہ تو ہمیں معلوم ہے نئی بات کیا ہے؟" سفیر چہکا "یہاں سے چلیں گے تو پنڈی پہنچ ہی جائیں گے۔"

"وہاں ٹھہریں گے کہاں، اس بارے میں بھی اپنا خیال پیش کرو۔"

"کہیں اور ٹھہرنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ راجا صاحب کا بنگلا ہے نا۔" سفیر نے کہا۔ "راجا صاحب کے گھر والوں کو اتنی جلدی اس بنگلے کا خیال نہیں آئے گا۔ تب تک ہم اس بنگلے کو استعمال کر سکتے ہیں۔"

"لیکن وہ بنگلا مرشد کی نظروں میں ہے اور نمٹنا اسی سے ہے۔" میں نے کہا۔

"یہ تو بعد کی بات ہے ابھی ہم وہاں جا کر ایک دو دن تو آرام کر سکتے ہیں۔ بعد کی بات بعد میں دیکھی جائے گی۔ وسیم کا وہ دوست جو اسٹیٹ ایجنٹ ہے اس کے ذریعہ کسی اچھے علاقے میں فرنشڈ گھر لے لیں گے۔"

"ایک گھر وہ والا ملا تھا نا جہاں کا مالک فرنشڈ گھر دے کر لوٹ لیا کرتا تھا، وسیم ایسا ہی گھر دلائے گا۔" میں نے ہنس کر جواب دیا۔ "تم تو ایسا ہی گھر ڈھونڈو گے جہاں سے ڈاکوؤں کی دولت ہاتھ آئے۔"

باتیں ابھی جاری تھیں کہ باہر ایک زوردار دھماکا ہوا اور پھر دروازے سے گولیوں کی بوچھار ٹکرائی۔ سفیر زور سے چیخا۔ "سب زمین پر لیٹ جائیں۔"

صغیر، اللہ ڈینو، جیدے نے زمین پر لیٹنے میں دیر نہیں لگائی۔ سفیر نے لیٹتے ہی دیوار کی طرف لڑھکنا شروع کر دیا تھا۔ تا کہ دروازے سے آنے والی کوئی گولی مزاج نہ پوچھ

لے۔

صرف ایک برسٹ چلا تھا پھر خاموشی چھا گئی تھی۔ کچھ دیر انتظار کے بعد میں اپنی جگہ سے اٹھا اور دیوار سے لگ کر کھڑکی تک پہنچا۔ احتیاطاً میں نے صغیر کی اتری ہوئی شرٹ کو کھڑکی کے سامنے لہرا کر جھٹکے سے ہٹایا۔ لیکن باہر کوئی نہیں تھا۔ اگر ہوتا تو فائر ضرور آتا۔ جب باہر کوئی تغیر نظر نہیں آیا تو میں نے کھڑکی سے جھانکا۔ سڑک پر بہت سارے تماشبین کھڑے تھے۔ سب کی نظریں اسی گھر پر ٹکی تھیں۔ مجھے کھڑکی پر دیکھ کر کئی افراد نے کچھ کہا تھا۔ ایک تو وہ لوگ دور تھے پھر شینے زبان میں بول رہے تھے جو میری سمجھ سے باہر تھی۔ میں نے مڑ کر مرجس سے کہا۔ ''یار تم اپنی زبان میں ان سے پوچھو کہ ہوا کیا ہے؟''

مرجس کھڑکی پر آنے کے لیے اٹھا تھا کہ میں نے کہا ''یہاں سے نہیں، باہر جا کر پتا کرو۔ میں بھی ساتھ چل رہا ہوں۔''

پہلے میں باہر نکلا پھر مرجس۔ مرکزی دروازے سے باہر جو چار دیواری تھی۔ اس کے گیٹ پر تباہی کے آثار نظر آئے۔ لکڑی کا آرائشی ستون بارود سے جلا ہوا تھا۔ دیوار بھی کریک ہوگئی تھی۔ لگتا یوں تھا جیسے دیسی ساختہ کریکر استعمال کیا گیا ہے۔ یہ بات سمجھ میں آچکی تھی کہ حملہ آور صرف دھمکانا چاہتے تھے۔ یہ کون لوگ ہو سکتے تھے یہ بھی سمجھ سے باہر تھا۔ اس لیے کہ ابھی تک ایسا کوئی دشمن نظروں میں نہیں تھا۔ اس نئے علاقے میں کون ہماری جان کا دشمن بن چکا ہے یہ اس وقت سمجھ نہیں آرہا تھا۔ اندازہ یہی تھا کہ امداد شاہ کے لوگ جاگ اٹھے ہیں۔ میں سڑک کی جانب بڑھنے لگا۔ وہاں کھڑے تماشبین ہمیں اس طرح سے گھور رہے تھے جیسے ہم عجوبہ ہیں۔ سڑک پر پہنچتے ہی میں نے مرجس کو آنکھ سے اشارہ دیا۔ وہ آگے بڑھا اور ایک شخص سے شینے زبان میں کچھ بولا۔ جواب میں اس نے جو کچھ کہا اسے سن کر مرجس میری طرف مڑ کر بولا ''دو بائیک پر چار لوگ تھے۔ وہ اس طرف سے آئے اور فائرنگ کرتے ہوئے نکل گئے۔ پیچھے والی بائیک پر بیٹھے شخص نے کوئی چیز دروازے کی جانب اچھالی تھی جس کے بعد دھماکا ہوا تھا۔''

''ان سے پوچھو کہ وہ لوگ دیکھنے میں کیسے تھے۔ کیا مقامی تھے یا....؟'' میں نے مرجس سے کہا۔

اس نے شاید وہی کچھ پوچھا تھا پھر مڑ کر مجھ سے اردو میں بولا ''وہ لوگ ایک سیکنڈ کے لیے بھی رکے نہیں تھے۔ چلتی گاڑی سے یہ کارروائی ہوئی تھی۔''

میں اب سمجھ چکا تھا کہ یہ صرف دہشت پھیلانے کے لیے کیا گیا ہے۔ میں نے مڑ کر کہا ''سفیر کہاں رہ گیا؟ یہ کچھ اور کھیل لگ رہا ہے۔''

''مجھے بھی ایسا ہی لگ رہا ہے۔'' کہتے ہوئے وہ مڑا اور پھر بولا ''لگتا ہے سفیر اندر ہی ہے۔ میں ابھی بلا کر لاتا ہوں۔''

وہ مڑا تھا کہ میں نے کہا۔ ''اندر جا کر تیاری کرو۔ ہمیں ابھی اور اسی وقت یہ علاقہ چھوڑنا ہوگا۔ یوں بھی دھماکے کی وجہ جاننے کے لیے پولیس والے آتے ہوں گے۔ ہمیں ان بکھیڑوں سے بچنا ہے۔''

ہم واپس کمرے میں پہنچے تو کمرا خالی پڑا تھا۔ نہ صغیر تھا نہ جیدے اور نہ اللہ ڈینو۔ سفیر بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ میں نے ایک کے بعد ایک تمام کمرے دیکھ ڈالے لیکن کسی کا بھی پتا نہیں تھا۔ تبھی میری نظر عقب میں کھلنے والی کھڑکی پر پڑی۔ اس کھڑکی کی گریل کٹی ہوئی تھی۔ جس سے کوئی بھی شخص اندر بہ آسانی داخل ہو جائے۔ میں نے اس کھڑکی پر پہنچ کر باہر جھانکا۔ عقب میں میدان تھا۔ کچی مٹی کچھ گیلی تھی اس لیے کسی گاڑی کے ٹائر کا نشان صاف نظر آرہا تھا۔ جب ہم باہر تھے تو کچھ لوگ اس راستے سے اندر داخل ہوئے اور امداد شاہ کو بشمول اللہ ڈینو، جیدے، صغیر کو ساتھ لے گئے۔ انہوں نے بہت عام طریقہ استعمال کیا تھا۔ یہ انسانی نفسیات ہے کہ دھماکا ہوتے ہی لوگ دھماکے کی وجہ جاننے میں لگ جاتے ہیں۔ اسی بات کا ان لوگوں نے فائدہ اٹھایا اور اپنے آدمیوں کو لے گئے، مگر سفیر کہاں گیا؟ کیا وہ لوگ اسے بھی قیدی بنا کر لے گئے؟ میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹی سی بج اٹھی۔ اب وہ لوگ اس پر تشدد کریں گے۔ جتنی آسانی سے وہ لوگ سب کو لے گئے یہ حیرت کی بات نہیں تھی۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ سفیر ان کے ساتھ اتنی آسانی سے کیسے چلا گیا۔ وہ اکیلا بھی کئی ایک کو سنبھال سکتا تھا۔ پھر اتنی خاموشی کے ساتھ وہ کیسے چلا گیا۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ مرجس نے سوالیہ انداز میں ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا ''یہ سب کہاں گئے؟''

''یہی تو میں سوچ رہا ہوں۔ ہم بمشکل دس منٹ کے لیے باہر گئے اور ادھر یہ کارروائی ہوگئی۔ امداد شاہ، صغیر، اللہ ڈینو، جیدے سب غائب ہوگئے۔ سفیر بھی غائب ہے۔''

''میرا خیال ہے کہ سفیر بھائی کو کوئی سراغ ملا اور ان کے پاس وقت نہیں ہوگا ہمیں بلانے کا اسی لیے وہ اکیلے ہی نکل گئے۔ ان کے تعاقب میں گئے ہوں گے۔'' مرجس نے

اپنا خیال پیش کیا۔اس کی بات میں دم تھا۔ایسا ہو سکتا تھا۔سفیر ان کے تعاقب میں لگ گیا ہوگا۔

''سر ایک عجیب سی میٹھی میٹھی بو ہوا میں کہاں سے آ رہی ہے؟'' مرجس نے گہری گہری سانس لے کر کہا۔

اندر آتے ہی ذہن الجھ گیا تھا اس لیے میں نے اس بو کو محسوس نہیں کیا اب اس نے توجہ دلائی تو یاد آیا کہ یہ بُو میتھول پروپیر ایتھر کی ہے۔اب ساری بات سمجھ میں آ گئی تھی۔باہر سے گیس کا گولا پھینکا گیا۔کمرے میں گیس پھیلی' اندر والے بے ہوش ہوگئے اور وہ لوگ انہیں اٹھا کر لے گئے۔یہ کارروائی عام لوگوں کی ہو ہی نہیں سکتی۔معمولی غنڈے بدمعاش ایسی چیزیں استعمال کب کرتے ہیں۔ضرور اس کے پیچھے کوئی منظم گروہ ہے۔امداد شاہ کسی معمولی گروہ کا کارندہ نہیں ہو سکتا۔اس کے ساتھ کوئی بڑا گروہ ہے۔اس سے نمٹنا آسان نہیں ہوگا پھر ان کی قید میں سفیر ہے۔سفیر کتنا ہی جی دار کیوں نہ ہو وہ گیس کے اثر سے لڑ نہیں سکتا۔دشمن اسے بھی اغوا کر کے لے گئے ہیں۔سفیر میرے لیے بہت اہم ہے اسے بازیاب کرانا ضروری ہے۔اب مجھے کیا کرنا چاہیے اس پر میں غور کرنے لگا۔

میرے پاس ہتھیار کے نام پر صرف دو پستول تھے۔ایک امداد شاہ اور دوسرا ریاست خان سے چھینا ہوا۔میں نے مرجس سے پوچھا''کیا یہاں اسلحہ مل سکتا ہے؟''

''کس قسم کا اسلحہ؟''

''جدید قسم کا اس لیے کہ ہمیں مقابلہ کرنا ہے۔ہمارے دشمن بہت طاقتور ہیں۔جب وہ جدید طریقہ کار استعمال کر سکتے ہیں تو ان کے پاس اسلحہ بھی انتہائی جدید ہوگا۔میرا ساتھی ان کی قید میں ہے اس لیے ہم آرام سے بیٹھ نہیں سکتے۔دو دو ہاتھ کرنا ہی ہوگا۔''

''میں ایک ایسے شخص کو جانتا ہوں جو اسلحہ کی تجارت کرتا ہے۔اس سے بات کرتا ہوں۔'' مرجس نے کہا۔

''تو پھر دیر نہ کرو ابھی جا کر بات کرو بلکہ یہ کچھ پیسے لیتے جاؤ۔اگر آٹومیٹک گنز مل جائیں تو ہاتھ کے ہاتھ لیتے آنا۔'' کہہ کر میں نے اسے ہزار کے نوٹوں کی ایک پوری گڈی دے دی۔اتنی بڑی رقم ہاتھ میں لیتے ہوئے اس کے چہرے پر زلزلے کی سی کیفیت تھی۔شاید اس نے زندگی میں پہلی بار اتنی بڑی رقم دیکھی تھی۔میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا''پنڈی پہنچ کر ہم تمہیں بطور انعام اس سے بڑی رقم دیں گے۔''

''جی...میں ابھی ایک گھنٹے میں آ جاؤں گا۔آپ لوگ فکر نہ کرنا۔'' کہہ کر مرجس نے دروازہ کھولا ہی تھا کہ باہر سے فائر ہوا۔یہ تو اس کی قسمت اچھی تھی کہ دروازہ کھولتے ہوئے وہ آگے بڑھتے بڑھتے رک کر میری طرف مڑا تھا۔شاید کچھ پوچھنا چاہتا تھا۔گولی نے دروازے میں سوراخ کر دیا تھا۔فائر ہوتے ہی وہ خوف سے زمین پر گرا تھا اور ہم نے سمجھا کہ اسے گولی لگی ہے۔میں پھرتی سے اس کی طرف کھسکتے ہوئے پہنچا۔اس کے جسم کو ہاتھ لگایا ہی تھا کہ وہ چیخا۔شاید اس پر خوف حاوی ہوگیا تھا۔میں نے پوچھا۔''زخم تو نہیں لگا ہے نا؟''

''جی...جی نہیں۔'' اس کی آواز میں خوف تھا۔اب تک مجھے جتنے ساتھی ملے تھے یہ ان میں سب سے بزدل ثابت ہو رہا تھا۔میں اسے کھینچتے ہوئے پیچھے لے کر آیا پھر اسے اٹھا کر بٹھا دیا۔

وہ بیٹھ تو گیا تھا لیکن اس کے چہرے پر اب تک خوف کی پرچھائیں لرزاں تھیں۔اس نے دھیمے لہجے میں کہا''ایسا پہلی بار ہوا ہے۔اس لیے خوفزدہ ہوگیا تھا۔ویسے اب ٹھیک ہوں۔''

''میرے یار ایسے ڈرو گے تو یہ دنیا جینے نہیں دے گی۔جو ڈر گیا سمجھو وہ مر گیا۔اس دنیا میں جینا ہے تو لڑنا سیکھو، بزدلی انسان کی موت ہے۔'' میں نے ناصح بن کر مشورہ دیا۔

''لگتا ہے آپ لوگوں کے ساتھ رہ کر میں بہادر بن ہی جاؤں گا۔پہلی بار مجھ پر فائر ہوا اسی لیے ڈر گیا تھا۔اب میں ٹھیک ہوں۔'' اس نے پھیکی ہنسی ہنس کر کہا۔''مگر یہ بات سمجھ نہیں آئی کہ کسی کو مجھ سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے۔''

''دشمنی تم سے نہیں ہم سے ہے۔وہ لوگ ہمیں یہاں قید رکھنا چاہتے ہیں۔شاید ان کا ارادہ ہو کہ پولیس کے آنے تک ہم اسی گھر میں رہیں۔اس لیے انہوں نے اپنے بندے کو کھڑا کر دیا ہے۔''

''مگر کچھ ہی دیر پہلے ہم باہر نکلے تھے تب تو کسی نے روکا نہیں تھا۔''

''ہو سکتا ہے فائر کرنے والا بعد میں آیا ہو یا پھر اس نے ہمیں پہچاننے کے لیے اس وقت کچھ نہیں کہا۔''

''اب کیا ہوگا۔اس نے ہماری شکلیں تو پہچان لی ہوں گی۔''

''یہ بعد کی باتیں ہیں فی الحال تو ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا۔'' میں نے ہنستے ہوئے عام سے لہجے میں کہا تاکہ

ماحول کی کشیدگی کم ہو جائے۔

''لیکن ہم نکلیں گے کیسے اس لیے کہ دروازے کے باہر تو وہ لوگ پہرا دے رہے ہیں۔'' اس نے کہا۔

''کوئی اور راستہ نہیں ہے؟''

''ایک راستہ ہے۔'' مرجس بولا۔

''کون سا؟'' میں نے سوالیہ انداز میں اس سے پوچھا۔

''برابر والا گھر خالی ہے۔ درمیان میں جو دروازہ ہے اسے توڑ کر ہم اس گھر میں داخل ہوتے ہیں اور پھر اس گھر کے عقب میں جو دروازہ ہے اس سے نکل جاتے ہیں۔ وہ دروازہ اس گھر کے باغیچہ میں کھلے گا اور باغیچے سے ہم پہاڑی کی طرف اتر جائیں گے۔'' مرجس نے جواب دیا۔

''کدھر ہے دروازہ۔'' کہہ کر میں نے اندر والے کمرے کی طرف دیکھا۔

''جی ہاں ادھر ہی دروازہ ہے۔'' وہ بولتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا اور اس کمرے میں داخل ہو گیا۔ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے اندر پہنچا۔ اس کمرے کو ہال کہا جا سکتا تھا۔ خوب بڑا سا کمرا تھا۔ اس کمرے کا دروازہ عقب میں کھل رہا تھا۔ دروازے میں تالا بھی نہیں تھا۔ کنڈی بھی کھلی ہوئی تھی۔

''اس دروازے پر تو تالا پڑا رہتا ہے پتا نہیں کیسے کھلا رہ گیا۔'' مرجس بولا اور دھکا دے کر اس دروازے کو اس نے کھول دیا۔ سامنے ایک بڑا سا آنگن تھا۔ اس آنگن کے آخر میں ایک دروازہ تھا جس پر شاید تالا لگا ہوا تھا جسے کسی نے کھولا تھا۔ اس لیے کہ ایک پرانا سا تالا نیچے پڑا تھا۔ دروازے کو دھکا دیا تو سامنے بھی آنگن ہی تھا۔ پہلے میں ادھر پہنچا۔ مرجس بھی ساتھ تھا۔ ہم نے اس آنگن کو پار کیا اور کمرے میں پہنچے۔ اس کمرے میں دو دروازے تھے۔ مرجس نے کہا ''ادھر نہیں۔ وہ باہر کا دروازہ ہے۔ اس والے دروازے سے چلیں۔ اس نے جس دروازے کی طرف اشارہ کیا تھا ہم ادھر بڑھے۔ اس دروازے کو کھولتے ہی سامنے ایک بڑا سا باغیچہ نظر آیا۔

''اگر ہم اس طرف کی دیوار میں بنے دروازے سے گزرتے ہیں تو ادھر پہاڑی ہے۔ ویرانہ ہے۔ ادھر کوئی نہیں جاتا۔ سڑک اور پہاڑی کے درمیان یہ مکان ہے اس لیے ادھر سے ہم انہیں نظر بھی نہیں آئیں گے۔'' مرجس نے کہا۔

''اور اگر ادھر کوئی ہوا تو؟'' میں نے خدشہ ظاہر کیا۔

''اُمید تو نہیں ہے۔ ان کی نظروں میں صرف وہ گھر ہو گا۔ اگر کوئی ہوا بھی تو اس گھر کے عقب میں ہو گا جب کہ یہ والا دروازہ الگ سمت میں کھلتا ہے۔''

''دیر کرنا مناسب نہیں۔ جو ہو گا دیکھا جائے گا۔'' کہہ کر میں نے اس دروازے کو کھول لیا۔ دروازہ کھلتے ہی ویران پہاڑی نظر آئی۔ میں نے پستول نکال لیا تھا اور جھک کر دروازہ پار کیا۔ اگر کوئی دور سے نشانہ لیے بیٹھا ہو تو فائر کارگر نہ ہو۔ اسی لیے میں جھک کر چل رہا تھا۔ مرجس نے بھی میری تقلید کی تھی۔

ہم جھکے جھکے آگے بڑھتے چلے گئے۔ کافی آگے جانے کے بعد پہاڑی کی چڑھائی آ گئی تو میں نے کہا ''پہاڑی پر چڑھنا مناسب نہیں ہے۔ دور سے ہمیں دیکھا جا سکتا ہے۔''

''پہاڑی پر چڑھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس جانب بڑھتے چلے جائیں۔ کچھ آگے...... جانے کے بعد ایک سڑک ہے۔ اس پر گاڑیاں آتی جاتی رہتی ہیں۔ کسی سے لفٹ لے کر ہم واپس شہر میں آ سکتے ہیں۔ ویسے بھی ادھر سے شہر زیادہ دور نہیں ہے پیدل بھی آیا جا سکتا ہے۔'' مرجس نے اطلاع دی۔

''تو پھر وقت برباد نہ کرو اور پیدل ہی چل دو، اگر لفٹ مل گئی تو واہ وا ورنہ پیدل پہنچ ہی جائیں گے۔'' میں نے کہا۔

''میرے خیال میں ہمیں زیادہ دیر کھڑے رہنا نہیں پڑے گا۔ کوئی نہ کوئی گاڑی آ ہی جائے گی۔'' مرجس نے ڈھارس بندھائی۔ اس کی بات ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ ایک واکس ویگن آتی نظر آئی۔ کبھی ایسی چھوٹی بسیں کراچی میں بھی چلا کرتی تھیں۔ جس میں بندہ ٹھونسا جاتا تھا۔ اندر جانے والے کی یا تو کب نکل آتی تھی یا کب درست ہو جاتی تھی۔ انسان کو مرغا بنانے کا اچھا طریقہ تھا۔ اگر ایسی سواری کہیں اور ملتی تو میں اسے نظر انداز کر دیتا لیکن یہ موقع ایسا نہیں تھا اس لیے میں نے بھی اسے رکنے کے لیے ہاتھ اٹھا دیا۔ جیسے ہی وہ ''مرغا'' گاڑی رکی میں نے اندر کی جانب قدم بڑھا دیے۔ کوئی بھی سیٹ خالی نہیں تھی۔ کئی لوگ رکوع کی حالت میں پہلے سے موجود تھے۔ ان کی صف میں ہم بھی شامل ہو گئے۔ گاڑی اسٹارٹ ہوئی اور آگے کی سمت بڑھنے لگی۔ کچھ دور جانے کے بعد وہ اسی سڑک پر مڑ گئی جو اس طرف سے آ رہی تھی جس طرف وہ مکان ہے جہاں ہم

ٹھہرے ہوئے تھے۔ اگر دائیں جانب نہ مڑ کر بائیں جانب مڑ جاتے تو واپس اسی گھر کے دروازے پر پہنچ جاتے۔

کچھ دور آگے جاتے ہی شہر کی عمارتیں نظر آنے لگیں تھیں۔ ابھی ہم شہر میں داخل نہیں ہوئے تھے کہ ایک کے پیچھے ایک دو پولیس وین سامنے سے آتی ہوئی نظر آئی۔ میں سمجھ گیا کہ پولیس کی نیند ٹوٹ گئی ہے۔ اسے علم ہو گیا ہے کہ کسی گھر پر حملہ ہوا ہے اور وہ اب انہیں بچانے یا ملزم کو گرفتار کرنے جا رہے ہیں۔ وین کو مرجس نے بھی دیکھ لیا تھا اور اس کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ کھل اٹھی تھی۔ شاید وہ دل ہی دل میں پولیس کی پھرتی پر داد بھی دے رہا ہو۔ وین ہمارے برابر سے گزرتی ہوئی دور نکل گئی اور ہم شہر میں داخل ہو گئے۔

شہر کے بس اسٹاپ پر وہ وین نما ویگن رکی تو ہم باہر آ کر کمر سیدھی کرنے لگے پھر میں نے مرجس سے پوچھا ”ایسا کوئی ٹھکانا ہے جہاں ہم رک سکیں۔ اس لیے کہ جب تک میں اپنے ساتھی کو ان کے چنگل سے چھڑاؤں گا نہیں اس علاقے سے جا نہیں سکتا۔“

”میرا ایک دوست ہے۔ وہ ان دنوں ہنزہ گیا ہوا ہے، اپنی بیوی بچوں کو لانے۔ اتفاق کی بات ہے کہ جاتے وقت وہ اپنے گھر کی چابی مجھے دے گیا تھا۔ اس لیے کہ اس کا ایک بھائی پنڈی میں رہتا ہے وہ آنے والا تھا۔“ مرجس نے خوشخبری سنائی۔

”وہ چابی تمہارے پاس ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”جی ہاں۔ اس وقت بھی میری جیب میں ہے۔“

”چلو ہم اسی طرف چلتے ہیں۔“ میں نے کہا تو وہ مجھے ساتھ لے کر اسٹاپ کے سامنے والی آبادی کی طرف چل پڑا۔

وہ مکان دو کمروں پر مشتمل تھا اور اس کے ہر کونے سے غربت جھانک رہی تھی۔ میلے کچیلے بستر پر بیٹھتے ہوئے میں نے پوچھا ”مرجس، وہ گھر تم نے اپنے نام سے لیا تھا۔ بعد میں پولیس پریشان تو نہیں کرے گی؟“

”ان دنوں مکان مالک بھی یہاں نہیں ہے۔ وہ بھی اپنے گھر ترکیستان گیا ہوا ہے۔ اسے واپس آتے آتے بھی ایک ماہ لگیں گے۔ اتنے دنوں میں کیس دب چکا ہوگا۔ اگر کسی نے پوچھا بھی تو میں کہہ دوں گا۔ ان لوگوں کو میں نے سیاح سمجھ کر گھر دلایا تھا۔ انہوں نے مجھے معقول کمیشن دیا تھا۔ یہ بات یہاں عام ہے۔ سیاح آتے رہتے ہیں۔ ان سے کوئی نہیں پوچھتا کہ تم کیا کرنے آئے ہو۔ میں بھی یہی بیان دوں گا۔ زیادہ سے زیادہ پولیس والے کچھ لے دے کر چھوڑ دیں گے۔“

”تم فکر نہ کرنا میں تمہیں اتنا کچھ دوں گا کہ تمہیں نوکری کی بھی فکر نہیں ہوگی۔ آرام سے کہیں زمین خرید کر بڑا سا گھر بنا کر رہنا اگر کھیتی کرنے سے دلچسپی ہے تو مزید زمین خرید لینا یا کوئی چھوٹی موٹی تجارت شروع کر دینا۔“ میں نے اس کی پیٹھ پر تھپکی دے کر کہا۔

”جی ہاں صاحب جی مجھے بہت ارمان ہے کہ محسنہ کو اپنے گھر کی رانی بنا کر رکھوں۔ اسے ہر آرام دوں۔ اس کے لیے بڑا سا گھر بناؤں اور ہم دونوں ہر فکر سے آزاد ہو کر زندگی گزارتے رہیں۔“ مرجس آنسو پونچھتے ہوئے بولا۔

”بے فکر رہو تمہارے سارے خواب پورے ہوں گے۔“ میں نے اسے سینے سے لگاتے ہوئے ڈھارس دی ”نہ صرف میں تمہیں ایک بڑی رقم دوں گا بلکہ حکومت سے بھی انعام دلواؤں گا۔“

”تب تو میرا نام بہت ہو جائے گا۔ لوگ مجھے عزت کی نگاہ سے دیکھیں گے کہ مجھے حکومت نے انعام کا حقدار قرار دیا۔ ویسے سر آپ کا تعلق کس شعبہ سے ہے؟ کیا آپ انٹیلی جنس والے ہیں۔“

”اتنی جلدی نہیں... آہستہ آہستہ معلوم ہو ہی جائے گا۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا ”بعض باتیں راز میں رہیں تو اچھا ہے۔“

پتا نہیں اس نے میری بات کا کیا مطلب لیا کہ وہ بالکل مطمئن نظر آنے لگا۔ شاید وہ اپنے مفروضے پر یقین کر چکا تھا کہ میرا تعلق محکمہ خفیہ سے ہے۔ وہ کمرے کی صفائی میں لگ گیا تھا۔ اس نے بستر کی چادر کو درست کیا اور پھر بولا ”ایسا کرتا ہوں۔ بازار سے ایک دو چادر لے آتا ہوں۔“

”اور اگر بازار میں تمہارا کوئی جاننے والا مل گیا تو؟“

”جاننے والا تو پورے شہر میں ہے۔ یہ شہر ہی کتنا بڑا۔ پھر میں بس اسٹینڈ پر رہتا ہوں اس لیے تقریباً سب ہی جانتے ہیں۔“ وہ ہنستے ہوئے بولا۔

”اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ اگر کوئی دشمن ٹکرا گیا تو؟ فی الحال ان باتوں کو رہنے دو۔ صرف یہ سوچو کہ دشمنوں سے نمٹا کیسے جائے۔“ پھر میں نے جیب سے اپنا موبائل فون نکالا اور وسیم کا نمبر ملانے لگا۔ دوسری بیل پر اس نے کال ریسیو کر لی۔ رابطہ ہوتے ہی میں نے پوچھا ”تم لوگ کہاں ہو؟“

''اس وقت تو گھر سے باہر سڑک پر کھڑے ہیں۔ اندر کیا ہو رہا ہے۔ پولیس نے پورے علاقے کو گھیرے میں لے رکھا ہے۔''

''ہم اب وہاں نہیں ہیں۔ شہر واپس آجاؤ۔ بس اسٹاپ پر تمہیں مرجس مل جائے گا۔ وہ نئے گھر تک رہنمائی کردے گا۔''

''ہم آرہے ہیں۔'' کہہ کر اس نے کال آف کر دی۔ میں نے موبائل کو جیب میں رکھا ہی تھا کہ مرجس بولا:

''میرا خیال ہے کہ ہمیں سراغ لگانے کی کوشش کرنی چاہیے کہ انہوں نے سفیر بھائی کو رکھا کہاں ہے۔''

''اب تک ہم خود کو محفوظ رکھنے کی جتن میں لگے ہوئے تھے اب اسی سمت کام کرنا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''ایسا کرو کہ تم بس اسٹینڈ چلے جاؤ وسیم آرہا ہے۔''

''جی اچھا۔'' کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔ میں اب حالات کا ذہن میں تجزیہ کرنے لگا۔ ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ دروازہ کھلا اور وسیم و عبداللہ، مرجس کے ساتھ اندر داخل ہوئے۔

''ہوا کیا؟'' وسیم نے اندر آتے ہوئے پوچھا۔

میں نے اسے تمام باتیں بتائیں تو وہ بولا ''سفیر کا یوں گم ہو جانا عجیب ہے۔ میرا خیال ہے وہ تعاقب میں ہوگا۔''

''اللہ کرے ایسا ہی ہو۔'' عبداللہ بولا۔

''اس کے موبائل پر کال کرتے ہیں۔ ہو سکتا ہے دشمنوں کی نظر موبائل پر نہ پڑی ہو۔'' وسیم نے خیال پیش کیا۔

میں خود بھی یہی کرنے والا تھا لیکن وسیم نے جب کہہ دیا تو اس کی تعریف کرنا پڑی کہ تم نے صحیح کہا۔ وسیم نے فوراً اپنے موبائل سے نمبر پش کیا اور موبائل کو کان سے لگا لیا۔ میری نظریں اس کے چہرے کا احاطہ کیے ہوئے تھیں۔ چہرہ اندرونی جذبات کا ترجمان ہوتا ہے۔ اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ میں سمجھ گیا کہ بیل جارہی ہے۔ پھر اس کا چہرہ الجھن کی آماجگاہ بن گیا۔ شاید کال ریسیو نہیں ہوئی تھی۔ اس نے دوبارہ نمبر پش کیا۔ اور ادھر کی آواز سنتا رہا لیکن ایسے آثار نظر نہیں آئے کہ ادھر سے کال ریسیو کی گئی ہو۔ میں نے منع کیا ''بار بار کال نہ کرو۔ ہو سکتا ہے کہ وہ کال ریسیو کرنے کی پوزیشن میں نہ ہو اور رنگ ٹون سن کر کوئی دوسرا موبائل پر قابض نہ ہو جائے۔''

''سفیر رنگ ٹون بند رکھتا ہے لیکن وائبریٹ سسٹم آن رہتا ہے۔'' وسیم نے فکرمندی بھرے لہجے میں جواب دیا۔

''اسے پتا لگ چکا ہوگا کہ کال کی جارہی ہے۔ موقع ملتے ہی وہ خود فون کرلے گا۔ ضرور کرے گا۔'' میں نے حوصلہ دیا۔

ابھی ہم باتیں کر ہی رہے تھے کہ وسیم کا موبائل بج اٹھا۔ اس نے اسکرین پر نظر ڈالی تو اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ میں سمجھ گیا کہ دوسری طرف سفیر ہے۔ وسیم نے کال ریسیو کرتے ہی کہا ''کہاں ہے تو، جلدی بول۔ محل وقوع بتا۔ ہم ابھی پہنچ جاتے ہیں۔''

وسیم نے مائیک آن کر دیا تھا۔ ادھر کی آواز مجھے بھی سنائی دی۔ سفیر نے کہا تھا ''میں تم لوگوں کو ڈھونڈ رہا ہوں۔ سائیکل چلا چلا کر میری ٹانگیں ناکارہ ہو گئی ہیں۔''

''یہ سائیکل کا ذکر کہاں سے آ گیا؟'' وسیم نے پوچھا۔

''ایک لمبی کہانی ہے۔ جلدی سے بتاؤ کہاں پر ہو؟''

''ایسا کرو بس اسٹاپ پر آجاؤ۔ ہم اب شہر منتقل ہو گئے ہیں۔'' میں نے اونچی آواز میں کہا ''بس اسٹاپ پر میں مرجس کو بھیج رہا ہوں۔''

''اوکے میں شہر کی طرف آرہا ہوں۔ سارے مسلز پھول گئے ہوں گے۔ اتنے دنوں بعد سائیکل چلائی ہے اور وہ بھی مسلسل کئی گھنٹے تک۔'' کہہ کر اس نے کال منقطع کر دی۔

میں نے مرجس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ''تم نے بھی سن لیا ہوگا کہ سفیر اسٹاپ پر منتظر ہے۔''

''جی میں جارہا ہوں۔ اگر آپ کہیں تو میں ایک چکر محسنہ کے گھر کا بھی لگالوں۔ کئی دن سے اسے دیکھا بھی نہیں ہے؟'' مرجس کا لہجہ التجائیہ تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اجازت نہیں بھیک مانگ رہا ہو لیکن میں نے اسے ڈانٹ دیا۔

''یہ موقع مناسب نہیں ہے۔ ہمیں بالکل خبر نہیں کہ دشمن کہاں سے وار کرے گا اس لیے ہمہ وقت ہوشیار رہنا ہوگا۔ زندگی رہی تو محسنہ سے زندگی گلزار کر لینا لیکن اس وقت نہیں۔''

میری بات نے اس پر مایوسیوں کے بادل برسا دیئے۔ وہ بالکل بجھ سا گیا اور منہ لٹکائے چلا گیا۔ اس کے جانے کا منظر کچھ ایسا تھا کہ وسیم اپنی ہنسی نہ روک سکا۔ اس نے کہا ''یہ تو مجنوں کو بھی پیچھے چھوڑ دینے والا بندہ ہے۔ ایسے باہر جارہا تھا جیسے کمار نے مغل اعظم میں سیڑھیاں اترتے ہوئے تان لگائی تھی'' جس کے دل میں

پیار نہ ہو وہ پتھر ہے انسان کہاں۔"

"بڑی ہری ہری سوجھ رہی ہے۔ سفیر کی خیریت کی خبر ملی تو گانا سوجھنے لگا۔ بھائی میاں دشمن تاک میں ہے۔ کچھ اس کا بھی سوچ لو۔"

"اس کام کے لیے آپ ہیں نا۔" اس نے پٹ سے جواب دیا اور ہنسنے لگا۔

ہم سب کا مزاج بھی عجب ہے۔ پل بھر کی خوشی کو بھی بھرپور انداز میں انجوائے کرتے ہیں۔ شاید اس لیے کہ ہماری زندگی میں اب تک ٹھہراؤ نہیں آیا ہے۔ موت اور زندگی ایک دوسرے کے ساتھ چل رہی ہے۔ کبھی موت کا پلہ جھکتا ہوا نظر آتا ہے اور کبھی زندگی کا اور کبھی زندگی بے معنی سی نظر آنے لگتی ہے اسی لیے ہم سب چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو بھی نظر انداز نہیں کرتے۔ بھرپور لطف اٹھاتے ہیں۔

وسیم کی بکواس جاری تھی کہ دروازہ کھلا۔ ایسا لگا تھا جیسے اس کو کھولنے کے لیے کسی نے لات ماری ہو۔ اس ڈرام کی آواز پر ہم دونوں چونک گئے تھے۔ وسیم نے پستول بھی نکال لیا تھا، بس فائر کرنے کی دیر تھی کہ سفیر کا قہقہہ گونجا۔ وہ ایک اسپورٹ سائیکل سمیت اندر گھس آیا تھا۔ اس نے اندر آتے ہی کہا "یاران باوفا، عرض ہے کہ میں پورے ڈھائی تین گھنٹے سے اس سائیکل پر ہوں اس لیے لگتا ہے یہ سائیکل میری ٹانگوں سے چپک گئی ہے اور جدا ہونے پر بالکل تیار نہیں اس لیے اس کے ساتھ اندر تشریف لے آیا اگر آپ لوگوں کو اعتراض نہ ہو تو مجھے اس سائیکل پر سے اتار بھی دیں۔"

"آ میرے للا میں تجھے گود میں اٹھا کر چاند دکھا لاؤں۔" کہتے ہوئے وسیم ہاتھ پھیلائے ہوئے اس کی طرف بڑھا اور سچ مچ اس نے سفیر کو گود میں اٹھانے کی کوشش کی تھی مگر وہ خود ہی اچھل کر سائیکل سے نیچے اتر آیا۔ دروازے پر کھڑا مرتجس اپنی ہنسی روکنے کے لیے منہ پر ہاتھ رکھے ہوئے تھا لیکن اس کی ہنسی آنکھوں سے ظاہر ہو رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک شاپر تھا۔ خوب بڑا سا۔

"اس میں کیا لے آئے؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"سفیر بھائی پہنچے نہیں تھے۔ بس اسٹاپ پر میرے جاننے والے کی ایک دکان ہے اس کے ہاں سے دو چادریں لے لیں تاکہ اس گندے سندے ماحول کا کچھ اثر کم ہو سکے۔ واپسی کے وقت مجھے خیال آ گیا کہ کچھ دیر میں بھوک بھی لگ سکتی ہے سو کچھ روٹیاں اور مٹن کڑاہی بھی لے

دنیا میں جنگیں تو ہوتی رہی ہیں۔ لیکن کچھ جنگوں کے نتائج بہت حیرت انگیز نکلے ہیں۔ ایک جیتنے والی فوج ہار جاتی ہے، اور ہار جانے والے تھوڑے سے فوجی بہت بڑی بڑی فوجوں کو شکست دے دیتے ہیں۔

آخر کیوں۔ اس کی کیا وجوہات ہو سکتی ہیں۔

غلط پلاننگ۔ خراب موسم۔ سپہ سالار کی نالائقی یا کچھ اور، آئیں تاریخ کی ایسی ہی عظیم الشان چند جنگی غلطیوں پر نظر ڈالتے ہیں۔

نپولین۔

اس نام سے کون واقف نہیں ہے۔ یہ شخص آندھی طوفان کی طرح بڑھتا چلا جارہا تھا۔ فتح کے نشے میں سرشار وہ روس تک نکل گیا۔

اس موقع پر روسیوں نے شاندار جنگی حکمت عملی دکھائی۔

روسیوں نے شہر کے شہر خالی کردیے۔ نپولین نے دیکھا کہ مزاحمت کرنے والا تو کوئی نہیں ہے اسی لیے وہ آگے بڑھتا چلا گیا۔

لیکن ہوا یہ کہ روسیوں نے نپولین کی فوجوں کو گھیر کر ان کی سپلائی لائن کاٹ دی۔ نپولین کی فوجیں پریشان ہو کر رہ گئیں۔

چونکہ وہ روسیوں کا اپنا علاقہ تھا۔ اس لیے انہوں نے گوریلا جنگ شروع کردی۔ اوپر سے بے پناہ سردی۔

سردی نے نپولین کی فوج کو منجمد کر کے رکھ دیا۔ اس کی آدھی فوج اس بے پناہ غلط پلاننگ کی وجہ سے ہلاک ہوگئی۔

مرسلہ: نادر علی، حیدرآباد

لی۔" مرتجس بولا۔

"کچھ بھی کہو یہ بندہ ہے بڑے کام کا۔ واقعی مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ گدھے کی طرح محنت کی ہے میں نے۔" سفیر نے جھپٹ کر اس کے ہاتھ سے شاپر لیا اور اس میں سے کھانے کے لوازمات والا شاپر الگ کرلیا اور شاپر

واپس کر دیا۔ مرجس نے ہنستے ہوئے شاپر واپس لیا اور اس میں سے چادر نکال کر بیڈ پر بچھانے لگا۔ اتنی دیر میں وسیم نے پتا نہیں کہاں سے دو پلیٹ ڈھونڈ لی اور اسے دھو کر لے آیا۔ اس میں سالن رکھتے ہوئے بولا۔ ''کھانے کے درمیان اپنی روداد سناتے رہنا تاکہ کھانے کا مزہ دوبالا ہو سکے۔''

''واہ اچھا طریقہ سوچا ہے... نہیں نہیں میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں کہ اپنی روداد سناتا رہوں اور تم بوٹیاں کم کرتے جاؤ۔ پہلے میں ڈٹ کر کھاؤں گا پھر چائے پیوں گا اور پھر سناؤں گا کہ امداد شاہ کو کہاں رکھا گیا ہے۔'' سفیر نے ناراض بچے کے سے انداز میں کہا اور روٹی کا نوالہ توڑنے لگا۔

''اور میں صبر کا دامن چھوڑ کر تمہارا سر توڑنے پر غور کرنے لگا ہوں۔ جلدی بتاؤ امداد شاہ کو کہاں رکھا گیا ہے۔'' وسیم نے مصنوعی غصے سے کہا اور روٹی والی پلیٹ اٹھا کر اپنی گود میں رکھ لی۔

پہلے چائے کی تیاری پکڑو۔ مرجس نے شاپر میں چائے لی ہے۔ اسی شاپر میں پڑی ہوگی۔ جب پلیٹ ڈھونڈ نکالی ہے تو کپ بھی ڈھونڈ لو اتنی دیر میں، میں پیٹ بھر لیتا ہوں۔'' سفیر اپنی بات پر قائم رہا۔ اس نے پلیٹ واپس چھین لی تھی اور نوالے توڑ کر سالن میں لگا رہا تھا کہ مرجس بولا۔

''آپ کھانا تو ختم کریں میں نے چائے کے لیے پیالیاں دھولی ہیں۔''

عبداللہ کسی فلسفی کی طرح سوچ میں گم تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ دل ہی دل میں کوئی پلان بنا رہا ہے۔ اس لیے کہ اس نے ابھی تک کسی بات میں دخل نہیں دیا تھا اور نہ کوئی سوال کیا تھا۔ جب کسی کی آواز کچھ اونچی ہوتی تو وہ چونک کر اسے دیکھتا اور پھر خیالوں میں کھو جاتا۔

''تو پھر دیر کس بات کی میں تو چائے سے ہی کھانے پر تہہ لگاؤں گا۔'' کہہ کر سفیر نے پانی کا گلاس اٹھا لیا جو میں نے اس کے سامنے لا کر رکھا تھا۔

''ہاں اب بولو۔'' میں نے مسکراتے ہوئے سفیر کو مخاطب کیا۔ اس نے گلاس رکھ کر پیٹ پر ہاتھ پھیرا پھر وسیم کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''اگر میں نے سعدیہ کو تیرا یہ ظلم نہ بتایا کہ تو مجھے کھانے بھی نہیں دیتا ہے تو کہنا۔ پھر وہ جو کرے گی سو کرے گی، مجھے مت کہنا کہ ایسا کیوں کیا۔''

''ان باتوں کو چھوڑو یہ بتاؤ تم وہاں سے فرار کیوں ہوئے تھے؟'' میں نے باتوں کا رخ بدلنے کے لیے کہا۔

''ہوا یہ'' سفیر نے چائے کا سپ لے کر کہا'' جیسے ہی دھما کا ہوا اور سب ادھر دوڑے اسی وقت مجھے عقب سے کسی گاڑی کے بریک کی آواز سنائی دی جو بالکل قریب کی لگی۔ میں ادھر متوجہ ہو گیا۔ کیونکہ ادھر کوئی سڑک نہیں ہے پھر گاڑی کیا کرنے آئی ہے۔ میں حفظ ماتقدم کے تحت ادھر گیا تھا۔ اسی وقت مجھے کچھ لوگوں کے بولنے کی آواز سنائی دی۔ یہ کون لوگ ہیں۔ میں انہیں دیکھنا چاہتا تھا لیکن کھڑکی کھولتا تو وہ ہوشیار ہو جاتے اس لیے میں نے برابر والے دروازے کو کھولا اور اس گھر کے آنگن میں پہنچ گیا۔ عقب میں جو دروازہ تھا۔ اس کو کھولا اور ادھر سے جھانکا تو دیکھا کہ ایک بندے نے کوئی چیز اندر پھینکی پھر پیچھے ہٹ گیا۔ میں سمجھا تھا کہ گرینیڈ وغیرہ ٹائپ کا کوئی گولا ہے۔ میں بھی چونک گیا مگر آواز نہ آئی تو پھر جھانکا تو نظر آیا کہ وہ لوگ کھڑکی کے پاس کھڑے گیس سلنڈر سے گریل کاٹ رہے تھے۔ میں وہیں دبک کر دیکھنے لگا۔ پھر جب وہ لوگ اندر سے ایک کے بعد ایک بندے کو لا لا کر گاڑی میں بھرنے لگے تو میں سمجھ گیا کہ آپ سب باہر نکل چکے ہو۔ گھر خالی ہے ورنہ اتنی آسانی سے یہ لوگ امداد شاہ کو باہر نہیں لا سکتے تھے۔ ان کے بندوں کے ہاتھ میں جدید اسلحے تھے اور ہم خالی ہاتھ۔ ان سے پتھروں سے تو لڑ نہیں سکتا تھا۔'' ابھی اس کی بات ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ وسیم بولا:

''اور تم نے ان کے تعاقب کا فیصلہ کر لیا۔''

''وہ بھی سائیکل پر۔'' عبداللہ نے لقمہ دیا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے سے سوچ کا عکس ہٹ چکا تھا۔

''تو کیا میں تعاقب کرنے کے لیے تمہاری اجازت کا منتظر رہتا کہ تم آؤ اور مجھ سے کہو ذرا جا کر دیکھو تو یہ لوگ کیا کرنے والے ہیں کہاں رہتے ہیں۔'' سفیر نے چڑ کر کہا۔

''یار وسیم بات پوری ہونے دو۔'' میں نے وسیم کو خاموش کرا دیا ورنہ نوک جھوک چلتی رہتی اور وقت برباد ہوتا رہتا۔

''تو میں بتا رہا تھا کہ وہ لوگ ایک کے بعد ایک بندے کو اس طرح اٹھا کر لا رہے تھے جیسے وہ سب بے ہوش ہوں۔ میں سمجھ گیا تھا کہ جو لوگ گریل کاٹنے کے لیے گیس

سلینڈر کے ساتھ آئے ہیں وہ کیا کلوروفارم کے بغیر آئے ہوں گے۔ اسی قبیل کی کوئی گیس کا استعمال کیا ہوگا۔ اب میں کیا کروں، یہی سوچ رہا تھا کہ میری نظر آنگن میں کھڑی سائیکل پر پڑی اور میں نے اس اسپورٹ سائیکل کو اٹھا لیا۔ جیسے ہی گاڑی سڑک پر چڑھی میں سائیکل پر تعاقب میں لگ گیا۔ حالاں کہ درمیان میں فاصلہ بہت رہا لیکن سڑک بھی ویران اور علاقہ بھی میدانی یعنی دور سے نظر آنے والا۔ گاڑی جہاں رکی اس مقام سے میں تب بھی ایک کلو میٹر سے زیادہ دور تھا لیکن وہ گھر نظروں میں آگیا تھا۔ میں آہستہ آہستہ اس گھر تک پہنچا اچھی طرح جائزہ لیا اور پھر واپس آگیا۔''

''تم پہلے وہاں گئے تھے جہاں ہم ٹھہرے ہوئے تھے؟'' اس کے خاموش ہوتے ہی میں نے پوچھا تو وہ ہنستے ہوئے بولا:

''جی ہاں۔ اس مکان کے نزدیک پہنچا تو وہاں کا منظر ہی ایسا تھا کہ میں سڑک پر ہی رک گیا۔ دو پولیس موبائل کھڑی تھیں اور بہت سارے تماشین اندر سے کیسا سانپ نکلے گا یہ دیکھنے کو منتظر تھے۔ اس بھیڑ میں، میں بھی شامل ہوگیا تھا کہ موبائل بج اٹھا۔ اور میں نے دوبارہ سے پیڈل مارنا شروع کردیا۔'' سفیر نے بات ختم کی اور بستر پر پسر گیا۔

اسے لیٹتے دیکھ کر وسیم نے مجھ سے پوچھا ''اب کیا ارادہ ہے؟ اس مکان کا جائزہ نہ لے لیا جائے؟''

''تمہارے خیال میں کیا میں نے جائزہ نہیں لیا ہوگا؟ عقل کے معاملے میں تم سے کچھ...'' سفیر نے انگلیوں سے پیمانہ بنا کر کہا ''زیادہ ہی ہوں گا۔ میں نے اس مکان کا آگے پیچھے ہر زاویہ سے جائزہ لے لیا ہے۔ عام سا مکان ہے۔ تقریباً آٹھ بندے ہیں۔ سب کے سب مسلح ہیں۔ ان کے پاس جدید اسلحہ ہے۔ اور کچھ پوچھنا ہے؟''

''امداد شاہ کو وہیں رکھا ہے یا وہاں سے کہیں اور لے گئے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہمارے خیال سے وہیں ہوگا۔ اس لیے کہ جب تک میں تھا تو وہاں سے کوئی گاڑی نکلی نہیں۔''

''وہ زخمی تھا۔ میں نے اس کی ران موم بتی سے داغا ہے۔''

''یہ کوئی اتنا بڑا زخم نہیں کہ آپریشن تھیٹر کی ضرورت پڑے۔ مرہم وغیرہ لگا دیا ہوگا۔''

''رات ہونے دو۔ وہاں کا ایک چکر لگاؤں گا۔'' میں نے کہا اور چائے کی پیالی میں بچی ہوئی چائے کا گھونٹ لیا۔ اتنی دیر سے مرجس چپ تھا۔ سفیر کے چپ ہوتے ہی وہ بولا ''سر میں ایک چکر لگا آؤں؟ محسنہ کے گھر تک۔''

میرے کچھ بولنے سے پہلے ہی وسیم نے کہا ''او مجنوں کے نانا کچھ تو صبر کرلو۔ تمہاری محبوبہ کہیں جا نہیں رہی۔ ابھی ہر طرف دشمن ہیں۔ اگر ان کے ہتھے چڑھ گئے تو جان سے بھی جاؤ گے۔ ہوشیاری کی ضرورت ہے۔ تھوڑا سا صبر کر لو۔ پھر دیکھنا ہم خود تمہیں سہرا پہنا کر محسنہ کے پاس چھوڑ آئیں گے۔''

''جی بہتر۔'' مرجس مایوسی بھرے لہجے میں بولا۔ اور پھر پلیٹیں اٹھا کر دھونے کے لیے چلا گیا۔

اس کا چہرہ دیکھ کر سفیر مسکرا کر رہ گیا لیکن وسیم نے قہقہہ لگا دیا۔ عبداللہ بھی مسکرانے لگا تھا۔ یہ پیار بھی کیا چیز ہے۔ اگر ہو جائے تو انسان کو سودائی بنا دیتا ہے۔ لوگ اس کا مذاق بنا دیتے ہیں وہ خود ایک تماشا بن کر رہ جاتا ہے۔ میں نے انہیں آنکھیں دکھائیں کہ اس طرح اس کا مذاق نہ اڑا۔ وہ دونوں خاموش ہوگئے۔ اگر میں مداخلت نہ کرتا تو یقیناً ان میں سے کوئی ایک مزید جملے کستا۔ اور وہ بے چارہ کوئی جواب نہ دے کر تلملا کر رہ جاتا۔

میں نے بیڈ کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ آنکھیں بند ہوں تو ذہن کھل جاتا ہے۔ خیالات کی یلغار ہو جاتی ہے۔ اس وقت بھی یہی ہوا تھا۔ گزرے ہوئے لمحے آنکھوں کے پردے پر رقص کرنے لگے تھے۔ زندگی کتنی تیز رفتاری سے بھاگ رہی تھی۔ ہر پل ایک نیا باب کھل جاتا تھا۔ کبھی ایسی سست رفتار تھی کہ وقت گزرتے نہیں گزرتا تھا اور اب کہاں اتنی تیز ہوگئی ہے کہ پتا ہی نہیں چلتا کہ ہفتہ مہینے میں کیسے بدلا۔ اگر اسی طرح زندگی بھاگتی رہی تو شاید ہی کبھی سکون کا کوئی لمحہ میسر آئے۔ کبھی میرے ذہن میں بیتو کا چہرہ آگیا۔ مہذب معاشرے نے اسے کیا دیا؟ موت۔ کیسا معصوم بندہ تھا اور میں اس کے لیے کچھ بھی نہ کرسکا۔ اس کی موت کا جتنا دکھ مجھے تھا اتنا دکھ کسی اور کی موت کا نہیں ہوا۔ بیتو کے ساتھ مانی کی یاد آگئی۔ کمپیوٹر کی دنیا کا بے تاج بادشاہ لیکن کیسا معصوم۔ مانی کی یاد آئی تو میں نے سفیر سے پوچھا۔

''مانی سے رابطہ ہو تو اس سے میری بات کرانا۔''

''مانی سے عبداللہ کو کام رہتا ہے۔ دوسروں کی زندگی

جُرجان

ایک قدیم صوبہ جس کی حدود وہی تھیں جو موجودہ ایرانی صوبے استر آباد کی ہیں۔ اس صوبے کی زرخیزی اور خوش حالی کا دارومدار اترک اور جُرجان کے دریاؤں پر تھا۔ ساسانی عہد میں جرجان کو بہت اہمیت حاصل تھی جس کی وجہ یہ تھی کہ شمال کی جانب سے دباؤ ڈالنے والے خانہ بدوشوں کے مقابلے میں اسے ایک سرحدی صوبے کی حیثیت حاصل تھی۔ شہرستان، یزدگرداور شہر پیروز کے قلعے بیابان دہستان کے خانہ بدوشوں کے حملوں کا دفاع کرنے کے لیے تعمیر کیے گئے تھے۔ علاقے کی حفاظت کے لیے شمالی سرحد کے ساتھ ساتھ ایک لمبی فصیل تیار کرائی گئی تھی۔ اگرچہ 30ھ /50-652ء میں سعید بن العاص نے شاہ جرجان پر جزیہ عائد کیا تھا لیکن جرجان پر مسلمانوں کا قبضہ حقیقی معنوں میں 98ھ /17-716ء میں ابن مہلب کے ہاتھوں ہوا۔ اس وقت اس علاقے پر ایک مرزبان کی حکومت تھی لیکن عملاً سارے اختیار ایک ترک سردار صول کے ہاتھوں میں تھے۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ جب سوید بن مقرن نے 18ھ /639ء میں بسطام فتح کرلیا تو روزبان صول نے جزیہ ادا کرنے کی شرط پر مسلمانوں کی ماتحتی قبول کرلی۔ دریائے اندر ہاز (موجودہ دریائے جرجان) کے کنارے سرکش آبادی کی گوشمالی کے بعد ابن مہلب نے شہر جرجان کی بنیاد رکھی۔ اس زمانے میں اس شہر کو اسی نام سے صوبے کا صدر مقام بنادیا گیا۔ تیسری صدی ہجری /نویں صدی عیسوی، چوتھی صدی ہجری /دسویں صدی عیسوی میں یہ شہر خوش حال تھا۔ اس

میں جھانکنے کا فن سیکھنے کی کوشش میں یہ اس بچے کو دوست بنائے ہوئے ہے۔'' وسیم نے عبداللہ کی طرف دیکھتے ہوئے چوٹ کی۔

عبداللہ تلملا گیا۔ اتنی دیر سے وہ خاموش تھا لیکن بالآخر اس کی خاموشی ٹوٹ ہی گئی۔ اس نے کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے کہا'' آئی ٹی کا علم ایک سمندر ہے۔ اگر میں یہ علم حاصل کررہا ہوں تو آپ کو کیا تکلیف ہے۔''

''تکلیف یہ ہے کہ اس کام کے لیے دماغ چاہیے جو آپ کا حاضر نہیں ہوتا۔''

''جس دماغ میں گوبر ہو وہی اتراتا ہے۔''

''ذرا شادی تو ہولے پھر پوچھوں گا بچو!''

''ٹھیک ہے حویلی پہنچتے ہی میں سادی باجی سے یہی کہوں گا کہ یہ صاحب کہتے ہیں بیویاں دماغ کھا جاتی ہیں۔'' عبداللہ کہاں چوکنے والا تھا۔

''یار بور مت کرو سونے دو۔'' سفیر نے کروٹ لیتے ہوئے کہا۔ ''خواب میں کھونے دو۔''

''اوئے ہوئے۔'' وسیم نے پھر چوٹ کی۔

کہیں یہ جملوں کی جنگ تیز نہ ہوجائے اس لیے میں نے مداخلت کا ارادہ کیا اور باری باری سے ان تینوں کو دیکھا۔ سفیر تو آنکھیں بند کیے پڑا تھا۔ ایسے جیسے لاتعلق ہو مگر مجھے پتا تھا کہ وہ اسی حالت میں ان کے جملوں کا جواب دیتا رہے گا۔ وسیم فرش پر بیٹھا تھا لیکن اس کی قوت سماعت دوستوں پر مرکوز ہوگی۔ عبداللہ بھی لاتعلق سا ایک جانب بیٹھا تھا لیکن وہ بھی جوابی حملہ کرنے پر پر تول رہا ہوگا۔ ان سب کی نوک جھوک سے ہی زندگی میں رونق ہے۔ حالات کیسے ہی کیوں نہ ہوں لیکن ان کی شگفتہ مزاجی نہیں جاتی۔

ان پر نظر ڈالنے کے بعد میں نے عبداللہ سے کہا'' ہم کچھ ہی دیر میں جب اندھیرا پھیل جائے گا۔ اس مکان کی طرف جائیں گے۔ تم بھی تیار رہنا۔''

''ہاں ہاں اچھا سا سوٹ نکال لینا۔ پرفیوم بھی لگا لینا۔'' وسیم نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

''مجھ سے زیادہ پرفیوم کی ضرورت تمہیں ہے۔ میرے لیے تو پستول ہی کافی ہے۔'' عبداللہ نے جوابی چوٹ کی۔

''اور پستول اس وقت نایاب ہے۔'' وسیم نے کسی مولوی کے دعا کرانے کے انداز میں کہا۔

اس کی بات سن کر مجھے یاد آیا کہ مرجس کو ہتھیار کی فراہمی کے لیے جانا تھا۔ میں نے مرجس کی طرف دیکھ کر کہا'' او بھائی تم نے کہا تھا کہ کوئی تمہارا جاننے والا ہے جو ہتھیار فراہم کرتا ہے۔''

''جی ہاں۔ میں ابھی اس سے رابطہ کرتا ہوں۔'' کہہ

کے اردگرد باغات تھے جن کی آبیاری دریا سے کی جاتی تھی۔ اس شہر کی صنعت میں ریشم سازی خاص طور پر اہم تھی۔ یہ شہر روس جانے والی کاروانی شاہراہ کی ایک منزل بھی تھا۔ شہر کے دونوں حصوں کو ملانے کے لیے ایک کشتیوں کا پل تھا۔ دریا کے مشرقی کنارے پر اصل شہر تھا جو شہرستان کے نام سے مشہور تھا۔ بقول المقدسی اس کے نو دروازے تھے۔ مغربی کنارے پر ایک مضافاتی شہر بکر آباد کے نام سے مشہور تھا۔ بحر خزر کے ساتھ کا علاقہ علوی دعوت (اہل تشیع) کے لیے بہت بہتر ثابت ہوا یہی وجہ ہے کہ طبرستان کے علویوں نے جرجان کو بھی اپنے حلقہ اثر میں لے لیا۔ خاص جرجان میں حضرت محمد بن جعفر صادقؑ کی قبر ہے۔ جب منگول یلغار ہوئی تو جرجان کی آبادی کا خوب قتل عام کیا گیا۔ بقول المستوفی جس نے آٹھویں صدی ہجری/ چودھویں صدی عیسوی میں اپنی کتاب نزہۃ القلوب تحریر کی۔ رقم کیا ہے کہ جرجان شہر کھنڈروں کا ڈھیر تھا۔ ایک روایت کے مطابق تیمور نے 795ھ/1393ء میں یہاں پر دریا کے کنارے ایک محل تعمیر کرایا تھا لیکن جرجان کی پہلی سی خوش حالی دوبارہ واپس نہ آسکی۔ حاجی خلیفہ نے جہاں نما میں جو 1145ھ/1732ء کی تصنیف ہے لکھا ہے کہ عہد منگول کے بعد جب جرجان دوبارہ آباد ہوا تو اس وقت سے یہاں کی اکثریت شیعوں پر مشتمل رہی ہے۔ دریائے جرجان اور خرم رود کے سنگم سے جو زاویہ بنتا ہے وہاں کھنڈروں کے بڑے بڑے ڈھیروں سے قدیم جرجان کی جائے وقوع کا پتا چلتا ہے۔

مرسلہ: محمد عفان عطاری۔ میرپورخاص

کر وہ میرے قریب آکر موبائل پر کسی کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔ پہلی ہی بار کی بیل پر فون ریسیو ہوگیا۔ ادھر سے کچھ کہا گیا تھا کہ مرجس نے جواب دیا ”مرجس بول رہا ہوں... جی جی ڈرائیور.... ایک کام ہے.. جی... میرے ایک دوست کو ایک دو اچھا والا بادام چاہیے.... جی جی... پیسا نقد اور ابھی ملے گا... جی میں آرہا ہوں۔“ کہہ کر اس نے موبائل آف کیا پھر بولا ”ابھی چلنا ہوگا۔“

”پیسے تمہارے پاس ہیں۔ اسلحے کی پہچان وسیم کو ہے۔ اسے ساتھ لے جاؤ۔“ میں نے مشورہ دیا۔

”آیئے وسیم بھائی۔“ مرجس نے باہر کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

وہ دونوں کمرے سے نکل گئے۔ اب کمرے میں سفیر اور عبداللہ تھے جو اس وقت خاموش تھے۔ دونوں میری طرف متوجہ تھے۔ ان کی نظروں میں سوال تھے۔ شاید وہ منتظر تھے کہ میں ان سے ڈسکس کروں کہ ہمارا اگلا قدم کیا ہوگا۔ کیسے اس مکان میں داخل ہوا جائے گا۔ کیسے ہم امداد شاہ کو ان کے چنگل سے چھینیں گے۔ اس لیے کہ امداد شاہ وہ مہرہ ہے جس سے بہت کچھ معلوم ہو سکتا ہے۔ اسے کیسے حاصل کیا جائے۔ کس قسم کی پیش بندی کی جائے۔ اس پر غور کرنا۔ مشاورت کرنا بہت ضروری تھا۔ بالآخر میں نے سفیر کی طرف دیکھ کر پوچھ لیا ”وہ گھر کتنے رقبے پر ہے؟“

”گھر کی حالت بتا رہی ہے کہ مالک خاصہ امیر آدمی ہے۔ یوں سمجھ لیں ایک...... حویلی ہے۔ دو منزلہ ہے اور آگے اور پیچھے باغیچہ ہے۔ جس میں پھلدار پیڑ لگائے گئے ہیں۔ احاطہ کی دیوار تقریباً پانچ فٹ اونچی ہوگی۔ دیوار پر شیشے کے ٹکڑے یا آہنی کیلیں نہیں لگی ہیں جس کی وجہ سے بہ آسانی اس پر چڑھا جا سکتا ہے۔“ سفیر نے بتایا۔

”کیا مسلح گارڈ بھی وہاں نظر آئے یا وہی لوگ مسلح تھے جو اس گاڑی میں تھے؟“

”اندر ہوں تو بات دیگر ہے۔ باہر سے نظر نہیں آئے۔“

ابھی ہم باتوں میں مشغول ہی تھے کہ دروازہ کھلا اور مرجس کا چہرہ نظر آیا۔ اس کے پیچھے وسیم تھا۔ ان دونوں کے ہاتھ میں بیگ تھے۔ مرجس کے چہرے سے خوشی پھوٹی پڑ رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ بہت زیادہ خوش ہے۔ اسے اتنا خوش دیکھ کر عبداللہ نے مسکراتے ہوئے کہا ”بڑے خوش دکھائی دے رہے ہو... کیا محسنہ سے ملاقات ہوگئی؟“

”واقعی میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میری اتنی عزت ہوگی۔ بابر خان کسی سے سیدھے منہ بات نہیں کرتا۔ جب میں پہنچا اور وسیم صاحب سے اس نے دو بات کی تو وہ ایسا ہو گیا جیسے وہ مجھے سر پر بٹھا لے گا۔ بار بار کہتا تھا کہ مرجس تیرا

شکریہ میں کیسے ادا کروں۔ تُو نے مجھے اتنے بڑے آدمی سے ملاقات کرا دی۔'' وہ سانس لینے کے لیے رکا پھر بولا ''وسیم بھائی نے کم سے کم پانچ لاکھ روپے کی خریداری کی ہے۔ایسے ایسے ہتھیار خریدے ہیں کہ میں نے کبھی دیکھے بھی نہیں تھے۔اگر میں اکیلا جاتا تو دو کلاشنکوف ہی خرید سکتا تھا۔وسیم صاحب کے پاس تو بہت روپیا ہے۔انہوں نے اسی وقت کھڑے کھڑے قیمت ادا کی ہے۔وہ زندگی بھر نہیں بھولے گا کہ میں اس کے لیے اتنا بڑا خریدار لے کر گیا تھا۔''

''ہاں بھئی وسیم۔'' میں نے مسکراتے ہوئے وسیم سے کہا ''اتنے روپے کہاں چھپا رکھے تھے۔''

''بابر خان کے ساتھ شہر کے چار بینکوں کے اے ٹی ایم خالی کیے تب جا کر اس کی پیمنٹ ہوئی۔''

''ہاں ہاں یہ کچھ دیر کے لیے بابر خان کے ساتھ باہر گئے تھے.... میں سمجھا تھا کہ چائے شائے پینے گئے ہیں۔''

''اچھا اچھا اب دکھاؤ کیا کیا لائے ہو۔'' میں نے وسیم سے کہا۔

وسیم کے جھکنے سے پہلے ہی مرجس نے جھک کر بیگ کھولا۔اس میں سے ایک ایک کر کے چار آٹو میٹک پسٹل نکالا۔اس کی گولیوں کے ڈبے دکھائے پھر ہاتھ ڈال کر بیس کے قریب گرینیڈ نکالے۔ایک اسنائپر رائفل دکھائی۔ دوربین اور پسٹل سائلنسر دکھایا۔ ہلکی مشین گن دکھائی۔تبھی وسیم بولا ''اتنا ہی مال دوسرے بیگ میں بھی ہے۔ضرورت کی ہر شے لے لی ہے۔''

''اتنے چھوٹے سے شہر میں اتنا اسلحہ...کون خریدتا ہے؟ ایسے اسلحے تو معمولی لوگ لیتے نہیں ہیں؟''

''بابر خان افغانستان اور چائنا سے اسلحہ اندرون ملک بھیجتا ہے۔اس نے میرا نام سن رکھا تھا۔میں جن لوگوں سے مال لیا کرتا تھا، وہ انہیں بھی جانتا ہے۔اس لیے جلدی یقین کر لیا اور بڑے اسلحے بھی دکھانے پر راضی ہو گیا ورنہ تو وہ پہلے کہہ رہا تھا کہ صرف درا پستول ہوتا ہے۔وہ لے لو۔'' وسیم نے ہنستے ہوئے بتایا۔

''ایسا کرو اسلحہ آپس میں تقسیم کر کے ریڈی ہو جاؤ۔کچھ ہی دیر میں ہم کوچ کرنے والے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''ایک بات تو بتائی ہی نہیں۔میں ایک اور کام کی چیز کرایہ پر لے آیا ہوں۔'' مرجس بولا ''جس کی ضرورت پڑے گی۔''

''ایسی کیا چیز لائے ہو؟'' میں نے ہنس کر پوچھا۔

''کالے رنگ کی ہائی لیکس۔رات میں دور سے نظر بھی نہیں آئے گی۔'' اس نے فخریہ بتایا۔

''واہ، یہ ہوئی نا بات۔'' میں نے اس کا دل رکھنے کے لیے شاباشی دی۔یہ کام کی چیز ضرور تھی لیکن اتنی بھی اہم نہ تھی۔کیونکہ ہمیں گاڑی وہاں سے دور کھڑی کرنی تھی۔پھر پیدل ہی آگے جانا تھا۔

وسیم نے جیکٹ کے اندر گرینیڈ رکھے اور مشین پسٹل کمر میں کھونسا پھر مشین گن کا پٹا کندھے پر لٹکا کر بولا ''میں تو تیار ہو گیا ہوں۔دوسروں کی پوزیشن بتائی جائے۔''

''ہم آپ سے کم ہیں کیا؟'' عبداللہ نے جواب دیا۔اس نے بھی ضروری اسلحے سیٹ کر لیے تھے۔سفیر نے اٹینشن ہو کر کہا ''بندہ بھی تیار ہے۔''

''سنو مرجس۔'' میں نے اسے مخاطب کیا ''اس وقت ہم جس مہم پر جا رہے ہیں۔یہ تمہارے لیے بالکل نئی چیز ہے اس لیے میرا مشورہ ہے کہ تم گاڑی میں ہی رہو گے۔تاکہ جب تمہاری ضرورت پڑے تو تم حاضر رہو۔یہ کام سب سے اہم ہے ورنہ ہم وہاں سے نکل نہیں پائیں گے۔'' میں نے اسے مہم سے دور رکھنے کے لیے اس کے کام کو اہم بنا دیا۔وہ بھی خوش ہو گیا کہ وہی سب سے اہم بندہ ہے۔یہی وجہ تھی کہ ہمارے باہر نکلنے سے پہلے ہی وہ ہائی لیکس کو چیک کرنے چلا گیا۔ہم سب تیار ہو کر باہر آئے۔میں نے اگلی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے اس سے پوچھا ''ٹنکی فل کرا لی ہے نا؟''

''جی ہاں وسیم بھائی نے پہلا کام یہی کیا ہے۔'' مرجس نے جواب دیا۔اور انجن اسٹارٹ کرنے لگا۔

ہائی لیکس کی آواز بالکل نہ ہونے کے برابر تھی۔انجن ورکنگ کنڈیشن میں تھا۔اس نے اندر کی لائیٹ بجھا رکھی تھی۔روڈ بھی تقریباً ویران تھا۔ہم تیز رفتاری سے منزل کی طرف بڑھتے چلے جا رہے تھے۔

تقریباً آدھے گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد ایک پہاڑی کے دامن میں پہنچے۔کافی دور تک پھیلا میدان تھا۔میدان کے درمیان وہ مکان تھا اور مکان کے عقب میں پہاڑی سلسلہ تھا۔دور سے ایک مکان کے ہیولے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سفیر نے کہا ''وہ والی عمارت ہے۔''

میں نے عمارت پر نظر ڈالی سڑک سے ایک ذیلی

سڑک اس عمارت تک جا رہی تھی۔ جس نے بھی وہ عمارت بنوائی تھی، بہت شوقین مزاج لگتا تھا۔ اچھے خاصے پیسے اس کی تعمیر پر خرچ کیے ہوں گے۔

جہاں سے وہ ذیلی سڑک مڑتی اس سے کچھ پہلے میں نے گاڑی روکنے کو کہا۔ اس لیے کہ مجھے جھاڑیوں کا ایک جھنڈ نظر آ گیا تھا۔ ''ان جھاڑیوں میں گاڑی اس طرح کھڑی کرو کہ فوراً کسی کی نظر میں نہ آسکے۔''

میں نے کہا تو مرجس نے اسی طرف رخ موڑ دیا۔ جھاڑیوں کی وجہ سے گاڑی بالکل چھپ کر رہ گئی تھی۔ کالی رنگت یوں بھی اندھیرے میں نظر کہاں آتی۔ ہم نے کپڑے بھی کالے پہن لیے تھے۔ یہ کپڑے بھی وسیم لایا تھا۔ اس نے پوری تیاری کرائی تھی۔ نیچے اتر کر وسیم نے سائبریائی ٹوپی نکالی اور اسے پہن لی۔ پھر ایک ٹوپی مجھے، دوسری عبد اللہ اور ایک سفیر کو بھی دی۔ میں نے ٹوپی لی تو احساس ہوا کہ اس میں ہینڈ سیٹ بھی ہے۔ وسیم نے کہا ''یہ ہینڈ سیٹ اتنا طاقتور ہے کہ اس پر سرگوشی بھی دو میل کے احاطے میں صاف سنی جا سکتی ہے۔ ہم الگ رہ کر بھی ایک دوسرے سے رابطے میں رہیں گے۔''

پھر اس نے ایک ایک پستول سب کو دیا۔ جب کہ ہمارے پاس مشین پسٹل پہلے سے تھا۔ اس پسٹل کی ساخت عجیب سی تھی۔ اس کے بارے میں کوئی سوال کرتا کہ وسیم نے خود ہی بتا دیا کہ یہ ایک طرح کا بلیو پائپ جیسا ہے۔ اس سے سوئی نکلتی ہے جو مقابل کے جسم میں داخل ہوتے ہی مضروب کو بے ہوش کر دیتی ہے۔ اس طرح شور شرابے سے بھی بچا جا سکتا ہے۔''

میں نے وہ پستول بھی پینٹ کی جیب میں رکھ لیا۔ وسیم نے کہا۔ ''ہمیں چار جانب سے آگے بڑھنا چاہیے۔ الگ الگ سمت سے داخل ہونا ہی بہتر ہے۔''

میں نے اعتراض نہیں کیا۔ عبد اللہ نے مغربی سمت منتخب کی۔ سفیر مشرقی دیوار اور وسیم نے شمالی اور میں نے جنوبی دیوار سے چڑھنے کا بتایا۔ اس طرح کوئی ایک نظروں میں آجاتا تو دشمن کی پوری توجہ اس کی طرف ہو جاتی اور باقی لوگ بہ آسانی اندر پہنچ جاتے۔

میں ان لوگوں سے الگ ہو کر جنوبی دیوار کی جانب بڑھنے لگا۔ اس طرف جھاڑیاں بہ کثرت تھیں۔ ان کی آڑ مل رہی تھی۔ چلتے چلتے مجھے خیال آیا کہ دشمن جس قسم سے کارروائی کر چکا ہے اس سے یہی نتیجہ اخذ ہو رہا ہے کہ وہ ٹرینڈ ہے۔ کہیں اس عمارت کی پہرے داری کے لیے ان لوگوں نے کوئی خاص نظام نہ لگا رکھا ہو۔ کیمرے نہ لگا رکھے ہوں۔ حساس مائیک بھی لگا سکتے ہیں جو ہلکی آواز کو بھی کیچ کر لیتے ہیں۔ اب تو بازار میں نگرانی کے ایسے آلات نہایت ارزاں قیمت میں آسانی سے مل جاتے ہیں۔ دو اور چار پیروں والے کتے بھی اِدھر اُدھر بیٹھا رکھے ہوں۔ یعنی کتے اور چوکیدار ایسا اگر ہے تو پریشانی پیدا ہو سکتی ہے۔ ابھی میں اسی سوچ میں تھا کہ کان میں سرگوشی سی سنائی دی۔ یہ آواز سفیر کی تھی ''میں دیوار کے نزدیک پہنچ چکا ہوں۔''

''احتیاط رکھنا، کہیں ان لوگوں نے کیمرے نہ لگا رکھے ہوں۔'' میں نے جواب میں کہا۔

''میں نے بڑی باریک بینی سے دیکھا ہے۔ کیمرے اگر لگائے ہوئے ہیں تو خفیہ ہو سکتے ہیں۔ ویسے مجھے تو اُمید کم ہی ہے۔ اس لیے کہ میں نے جو معلومات حاصل کی ہیں اس کے مطابق چھ سات ماہ قبل اس مکان میں عنایت شاہ نامی ایک تاجر رہا کرتا تھا۔ اس کی بیوی روڈ ایکسیڈنٹ کا شکار ہو گئی تو وہ مکان چھوڑ گیا۔ تاجر نے ہی مکان بنوایا تھا۔ کیمرے کی اسے ضرورت شاید ہی محسوس ہوئی ہو۔''

''احتیاط سے داخل ہونا، میں بھی دیوار کے نزدیک پہنچ چکا ہوں۔'' میں ایک ایک قدم پھونک پھونک کر رکھ رہا تھا۔ ہر اس جگہ سے بچنے کی کوشش کرتا جہاں مجھے کیمرے کا شبہ ہوتا۔ گو کہ تاریکی تھی لیکن کیمرے اگر انفراریڈ والے ہوں تو اندھیرے میں بھی بہ آسانی انسانی جسم کو محسوس کر لیتے ہیں اور اسکرین پر دکھا دیتے ہیں۔

میں آہستہ آہستہ آگے بڑھتا ہوا دیوار تک پہنچ ہی گیا۔ دیوار اتنی زیادہ اونچی نہ تھی کہ اس پر چڑھنے کے لیے مجھے سوچنا پڑتا۔ پھر دیوار کے قریب ایک گھنا پیڑ بھی تھا جس کی ڈالیاں دیوار کو چھو رہی تھیں۔ اوپر چڑھنے میں مدد ضرور دے سکتی تھیں۔ میں نے اس درخت کا انتخاب کر لیا اور اس کے تنے کے گرد دونوں ہاتھ سے گھیرا بنایا اور اس پر چڑھتا چلا گیا۔ درخت اس دیوار سے خاصہ اونچا تھا۔ دیوار تک پہنچ کر میں نے اچھال بھری۔ جمناسٹک کی مہارت کام آئی اور میں پہلی کوشش میں ہی درخت سے دیوار پر پہنچ گیا اور پھر نیچے کود گیا۔ ہلکی سی دھپ کی آواز آئی اور میں بھربھری زمین پر تھا۔ کچھ دیر تک وہیں دبکا رہا پھر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اسی وقت کانوں میں ایک ساتھ دو آوازیں آئیں۔ پہلی آواز سفیر کی تھی اور دوسری آواز وسیم کی وہ دونوں بھی اندر آچکے

تھے۔

میں نے دونوں کو اپنی محل وقوع بتائی اور قریب آجانے کو کہا۔ ابھی میں کھڑا ہوا ہی تھا کہ مجھے ایک سایہ سا اپنی سمت آتا ہوا نظر آیا۔ اس کے پیچھے ایک اور سایہ تھا۔ ان کے ہاتھوں میں ہتھیار تھے۔ میرے اندر سے آواز ابھری' شاید یہ پہرے دار ہیں۔ میں فوراً ہی جھک گیا۔ وہاں ایسی کوئی جگہ نہیں تھی جہاں میں خود کو چھپا سکتا۔ اب صرف ایک ہی راستہ رہ گیا تھا کہ زمین پر لیٹ جاؤں۔ میں لیٹنے پر غور ہی کر رہا تھا کہ میرے کانوں میں عبداللہ کی سرگوشی سنائی دی"میں نے آپ کو دیکھ لیا ہے۔ میرے ساتھ وسیم بھی ہے۔ ہم دونوں آپ کی طرف آرہے ہیں۔"

میں نے اطمینان کی سانس لی اور دوبارہ سے سیدھا ہونے پر غور کر ہی رہا تھا کہ میری طرف آنے والے دونوں افراد قریب آگئے۔ یہ میری خوش قسمتی تھی یا ان کی بد قسمتی۔ وہ دونوں باتیں کرنے میں مگن تھے۔ وہ سرگوشیوں میں بول رہے تھے۔ ایک نے کہا تھا"ایسا لگتا ہے کہ خان کو خواب آتے ہیں۔ سردی ہڈی میں اتر رہی ہے اور ہمیں باہر بھیج دیا کہ کوئی اندر کودا ہے۔ کہاں ہے کودنے والا۔"

دوسرے نے ایک غیر پارلیمانی لفظ کا استعمال کیا اور انہیں بھیجنے والے کی بہن سے اپنے رشتے کا اعلان کیا پھر بولا"اپنے آپ کو اہم ثابت کرنے کے لیے وہ ایسا کرتا ہے۔"

"دل تو کرتا ہے کہ اس کے سڑے ہوئے دماغ میں ساری گولیاں اتار دوں لیکن باس کی وجہ سے خاموش ہو جاتا ہوں۔"

اس کا دل جو چاہ رہا تھا وہ تو اس نے کیا نہیں لیکن میں نے اپنے دل کی بات مان لی اور اس کی طرف اس عجیب ساخت کے پستول کی نال کو سیدھا کیا اور اس کے گال کا نشانہ لے کر ٹریگر دبا دیا۔ ہلکی سی کٹ کی آواز ابھری اور وہ کچھ بولے بغیر گال پر ہاتھ رکھے گرتا چلا گیا۔

اپنے ساتھی کا حشر دیکھ کر دوسرا چونکا مگر دیر ہو چکی تھی۔ میں نے اس پر بھی وہی پستول آزمایا۔ وہ بھی آواز نکالے بغیر ڈھیر ہو گیا۔ ان دونوں کے جسم کو چھپانے کی کوئی جگہ بھی نہیں تھی۔ اس لیے انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا۔ اور آگے بڑھا۔ اب میرا رخ عمارت کی طرف تھا۔ سامنے ایک کھڑکی تھی جو کھلی ہوئی تھی۔ اندر اندھیرا تھا۔ اس سے اندر جھانک کر تو دیکھوں۔ یہ سوچ کر میں آگے بڑھا۔ کھڑکی میں گریل لگی تھی۔ مضبوطی آزمانے کے لیے میں نے اسے جھٹکا دیا۔ کافی مضبوط لگی تھی کیا کروں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ وسیم کی سرگوشی گونجی"آپ ہٹ جائیں میں دیکھتا ہوں۔"

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ وسیم بالکل میرے عقب میں کھڑا تھا۔ اس نے جیکٹ کے اندر سے کوئی اوزار نکالا تھا کہ میں نے کہا"شور نہ ہو تو بہتر ہے۔"

"فکر ہی نہ کریں۔" کہہ کر اس نے ایک چھوٹی سی بوتل نکالی اور اس میں بھرا محلول اس نے گریل کے جوائنٹ پر گرایا پھر اوزار کو اس میں پھنسا کر ایک دوبار ہلکے ہلکے جھٹکا دیا۔ تیسری چوتھی بار میں گریل کا جوائنٹ کھلتا چلا گیا۔ شاید اس نے کسی قسم کا تیزاب استعمال کیا تھا۔ اسی طرح اس نے چار جانب کیا تو گریل اکھڑ کر ہاتھ میں آگئی۔

گریل کو نیچے رکھنے کے بعد اس نے کہا"پہلے میں جاتا ہوں۔" کہہ کر وہ اندر کود گیا۔ اس کے بعد میں بھی اندر داخل ہو گیا۔

اندر بالکل گھپ اندھیرا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اندر کوئی رہتا ہی نہیں۔ دبے قدموں ہم دروازے سے باہر نکلے۔ سامنے ایک اور کمرا تھا۔ اس کمرے میں جھانکا۔ وہ بھی خالی تھا۔ اب دوسرے کمرے کی طرف بڑھے۔ اس کمرے میں نائٹ بلب جل رہا تھا اندر کوئی چادر اوڑھے سو رہا تھا۔ اس کی طرف بڑھتا کہ سفیر کی آواز ہنڈ سیٹ پر گونجی"میں آپ کے عقب میں ہوں۔ کھڑکی سے ابھی اندر آیا ہوں۔"

میں نے رخ تبدیل کیا ہی تھا کہ یکا یک پورا کمرا اور گلیارا بقع نور بن گیا۔ ایک ساتھ بہت ساری سرچ لائٹ جل اٹھیں۔ ایسی روشنی پھیل گئی تھی جیسے ہم کرکٹ گراؤنڈ میں کھڑے ہوں اور اب میچ شروع ہونے والا ہے۔

روشنی ہوتے ہی میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ کمرے کے چاروں کونے پر مسلح افراد کھڑے تھے۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ سفیر بھی کمرے سے باہر بھونچکا سا کھڑا تھا اور اس کے پیچھے دو مسلح افراد کھڑے تھے۔ ان کے ہتھیاروں کا رخ اس کی طرف تھا اور وہ دونوں شاید پہرے دار تھے اس لیے کہ ان دونوں کے جسم پر نیلی وردی تھی۔ تبھی مائیک کی آواز گونجی"تم سب اپنے اپنے ہاتھوں کو سر پر رکھ کر دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جاؤ۔"

(جاری ہے)

(نجمی رحمٰن برٹ لیٹ یو ایس اے کا جواب)

نصرت افشاں.........ساہیوال

وقت کا مانی و بہزاد ہوں لاریب مگر
کیا کروں جب تری تصویر بنائے نہ بنے

انیسہ احمد.........مظفر گڑھ

وجۂ رسوائی نہ بن جائے ضرورت میری
مجھ کو نیلام نہ کردے کہیں غربت میری

نیاز احسن.........سیالکوٹ

وقت کا فیصلہ ضروری ہے
مجرموں کو سزا ضروری ہے

ناعمہ کریم.........کراچی

وقت سے پہلے بچوں نے چہروں پہ بڑھاپا اوڑھ لیا
تتلی بن کر اڑنے والے سوچ میں ڈوبے رہتے ہیں

نزہت پروین.........کراچی

وہ ہجر کی راتوں کے سلگتے ہوئے لمحے
آنکھوں پہ میری بار تھا سب بھول چکا ہوں

احمد جاوید.........چنیوٹ

وہ جو پتھر یوں ہی رستے میں پڑے رہتے ہیں
ان کے سینے میں بھی شاہکار ہوا کرتے ہیں

(سعید احمد چاند کراچی کا جواب)

احمد ذیشان.........کراچی

یہ خود شناسی بھی آخر کہاں پر لے آئی
کہ اپنے آپ سے لگنے لگا ہے ڈر مجھ کو

عنایت مسیح.........کراچی

یک رنگیوں کے ساتھ وہ رہتا نہ تھا کبھی
بیگانہ تھا کبھی تو وہ تھا آشنا کبھی

ضیاء الرحمٰن.........فورٹ عباس

یہ دل کہیں کا نہ رکھے گا اعتبار نہ کر
نہ کر خدا کے لیے میرا انتظار نہ کر

فلک شیر ملک.........رحیم یار خان

یاد کے بے نشاں جزیروں سے
تیری آواز آرہی ہے ابھی

(ناعمہ کریم ملیر کراچی کا جواب)

راشد کنجاہی......اسلام آباد

نیا کچھ نہیں اس فسانے میں کچھ راشد
پرانا فسانہ کہاں تک سنائیں

ماہین فاطمہ شاہین.........لیہ

نے پردہ، نہ تعلیم نئی ہو کہ پرانی
نسوانیتِ زن کا نگہباں ہے فقط مرد

(عنایت مسیح کراچی کا جواب)

نزہت افشاں......لاہور

اندھیری رات کی صورت بڑی بھیانک ہے
اجالے دیکھنے آتے تو ڈر گئے ہوتے

عباس علی سید......جھنگ

امیر شہر نے ساری خرید کر رکھ لی
سروں میں جتنی تھی دانشوروں کے دانائی

محمد فہیم......چکوال

ان کا جنگل تھا اور ان کا قانون تھا
جس طرح جی میں آیا بدلتے رہے

شعیب اعوان......ڈسکہ

ایسے حالات دشوار ہے مرنا کہ مجھے
زندہ رہنا ہے ابھی مجھے میری سزا باقی ہے

(فدا حسین کا جواب)

احمد منصور.........ملتان

اک نظر بندی کا عالم تھا نگر کی زندگی
قید میں رہتے رہے جب تک شہر والوں میں تھے

(نجمی رحمٰن برٹ لیٹ کا جواب)

سیف اللہ.........ملک وال

اس شہرِ بے چراغ میں جائے گی تو کہاں
اے شب فراق تجھے گھر ہی لے چلوں

نرگس شمشاد.........کراچی

اسی رنگ کا پھول اس نے چنا
جو اک رنگ میری وفا میں نہیں

ممتاز اقبال.........کراچی

اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غمناک
نہ زندگی نہ محبت نہ معرفت نہ نگاہ

نرجس عابدی.........کراچی

اٹھتی ہیں کبھی دل سے غموں کی جو گھٹائیں
احساس کا دریا بھی بہا دیتی ہیں آنکھیں

(نوشین اختر سیالکوٹ کا جواب)

ندرت فاطمہ.........سرگودھا

میں گہری سوچ میں تھا اور کوئی بھیگا ہوا لمحہ
نہ جانے کر گیا کب آ کے پھر سیراب آنکھوں کو

آصفہ عامر.........لاہور

میداں کوئی رہ جائے نہ کونین کا خالی
دھرتی ہرے پودوں سے یہ ڈھک جائے تو اچھا

سمیعہ اختر.........ساہیوال

میرے ناخن کے جوہر اب کھلیں گے
خوش قسمت کہ الجھایا گیا ہوں

عارفہ توقیر.........لاہور

مہک رہی ہے وہی آن بان کی خوشبو
مرے لہو میں مرے خاندان کی خوشبو

افسر اقبال.........کوئٹہ

ممکن نہیں اس باغ میں کوشش ہو بار آوری تری
فرسودہ ہے پھندا ترا، زیرک ہے مرغ تیز تر

(اشفاق احمد سکھر کا جواب)

شجاع احمد.........العین یو اے ای

ہم وادی خیال میں بھٹکے بہت مگر
خود اپنی آہٹوں کے سوا اور کیا ملا

حیات خان.........حیدرآباد

ہم شاد ہیں صرف مگر دل ہے چکنا چور
دنیا ہمارا کرب سمجھ پائے گی کہاں

اکرم جیلانی عطاری.........میرپور خاص

ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم
کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ

(حیات مرزا حیدرآباد کا جواب)

ہما اختر.........مظفر گڑھ

کوئی غم ادھر آئے اسے گھورتی کیوں ہے
اور چاہتی کیا ہے اب تری خوشی ہم سے

ساجد فاروق.........سرگودھا

کبھی کسی سے کوئی ذکر بھی کیا میں نے
تمہارے بارے میں ہر چند کہ سنا ہے بہت

(زویا اکبر لاہور کا جواب)

ایم عمران جونانی.........کراچی

دیکھ کر ہر در و دیوار کو حیراں ہونا
وہ میرا پہلے پہل داخلِ زنداں ہونا

(سلمٰی شاہین فیصل آباد کا جواب)

ہادیہ ایمان، ماہا ایمان.........ڈیرہ نواب

یہی ہے عبادت یہی دین و ایماں
کہ کام آئے دنیا میں انساں کے انساں

(مہوش صدیقی آزاد کشمیر کا جواب)

عبدالجبار رومی انصاری.........لاہور

یہ دلوں کی ہم خیالیاں کبھی تیری زباں کبھی میری زباں
محبتوں کے سلسلوں میں ایسے ہوتا ہے عشق و پیام جاوداں

(عائشہ کریم فیصل آباد کا جواب)

انجم شاہین.........جھنگ

دن میں جانے کب گھس آیا صحرا میرے کمرے میں
دفتر سے لوٹے تو دیکھا گھر کا نقشہ آج عجیب

امتیاز اسد.........پاک پتن

دل پہ ہو گئی کیسی گھاتیں صبح سے پہلے شام کے بعد
کون کرے اب راز کی باتیں صبح سے پہلے شام کے بعد

بیت بازی کا اصول ہے جس حرف پر شعر ختم ہو رہا ہے اسی لفظ سے شروع ہونے والا شعر ارسال کریں۔ اکثر قارئین اس اصول کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ نتیجتاً ان کے شعر تلف کر دیے جاتے ہیں۔ اس اصول کو مدنظر رکھ کر ہی شعر ارسال کریں۔

میرے خیال سے اس مرتبہ دریافت کی گئی شخصیت کا نام.............................ہے۔

نام:.............................

پتا:.............................

....

انعام یافتہ ہونے کی صورت میں مجھے جاسوسی ☐ سسپنس ☐ پاکیزہ ☐ سرگزشت ☐ بھجوایا جائے

کسی ایک پر ☑ کیجیے۔

کوپن کے ہمراہ اپنے جوابات مورخہ 30 اگست 2016ء تک علمی آزمائش 128 پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200 پر ارسال کریں۔

قارئین کے مسلسل اصرار پر ادبی ذوق کی تسکین کے لیے اک نیا سلسلہ "بیت بازی" شروع کیا گیا ہے۔ آپ اپنے پسندیدہ شعر کے آخری حرف سے شروع ہونے والا شعر ارسال کرسکتے ہیں۔

نام.............................

پتا.............................

....

محترم / محترمہ .... کے شعر کے جواب میں شعر ارسال کر رہا ہوں اسے شامل اشاعت کرلیں (شعر الگ کاغذ پر ہے)

88

مقابلہ بیت بازی
پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی، 74200

علمی آزمائش۔ 128

ادارہ

ماہنامہ سرگزشت کامنفرد انعامی سلسلہ

علمی آزمائش کے اس منفرد سلسلے کے ذریعے آپ کو اپنی معلومات میں اضافے کے ساتھ انعام جیتنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ ہر ماہ اس آزمائش میں دیے گئے سوال کا جواب تلاش کر کے ہمیں بھجوائیے۔ درست جواب بھیجنے والے پانچ قارئین کو ماھنامہ سرگزشت، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ اور ماھنامہ پاکیزہ میں سے ان کی پسند کا کوئی ایک رسالہ ایک سال کے لیے جاری کیا جائے گا۔

ماہنامہ سرگزشت کے قاری ''یک صفحی سرگزشت'' کے عنوان تلے منفرد انداز میں زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں مقام رکھنے والی کسی معروف شخصیت کا تعارف پڑھتے رہے ہیں۔ اسی طرز پر مرتب کی گئی اس آزمائش میں دریافت کردہ فرد کی شخصیت اور اس کی زندگی کا خاکہ لکھ دیا گیا ہے۔ اس کی مدد سے آپ اس شخصیت کو بوجھنے کی کوشش کریں۔ پڑھیے اور پھر سوچیے کہ اس خاکے کے پیچھے کون چھپا ہوا ہے۔ اس کے بعد جو شخصیت آپ کے ذہن میں ابھرے اسے اس آزمائش کے آخر میں دیے گئے کوپن پر درج کر کے اس طرح سپرد ڈاک کیجیے کہ آپ کا جواب ہمیں 30 اگست 2016ء تک موصول ہو جائے۔ درست جواب دینے والے قارئین انعام کے مستحق قرار پائیں گے۔ تاہم پانچ سے زائد افراد کے جواب درست ہونے کی صورت میں بذریعہ قرعہ اندازی انعام یافتگان کا فیصلہ کیا جائے گا۔

اب پڑھیے اس ماہ کی شخصیت کا مختصر خاکہ

بانٹوا نامی علاقے میں پیدا ہوئے۔ ہجرت کا دکھ اٹھا کر پاکستان آئے تو ماں پر فالج کا حملہ ہوا اور وہ اپاہج ہو گئیں۔ وہ علاج کے لیے کوشش کرتے رہ گئے لیکن ماں کو بچا نہ سکے۔ اس دکھ نے انہیں ہلا کر رکھ دیا۔ انہوں نے خود سے عہد کیا کہ اپنی ماں کو تو بچا نہ سکا لیکن دوسروں کو بچانے کی کوشش ضرور کروں گا۔ کل جمع پونجی سے انہوں نے ایک چھوٹی سی ڈسپنسری قائم کی اور خدمتِ انسانیت میں لگ گئے۔ نیت صاف تھی۔ خدمت کا جذبہ قوی تھا۔ دیکھتے دیکھتے وہ بنگلہ دیش، ایتھوپیا، فلسطین، افغانستان غرض بہت سارے ممالک میں امدادی کام کرنے لگے۔

علمی آزمائش 126 کا جواب

رالف رسل 1918ء میں برطانیہ کے ہومرٹن میں پیدا ہوا۔ وہ نسلاً انگریز تھا لیکن اردو سے عشق کرتا تھا۔ اس نے GHALIB LIFE & LETTERS جیسی کتاب تالیف کی یعنی خطوط غالب کا ترجمہ کر کے نئے انداز میں ڈھالا۔ وہ اردو میں انگریزی الفاظ کی آمیزش کا مخالف تھا۔ اسے برطانوی بابائے اردو کہا جاتا تھا، چند سال پہلے اس کا 90 سال کی عمر میں انتقال ہوا۔

انعام یافتگان

1۔ ابرار احمد۔ لاہور 2۔ زاہد حسین طوری۔ پاراچنار 3۔ محمد حسین۔ ڈسکہ
4۔ فہیم اللہ۔ پشاور 5۔ شگفتہ مشتاق۔ راولپنڈی

ان قارئین کے علاوہ جن لوگوں کے جوابات درست تھے۔

کراچی سے وکیل الرحمٰن، محمد عثمان، سید عزیز الدین، شاہد اقبال شاہد، ارباب حسن، سید عباس، محمد یامین، مرزا سلیم، علیم ذکائی، طیب الحسن، خادم حسین، صالحہ محمود، عباس خان، خالدہ یوسف، توقیر ناصر، یاسین خان، راغب الحسن، ایم ناصر، منیبہ حبیب، اشتیاق محمد، شجاع رضوی، طیب خان، دانش قریشی، ناصر بٹ، منیر الحسن، اکبر حیات، سید فرخ محمود، فیض محمد، دانش قریشی، محمد اختر، سلطان خان، توقیر عباس اچکزئی، فرحین سلطان، ناصر حسین، عارف اچکزئی، سلطان جونانی، ایاز سکھیرا، فرحین سلطان۔ لاہور سے عبدالجبار رومی، ارسلان شاہد، نگین بھٹ، تو ید اصغر، نواب احسن، ظفر جتوئی، محمد اکرم، فاضل اختر، عباس علی، شیخ محمد سرور جاوید، فہد اللہ، یاسمین محمد، آصف خان، فرحت مصطفیٰ، خادم علی، عبدالخالق، ناصر علی، زرینہ ایوب، انیس الحسن، چوہدری فضل اللہ، برکات اللہ، ظفر قاسم، ذیشان علی، کائنات علی، احمد صدیقی، تابش بلوچ، ناظم حسین سید، فرحت بٹ، جاوید عثمانی، راحیل عثمان، ابرار رضوی، نیاز ملکانی۔ ملتان سے محمد منیب، احمد منصور، اشرف، عبداللہ، عبدالرحیم چشتی۔ اقبال انصاری، لبنیٰ ارشاد، تو ید اصغر بخاری، محمد معین، خواجہ محمد حسین، خضر حیات بھٹی۔ بابر سعید، سلطان فتح علی، محمد آصف، ناصر گواچہ، اشفاق حسن، توقیر عباس، اویس سلمان، رشید علی سید، اقبال حسن خان، انعام حسن خان، امام بخش، حنیف محمد، برکات اللہ بخش، اسماعیل آفاق، ارشاد کاظمی، نہال کاظمی۔ شیخ نہال احمد، سید فرحت عباس، مظہر حسین سید۔ پشاور سے وحید خان، غلام عباس طوری بنگش، باسط علی، خرم علی پاشا، شاہ زرولی، عنایت علی، رضوان شاہ، محمد عرفان، قدرت خان۔ سرگودھا سے ماریہ چودھری، اشفاق حسن، فرحت اللہ، ظفر مینگل، عمیر علی، قدرت خان، داؤد عثمان، رمضان حسن، ہاشم رضا۔ اسلام آباد سے افشاں زیاد، محمد ریاض راحیل، ادریس پاشا، شیخ فتح یاب، صدیق بھٹی، ساغر علی ساغر، عبدالاحد، یوسف حمید گل، خرم لودھی، جنید ملک، بتول کاظمی، عباس نیازی، جہانزیب خان، ارشد خان، فیض بخش، قیام حسین، شگفتہ مشتاق، ملائکہ احسن، وسعت اللہ گجر، توصیف ہمدانی، معیز خان۔ راولپنڈی سے ڈاکٹر سعادت علی خان، احمد شیراز، سرفراز بٹ، عنایت اللہ، زرین زرولی، ظفر خانزادہ، وسیم الدین ہمدانی، علی اسد، کاظم حسن، طیب جسن۔ میر پور خاص سے غلام شبیر، عابد علی، ثانیہ عطاری، لبنیٰ اکرام، شیخ یاسین، محمد بخش، معیز علی خان، حافظ محمد حسن، شیخ ابرار علی، رخسانہ اکمل، فرحت اعجاز بھٹو، زرفشاں فاطمہ، زویا اعجاز بھٹو، ثمرہ متین۔ ساہیوال سے حسن اختر۔ میر پور اے کے سے زاہد بھٹ۔ قصور سے اشرف بٹ۔ خان بیلہ سے یاسین فراز۔ اٹک سے سید محمد حسین شاہ، حیا علی۔ شاہ گڑھ سے فلک شیر ملک۔ اٹک تحصیل جنڈ سے محمد اعجاز خان۔ میانوالی سے کمال حسن۔ سیالکوٹ سے اقرار حسن، نوید شہزاد خواجہ (خادم علی روڈ) ڈاکٹر عبدالغفار، کوکب سلمان، فریحہ سلطان۔ شیخوپورہ سے: قاسم نصیب (صفدر آباد) طاہر الدین، سلمیٰ مہر، ثاقب علی، خورشید حسن، طالب مولیٰ۔ صوابی سے: ضیاالرحمٰن، مولوی شفیق الرحمٰن (زروبی، ٹوپی) محمد منظور۔ لیہ سے: خالد یوسفی، امروز اسلم مغل، سیمیں ناظر، عبدالقادر، رابعہ مبین۔ برہ زئی پچھو سے: ملک جاوید محمد خان سرکانی درانی، سہیل احمد، ثاقب شاہ۔ اوکاڑہ سے: صاحب جان، اشعر محمد، سعید احمد، حسن ابرار، نعمت خان، زاہد جان، زین الاسلام، صالح الدین، بشیر احمد سلطانی، حافظ فیروز الدین اوکاڑوی، سید احسن محمد محمود، محمد سلام، چوہدری سلمان ملک، زرگل خانزادہ، فرحت جہاں، نوشین اختر، محمد فیروز۔ تاثیر زیدی۔ خوشاب سے شمس الاسلام، امینہ رؤف۔ حیدر آباد سے ساجد فاروق، حکیم اللہ جان، سید کاظم علی، نعمان فاروق، فرحت عثمان، نصیر بوترابی، زوفی انصاری، اختر ہاشمی، منیر حسین، دانش فتح محمد، کاظم علی کاظمی، رضوانہ اسحاق، ملک یاسر، عائشہ اعوان۔ ہری پور ہزارہ سے اشرف الماس، مہ جبیں، طوبیٰ شاہ، تہذیب حسین۔ ڈیرہ اسماعیل خان سے باسط سلمان نیازی، لاریب افشاں۔ ڈیرہ غازی خان سے رفیق احمد ناز، اشرف حسن، قبلائی خان، ظریف حسن۔ خوشاب سے ممتاز حسن، زرولی خان، صغریٰ کوثر۔ بہاولنگر سے ناصر عباس، غلام یاسین، فتح محمد خان۔ بہاولپور سے نصرت افضال، سعیدہ طارق، اشفاق محمود، زاہد بٹ۔ جہلم سے زعیم شریف، عاصم بٹ، سکندر حیات، نورین تبسم۔ جونیاں سے ملک شاہین۔ کمالیہ سے ذیشان مصطفیٰ، زاہد طارق، عبدالخالق، عبدالہادی، عثمان والہ سے ساجد شاہ زاہد، زرین صدیقی۔

بیرونِ ملک سے ذیشان علی سید، العین یو اے ای۔ عباس علی سید، ٹوکیو جاپان۔ ارشد علی مانچسٹر یو کے۔ زاہد اقبال شانی، برٹ لیٹ یو ایس اے۔ عباس علی، لندن یو کے۔

محترمہ عذرا رسول

السلام علیکم

کچھ لوگ احساسِ کمتری کا شکار ہو کر خود اپنا نقصان کربیٹھتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں میں نورین کا شمار .... ہوتا ہے۔ میری یہ پیاری سی سہیلی زندگی کو کھیل سمجھ بیٹھی تھی۔ اگر میں ہوشیار نہ رہتی تومیرے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ میں اپنی آپ بیتی ستائش کے لیے نہیں بھیج رہی ہوں۔ ہماری بہنیں اسے ضرور پڑھیں اور عبرت حاصل کریں۔

مسز ندیم

(کراچی)

میں نے دروازہ کھولا تو اپنے سامنے نورین کو کھڑا دیکھ کر حیران رہ گئی۔ میں نے اسے پانچ سال بعد دیکھا تھا۔ گو کہ اس کا وزن کچھ بڑھ گیا تھا لیکن وہ اب بھی پہلے کی طرح پُرکشش تھی۔ گورا رنگ، بڑی بڑی سیاہ آنکھیں، ستواں ناک، نازک لب اور بھرا بھرا جسم لیکن چہرے پر شوخی کی بجائے سنجیدگی اور متانت چھائی ہوئی تھی۔ ممکن ہے کہ یہ عمر کا تقاضا ہو یا پھر حالات کی گردش، میں فوری طور پر کوئی فیصلہ کرنے سے قاصر تھی۔ ویسے بھی اسے اچانک اپنے سامنے دیکھ کر جو خوشی ہوئی اس کے بعد کچھ اور سوچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں بے اختیار اس سے لپٹ گئی اور جذباتی لہجے میں بولی۔ ”اری بے مروت، کہاں جا کر چھپ گئی تھی پلٹ کر خبر بھی نہ لی۔“

اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی اور وہ جھینپتے ہوئے بولی۔ ”اندر تو آنے دو، کیا دروازے پر کھڑے کھڑے ہی سب پوچھ لوگی۔“

”اوہ ہاں کیوں نہیں .....“ میں گڑبڑا گئی۔ ”آؤ تمہیں کون روک سکتا ہے۔“

وہ میرے پیچھے پیچھے ڈرائنگ روم میں آئی۔ میں نے اے سی آن کیا اور اسے صوفے پر بٹھا کر اس کے لیے جوس بنانے چلی گئی۔ اس وقت میں گھر میں اکیلی تھی۔ ندیم اپنے دفتر اور بچے اسکول گئے ہوئے تھے۔ ماسی بھی اپنا کام نمٹا کر جا چکی تھی اور میں دوپہر کا کھانا بنانے کی تیاری کر رہی تھی کیونکہ بچے ڈیڑھ بجے تک آجاتے تھے۔ میری کوشش ہوتی تھی کہ اس وقت تک کھانا تیار ہو جائے۔ میں نے جلدی جلدی جوس بنایا۔ ساتھ میں کچھ ریفریشمنٹ کا سامان ٹرے میں رکھا اور ڈرائنگ روم میں آگئی۔ وہ ایک پینٹنگ پر نظریں جمائے کھڑی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی بولی۔

”گھر تو ماشاء اللہ خوب سیٹ کیا ہے۔ لگتا ہے ندیم بھائی ٹھیک ٹھاک کما رہے ہیں۔“

مجھے اس کا یہ انداز پسند نہیں آیا لیکن پرانی سہیلی تھی

اس لیے برداشت کرلیا اور بولی۔ ''ہاں اللہ کا شکر ہے۔ عزت سے گزارہ ہو رہا ہے۔'' پھر میں نے اسے جوس کا گلاس پکڑاتے ہوئے کہا۔ ''تم سناؤ اتنا عرصہ کہاں رہیں اور آج میری یاد کیسے آگئی؟''

''اگر یہی شکایت میں کروں تو......''
وہ صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''تم نے بھی تو مجھ سے کوئی رابطہ نہیں کیا۔''

''کیسے کرتی تم تو شادی کے بعد لاہور چلی گئی تھیں۔ میرے پاس جو تمہارا نمبر تھا۔ اس پر دو تین مرتبہ ملایا لیکن کوئی جواب نہیں ملا میں سمجھی کہ شاید تمہارا نمبر تبدیل ہوگیا ہے۔''

''ہاں اس نمبر پر کچھ بے ہودہ کالز آرہی تھیں۔ مجھے ڈر لگا کہ کہیں میاں جی نے کوئی ایسی ویسی کال اٹینڈ کرلی تو مصیبت آجائے گی۔ اس لیے میں نے سم ہی تبدیل کرلی پھر گھر اور سسرال کے بکھیڑوں میں اس طرح الجھی کہ دوستوں کو نمبر دینے کا خیال ہی نہیں آیا۔''

''خیر چھوڑو ان باتوں کو، یہ بتاؤ کراچی کب آئیں، کب تک رہو گی۔ میاں جی بھی ساتھ آئے ہیں وغیرہ وغیرہ۔''

''مجھے آئے ہوئے ایک ہفتہ ہوا ہے۔ وہ مجھ سے پہلے آگئے تھے۔ دراصل ان کا کراچی تبادلہ ہوگیا ہے اور اب ہم یہیں رہیں گے۔''

''اوہ یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔ خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں کے دیوانے دو، سچ پوچھو تو میں بھی کسی دوست کی کمی شدت سے محسوس کررہی تھی۔ سب سہیلیاں شادی کر کے اپنے اپنے ٹھکانوں کو چلی گئیں۔ کسی سے کوئی رابطہ نہیں رہا۔''

''ٹھیک کہا تم نے۔'' وہ سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔ ''وقت کے ساتھ ساتھ تعلقات اور رشتے بھی بدل جاتے ہیں اسی لیے کہتے ہیں کہ کسی تعلق کو پائیدار مت جانو۔''

میں نے پہلے کبھی اسے اتنا سنجیدہ نہیں دیکھا تھا۔ اس لیے میرا حیران ہونا ایک فطری امر تھا۔ میں نے غور سے اس کے چہرے کو دیکھا۔ ''تم تو بڑی شوخ اور نٹ کھٹ ہوا کرتی تھیں۔ ایسی فلسفیانہ باتیں کب سے کرنے لگیں؟''

''وقت سب کچھ سکھا دیتا ہے۔'' وہ پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ پھر اس نے اپنا پرس اٹھایا اور کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔ ''اچھا اب چلتی ہوں۔ کھانا بھی بنانا ہے۔ وہ تین بجے تک آجاتے ہیں اور گھر میں قدم رکھتے ہی انہیں بھوک ستانے لگتی ہے۔''

''ارے اتنی جلدی ابھی تو کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔'' میں اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولی۔ ''میں کھانا کھائے بغیر نہیں جانے دوں گی۔''

''نہیں پھر آؤں گی۔ کھانا بھی کھاؤں گی اور بہت سی باتیں بھی کریں گے۔''

اس کے جانے کے بعد میں اپنے کاموں میں مصروف ہوگئی لیکن ذہن بار بار اس کی طرف جا رہا تھا۔ یہ وہ نورین نہیں تھی جو کبھی میری کلاس فیلو ہوا کرتی تھی۔ وہ تو بڑی شوخ چنچل اور ہنسنے ہنسانے والی لڑکی تھی۔ ہر وقت مذاق اور نت نئی شرارتیں کرنا اس کی فطرت میں شامل تھا۔ وہ بڑی باتونی اور ہنس مکھ تھی اور ہر ایک سے بہت جلد دوستی کرلیا کرتی تھی۔ ہمارے کالج میں مخلوط تعلیم تھی گو کہ ہم چار پانچ لڑکیوں نے اپنا گروپ بنا رکھا تھا لیکن وہ لڑکوں سے بھی بڑے تکلفانہ انداز میں پیش آتی تھی۔ ہمارا گھرانا خاصا

قدامت پسند اور مذہبی واقع ہوا تھا اس لیے ہم لوگ اپنے کزنز سے بھی فاصلے پر رہا کرتے تھے۔ خاندان میں کوئی تقریب ہوتی تو لڑکے لڑکیاں الگ الگ ٹولیوں میں بٹ جاتے۔ مجھے بچپن سے ہی یہ تربیت دی گئی تھی کہ نامحرم لڑکوں سے زیادہ بات چیت نہ کروں۔ چاہے وہ خاندان کے ہی کیوں نہ ہوں۔ یہ گھر کے ماحول اور تربیت کا ہی اثر تھا کہ کالج میں بھی کسی لڑکے سے دوستی نہیں ہوئی۔ اگر کوئی لڑکا کسی بہانے مجھ سے بات کرنے کی کوشش کرتا تو میں مختصر جواب دے کر اسے ٹال دیتی۔ میرے گروپ کی دوسری لڑکیوں کا بھی یہی حال تھا۔ ہم فارغ وقت ایک ساتھ گزارتے۔ خالی پیریڈ میں اکٹھے کینٹین جاتے یا کامن روم میں بیٹھ کر باتیں کرتے لیکن ہماری محفل میں کسی لڑکوں کا داخلہ بند تھا۔

نورین کا معاملہ ذرا مختلف تھا۔ ویسے تو وہ ہمارے گروپ میں شامل تھی لیکن موقع بہ موقع لڑکوں سے بات کرنے میں بھی اسے کوئی اعتراض نہ تھا۔ یہ رنگ ڈھنگ دیکھ کر لڑکے بھی اس کی طرف متوجہ ہونے لگے۔ شروع شروع میں تو ہم نے کچھ محسوس نہ کیا لیکن جب میں نے ایک دو مرتبہ نوید کے ساتھ اسے کینٹین میں بیٹھے دیکھا تو مجھ سے برداشت نہ ہوسکا۔ میں نے اسے اکیلے میں سمجھاتے ہوئے کہا کہ وہ نوید سے راہ و رسم نہ بڑھائے۔ اس کی شہرت اچھی نہیں ہے لیکن نورین نے میری بات کو ہنسی میں ٹال دیا اور بولی۔ ''میں کوئی دودھ پیتی بچی نہیں ہوں اگر اس نے حد سے آگے بڑھنے کی کوشش کی تو مزہ چکھا دوں گی۔''

اس کے بعد میں نے اس موضوع پر اس سے کوئی بات نہیں کی کیونکہ وہ کچھ سننے اور سمجھنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ اس لیے اس سے سر کھپانا بے کار تھا۔ آہستہ آہستہ وہ ہم لوگوں سے دور ہوتی گئی۔ اب اس کا زیادہ وقت نوید کے ساتھ ہی گزرتا۔ وہ ہمارے ساتھ کینٹین بھی نہیں جاتی تھی۔ نوید اس کا پارٹنر بن گیا تھا۔ ہمارے گروپ کی دوسری لڑکیوں نے اس بات کو زیادہ محسوس نہیں کیا کیونکہ کالج میں لڑکے لڑکیوں کی دوستی کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ کچھ لڑکیاں اسے پسند نہیں کرتی تھیں اور کچھ کے نزدیک اس میں کوئی حرج نہیں تھا۔ میں جانتی تھی کہ لڑکے محض وقت گزاری کے لیے لڑکیوں سے عارضی دوستی کرتے اور دل بھر جانے پر تعلق ختم کر لیتے ہیں یا پھر ان کی کسی اور لڑکی سے دوستی ہو جاتی ہے۔ میں نے کتابوں، رسالوں اور فلموں میں مرد کی ہرجائی طبیعت کے بارے میں بہت کچھ پڑھا اور دیکھا تھا۔ محلے میں بھی ایک دو واقعات ایسے سننے میں آئے جن میں کسی لڑکے نے اپنی پڑوسن کو محبت کا جھانسا دیا اور کچھ عرصہ بعد اسے برباد کر کے غائب ہوگیا۔ اسی وجہ سے میں لڑکوں سے دوستی کے خلاف تھی اور اسی لیے میں نے نورین کو نوید سے دوستی کرنے سے باز رکھنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہی۔

کچھ ہی دن گزرے تھے کہ ایک روز نورین کلاس ختم ہونے کے بعد میرے پاس آئی اور مجھے پکڑ کر ایک کونے میں لے گئی پھر اس نے اپنے بیگ میں سے ایک بہت ہی قیمتی موبائل نکالا اور مجھے دکھاتے ہوئے بولی۔ ''کیسا ہے؟''

اس وقت تک میرے پاس موبائل فون نہیں تھا۔ اس لیے مجھے اس بارے میں کچھ معلومات نہیں تھیں تاہم اس کا دل رکھنے کے لیے کہہ دیا۔ ''اچھا ہے، کتنے کا لیا؟''

وہ جھینپتے ہوئے بولی۔ ''پاگل ہوگئی ہو۔ میں اتنا قیمتی موبائل کیسے خرید سکتی ہوں۔ تمہیں تو ہمارے حالات کا پتا ہے نا۔''

میں اس کے گھریلو حالات سے اچھی طرح واقف تھی۔ وہ چھ بہن بھائیوں میں سب سے بڑی تھی۔ ابا کسی سرکاری محکمے میں معمولی سی پوسٹ پر تھے اور اماں محلے والوں کے کپڑے سی کر گھر کی آمدنی میں اضافہ کرنے کی کوشش میں لگی رہتیں۔ بس کسی نہ کسی طرح سفید پوشی کا بھرم قائم رکھا ہوا تھا۔ دو وقت کی روٹی اور بچوں کی پڑھائی کا خرچ ہی پورا ہو جائے تو بڑی بات تھی۔ موبائل فون خریدنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ اکثر میرے سامنے اپنی غربت کا رونا روتی اور تان اس جملے پر آن کر ٹوٹتی کہ آخر میں اس گھر میں کیوں پیدا ہوئی؟

اس کا جواب سن کر میرا تجسس بڑھ گیا اور میں نے اسے کریدنے کی خاطر پوچھا۔ ''پھر۔ یہ موبائل تمہیں کس نے دیا ہے؟''

''نوید نے۔'' وہ اس کا نام لیتے ہوئے یوں شرمائی جیسے یہ موبائل اس کے منگیتر نے دیا ہے۔

''تمہیں یہ موبائل نہیں لینا چاہیے تھا۔'' میں نے ناراض ہوتے ہوئے کہا۔

''کیوں اس میں حرج ہی کیا ہے۔'' وہ آنکھیں مٹکاتے ہوئے بولی۔

''اس لیے کہ اس سے تمہارا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ وہ

تمہارا شوہر، منگیتر، بھائی، کزن کچھ بھی تو نہیں ہے۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ وہ میرا دوست ہے اور دوستی میں تحفے تحائف دیے ہی جاتے ہیں۔"

"اچھا اگر یہ بات ہے تو کیا تم بھی دوستی کو مضبوط بنانے کے لیے ایسا کوئی تحفہ اسے دے سکتی ہو؟"

"مجھ پر طنز کر رہی ہو۔" وہ منہ پھلاتے ہوئے بولی۔

"جب کہ تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں اسے دس روپے کی چیز بھی تحفہ میں نہیں دے سکتی۔"

"اسی لیے تو کہہ رہی ہوں کہ یہ یک طرفہ ٹریفک ٹھیک نہیں۔ اگر یہ سلسلہ یونہی چلتا رہا تو ایک دن تم تحفوں کے بوجھ تلے دب کر اس کی ہر جائز و ناجائز بات ماننے پر مجبور ہو جاؤ گی۔"

"تم کچھ بھی کہو لیکن میں جس راستے پر چل نکلی ہوں اس سے واپس نہیں آسکتی۔ بچپن سے لے کر آج تک محرومیوں کی آگ میں جلتی رہی ہوں، اب اس موقع کو کھونا نہیں چاہتی نوید کے علاوہ اور لڑکوں سے بھی دوستی کر رہی ہوں تاکہ صرف نوید پر انحصار کم ہو جائے۔"

"یہ تو سراسر آوارگی ہے۔"

"آوارگی نہیں ضرورت۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "میں کب تک اپنی خواہشات کا گلا گھونٹتی رہوں گی۔ اگر دو سال تک بھی اپنا جیب خرچ جمع کرتی رہوں تو ایسا موبائل نہیں خرید سکتی جو مجھے مفت میں مل گیا ہے۔ میرا بھی دل چاہتا ہے کہ اچھے کپڑے پہنوں، قیمتی جیولری اور میک اپ کا سامان خریدوں۔ شہر کے مہنگے اور عالیشان ہوٹلوں میں لنچ اور ڈنر کروں اور ملٹی پلیکس سنیماؤں میں فلمیں دیکھوں لیکن میں یہ سب افورڈ نہیں کر سکتی۔ اس کے لیے بہت سا پیسا چاہیے جو میرے پاس نہیں ہے۔ اس لیے میں نے نوید اور اس جیسے دوسرے لڑکوں کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا ہے تاکہ اپنی خواہشات کی تکمیل کر سکوں۔"

"نوید نے یہ موبائل ایسے ہی گفٹ نہیں کیا۔ اس میں بھی اس کی کوئی غرض پوشیدہ ہوگی۔"

"میں اس کی نوبت ہی نہیں آنے دوں گی۔" اس نے بے پروائی سے کہا۔

"اچھا میری ایک بات مان سکتی ہو۔" میں نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔

"وہ کیا؟"

"نوید یا کسی بھی لڑکے کے ساتھ باہر جانے سے گریز کرنا، مثلاً ہوٹل یا سنیما وغیرہ۔ تمہاری دوستیاں کالج کی چار دیواری تک ہی محدود رہنی چاہئیں۔"

"تمہارے مشورے کا شکریہ، میں محتاط رہوں گی۔ بائی دا وے کسی اور فرینڈ کو اس گفٹ کے بارے میں مت بتانا۔" اس نے جانے سے پہلے کہا۔

"بے فکر رہو۔ کسی کو نہیں بتاؤں گی۔"

مجھے اس کی سادگی اور حماقت پر ہنسی آرہی تھی۔ ایسی باتیں بھلا چھپ سکتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب وہ کال سننے یا ایس ایم ایس پڑھنے کے لیے موبائل نکالے گی تو سب لوگ اسے دیکھ کر حیران رہ جائیں گے اور ہر ایک کے دل میں لازمی طور پر تجسس پیدا ہوگا کہ نورین کے پاس اتنا قیمتی موبائل کہاں سے آیا کیونکہ ہمارے گروپ کی سب لڑکیاں اس کے گھریلو حالات سے بخوبی واقف تھیں اور جانتی تھیں کہ وہ کبھی بھی اتنا قیمتی موبائل نہیں خرید سکتی۔ ویسے بھی لڑکوں سے اس کے میل جول کے بارے میں دبی زبان میں باتیں شروع ہوگئی تھیں۔ میری عادت نہیں تھی کہ دوسروں کے بارے میں پیٹھ پیچھے کوئی بات کروں لیکن فرینڈز کی گفتگو سے اندازہ ہوا کہ وہ نورین کی اس روش کو اچھا نہیں سمجھتی تھیں۔

نورین ان سب باتوں سے بے خبر اپنی ہی دنیا میں مگن تھی۔ اب اس نے نوید کے علاوہ دوسرے لڑکوں سے بھی دوستیاں کر لی تھیں۔ وہ سب کھاتے پیتے گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے اور ان کے پاس پیسوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ نورین کے چہرے پر بھی رونق آگئی تھی اور وہ پہلے کے مقابلے میں زیادہ شوخ اور ہنس مکھ ہوگئی تھی۔ کالج میں یونی فارم کی پابندی کی وجہ سے وہ اپنے من پسند کپڑے نہیں پہن سکتی تھی جن سے اس کی الماری بھرتی جا رہی تھی لیکن اس کی خوش حالی اور بے فکری کسی سے چھپی نہیں رہ سکی۔ ایک دن وہ میرے ساتھ چائے پینے کینٹین گئی اور جب اس نے بل دینے کے لیے اپنا پرس کھولا تو مجھے اس میں کئی بڑے نوٹ نظر آئے۔ میں نے فوراً ہی اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولی۔

"رہنے دو، بل میں دوں گی۔"

"ہمیشہ تم ہی دیتی ہو۔ آج مجھے دینے دو۔"

"وہ نہیں اگر یہ تمہارے اپنے پیسے ہوتے تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہوتا۔"

"اچھا بابا، اس وقت میں تم سے بحث کے موڈ میں نہیں ہوں۔" وہ پرس بند کرتے ہوئے بولی۔ "چلو تم ہی بل

ادا کردو۔‘‘

ویٹر برتن لے کر چلا گیا تو میں نے ایک بار پھر اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ’’دیکھو نورین جو کچھ تم کررہی ہو یہ ٹھیک نہیں ہے۔ اس وقت تمہارے پرس میں اتنے ڈھیر سارے نوٹ دیکھ کر میرا دل اندر سے دہل گیا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ کسی روز یہ لڑکے اپنا قرض بمعہ سود وصول نہ کرلیں۔ بلاوجہ کوئی کسی پر نہیں لٹاتا۔‘‘

’’تم بلاوجہ پریشان ہورہی ہو۔ تمہیں شاید معلوم نہیں کہ میں نے شام میں کچھ ٹیوشنز کرلی ہیں۔ ان کے پیسوں سے ایک کمیٹی ڈالی تھی۔ یہ وہی پیسے ہیں کالج سے واپسی پر بینک میں جمع کرادوں گی۔‘‘

میں جانتی تھی کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے لیکن اس سے مزید بحث کرنا مناسب نہ سمجھی اس سے زیادہ کیا سمجھا سکتی تھی۔ اب میں یہی دعا کررہی تھی کہ جلد از جلد امتحان ہوں اور نوید جیسے لڑکوں سے اس کی جان چھوٹ جائے۔ میری کوشش ہوتی تھی کہ زیادہ سے زیادہ اس کے ساتھ رہوں تاکہ اسے کسی لڑکے سے بات کرنے کا موقع نہ مل سکے لیکن اس کی عادتیں اتنی پختہ ہوچکی تھیں کہ وہ مجھے بھی غچہ دے کر نکل جاتی۔ تاہم میں نے اپنی نگرانی جاری رکھی اور اسے یہ دھمکی بھی دے دی کہ اگر میں نے اسے نوید یا کسی دوسرے لڑکے کے ساتھ کالج سے باہر جاتے دیکھ لیا تو اسی وقت اس کے گھر والوں کو بتادوں گی۔

ایک دن وہ کالج آئی تو اس کا منہ اترا ہوا تھا اور آنکھیں بھی سوجی ہوئی تھیں۔ لگتا تھا جیسے دیر تک روتی رہی ہو۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ نوید سے جھگڑا ہوگیا ہے۔ میں نے وجہ پوچھی تو کہنے لگی۔ ’’وہ مجھے اپنے گھر لے جانا چاہ رہا تھا تاکہ اس کی امی سے مل سکوں۔ اس نے ان سے میرا ذکر کیا تھا۔ وہ چاہتی ہیں کہ بات آگے بڑھانے سے پہلے وہ ایک دفعہ مجھ سے مل لیں لیکن میں نے انکار کردیا اور کہا ابھی میرا شادی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ ماسٹرز کرنے سے پہلے شادی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی۔ اگر تم رشتہ پکا کرنا چاہتے ہو تو اپنی امی کو ہمارے گھر بھیج دو۔ اس پر وہ غصے میں آگیا اور کہنے لگا کہ تمہیں مجھ پر بھروسا نہیں ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ بات بھروسے کی نہیں لیکن میں اسے اچھا نہیں سمجھتی کہ اپنا چہرہ دکھانے تمہاری امی کے پاس چلی جاؤں۔ یہ سن کر اس کا پارہ اور ہائی ہوگیا اور کہنے لگا کہ تم اپنے آپ کو کیا سمجھتی ہو۔ میرے لیے لڑکیوں کی کوئی کمی ہے ایک سے ایک اچھی لڑکی مل سکتی ہے۔ اس پر میں نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا اور بولی پھر میرا دماغ کیوں خراب کررہے ہو۔ جاؤ کسی ایسی لڑکی سے دوستی کرو جو تمہارے ساتھ ڈیٹ پر جاسکے۔ یہ سن کر وہ پیر پٹختا ہوا چلا گیا۔ اب دو دن سے بات چیت بند ہے۔ سامنے آجائے تو منہ پھلا کر نکل جاتا ہے۔ فون بھی نہیں کیا۔‘‘

’’کیا فون پر بھی اس سے باتیں کرتی ہو؟‘‘ میں نے چونکتے ہوئے کہا۔

’’ہاں وہ رات میں فون کرتا ہے اور ہم دیر تک باتیں کرتے رہتے ہیں۔ پیکیج کا یہی تو فائدہ ہے۔‘‘

’’لعنت بھیجو پیکیج پر۔‘‘ میں نے جھلاتے ہوئے کہا۔ ’’اب تمہیں پہلا کام یہ کرنا ہے کہ فوراً اپنی سم بدل دو تاکہ وہ تمہیں فون پر تنگ نہ کرے۔ یہ نیا نمبر کسی دوسرے لڑکے کو بھی مت دینا۔‘‘

چند روز گزر گئے لیکن کوئی خاص بات نہیں ہوئی پھر میں نے نوید کو کسی دوسری لڑکی کے ساتھ دیکھا تو میرا شک یقین میں بدل گیا اور اس کے بارے میں جو رائے قائم کی تھی وہ درست ثابت ہوئی۔ نوید ان لڑکوں میں سے تھا جو غریب لڑکیوں کو روشن مستقبل کا خواب دکھا کر عارضی دوستی کرتے ہیں اور مطلب نکل جانے کے بعد منہ پھیر لیتے ہیں اگر میں نے نورین کو پہلے سے ہوشیار نہ کیا ہوتا تو وہ بھی اس کے بچھائے ہوئے جال میں پھنس جاتی۔

جب میں نے نورین کو نوید کی نئی دوستی کے بارے میں بتایا تو وہ منہ بناتے ہوئے بولی۔ ’’جانتی ہوں اس نے مجھ سے دوستی ختم کردی ہے اور اب دوسری لڑکیوں کے پیچھے بھاگ رہا ہے۔ خیر مجھے کیا میرے لیے بھی لڑکوں کی کمی نہیں۔ نوید سے کہیں زیادہ اچھے لڑکے میری جیب میں ہیں۔‘‘

میں نے غصے سے کہا۔ ’’تم اپنی حرکتوں سے باز نہیں آؤ گی۔ میں تو سمجھ رہی تھی کہ اس واقعے کے بعد تمہیں عقل آگئی ہوگی۔‘‘

’’اگر عقل آگئی تو میرا گزارہ کیسے ہوگا۔‘‘ وہ ڈھٹائی سے بولی۔ ’’ان لڑکوں سے دو چار باتیں کرلو تو یہ اپنی جیب خالی کرنے پر تیار ہوجاتے ہیں۔ جب کوئی خود ہی بے وقوف بننے پر آمادہ ہو تو میں کیا کرسکتی ہوں۔‘‘

میں ڈر رہی تھی کہ کہیں نوید موقع پاکر نورین کو تنگ نہ کرے لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ شاید نوید کو بھی اندازہ ہوگیا تھا

کہ انگور کھٹے ہیں۔ نورین بنیادی طور پر ایک شریف لڑکی ہے اور وہ اس کی دھمکیوں سے مرعوب نہیں ہوگی۔ دوسری جانب نورین نے بھی ہمارے گروپ میں اٹھنا بیٹھنا شروع کردیا تھا۔ کیونکہ وہ نوید کو کوئی موقع نہیں دینا چاہتی تھی لیکن دوسرے لڑکوں سے اس کی دوستیاں برقرار تھیں اور ان کے پیسوں سے اس کے ٹھاٹ باٹ چل رہے تھے۔ میں نے اس کے معاملے میں بولنا چھوڑ دیا تھا۔ ویسے بھی امتحان نزدیک آگئے تھے اور میں سب کچھ بھول کر پڑھائی میں لگ گئی۔

امتحان ختم ہوئے، نتیجہ آیا اور ہم لوگ کالج سے نکل کر یونیورسٹی میں آگئے۔ میرے گروپ کی تین لڑکیاں ایک ہی ڈیپارٹمنٹ میں تھیں لیکن نورین کے نمبر کم آئے تھے اس لیے اسے کیمسٹری میں داخلہ نہیں ملا چنانچہ وہ بوٹنی میں چلی گئی۔ اب میری اس سے بہت کم ملاقات ہوتی تھی۔ کبھی کسی راہداری یا کینٹین میں مل جاتی تو کھڑے کھڑے دو چار باتیں کرلیتی لیکن یونیورسٹی میں بھی اس کی وہی روش برقرار تھی۔ میں جب بھی کینٹین گئی تو اسے کسی نہ کسی لڑکے کے ساتھ سرگوشیوں میں باتیں کرتے ہوئے دیکھا۔ یہاں کالج کے مقابلے میں زیادہ آزادی تھی اور لڑکے لڑکیوں کا میل جول معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔

ایک دن میں لائبریری میں بیٹھی کچھ نوٹس تیار کررہی تھی کہ وہ بھی وہاں آگئی۔ مجھے دیکھ کر اس نے ہاتھ ہلایا اور میرے برابر والی کرسی پر آکر بیٹھ گئی۔ وہ مجھے کچھ پریشان لگ رہی تھی۔ میں نے حال پوچھا تو بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ”کوئی ایک بات ہو تو بتاؤں۔ ایسا لگتا ہے کہ پریشانیوں نے ہمارا گھر دیکھ لیا ہے۔ ابو کی قلیل تنخواہ میں ویسے ہی گزارہ نہیں ہوتا تھا۔ امی بے چاری سلائی کر کے کچھ پیسے جوڑ لیا کرتی تھیں۔ ان کی آنکھ میں بھی موتیا آگیا ہے۔ ڈاکٹر نے فوراً آپریشن کے لیے کہا ہے لیکن میں نہیں سمجھتی کہ اس کے بعد بھی وہ سلائی کا کام جاری رکھ سکیں گی۔ سوچ رہی ہوں کہ میں کوئی چھوٹی موٹی جاب کرلوں۔“

”تمہارا یونیورسٹی میں پہلا سال ہے۔ کم از کم آنرز تو کرلو تاکہ تمہیں کوئی معقول ملازمت مل سکے۔“

”نہیں میں اتنا انتظار نہیں کرسکتی۔ ان حالات میں میرے لیے تعلیم جاری رکھنا ممکن نہیں بس جتنا پڑھ لیا وہی کافی ہے ویسے بھی عورت چاہے کتنا ہی پڑھ لکھ جائے کچن سے اس کی جان نہیں چھوٹتی۔ مجھے فوراً کوئی جاب ڈھونڈنا ہو

منطق الطیر

شیخ فرید الدین عطار کی تمثیلی مثنوی جو 4600 اشعار پر مشتمل ہے اس میں عارفانہ مطالب کو حقیقت کے پیرائے میں ادا کیا گیا ہے۔ اس مثنوی کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک روز سب پرندے یکجا ہو کر کہنے لگے کہ کوئی ملک ایسا نہیں جہاں بادشاہ نہ ہو۔ ہمیں بھی چاہیے کہ ہم اپنے بادشاہ کو تلاش کریں۔ ہدہد بولا کہ ہمارے بادشاہ کا نام سیمرغ ہے۔ سب ہدہد کو اپنا رہنما بنا لیتے ہیں تاکہ سیمرغ کی تلاش ہو سکے۔ ہدہد وعدہ کرتا ہے کہ وہ انہیں سیمرغ تک پہنچا دے گا بشرطیکہ وہ راستے کی سختیاں برداشت کریں اکثر پرندے وہیں معذرت کرلیتے ہیں۔ کچھ مسافرت میں تھک کر پیچھے رہ جاتے ہیں۔ بہرحال صرف تیس پرندے سات ہولناک وادیوں میں سے گزرتے ہوئے سیمرغ کی بارگاہ میں پہنچتے ہیں لیکن وہاں انہیں معلوم ہوتا ہے کہ سیمرغ اور تیس پرندے ایک ہی چیز کے دو نام ہیں گویا وہ جس حقیقت کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے یہاں آئے تھے وہ خود ان کے باطن میں موجود تھی۔ اس تمثیلی مثنوی میں تیس پرندے تیس سالک ہیں۔ سیمرغ ان کا محبوب ہے۔ سالکوں نے جو تکالیف برداشت کی ہیں وہ درحقیقت عارفوں کی ریاضتیں اور مجاہدے ہیں۔ سالکوں نے ذیل کی سات وادیاں عبور کی ہیں اور یہی تصوف کے منازل و مقامات ہیں۔ طلب و جستجو، عشق، معرفت، استغنا، توحید، حیرت، فنا۔

مرسلہ: احمد فاروقی۔ سیالکوٹ

منطقۂ معتدلہ شمالی

شمالی 1/2-23 درجے عرض بلد شمالی سے 1/2-66 درجے عرض بلد شمالی کے درمیان واقع ہے (یعنی خط سرطان سے لے کر دائرہ قطب شمالی تک) اس خطے میں گرمیوں میں خاصی گرمی پڑتی ہے مگر منطقۂ حارہ سے کم اور سردیوں میں اچھی خاصی سردی پڑتی ہے مگر قطبین سے کم۔ اگر سال بھر کی اوسط لگائی جائے تو یہ منطقہ منطقہ حارہ سے کم گرم اور منطقہ باردہ کے مقابلے میں کم سرد ہے۔

مرسلہ: رعنا تبسم۔ لاہور

گی۔"

کچھ دنوں بعد اس نے بتایا کہ اسے ایک دواؤں کی کمپنی میں جاب مل گئی ہے۔ معقول تنخواہ اور آنے جانے کی سہولت بھی موجود تھی۔ مجھے اس کے یونیورسٹی چھوڑنے کا بہت افسوس ہوا لیکن وہ بھی حالات سے مجبور تھی۔ اس نے رخصت ہوتے وقت وعدہ کیا کہ وہ مجھ سے رابطہ میں رہے گی اور وقفے وقفے سے اپنے حالات سے آگاہ کرے گی۔ میں نے بھی اس سے ایسا ہی وعدہ کیا اور یوں ہمارے راستے جدا ہو گئے۔

شروع شروع میں تو وہ مجھے باقاعدگی سے فون کرتی رہی۔ میں بھی کبھی کبھی اس کی خیریت معلوم کرلیا کرتی تھی۔ پھر اس میں کمی آتی گئی اس نے اپنے بارے میں جو کچھ بتایا۔ اس سے تو یہی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اپنی ملازمت سے مطمئن ہے۔ اس کی امی کی آنکھ کا آپریشن ہو گیا تھا لیکن نورین نے انہیں سلائی کرنے سے منع کر دیا تھا اور اپنی پوری تنخواہ ان کے ہاتھ پر رکھ دیتی تھی۔ اپنے اخراجات کی اسے کوئی فکر نہیں تھی کیونکہ وہاں بھی اس نے اپنی پرانی روش برقرار رکھی۔ جس کی طرف مسکرا کر دیکھ لیتی وہی اس کا دیوانہ ہو جاتا۔ حالانکہ اس کے ساتھ اور بھی کئی لڑکیاں کام کرتی تھیں لیکن مردوں میں وہ بہت جلد ہردلعزیز ہو گئی۔ شکل صورت کی اچھی تھی۔ بن سنور کر اور جدید تراش خراش کا لباس پہن کر کام پر آتی تو ساری نگاہیں اس کی طرف اٹھ جاتیں، صرف کنوارے ہی نہیں بلکہ شادی شدہ مرد بھی اس کی نگاہ التفات کے منتظر رہتے اور وہ کسی کو مایوس نہیں کرتی تھی۔

یہ سب باتیں اس نے مجھے فون پر بتائیں، "میں تمہیں بتا نہیں سکتی کہ یہاں کا ماحول کتنا مختلف ہے۔ پہلے میں سمجھتی تھی کہ کالج اور یونیورسٹی کے لڑکے ہی بے وقوف ہوتے ہیں لیکن اب معلوم ہوا کہ سارے مرد ایک جیسے ہیں۔ وہ بے چارے تو اپنے جیب خرچ سے چھوٹے موٹے تحفے دیا کرتے تھے لیکن کمانے والے مردوں کے لیے یہ کوئی مسئلہ نہیں۔ پہلے پہل میں محتاط رہی اور اپنی طرف سے کسی سے دوستی کرنے کی کوشش نہیں کی لیکن جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ یہاں تو ہر کوئی میری توجہ کا طالب ہے۔ سو میں نے بھی بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے کا فیصلہ کرلیا اور اب مزے کر رہی ہوں۔ سچ پوچھو تو میں نے آج تک کسی سے کوئی فرمائش نہیں کی۔ بغیر کہے میرے سارے کام ہو جاتے ہیں۔ میں بھی بہانے بہانے دفتر میں ہی چھوٹی موٹی تقریبات کر کے ان سے تحائف بٹورتی رہتی ہوں کبھی اپنی سالگرہ، کبھی ملازمت کا سال پورا ہونے پر تقریب کبھی بہن کے پاس ہونے کی پارٹی تو کبھی امی کی صحت یابی کا جشن وغیرہ وغیرہ۔ ان تقریبات پر میرے ہزار روپے بھی خرچ نہیں ہوتے لیکن اس کے بدلے سیکڑوں روپے کے تحائف اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ کئی ایک تو مجھے لنچ، ہائی ٹی اور سینما لے جانے کی دعوت دے چکے ہیں لیکن مجھے تمہاری نصیحت یاد ہے۔ اس لیے ابھی تک کسی کے ساتھ باہر نہیں گئی جب ویسے ہی میرا کام چل رہا ہے تو خوامخواہ کی بدنامی مول لینے سے کیا فائدہ؟

"میرا مشورہ ہے کہ تمہیں یہ عادت ترک کر دینی چاہیے۔" میں نے اس کی پوری بات سننے کے بعد کہا۔ "اگر کسی دن کوئی گلے پڑ گیا تو مصیبت آجائے گی۔"

"یہ تاریخی واقعہ بھی ہو چکا ہے۔" اس نے زوردار قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ "ایک سے زیادہ لوگ مجھے شادی کا جھانسا دے چکے ہیں لیکن میں نے ان سے بھی یہی کہا ہے کہ اگر وہ ایسا چاہتے ہیں تو اپنے بڑوں کو میرے گھر بھیجیں۔ یہ سن کر ان کا سارا جوش جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔"

"اسی سے اندازہ ہو جانا چاہیے کہ تم سے دوستی کرنے والوں کی نیت کیا ہے۔ اس کے باوجود تم اپنی عادت بدلنے کو تیار نہیں۔"

"تم اسے میری مجبوری سمجھ لو اور میں اس طرزِ زندگی کی عادی ہو چکی ہوں۔ میری اپنی تنخواہ میں یہ اللّے تللّے نہیں ہو سکتے۔ اگر اپنے اوپر خرچ کرنے لگی تو گھر میں کیا دوں گی۔"

"تم سادہ طرزِ زندگی بھی اختیار کر سکتی ہو ضروری نہیں کہ تم قیمتی لباس، جیولری اور پرفیوم وغیرہ استعمال کرو۔ ان کے بغیر بھی گزارہ ہو رہا ہے۔"

"معاف کرنا، میں ایسا نہیں کر سکتی۔ اس راستے پر اتنا آگے جا چکی ہوں کہ اب واپسی مشکل ہے۔"

"اس کا ایک حل ہے۔" میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"وہ کیا؟"

"کوئی موٹی آسامی دیکھ کر اس سے شادی کرلو۔"

"تم نے میرا گھر نہیں دیکھا۔ اس لیے ایسی بات کبھی نہ کہتیں۔ اس گلی میں تو کوئی دبلی آسامی بھی نہیں آسکتی۔ ویسے بھی ڈیفنس والا، سرجانی میں نہیں آسکتا اور نہ ہی سرجانی والے میں اتنی جرأت ہے کہ وہ ڈیفنس کا رخ کرے۔"

"بس تو میں تمہارے لیے دعا ہی کر سکتی ہوں۔" میں نے جھلّاتے ہوئے کہا۔

”ہاں وہ کرتی رہو، تم جیسی دوست سے یہی توقع کی جاسکتی ہے۔“

اس کے بعد کئی مہینے تک اس کا فون نہیں آیا۔ میں بھی پڑھائی کی مصروفیت میں گم ہو کر اس سے رابطہ نہ کر سکی۔ میرا ماسٹرز مکمل ہو چکا تھا اور گھر میں میری شادی کی بات چل رہی تھی لیکن امی نے ان سے ایک سال کا وقت مانگا تھا کیونکہ ابو کی ایک بڑی رقم کسی جگہ پھنسی ہوئی تھی۔ اس کے ملنے کے بعد ہی شادی ہو سکتی تھی۔ ان لوگوں نے کوئی اعتراض نہیں کیا اور مجھے منگنی کی انگوٹھی پہنا کر ندیم سے منسوب کردیا۔ وہ پیشے کے لحاظ سے انجینئر تھے۔ وہ اپنی والدہ اور بڑے بھائی کے ساتھ رہتے تھے۔ بہنوں کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ بڑے بھائی بھی شادی شدہ تھے۔ میرے گھر والوں نے پوری چھان بین کرنے کے بعد یہ رشتہ طے کیا تھا۔ میری بھی ندیم سے ایک ملاقات کروادی گئی تھی۔ میں نے انہیں خاصا مہذب اور معقول شخص پایا۔

دوسرے دن میں نے نورین کو اپنی منگنی کی اطلاع دی تو وہ بہت خوش ہوئی۔ اس نے چہکتے ہوئے کہا۔ ”میں بھی تمہیں ایک خوش خبری سنانے والی ہوں لیکن اس کے لیے تمہیں چند روز انتظار کرنا ہوگا۔“

”کوئی بات نہیں اگر اچھی خبر ہے تو انتظار بھی کیا جاسکتا ہے۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

دو مہینے بعد نورین نے فون پر اطلاع دی کہ اس کا رشتہ ہو گیا ہے اور بہت جلد شادی ہونے والی ہے۔ تاریخ طے ہو جائے تو وہ مجھے شادی ہال کے نام اور محل وقوع سے آگاہ کردے گی۔ اس نے مجھ سے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ وہ شادی کا کارڈ نہیں بھیج سکے گی۔ اس لیے فون پر ہی دعوت دے رہی ہے۔ جب میں نے اس سے ہونے والے دولہا کا نام پوچھا تو وہ بولی۔ ”یہ ایک سرپرائز ہے۔ تم شادی میں آؤ گی تو خود دیکھ لینا۔“

ایک ہفتے بعد اس نے فون کر کے شادی کی تاریخ اور شادی ہال کے محل وقوع کے بارے میں بتادیا اور تاکید کی کہ مجھے ضرور اس کی شادی میں آنا ہے۔ اگر اکیلے آنے میں کوئی مسئلہ ہو تو میں گھر کے کسی فرد کو اپنے ساتھ لاسکتی ہوں۔ میں نے وعدہ کرلیا کہ اس کی شادی میں ضرور شرکت کروں گی۔ سب سے زیادہ خوشی اس بات کی ہو رہی تھی کہ وہ بھٹکنے سے بچ گئی ورنہ وہ جس راہ پر چل رہی تھی اس پر کسی بھی وقت کوئی بھی مسئلہ ہو سکتا تھا۔

خدا کا کرنا یہ ہوا کہ میں وعدہ کرنے کے باوجود اس کی شادی میں شرکت نہ کر سکی کیونکہ مجھے ٹائیفائیڈ ہو گیا تھا۔ پورا ایک مہینا بستر پر لیٹی رہی۔ خدا خدا کر کے طبیعت کچھ سنبھلی تو سوچا کہ فون کر کے اس سے معذرت کرلوں اور اسے شادی میں نہ آنے کی وجہ بھی بتادوں۔ میں نے اس کا نمبر ملایا۔ پہلے تو اس نے کال ہی اٹینڈ نہیں کی۔ دوسری یا تیسری مرتبہ کوشش کرنے پر اس سے رابطہ ہو گیا۔ وہ خاصی ناراض لگ رہی تھی لیکن جب میں نے اسے اپنے نہ آنے کی وجہ بتائی تو وہ کچھ نرم پڑ گئی۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا کہ جیسے ہی اسے وقت ملا وہ مجھ سے ملنے ضرور آئے گی۔

دو تین مہینے بعد میری صحت بحال ہوئی تو گھر میں شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ میں اس کے فون کا انتظار ہی کرتی رہی لیکن وہ شاید کچھ زیادہ ہی مصروف ہو گئی تھی۔ میں نے بھی اس سے رابطہ کرنے کی کوشش نہیں کی کیونکہ میں اسے ڈسٹرب کرنا نہیں چاہتی تھی۔ شادی کے بعد لڑکی کی زندگی یکسر تبدیل ہو جاتی ہے اور اسے اپنے آپ کو نئے ماحول میں ایڈجسٹ کرنے میں کچھ وقت لگتا ہے۔ خدا جانے اس کے سسرال کا ماحول کیسا ہو۔ شوہر کس مزاج کا ہو، وہ خود کس صورتِ حال سے دوچار ہو، یہ سب باتیں اسی وقت معلوم ہو سکتی تھیں۔ جب اس سے میرا رابطہ ہو جاتا۔

پھر ایک دن اس کا فون آیا کہ وہ لاہور شفٹ ہو گئی ہے۔ کچھ ایسے حالات ہو گئے تھے کہ وہ مجھ سے ملنے نہ آسکی اور نہ ہی اپنی روانگی کی اطلاع دے سکی تاہم اس نے وعدہ کیا کہ جب بھی کراچی آنا ہوا وہ مجھ سے ملنے ضرور آئے گی۔ میری شادی کی تاریخ طے ہو چکی تھی اس لیے میں نے اسے بتانا ضروری سمجھا۔ اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ ”شہلا! اتنی جلدی میرا آنا بہت مشکل ہے۔ فون پر تفصیل نہیں بتا سکتی۔ جب بھی قسمت میں ملنا ہوا تو تم سے بہت سی باتیں کروں گی۔“

اس کے لہجے کی تلخی اور اداسی نے مجھے تشویش میں مبتلا کردیا۔ مجھے لگا جیسے وہ اپنی موجودہ زندگی سے خوش نہیں ہے اور شادی سے پہلے اس نے آسودگی کا جو خواب دیکھا تھا۔ وہ پورا نہیں ہوا۔ میں تو یہ بھی سمجھنے سے قاصر تھی کہ وہ لاہور کیوں شفٹ ہو گئی۔ لوگ تو روزگار کی تلاش میں کراچی آتے ہیں۔ اس کے میاں کے ساتھ ایسی کیا مجبوری تھی کہ اسے لاہور جانا پڑ گیا۔ یہ اور ایسے کئی سوالات تھے جو میں اس سے پوچھنا چاہ رہی تھی لیکن وہ بہت جلدی میں لگ رہی تھی۔ اس لیے

میں نے ان سوالوں کو کسی اور وقت کے لیے رکھ دیا۔

میری شادی ہوگئی۔ ندیم بہت اچھے شوہر ثابت ہوئے۔ انہوں نے شروع دن سے ہی میرا بہت خیال رکھا۔ میں چند مہینے اپنی سسرال میں رہی پھر میری ساس نے ہمارے لیے ایک الگ اپارٹمنٹ کا بندوبست کردیا۔ دراصل میں جس مکان میں بیاہ کر آئی۔ وہ میرے مرحوم سسر نے بنوایا تھا اور اس میں سب بہن بھائیوں کا حصہ تھا۔ میری ساس اس مکان کو فروخت کر کے حصے بخرے کرنے کے حق میں نہیں تھی۔ اس لیے انہوں نے ندیم کے بڑے بھائی کو مشورہ دیا کہ وہ اس مکان کی مارکیٹ ویلیو معلوم کریں اور اس کے حساب سے سب بہن بھائیوں کو حصہ دے کر مکان اپنے نام کروالیں۔ بڑے بھائی اس پر تیار ہوگئے۔ ندیم نے اپنے حصے میں کچھ پیسے ملائے اور اپنے لیے یہ اپارٹمنٹ خرید لیا جو شہر کے ایک پوش علاقے میں واقع تھا۔ میں نے نورین کو فون کرکے اسے اپنے نئے مکان کا ایڈریس لکھوا دیا تاکہ جب بھی وہ کراچی آئے تو اسے مجھ تک پہنچنے میں کوئی دشواری نہ ہو۔

اس کے بعد میرا نورین سے کوئی رابطہ نہیں ہوا۔ حالانکہ میں نے اسے کئی مرتبہ فون کیا لیکن بات نہ ہوسکی۔ ایسا لگتا تھا کہ اس کا نمبر تبدیل ہوگیا ہے لیکن وہ تو مجھے فون کر سکتی تھی۔ میں کبھی اس کے گھر نہیں گئی تھی اور نہ ہی اس کے گھر کے کسی فرد کو جانتی تھی۔ اس لیے اس کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہوسکا کہ وہ کس حال میں ہے۔ مجھے کچھ عرصہ تشویش رہی پھر میں بھی اپنی مصروفیات میں گم ہوکر اسے بھلا بیٹھی اور اب پانچ سال بعد اسے دیکھا تو یہ سب باتیں کسی پرانی فلم کی طرح ذہن کے پردے پر چلنے لگیں۔

وہ اتنی جلدی میں آئی اور چلی گئی کہ اس بار بھی میں اس سے فون نمبر نہیں لے سکی اور نہ ہی اس کے گھر کا پتا معلوم کیا۔ اب میں اس سے دوسری ملاقات کا بے چینی سے انتظار کررہی تھی تاکہ جان سکوں کہ شادی کے بعد اس کی زندگی کیسی گزر رہی ہے اور یہ کہ اس میں جو تبدیلی نظر آرہی ہے وہ میرا وہم ہے یا وہ اپنے حالات سے مطمئن نہیں ہے۔ شام کو ندیم گھر آئے تو میں نے انہیں نورین کی آمد کے بارے میں بتایا۔ میں ان سے کوئی بات نہیں چھپاتی تھی اور وہ بھی اپنی ہر بات مجھے بتا دیتے تھے۔ البتہ میں نے انہیں نورین کے پس منظر کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ کیونکہ میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ اس کے بارے میں کوئی غلط رائے قائم کریں۔

ندیم نے پوری بات سننے کے بعد کہا۔ ''اتنے عرصہ بعد تمہاری سہیلی ملنے کے لیے آئی اور تم نے اسے کھانا کھلائے بغیر جانے دیا۔''

''دراصل وہ بہت جلدی میں تھی۔ کہہ رہی تھی کہ اسے گھر جا کر کھانا بھی بنانا ہے۔ اس کے میاں تین بجے تک آجاتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔ اب تم کسی دن ان دونوں میاں بیوی کو کھانے پر بلالو۔ اچھا ہے ہمارے ملنے والوں میں ایک اور فیملی کا اضافہ ہوجائے گا۔''

''ہاں! میں بھی یہی سوچ رہی ہوں اس کا فون آئے گا تو دعوت دے دوں گی۔''

''کیوں؟'' وہ چونکتے ہوئے بولے۔ ''تمہارے پاس اس کا فون نمبر نہیں ہے کیا؟''

''نہیں، وہ اتنی جلدی میں تھی کہ نہ تو اس سے فون نمبر لیا اور نہ ہی گھر کا ایڈریس پوچھا۔''

''کمال ہے۔ تم عورتوں کا بھی جواب نہیں۔ فضول باتیں کرنے کے لیے تو تمہارے پاس بہت وقت ہے لیکن کام کی بات ہمیشہ بھول جاتی ہو۔''

''اچھا، آپ پریشان نہ ہوں وہ ایک دو دن میں مجھے ضرور فون کرے گی۔''

اتفاق سے دوسرے دن ہی اس کا فون آگیا۔ میں نے اسے بتایا کہ ندیم تمہارے اس طرح چلے جانے پر ناراض ہورہے تھے اور انہوں نے کہا ہے کہ میں تمہیں شوہر سمیت کھانے پر مدعو کروں۔ بتاؤ کب آرہی ہو؟

''ٹھیک ہے، میں میاں جی سے پوچھ کر بتا دوں گی۔'' یہ کہہ کر اس نے فون بند کردیا۔ شاید اس وقت بھی وہ جلدی میں تھی۔

دو دن بعد اس نے فون کرکے مجھے بتایا کہ وہ لوگ ہفتے کی شام کو آئیں گے۔ میں نے ندیم سے کہہ دیا کہ وہ کہیں ادھر اُدھر جانے کی بجائے وقت پر گھر آجائیں۔ ایسا نہ ہو کہ اس کا شوہر اکیلا بیٹھا بور ہوتا رہے۔ اس روز میں نے شام کے کھانے کے لیے خاص اہتمام کیا۔ ندیم بھی وعدے کے مطابق گھر پر آگئے۔ ٹھیک سات بجے ڈور بیل بجی۔ میں دروازے پر گئی اور نورین کے ساتھ نوید کو دیکھ کر مجھ پر حیرتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ یوں لگا جیسے کوئی مردہ قبر سے باہر آگیا ہو۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ نوید تو

نورین کی زندگی سے اسی وقت چلا گیا تھا جب پہلی بار ان کے درمیان جھگڑا ہوا اور نوید نے اس سے دوستی ختم کر کے دوسری لڑکیوں سے میل جول بڑھانا شروع کر دیا تھا۔ اس کے بعد میں نے کبھی نورین کی زبان سے نوید کا نام نہیں سنا۔ پھر باسی کڑھی میں ابال کیسے آ گیا۔ نوید کس طرح اس کی زندگی میں واپس آیا اور نورین سے اس کی شادی کیسے ہو گئی یہ اور اس جیسے بہت سے سوالات تھے جو میرے ذہن میں بگولوں کی طرح گردش کر رہے تھے لیکن میں نے ندیم کی موجودگی میں اپنی حیرت کو ظاہر نہ ہونے دیا اور اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے مہمانوں کو ڈرائنگ روم میں لے آئی۔ پھر میں نے ان کے لیے چائے بنائی اور ندیم سے کہا۔ ''آپ لوگ باتیں کریں، میں نورین کے ساتھ مل کر کھانے کا انتظام کرتی ہوں۔''

میں نے نورین کا ہاتھ پکڑا اور اسے لے کر کچن میں آ گئی۔ کھانا تو تیار ہی تھا اور اسے صرف گرم کر کے نکالنا تھا۔ میں نے اسے کچن ٹیبل پر بٹھایا اور اس کے سامنے چائے کی پیالی رکھتے ہوئے بولی۔ ''اب بتاؤ یہ کیا قصہ ہے۔ نوید نے تو تم سے دوستی ختم کر دی تھی پھر یہ تمہاری زندگی میں دوبارہ کیسے آ گیا؟''

اس نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے۔ ''بظاہر یہ ایک فلمی کہانی لگتی ہے لیکن میرے ساتھ حقیقت میں ایسا ہوا ہے۔ جب نوید نے مجھ سے دوستی ختم کی تو میں بھی یہی سمجھی کہ اس سے پیچھا چھوٹ گیا ہے۔ یہ تو مجھے بہت بعد میں معلوم ہوا کہ وہ مجھ سے مخلص تھا اور اسی لیے اپنی امی سے ملوانے لے جا رہا تھا لیکن میں نے اس پر شک کیا اور اس کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ اس پر وہ غصے میں آ گیا اور اس کی مجھ سے زوردار جھڑپ ہوئی اور اس نے دوستی ختم کر کے مجھے جلانے کے لیے دوسری لڑکیوں سے تعلقات بنانے کی کوشش کی پھر جب میں نے یونیورسٹی میں داخلہ لیا تو وہ میری تلاش میں وہاں بھی پہنچ گیا اور میرا پیچھا کرتے کرتے گھر تک آ گیا۔ کیونکہ تمہارے کہنے پر میں نے سم تبدیل کر لی تھی۔ اس لیے وہ فون پر مجھ سے رابطہ نہ کر سکا۔ ایک دن جب میں چھٹی کے بعد گھر پہنچی تو وہ گلی کے نکڑ پر اس جگہ کھڑا ہوا تھا جہاں وین مجھے اتارتی تھی۔ جیسے ہی میں گاڑی سے باہر آئی وہ تیزی سے میرے پاس آیا اور ایک پرچا میرے ہاتھ پر رکھتے ہوئے بولا۔ ''میں کل اسی جگہ تمہارا انتظار کروں گا۔''

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں نے جلدی سے وہ پرچا اپنے پرس میں رکھا اور کچھ کہے بغیر گھر کی طرف چل دی۔ رات کو سونے سے پہلے میں نے وہ پرچا نکال کر پڑھا۔ اس میں لکھا تھا۔ ''نورین میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔ ایک ضروری بات کرنا ہے۔ اس کے بعد تم جو کہو گی میں وہی کروں گا۔ مجھے بتاؤ تم مجھے کب اور کہاں مل سکتی ہو؟''

میں نے اس پرچے کو کئی بار پڑھا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اتنے عرصہ کے بعد اسے میری یاد کیوں آئی اور وہ مجھ سے کیا ضروری بات کرنا چاہتا ہے پھر مجھے یاد آیا کہ ایک روز اس نے مجھے اپنی ماں سے ملانے کے لیے کہا تھا۔ کیا واقعی وہ میرے بارے میں سنجیدہ تھا اور میں نے اسے سمجھنے میں غلطی کی تھی۔ جیسے جیسے میں اس بارے میں سوچتی گئی۔ یہ خیال پختہ ہوتا گیا کہ وہ ابھی تک میری یاد کو دل سے لگائے بیٹھا ہوا ہے پھر میں نے اپنے بارے میں سوچنا شروع کیا۔ میں چوبیس سال کی ہو گئی تھی اور ابھی تک میرے لیے کوئی رشتہ نہیں آیا تھا۔ حالانکہ میری عمر اتنی زیادہ نہیں ہوئی تھی کہ امی مجھے دیکھ کر ٹھنڈی آہیں بھرنا شروع کر دیتیں لیکن انہیں کچھ زیادہ ہی جلدی تھی۔ اس لیے انہوں نے ہر آنے جانے والے سے میرے رشتے کے بارے میں کہنا شروع کر دیا۔ ہمارے خاندان میں تو دور دور تک میرے جوڑ کا کوئی لڑکا نہیں تھا۔ جہاں کام کرتی تھی وہاں زیادہ تر مرد شادی شدہ تھے اور جو چند کنوارے باقی رہ گئے تھے وہ کسی اونچی جگہ ہاتھ مارنے کا خواب دیکھ رہے تھے۔ وہ مجھ سے وقت گزاری کے لیے دوستی تو کر سکتے تھے لیکن شادی کے لیے کسی نے ہلکا سا اشارہ بھی نہیں دیا تھا۔ ان حالات میں مجھے نوید کا دم غنیمت معلوم ہوا۔ میں نے سوچا کہ ایک دفعہ مل لینے میں کیا حرج ہے۔ پتا تو چلے کہ وہ کیا کہنا چاہ رہا ہے۔ چنانچہ میں نے اسی پرچے کی پشت پر ایک قریبی ریستوران کا نام اور ملنے کا وقت لکھا اور اسے پرس میں رکھ کر سو گئی۔

میں وقت مقررہ پر ریستوران پہنچی تو وہ وہاں پہلے سے موجود تھا۔ اس نے ایک کیبن کا انتخاب کیا اور بیرے کو کھانے پینے کی چیزوں کا آرڈر دینے کے بعد بولا۔ ''نورین! میں تمہارا زیادہ وقت نہیں لوں گا اور نہ ہی پرانی باتیں دہراؤں گا۔ بس تم یہ یقین کر لو کہ جو کچھ کہنے جا رہا ہوں اس کا ایک ایک لفظ حقیقت پر مبنی ہے اور اس میں کوئی جھوٹ یا مبالغہ آرائی نہیں ہے۔ یہ سچ ہے کہ میں تمہیں شروع دن سے ہی چاہنے لگا تھا اور تمہیں ہمیشہ کے

لیے اپنا بنانے کا خواہش مند تھا اسی لیے میں تمہیں امی سے ملوانے لے جا رہا تھا لیکن تمہارے انکار پر مجھے غصہ آ گیا اور میں نے تم سے دوستی ختم کر دی لیکن بعد میں اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ میں نے تمہاری طرف واپس آنا چاہا لیکن دیر ہو چکی تھی۔ امتحانات کے بعد تم سے کوئی رابطہ نہیں رہا۔ بعد میں کسی سے معلوم ہوا کہ تم نے یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا ہے۔ میں تمہاری تلاش میں وہاں تک پہنچا اور تمہارا پیچھا کرتے کرتے گھر تک آ گیا۔ آج تم سے ملاقات کا مقصد بھی یہی ہے کہ میں تمہارا عندیہ معلوم کرنا چاہتا ہوں گھر میں میری شادی کی بات چل رہی ہے اور میں نے امی کو تمہارے بارے میں بتا دیا ہے لیکن جب تک تم گرین سگنل نہیں دو گی۔ میں بات آگے نہیں بڑھا سکتا۔“

”لیکن میں تو تمہارے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ تم کون ہو تمہارا خاندانی پس منظر کیا ہے۔ انٹر کے بعد تم کیا کرتے رہے اور اب کیا کر رہے ہو وغیرہ وغیرہ۔“

”یہ جاننا تمہارا حق ہے۔ ہم دو بھائی ہیں۔ بڑے بھائی کی شادی ہو چکی ہے۔ ہم جوائنٹ فیملی سسٹم میں رہتے ہیں۔ والد صاحب مرحوم بہت کچھ چھوڑ گئے ہیں اور گھر کا سارا انتظام بڑے بھائی کے ہاتھ میں ہے۔ میں نے بی بی اے کیا ہے اور ان دنوں ایک کمپنی میں سیلز آفیسر کے طور پر کام کر رہا ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔ مجھے سوچنے کے لیے وقت دو۔ ایک ہفتے بعد جواب دوں گی۔“

”میں تمہارے جواب کا انتظار کروں گا۔ اُمید ہے کہ تم مایوس نہیں کرو گی۔“

گھر آنے کے بعد میں دو تین دن تک اس کے بارے میں سوچتی رہی۔ بظاہر اس کے حالات ہم سے کہیں زیادہ بہتر تھے۔ وہ شہر کے ایک پوش علاقے میں رہتا تھا۔ کالج میں بھی میں نے اسے قیمتی گاڑی میں آتے دیکھا۔ وہ دوستوں میں دل کھول کر خرچ کرتا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ اس کے پاس روپے پیسے کی کوئی کمی نہیں تھی اور وہ مجھے ایک خوش حال زندگی دے سکتا تھا۔ جب میرا دل پوری طرح مطمئن ہو گیا تو میں نے امی کو اس کے بارے میں بتا دیا۔ انہوں نے ابو سے بات کی اور ان کی طرف سے گرین سگنل ملنے پر میں نے نوید سے کہہ دیا کہ وہ اپنی ماں کو ہمارے گھر بھیج سکتا ہے۔

گو کہ امی نے مہمانوں کی خاطر مدارات میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی لیکن گھر کی حالت ہماری مفلسی کا اشتہار بنی ہوئی تھی۔ نوید کی امی بردبار خاتون تھیں۔ اس لیے انہوں نے اپنے چہرے کے تاثرات ظاہر نہیں ہونے دیے البتہ اس کی بھابی بڑی حقارت سے ایک ایک چیز کو دیکھ رہی تھی۔ انہوں نے صرف چائے پی اور آدھ گھنٹے بیٹھنے کے بعد جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ چلتے چلتے انہوں نے اکھڑے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”بہن! میں اپنے بیٹے کی خواہش پر آپ کی بیٹی کا رشتہ مانگنے آئی ہوں آپ اپنے طور پر تسلی کر کے جواب دے دیں۔“

مجھے ان کا یہ انداز بالکل پسند نہیں آیا اور میں نے امی سے کہہ دیا کہ وہ ان لوگوں کو انکار کر دیں لیکن انہوں نے مجھے سمجھایا کہ جب حیثیت میں فرق ہو تو اس طرح کے رویے سامنے آتے ہیں اور مجھے ان لوگوں کی پرواہ کرنے کی بجائے نوید کے بارے میں سوچنا چاہیے۔ غرض یہ کہ دو چار رسمی ملاقاتوں کے بعد یہ رشتہ طے پا گیا اور میں نوید کی دلہن بن کر اس کے گھر آ گئی۔

شادی کے بعد ابتدائی چند روز تو بہت اچھے گزرے لیکن بہت جلد مجھے اندازہ ہو گیا کہ جو کچھ بتایا گیا تھا۔ حقیقت میں ویسا نہیں ہے۔ گھر پر بڑے بھائی کی حکمرانی تھی اور نوید کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ وہ اپنے بھائی کے اشاروں پر چلتا تھا۔ گھر کے سارے کام اس کے ذمے تھے۔ وہ بھابی کا ڈرائیور بنا ہوا تھا۔ ان کے بچوں کو گھمانا پھرانا اور سیر و تفریح کے لیے لے جانا بھی اس کی ذمے داری میں شامل تھا۔ اس کی تنخواہ بھی کچھ زیادہ نہیں تھی۔ آدھی تنخواہ وہ گھر کے اخراجات کے لیے دے دیتا اور آدھی سے وہ اپنا خرچ پورا کرتا۔ میرے لیے اس کے پاس کچھ نہیں تھا۔ پہلی تاریخ کو جیٹھ نے میرے ہاتھ پر ایک ہزار روپے رکھے اور بولے۔ ”یہ تمہارا جیب خرچ ہے۔ اپنی بیوی کو بھی میں اتنے ہی دیتا ہوں۔“

ساس سے زیادہ بھابی میری دشمن تھی۔ ان لوگوں نے شادی کے ایک ہفتے بعد ہی مجھے کام پر لگا دیا۔ ناشتا بنانا، کھانا پکانا، کپڑے اور برتن دھونا اور گھر کی صفائی سب میرے ذمے تھا۔ بھابی اتنی بد مزاج عورت تھی کہ کوئی ماسی ایک ہفتے سے زیادہ نہیں ٹھہرتی تھی۔ اوپر سے ساس اور بھابی ہر وقت مجھے جہیز نہ لانے کے طعنے دیتی رہتی تھیں حالانکہ امی نے اپنی حیثیت سے بڑھ کر جہیز دیا تھا لیکن وہ لوگ نہ جانے کیا توقع لگائے بیٹھے تھے۔

نوید بھی اس صورتِ حال سے بہت پریشان تھا۔ اس

نے کئی بار کہا کہ اگر میرا بس چلے تو تمہیں لے کر آج ہی الگ ہو جاؤں پھر ایک دن اس نے خبر سنائی کہ اس کا لاہور ٹرانسفر ہو گیا ہے صرف میں یہ جانتی تھی کہ اس نے مجھے اس جہنم سے نکالنے کے لیے خود اس ٹرانسفر کی کوشش کی تھی۔ وہ لاہور چلا گیا اور میں امی کے پاس آگئی۔ ایک مہینے بعد رہائش کا بندوبست ہو گیا تو اس نے مجھے بھی اپنے پاس بلا لیا۔ لاہور جا کر مجھے کچھ سکون ملا لیکن مالی تنگی اور بڑھ گئی۔ نوید کی تنخواہ میں بمشکل گھر کا خرچ مکان کا کرایہ اور یوٹیلٹی بلز ہی ادا ہو پاتے ہیں۔ دیگر اخراجات کے لیے کچھ نہیں بچتا۔ میں نے شادی کے بعد سے آج تک اپنے لیے کوئی چیز نہیں خریدی ہے۔ خوش حال زندگی گزارنے کا جو خواب میں نے دیکھا تھا وہ چکنا چور ہو گیا ہے اور میں اب بھی پہلے کی طرح محرومیوں کی آگ میں جل رہی ہوں۔''

''تم کراچی واپس آنے کے بعد بھی کرائے کے مکان میں کیوں رہ رہی ہو۔ اپنے گھر کیوں نہیں چلی گئیں۔ اس طرح کم از کم کرایہ کی بچت تو ہو جاتی۔'' میں نے اس کی کہانی سننے کے بعد کہا۔

''ساس کا دو سال پہلے انتقال ہو چکا ہے۔ اب اس گھر پر بھابی کا راج ہے۔ وہ تو میری بوٹیاں کر کے چیل کوؤں کو کھلا دے گی۔ نوید خود بھی وہاں نہیں رہنا چاہتا اس کا کہنا ہے کہ بھائی کی غلامی کرنے سے یہ تنگی بہتر ہے۔ سوچتی ہوں کہ دوبارہ اپنی پرانی جاب پر چلی جاؤں لیکن نوید کو یہ بھی گوارہ نہیں کہ میں چند روپوں کی خاطر صبح سے شام تک سر کھپاؤں اور واپس آ کر گھر کا کام بھی کروں۔ وہ خود بھی کوشش کر رہا ہے کہ اسے کوئی اچھی جاب مل جائے۔''

نورین کے حالات جان کر مجھے بہت افسوس ہوا۔ میں سوچنے لگی کہ قسمت بھی کیا گل کھلاتی ہے انسان سوچتا کچھ ہے اور ہوتا کچھ ہے۔ مجھے نورین سے ہمدردی محسوس ہونے لگی چلتے وقت اس نے بڑے خلوص سے مجھے اپنے گھر آنے کی دعوت دی اور میں نے وعدہ کر لیا کہ اگلے ہفتے ندیم اور بچوں کے ساتھ اس سے ملنے ضرور آؤں گی۔ میں نے اس کے لیے دو انتہائی قیمتی سوٹ، جیولری، پرفیوم، میک اپ کا سامان اور نوید کے لیے ایک برانڈڈ سوٹ خریدا۔ وہ اتنی ساری چیزیں دیکھ کر حیران ہو گئی اور بولی کہ میں نے اتنی زحمت کیوں کی؟ میں نے اسے جواب دیا کہ میں تمہاری شادی میں شریک نہیں ہو سکی تھی۔ اسے میری طرف سے شادی کا تحفہ سمجھ کر قبول کر لو۔

منطقۂ باردہ

وہ علاقہ جو قطب شمالی سے دائرہ قطب شمالی تک اور قطب جنوبی سے دائرہ قطب جنوبی تک یعنی 66-1/2 سے 90 تک شمال اور جنوب تک پھیلا ہوا ہے۔ اس میں براعظم انٹارکٹیکا (قطب جنوبی) گرین لینڈ کا اندرونی علاقہ اور ایشیا، یورپ اور شمالی امریکا کے بہت سے شمالی جزائر شامل ہیں۔ اس علاقے میں سورج کی کرنیں ترچھی پڑتی ہیں جس کے باعث یہاں سال بھر سردی پڑتی ہے اور برف جمی رہتی ہے۔ بعض مقامات پر برف کی تہ ہزاروں فٹ موٹی ہوتی ہے۔ اس خطے میں شدید سردی کے باعث کوئی چیز پیدا نہیں ہوتی البتہ کہیں کہیں کائی اور لچن اگ آتی ہے۔ آبادی بہت کم ہے۔

مرسلہ: حیدر سموں۔ لاڑکانہ

شیخ منظور قادر

(1913-1974ء)

پاکستانی ماہر قانون۔ سر عبدالقادر کے فرزند اور سر فضل حسین کے داماد۔ لاہور میں پیدا ہوئے۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے کیا۔ 1935ء میں لنکنز ان لندن سے قانون کی ڈگری لی۔ 1936ء میں لاہور ہائی کورٹ میں وکالت شروع کی۔ قیام پاکستان کے بعد پاک و ہند کے درمیان اثاثوں کی تقسیم کے ٹرائی بیونل کے رکن مقرر ہوئے۔ راولپنڈی سازش کیس (1951-52ء) میں وکیل صفائی تھے۔ اکتوبر 1958ء تا جون 1962ء وزیر خارجہ رہے۔ محدود جمہوریت اور صدارتی طرز حکومت پر مبنی آئین (1962ء) مرتب کیا۔ 1962ء میں مغربی پاکستان ہائی کورٹ کے چیف جسٹس مقرر ہوئے لیکن اگلے سال مستعفی ہو گئے۔ اگرتلہ سازش کیس (1958ء) میں حکومت کی وکالت کی۔ وفات سے کچھ عرصہ قبل پنجاب ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن کے صدر منتخب ہوئے۔

مرسلہ: جمیلہ احسن۔ کوئٹہ

اس کے گھر کی حالت دیکھ کر مجھے رونا آنے لگا۔ وہ دو کمروں کا چھوٹا سا فلیٹ تھا۔ ایک کمرے میں دو بیڈ پڑے ہوئے تھے۔ جب کہ دوسرے کمرے میں ایک پرانے صوفہ سیٹ اور سینٹر ٹیبل کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اسی طرح لاؤنج میں ایک چھوٹا سا فریج اور ٹی وی رکھا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ اس کے گھر میں کوئی لگژری آئٹم مثلاً ایئر کنڈیشنڈ، واشنگ مشین اور مائیکرو ویو اوون کچھ بھی نہیں تھا۔ نوید کی ملازمت اس طرح کی تھی کہ اسے مہینے میں دو تین مرتبہ شہر سے باہر جانا پڑتا تھا اور نورین چار پانچ دن تک گھر میں اکیلی رہتی تھی۔ میں نے اس سے کہا کہ جب نوید بیرون شہر جائے تو وہ میرے پاس آجایا کرے۔ اس طرح اکیلے رہنا ٹھیک نہیں۔ میرا بھی وقت اچھا گزر جائے گا۔ سارا دن گھر میں بور ہوتی رہتی ہوں۔

نوید نے بھی اس تجویز سے اتفاق کیا اور اس طرح وہ اپنے شوہر کی غیر موجودگی میں میرے پاس آکر رہنے لگی۔ دراصل اس طرح میں اس کی مدد کرنا چاہ رہی تھی۔ مجھے تو ایک آدمی کے رہنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن اسے اچھی خاصی بچت ہو سکتی تھی۔ اگر وہ مہینے میں دس بارہ دن بھی میرے یہاں رہتی تو کچن کا خرچ اور یوٹیلٹی بلز آدھے ہو جاتے۔

میرے گھر میں تین بیڈ روم تھے۔ ایک میرے اور ندیم کے استعمال میں، دوسرا بچوں کے لیے اور تیسرے کو ہم نے گیسٹ روم بنا رکھا تھا۔ جس میں کبھی کبھار ندیم کے بھائی بہنوں کے بچے آکر رہا کرتے تھے۔ وہ کمرا میں نے نورین کے لیے مخصوص کر دیا۔ اس میں اے سی سمیت تمام سہولتیں موجود تھیں۔ ویسے تو وہ سارا دن میرے ساتھ ہی رہتی۔ البتہ شام کو ندیم کے آنے کے بعد وہ لاؤنج میں بیٹھ کر ٹی وی دیکھتی یا بچوں کو ان کا ہوم ورک کرواتی۔ بچے بھی تھوڑے ہی دنوں میں اس سے مانوس ہو گئے تھے۔

ویسے تو سب ٹھیک تھا لیکن میں نے محسوس کیا کہ میرے گھر آنے کے بعد وہ شدید قسم کے احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتی تھی۔ اللہ کا شکر تھا کہ ہم ایک پُرآسائش زندگی گزار رہے تھے۔ میرے گھر کے ہر کمرے، ڈرائنگ روم اور ٹی وی لاؤنج میں اے سی تھا۔ اس کے علاوہ بھی ہر آسائش میسر تھی۔ وہ اکثر کہا کرتی تھی کہ تمہارے گھر آکر لگتا ہے کہ جنت میں آگئی ہوں اور میں ہنس کر کہتی کہ فکر نہ کرو۔ ایک دن تمہارے پاس بھی یہ سب آسائشیں ہوں گی۔

میرا طرزِ زندگی دیکھ کر اسے اپنی کم مائیگی کا شدت سے احساس ہونے لگا تھا اور وہ موقع بے موقع اس کا اظہار کرنے سے باز نہ آتی۔ کبھی کہتی واشنگ مشین سے کتنی آسانی ہو جاتی ہے۔ کبھی اسے مائیکرو ویو اوون میں سینکڑوں خوبیاں نظر آنے لگتیں۔ اے سی کی تعریف کرتے ہوئے تو اس کی زبان نہیں تھکتی تھی۔ یار تمہارے گھر میں تو سونے کا مزہ ہی الگ ہے۔ ایک ہمارے بیڈ روم کا پنکھا ہے جو مری ہوئی چال چلتا ہے اور اوپر سے گھوں گھوں کی آوازیں الگ سے آتی ہیں۔

مجھے بڑی شرم آتی جب وہ ندیم کے سامنے ایسی باتیں کرتی۔ وہ چونک کر اسے دیکھتے اور ان کے چہرے پر ایک سایہ سا لہرا جاتا۔ وہ فطرتاً رحم دل اور ہمدرد واقع ہوئے تھے اور اس کی باتیں سن کر یقیناً انہیں دکھ ہوتا ہوگا۔ جب نورین نے تین چار مرتبہ اپنے پنکھے کی شان میں قصیدہ پڑھا تو ایک دن ندیم نے مجھے دس ہزار روپے دیے اور بولے یہ اپنی سہیلی کو دے دینا۔ وہ اپنے گھر کے لیے نئے پنکھے خرید لے گی۔

میں نے وہ پیسے نورین کے حوالے کر دیے۔ پہلے تو وہ انکار کرتی رہی پھر بولی۔ "میں نوید کو کیا بتاؤں گی کہ یہ پنکھے کہاں سے آئے ہیں۔"

"کہہ دینا کہ میں نے گفٹ کیے ہیں۔ میرا نام سن کر وہ کچھ نہیں کہے گا۔"

نورین نے وہ پیسے لے لیے لیکن میرے دل میں اندیشے سر اٹھانے لگے اور میرے سامنے کالج کا منظر گھوم گیا جب وہ اپنی ضرورتیں پوری کرنے کی خاطر لڑکوں سے دوستی کیا کرتی تھی پھر دورانِ ملازمت بھی اس کی یہ روش برقرار رہی اور وہ اپنے ساتھیوں سے تحفے بٹورتی رہی۔ کہیں تاریخ اپنے آپ کو تو نہیں دہرا رہی۔ مجھے لگا کہ اس کی پرانی عادت لوٹ آئی ہے۔ کہیں وہ میرے ہی گھر میں تو نقب نہیں لگا رہی۔ اس سوچ کے آتے ہی میرے دل میں شک کا ناگ سر اٹھانے لگا اور میں اس وقت کو کوسنے لگی جب میں نے اسے اپنے گھر میں رہنے کی پیشکش کی تھی۔

میرا اندازہ درست نکلا۔ وہ ایک بار پھر پہلے والی نورین بن گئی۔ میرے گھر میں رہ کر اسے فراغت میسر آئی تو اس نے اپنے بناؤ سنگار پر توجہ دینا شروع کر دی۔ میں اسے مہینے میں دو تین جوڑے بنوا دیتی تھی۔ اس کی ڈریسنگ ٹیبل میک اپ کے سامان سے بھری ہوتی۔ وہ روزانہ ایک نیا جوڑا پہنتی اور شام کو بن سنور کر ٹی وی کے سامنے بیٹھ جاتی۔ ندیم شام کو دفتر سے آنے کے بعد لباس تبدیل کر کے تھوڑی دیر ٹی وی دیکھتے اور وہیں بیٹھ کر چائے پیتے تھے۔ اس

دوران وہ ان سے گپیں لگاتی رہتی اور میں نوکرانی کی طرح گھر کے کام کرتی رہتی اگر اس وقت کوئی اجنبی ہمارے گھر آجاتا تو وہ اسے مالکن اور مجھے نوکرانی ہی سمجھتا۔ اب اس نے بچوں کو ہوم ورک کروانا بھی چھوڑ دیا تھا۔ اس کی باتیں ہی کسی طرح ختم ہونے میں نہیں آتی تھیں۔ ندیم آٹھ بجے کھانا کھانے کے بعد اپنے بیڈروم میں چلے جاتے تب کہیں جا کر وہ ان کی جان چھوڑتی۔

رفتہ رفتہ وہ ندیم سے اتنی بے تکلف ہوگئی کہ اپنی ضرورتوں کا برملا اظہار کرنے لگی۔ ایک دن اس نے بے دھڑک کہہ دیا۔ ''نوید دفتر سے تھکے ہوئے آتے ہیں۔ میرا بڑا دل چاہتا ہے کہ انہیں جوس بنا کر دوں لیکن ہمارے یہاں تو جوسر ہی نہیں ہے۔''

ندیم نے چونک کر اسے دیکھا اور حسبِ عادت اداس ہوگئے۔ اللہ نے انہیں بہت کچھ دے رکھا تھا اور یہ چھوٹی موٹی چیزیں ان کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھیں۔ ویسے بھی فطرتاً فیاض اور ہمدرد واقع ہوئے تھے۔ ان سے نورین کی تکلیف برداشت نہیں ہوئی اور وہ اگلے دن جوسر کی بجائے کچن فیکٹری ہی لے آئے۔ نورین اندر سے تو بہت خوش ہوئی ہوگی لیکن اس نے بناوٹی انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ''ارے آپ تو سچ مچ سیریس ہوگئے۔ میں نے تو یونہی ایک بات کہی تھی۔''

''مجھے خوشی ہے کہ تم نے ہمیں اپنا سمجھ کر کہا۔ آئندہ بھی کسی چیز کی ضرورت ہو تو بے دھڑک کہہ دینا۔''

انہی دنوں بچوں کی چھٹیاں ہوگئیں۔ میں نے ہمیشہ کی طرح اس سال بھی امی کے یہاں جانے کا پروگرام بنایا۔ گرمیوں میں میرے میکے میں بڑی رونق ہوتی تھی۔ سب بہن بھائی اور ان کے بچے اکٹھے ہو جاتے۔ روزانہ طرح طرح کے کھانے پکتے، بچے دن بھر اودھم مچاتے، آئے دن پکنک کا پروگرام بنتا۔ رات کو سب لوگ آئس کریم کھانے جاتے۔ میری بھابیاں کام کرتے کرتے تھک جاتیں لیکن ان کے ماتھے پر شکن تک نہ آتی۔ ہم بہنیں بھی حتی المقدور ان کا ہاتھ بٹاتیں۔ اس طرح سارے کام ہنسی خوشی نمٹ جاتے۔ ندیم بھی دفتر سے واپسی پر شام کو وہیں آجاتے۔ کچھ دیر بچوں سے باتیں کرتے، کھانا کھاتے اور دس بجے کے قریب گھر واپس چلے جاتے تھے۔ میں نے نورین اور نوید کو بھی اپنے پروگرام سے مطلع کر دیا تھا۔ اس لیے میری غیر موجودگی میں اسے ایک مہینا اپنے ہی گھر گزارنا تھا۔

چھٹیاں کب ختم ہوئیں، مہینا کیسے گزرا، کچھ پتا ہی نہیں چلا۔ بہرحال بچوں نے بھی اس دوران خوب مزے کیے۔ میں بھی اپنے بہن بھائیوں کے ساتھ کچھ وقت گزار کر فریش ہوگئی۔ واپس آئی تو گھر کی حالت خاصی ابتر تھی گو کہ ماسی صفائی کرنے آتی تھی لیکن میری غیر موجودگی میں اس نے بھی بس اپنی ڈیوٹی ہی پوری کی۔ سب سے بری حالت بیڈروم کی تھی۔ بستر پر ندیم کے کپڑوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ وہ ہمیشہ اپنے کپڑے اتار کر بستر پر ڈال دیتے تھے اور میں ان کے میلے کپڑے ماسی سے دھلوانے کے لیے الگ کر لیتی اور کوٹ پتلونیں ہینگر میں لٹکا دیتی۔ گھر واپس آنے کے بعد سب سے پہلا کام یہی کیا۔ یہ میری عادت تھی کہ کپڑوں کو ان کی جگہ پر رکھنے سے پہلے میں جیبیں ضرور ٹٹولتی تھی کہ کہیں کوئی کاغذ، نقدی، چابیاں یا یو ایس بی ٹائپ کوئی چیز واشنگ مشین میں نہ چلی جائے۔ اس روز بھی یہی ہوا۔ میں حسبِ عادت ندیم کے کوٹ کی جیبیں ٹٹول رہی تھی کہ میرے ہاتھ میں وہ کاغذ آگئے۔ کھول کر دیکھا تو وہ خریداری کی رسیدیں تھیں۔ ایک واشنگ مشین اور دوسری مائیکرو ویو اوون کی تھی۔ ان رسیدوں کو دیکھ کر میں سناٹے میں آگئی۔ مجھے یہ سمجھنے میں بالکل دیر نہیں لگی کہ یہ چیزیں کس کے لیے خریدی گئی ہوں گی۔

گویا نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ نورین نے مجھے سائیڈ لائن کر کے براہِ راست ندیم سے فرمائشیں کرنی شروع کر دی تھیں۔ وہ بھی اتنے فیاض اور دریا دل نکلے کہ انہوں نے میرے واپس آنے کا انتظار بھی نہیں کیا اور دونوں چیزیں خرید کر اس کے گھر پہنچا دیں۔ ممکن ہے کہ وہ بھی ان کے ساتھ بازار گئی ہو۔ تاکہ اپنی پسند سے خریداری کر سکے۔ مجھے اس خریداری پر اعتراض نہیں تھا۔ البتہ دو سوال میرے ذہن میں کلبلا رہے تھے۔ ایک تو یہ کہ ندیم نے یہ بات مجھے کیوں نہیں بتائی اور دوسرا یہ کہ نورین نے اپنے شوہر کو کیا بتایا ہوگا کہ یہ چیزیں کہاں سے آئیں۔ خیر میرے لیے دوسرا سوال اتنا اہم نہیں تھا وہ نوید سے کچھ بھی کہہ سکتی تھی۔ مثلاً یہ کہ اس نے ایک کمیٹی ڈالی تھی اور شاید اسے یہ بتانے میں بھی کوئی عار نہ ہوتا کہ میں نے اس کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے یہ دونوں چیزیں اسے گفٹ کی تھیں۔ وہ اس کی عادت سے اچھی طرح واقف تھا۔ ویسے بھی پہلا تحفہ اسی نے نورین کو موبائل کی صورت میں دیا تھا۔

البتہ یہ سوال میرے دماغ میں سوئی کی طرح چبھ رہا تھا کہ ندیم نے یہ بات مجھے کیوں نہیں بتائی۔ اگر مثبت ذہن سے سوچتی تو اس کا جواب یہ ہوتا کہ سسرال میں ان کے ارد گرد بہت سے لوگ ہوتے تھے۔ اس لیے ان کی موجودگی میں انہوں نے مجھے بتانا مناسب نہ سمجھا ہو اور اگر روایتی عورتوں کی طرح سوچتی تو یہی بات ذہن میں آتی کہ تحفے بٹورنے کی خاطر نورین میرے ہی گھر میں نقب لگا رہی ہے گو کہ ندیم اتنی آسانی سے کسی عورت کے جال میں پھنسنے والے نہیں تھے لیکن مرد ہونے کے ناتے کسی بھی کمزور لمحے کی گرفت میں آسکتے تھے اور نورین ایک پُرکشش عورت تھی جسے مردوں کو بے وقوف بنانے میں ملکہ حاصل تھا۔

شام کو ندیم واپس آئے تو میں نے اس موضوع پر ان سے کوئی بات نہیں کی لیکن وہ سچے اور کھرے انسان تھے اور زیادہ دیر تک کوئی بات اپنے دل میں نہیں رکھ سکتے تھے۔ اس لیے انہوں نے رات کے کھانے کے بعد مجھ سے کہا۔ ''یار تمہاری سہیلی نے تو میرے کان کھا لیے۔ اس نے دو تین مرتبہ فون کر کے اشاروں میں کہا کہ اسے ہاتھ سے کپڑے دھونے میں بڑی مشکل پیش آتی ہے اور جس علاقے میں وہ رہتی ہے وہاں گیس کا پریشر کم ہونے کی وجہ سے چولہا نہیں جلتا اور کھانا گرم کرنے میں دشواری ہوتی ہے۔ میں نے اس کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے یہ دونوں چیزیں ارینج کر دی ہیں لیکن تمہارے میکے میں اتنا ہنگامہ ہوتا ہے کہ وہاں تمہیں بتانے کا موقع نہ مل سکا۔''

''اچھا کیا۔'' میں نے جل کر کہا۔ ''نیک کام کا اجر ضرور ملتا ہے۔''

''سوچ رہا ہوں کہ ایک ساتھ ہی ساری نیکیاں سمیٹ لوں۔'' وہ ہنستے ہوئے بولے۔ ''تم اپنی سہیلی سے کہو کہ وہ ان تمام چیزوں کی فہرست دے دے جن کی وہ ضرورت محسوس کرتی ہے میں ایک ہی دفعہ میں ارینج کر دوں گا تاکہ روز روز کا دکھڑا ختم ہو جائے۔''

مجھے ندیم پر نہیں بلکہ نورین پر غصہ تھا۔ انہوں نے تو مذاق میں ایک بات کہی تھی لیکن اگر وہ واقعی اس کا گھر آسائشوں سے بھر دیتے تب بھی وہ اپنی عادت سے باز نہیں آتی کیونکہ خواہشوں کے سمندر کی گہرائی لامحدود ہوتی ہے اور اسے ندیم کی شکل میں ایک بے وقوف دوست مل گیا تھا جس کے سامنے وہ اپنی محرومی کا رونا رو کر ان سے بہت کچھ سمیٹ سکتی تھی اور اگر یہ سلسلہ دراز ہو گیا تو کسی دن وہ میری جگہ بھی لے سکتی ہے۔

اس خیال کے آتے ہی میں لرز کر رہ گئی اور میں نے اس کا توڑ سوچنا شروع کر دیا اور صبح ہونے سے پہلے ایک نتیجے پر پہنچ گئی۔ دوسرے دن ناشتے کی میز پر میں نے ندیم سے کہا۔ ''میرے ذہن میں نورین کے مسئلے کا ایک حل آیا ہے لیکن اس کے لیے آپ کی مدد کی ضرورت ہوگی۔''

''وہ کیا؟'' انہوں نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں نے سوچا ہے کہ اگر نوید کو بیرونِ ملک کوئی ملازمت مل جائے تو ان کے مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ دبئی اور جدہ میں آپ کے کاروباری پارٹنر ہیں۔ اگر ان سے بات کی جائے تو وہ نوید کے لیے ویزے اور ملازمت کا بندوبست کر سکتے ہیں۔''

''ہاں یہ کام تو ہو سکتا ہے۔'' وہ سر ہلاتے ہوئے بولے۔ ''دیکھو میں بات کرتا ہوں۔''

مجھے یقین تھا کہ ندیم کے لیے یہ کوئی مشکل نہیں ہے۔ ان کی فرم مڈل ایسٹ میں بھی ٹھیکے لیتی تھی اور وہاں ان کے کاروباری پارٹنر ان منصوبوں کی نگرانی کرتے ہیں۔ ندیم بھی اس سلسلے میں کئی مرتبہ جدہ اور دبئی جا چکے تھے اور وہاں کئی لوگوں سے ان کے بڑے اچھے تعلقات قائم ہو گئے تھے۔

ایک ہفتے بعد ہی ندیم نے خوش خبری سنائی کہ نوید کے لیے ویزے اور ملازمت کا بندوبست ہو گیا ہے اس سے کہو کہ اپنا اور نورین کا ارجنٹ پاسپورٹ بنوا لے۔ اسے پہلی تاریخ سے جوائن کرنا ہے۔ پہلے وہ چلا جائے اور رہائش کا بندوبست ہونے پر بیوی کو بھی اپنے پاس بلا لے میں نے اسی وقت نورین کو فون کر کے خبر سنائی تو وہ خوشی سے جھوم اٹھی اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''کن الفاظ میں، میں تمہارا شکر ادا کروں۔ تم نے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔''

پندرہ دن کے اندر تمام کارروائی مکمل ہو گئیں اور نوید دبئی چلا گیا۔ نورین نے فلیٹ خالی کر دیا اور عارضی طور پر میرے یہاں شفٹ ہو گئی۔ تین ماہ بعد نوید نے اسے بھی اپنے پاس بلا لیا۔ اب دونوں میاں بیوی خوش و خرم زندگی گزار رہے ہیں۔ نوید کو خاصی معقول تنخواہ مل رہی ہے۔ اب نورین کو اپنی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے دوستیاں پالنے اور تحفے بٹورنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے ایک ہی دفعہ میں اس کی ساری محرومیوں کا ازالہ کر دیا ہے۔ نورین کے لیے اس سے بڑا تحفہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

جناب مدیر سرگزشت

سلام تہنیت

میں نے اس بار کافی تگ و دو کے بعد یہ روداد لکھی ہے۔ کسی کی زندگی کی مکمل روداد قلمبند کرنا آسان بھی تو نہیں ہے۔ انسان کچھ بھی کرلے ہوتا وہی ہے جو کاتبِ تقدیر لکھ چکا ہے۔ آپ خود بھی ملاحظہ کریں کہ خدا اپنے بندوں کی کس طرح مدد کرتا ہے۔

ناظم بخاری

(لودھراں)

اس دن لاشعوری طور پر یہ سوچ میرے ذہن میں در آئی تھی کہ کاش مجھ میں یہ ایمان داری کا کیڑا پیدا نہ ہی ہوا ہوتا تو اچھا تھا مگر دوسرے ہی پل اپنی اس سوچ پر سو بار توبہ اور سو بار استغفار کر چکا تھا۔ بات یہ تھی کہ میں ہر ماہ رمضان میں ویسا ہی مسلمان اور مومن بن جاتا تھا، جیسا کہ اسلام نے کہا ہے۔ میں پانچوں وقت کی نماز پڑھتا، روزے رکھتا۔ جھوٹ، غیبت اور دوسری برائیوں سے بچنے کی کوشش کرتا اور مجھ سے جتنا ہو پاتا، میں چھوٹی سے چھوٹی نیکی بھی کرنے کی کوشش میں لگا رہتا۔ زیادہ تعلیم حاصل نہ کر سکنے کے سبب میں بھی وہی کام کر رہا تھا جو پاکستان کے لاکھوں لوگ کر رہے ہیں۔ میں راولپنڈی میں اپنے چار عدد بچوں اور بیوی کے ساتھ، ایک کرائے کے مکان میں رہتا تھا اور کرائے پر آٹو رکشا چلاتا تھا۔ جون، جولائی کے دنوں میں دن بھر رکشا چلانا اتنا ہی اذیت ناک تھا، جیسے کہ کسی جہنم کے دروازے پر کھڑا ہونا۔ گرم انجن کے اوپر بیٹھے، ایک پل کے لیے بھی سکون میسر نہیں آتا تھا۔ میں صبح سویرے رکشا لے کر نکلتا تو رات کے آٹھ، نو بجے واپس آنا نصیب ہوتا۔ اور اس سارا دن کی مشقت کے بدلے صرف اتنے روپے حاصل ہو پاتے، جس سے بس جیسے تیسے گھر کا گزارہ ہو جاتا۔ خدا نے مجھے اور نگہت کو بہت شکر گزار طبیعت دی تھی۔ اس لیے۔ سارا دن میں ہمیں وہ جتنا رزق بھی دیتا تھا، ہم اس پر شکر بجا لاتے تھے۔ میرے اور نگہت کے لیے یہ اطمینان کی بات تھی کہ ہم اپنے بچوں کی پرورش رزق حلال سے کر رہے ہیں اور اس سے بڑھ کر ہمارے لیے کوئی اور بات نہ تھی۔ گھر کا گزارہ جیسے تیسے ہو رہا تھا اور رکشے کی دہاڑی سے

جو پیسے حاصل ہوتے تھے، وہ سب کے سب ضروریاتِ زندگی میں صرف ہوجاتے تھے۔ البتہ کبھی کبھار دو چار سو کی اضافی دہاڑی بھی لگ جاتی تھی۔ بچوں کی چھوٹی موٹی خواہشیں اور حسرتیں پوری ہوجاتیں اور ان کی خواہشیں اور حسرتیں تھیں ہی کیا۔ کسی ایک دن کے لیے کسی پارک میں گھومنا پھرنا، غبارے، چاکلیٹ اور آئس کریم کھانا اور شام کو واپس گھر لوٹ آنا۔ میری، پندرہ بیس دنوں بعد جب بھی کوئی اچھی دہاڑی لگتی میں بچوں کی یہ چھوٹی موٹی خواہشیں ضرور پوری کرتا۔ اور اس دوران گھر میں کبھی کبھار گوشت کی شکل بھی دکھائی دے جاتی۔ ہاں تو میں بات کر رہا تھا ماہ رمضان میں اچھا مسلمان بننے کی۔ اس بار بھی ماہ رمضان کا چاند نظر آیا تو ہمیشہ کی طرح میں نے دل میں ارادہ باندھ لیا کہ خدا کے فضل و کرم سے میں اس بار بھی نہ تو کوئی روزہ چھوڑوں گا اور نہ ہی کوئی نماز قضا کروں گا۔ اور پھر میں نے کیا بھی ایسا ہی۔ یکم رمضان سے لے کر چھبیس رمضان تک نہ ہی میرا کوئی روزہ چھوٹا اور نہ ہی کوئی نماز قضا ہوئی۔

جب سے ماہ رمضان شروع ہوا تھا، میں نے اپنے آس پاس رہنے والے دوستوں کے برعکس (وہ سب بھی رکشا ڈرائیور تھے) پوری طرح اسلام میں ڈھل گیا تھا اور میں نے نماز، قرآن اور روزوں میں سے کسی ایک چیز کو بھی نہیں چھوڑا تھا۔ جس طرح میں خدا کے قریب ہوگیا تھا اور اس کے تمام احکامات کی پابندی شروع کردی تھی، اسی طرح خدا کو بھی چاہیے تھا کہ وہ مجھ پر اپنے کرم کی خصوصی نگاہ کرتا۔ مگر اوپر والے نے مجھ پر کرم کی خصوصی نگاہ تو کیا کی، الٹا یہ معاملہ اس کے بھی بالکل برعکس کرڈالا۔ یعنی میرے رزق میں کمی ہوگئی اور میری دہاڑی پہلے سے بھی کم لگنے لگی۔ میرے آس پاس والے رکشا ڈرائیور نہ تو نماز پڑھتے تھے اور نہ ہی روزہ رکھتے تھے، مگر اس کے باوجود وہ ہر روز دو دو ہزار کی دہاڑی بنا کر گھر جاتے تھے۔ کم سے کم بھی پندرہ سو سے دہاڑی کم نہیں لگتی ان کی اور ایک میں تھا کہ میرا رزق جیسے پہلے سے بھی کم ہوگیا تھا۔ پہلے اگر بارہ تیرہ سو کی دہاڑی لگ جاتی تھی تو اب نو سو ہزار تک آکر رک گئی تھی۔ ہزار روپے روزانہ میں سے تین سو تو روز رکشا کا کرایہ نکل جاتا تھا۔ دو اڑھائی سو کا پیٹرول جل جاتا اور باقی جو چار، پانچ سو بچتے، ان سے بمشکل گھر کا گزارہ ہو پاتا۔

ماہ رمضان کے پہلے عشرے تک تو میں اس سلسلے میں پریشان نہیں ہوا۔ کیونکہ رکشے کی روزی 'ہوائی روزی' ہوتی، جس میں اچھی دہاڑی بھی لگتی تھی اور ہلکی بھی۔ مگر جب دس، پندرہ دنوں تک یہی روٹین برقرار رہی تو مجھے تشویش ہونے لگی۔ پچھلے کچھ دنوں سے نگہت جیسے تیسے گزارہ کررہی تھی مگر...... اگر آئندہ آنے والے دنوں میں اس طرح کی ہلکی دہاڑی لگتی رہی تو پھر گزارہ ہونا مشکل تھا۔ کچھ دنوں بعد عید آنے والی تھی۔ بچوں کے لیے جوتے اور کپڑے خریدنے تھے اور ان کی اس موقع کے لیے چھوٹی موٹی ضرورتیں اور خواہشیں پوری کرنی تھیں۔ اور وسیلہ صرف یہی تھا، رکشے کا۔ ماہ رمضان کے شروع سے مجھے اُمید تھی کہ میں ماہ رمضان کے آخری عشرے تک اتنے پیسے ضرور جوڑلوں گا کہ سب بچوں کا اور نگہت کا ایک ایک نیا جوڑا اور جوتے خرید سکتا۔ کیونکہ یہی تو ایک دو موقع ہوتے تھے، جب غریب بندہ بھی اچھے کپڑے پہن لیتا ہے مگر ہر گزرتے دن کے ساتھ میری اُمیدوں پر پانی پڑتا جارہا تھا حالانکہ میں خدا سے دن رات دعا بھی کرتا تھا کہ وہ میرے رزق اور روزی میں برکت دے۔ مگر خدا معلوم، اس میں بھی اس کی کوئی مصلحت یا حکمت پوشیدہ تھی کہ میرے لیے رزق کے دروازے، وسیع ہونے کی بجائے مزید تنگ ہوتے جارہے تھے۔ بات یہ نہیں تھی کہ ہم سب رکشا ڈرائیوروں کا کام سلو تھا۔ نہیں، میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ ایسا بالکل نہیں تھا۔ دوسرے سب لوگوں کا کام ٹھیک لگ رہا تھا، صرف میرا ہی کام سلو تھا۔ حالانکہ میں نے اس دوران اپنے کام کا دورانیہ بھی بڑھا دیا تھا۔ یعنی پہلے اگر میں رات سات بجے تک کام کرتا تھا تو اب رات نو بجے تک کرنے لگا تھا۔ مگر اس کے باوجود میرا کام اور دہاڑی ہنوز کم تھی۔ میں ہر روز تھکا ہارا گھر لوٹتا تو نگہت بے اختیار میرے قریب چلی آتی۔ ''آج کتنی دہاڑی بنی ہے؟''

میں جیب سے چار، پانچ سو نکالتا اور چپ چاپ اس کے ہاتھ پر رکھ دیتا۔ اس کے اشتیاق بھرے چہرے پر مایوسی پھیل جاتی۔ مجھے معلوم تھا کہ اس کے اشتیاق بھرے چہرے پر مایوسی کیوں پھیل جاتی ہے۔ وہ پیسے لے کر دھیرے سے کہتی۔ ''چلیں، کوئی بات نہیں۔ اللہ نے چاہا تو کل اچھی دہاڑی لگے گی۔''

وہ پتا نہیں کیوں مجھے دلاسا دینے کی کوشش کرتی۔ مگر وہ چاہنے کے باوجود اپنے لہجے پر قابو نہ رکھ پاتی، جو کہ بجھا ہوا ہوتا۔ ماہ رمضان سے پہلے اگر کبھی میری اتنی دہاڑی لگتی تھی اور میں وہ پیسے نگہت کے ہاتھ پر رکھتا تھا تو وہ یہی الفاظ مکمل اعتماد

اور اطمینان سے کہتی، جس میں صبر و شکر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوتا مگر اب؟ اب میری طرح اسے بھی اندازہ تھا کہ ان پیسوں سے گھر کا خرچا تو جیسے تیسے چل سکتا ہے، مگر بچوں کی عیدی نہیں بن سکتی۔ اور بچے تو پھر بچے ہی تھے، انہیں کون سمجھاتا؟ وہ اچھے برے حالات کو نہیں سمجھ سکتے تھے۔ عید پر اچھے جوتے اور اچھے کپڑے ان کا حق تھا۔ جب سارے بچے عید کے دن اچھے کپڑے اور جوتے پہنتے اور ہمارے بچے ان چیزوں سے محروم رہتے تو ان کے دل پر کیا گزرتی؟ ان کے کھلے ہوئے چہرے مرجھا جاتے اور...... اور ان کے وہ چہرے دیکھنا نہ ہی مجھے گوارہ تھا اور نہ ہی نگہت کو۔ سو ان حالات کی وجہ سے میں بھی پریشان تھا اور نگہت بھی۔ جب آدھا رمضان گزرنے کے باوجود بھی حالات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تو ایک رات نگہت نے مجھ سے کہا۔ ''سنیے جی! اگر آپ کو برا نہ لگے تو آپ میری ایک بات مانیں گے؟''

ہم دونوں اس وقت سونے کی تیاری کر رہے تھے۔ نہ جانے اس کے لہجے میں کیا تھا کہ میں پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''ہاں، کہو!'' میں نے اپنے لہجے کو پُرسکون رکھنے کی کوشش کی۔

''کچھ دن پہلے آپ نے کہا تھا کہ سعید بھائی سب کو ہر چیز قسطوں پر دلا رہے ہیں۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو مجھے قسطوں پر ایک سلائی مشین لا دیں۔ پانچ سو میں آپ کو کل دے دوں گی، باقی جو قسط بنے گی، وہ ہر ماہ دیتی رہوں گی۔''

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''کیوں، یہ سلائی مشین کی کیا ضرورت پڑ گئی تمہیں؟''

اس نے ایک گہری سانس لی۔ ''حالات آپ کے سامنے ہیں۔ عید سر پر آ رہی ہے اور بچوں میں سے کسی کا بھی ایک سوٹ ایسا نہیں جو عید پر پہننے کے قابل ہو۔ میں سوچ رہی ہوں کہ کیوں نہ سلائی مشین لے کر آس پاس والوں کے کپڑے سینے شروع کر دوں۔ عید کا موقع ہے، کام بھی بہت آئے گا۔ اگر اللہ کے فضل سے کام چل نکلا تو سب بچوں کے جوتے اور کپڑے آ جائیں گے۔''

اس بار میں نے گہری سانس لی۔ پتا نہیں کیوں، اس کی یہ بات سن کر میرے دل پر ایک پتھر سا آ لگا تھا۔ مجھے بے اختیار وہ دن یاد آ گئے، جب اس پھول جیسی لڑکی کو میں دلہن بنا کر اپنے گھر لایا تھا۔ اور اس دن سے آج تک، اس نے محنت مزدوری جیسا کوئی کام نہیں کیا تھا۔ یہ الگ بات کہ اسے ہر کام آتا تھا۔ اب جو میں نے اس کی یہ بات سنی تو میرے دل پر ایک پتھر سا آ لگا کہ کیا میری زندگی میں ایسے دن بھی آنے تھے۔ مجھے سمجھ نہیں آیا کہ میں اسے کیا جواب دوں۔ ابھی میں اپنی سوچوں میں الجھا ہوا تھا کہ اس کی آواز مجھے خیالات کی دنیا سے کھینچ لائی۔ ''تو کیا خیال ہے آپ کا؟ صبح مشین دلا رہے ہیں مجھے؟''

میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ ''ابھی سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ابھی تو عید میں پورے پندرہ دن پڑے ہیں۔ اگر اللہ نے چاہا تو اگلے پندرہ دنوں میں میرا کام بہت اچھا لگے گا اور بچوں کے جوتے کپڑے آ جائیں گے۔''

''اور اگر اچھا نہ لگا تو......؟''

''تو بعد کی بعد میں دیکھیں گے۔'' یوں تو میں نے نگہت کو اس وقت ٹال دیا تھا۔ مگر بعد میں مجھے یہ پریشانی لاحق رہنے لگی تھی کہ اگر نگہت کی بات درست ثابت ہوئی اور آنے والے دنوں میں بھی میرا کام اچھا نہ لگا تو کیا ہوگا؟ کیا مجھے اپنی خودداریت کو ایک طرف رکھ کر نگہت کو سلائی مشین لا کر دینا پڑے گی؟ یا پھر مجھے ہی اس سلسلے میں کچھ کرنا پڑے گا؟ میں جتنا ہی اس بارے میں سوچتا، میری پریشانی اتنی ہی بڑھ جاتی۔ بالآخر میں نے اس بات کا فیصلہ آنے والے وقت اور حالات پر چھوڑ دیا۔ مگر اس بار بھی میری اُمیدیں بر نہیں آئیں۔ آنے والے دنوں میں بھی حالات میں کوئی بہتری پیدا نہ ہو سکی۔ یہاں تک کہ ماہ رمضان کا دوسرا عشرہ بھی اختتام پزیر ہو گیا۔ اس رات نگہت نے ایک بار پھر مجھ سے وہی بات چھیڑ دی اور بغیر کسی تمہید کے کہا۔ ''آپ نے دیکھ لیا نا کہ حالات میں بہتری کی کوئی صورت پیدا نہیں ہو رہی۔ آپ بس صبح مجھے سلائی مشین لا کر دیں۔ آگے میں جانوں اور میرا کام۔''

اور اس بار میں اسے انکار نہیں کر سکا۔ اس مشکل حالات میں بھی نہ جانے کیسے اس نے پانچ سو پس انداز کر لیے تھے۔ میں نے اس سے پانچ سو لیے اور اسی دن جا کر قسطوں پر سلائی مشین لے آیا۔ مگر ایسا کرتے ہوئے میں بہت دل گرفتہ تھا۔ اس دوران میرے ذہن و دل میں ایک عجیب سی جنگ جاری رہی۔ بالآخر میں نے اپنی خودداریت کو بچوں کی خوشیوں پر قربان کر دیا۔ اس رات میں کام سے گھر لوٹا تو نگہت بہت خوش تھی۔ اس نے سلائی کے سلسلے میں آس پاس والوں سے بات کر لی تھی اور جونہی سلائی مشین گھر آئی، آس پاس

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

والوں کے کپڑے بھی آ گئے۔ نگہت نے سلائی کی قیمت بہت مناسب رکھی تھی۔ یعنی بازار میں جو ریٹ چل رہا تھا، اس سے بھی پچاس روپے کم۔ کچھ اس لیے بھی سلائی کے لیے کپڑے آ رہے تھے۔ دوسرا نگہت نے دس سالہ مزمل سے کہہ کر باہر گلی میں ایک چھوٹا سا پوسٹر بھی لگوا دیا تھا کہ زنانہ کپڑوں کی سلائی، مناسب قیمت پر یہاں سے کروائیں۔

اس رات نگہت نے مجھے خوش ہوتے ہوئے بتایا۔ ''میں نے کہا تھا نا کہ آپ بس مجھے سلائی مشین لے دیں، باقی میں سنبھال لوں گی۔ اور دیکھیے، پہلے دن ہی سلائی کے لیے اتنے سارے کپڑے آ گئے۔ اگر یوں ہی کام آتا رہا تو کچھ دنوں میں ہی بچوں کے جوتے اور کپڑوں کے پیسے ہو جائیں گے۔''

اس کے لہجے میں بچی خوشی کی چہکار تھی اور اس کی یہ چہکار محسوس کر کے میرے لبوں پر ایک اداس سی مسکراہٹ آ گئی تھی۔ میرا کام اسی طرح تھا اور اس میں بہتری کی کوئی صورت پیدا نہیں ہو سکی تھی۔ جیسے جیسے ماہ رمضان ختم ہوتا جا رہا تھا، ویسے ویسے میرے دل سے اس کا احترام اور نیکیوں کا احساس بھی مٹتا جا رہا تھا۔ رمضان اور خدا کے حوالے سے ایک عجیب سی 'بغاوت' دھیرے دھیرے میرے اندر جنم لے رہی تھی، جسے چاہنے کے باوجود بھی میں روک نہیں پا رہا تھا۔ گو رمضان کے آخری عشرے میں بھی میں روزے رکھ رہا تھا اور نماز کی پابندی کر رہا تھا، مگر ان فرائض میں اب پہلے سا خشوع و خضوع نہیں تھا۔ یوں سمجھیں میں یہ کام دل پر پتھر رکھ کر کر رہا تھا یا یوں، جیسے کوئی زبردستی یا مجبوری کے عالم میں کرتا ہے۔ اور اس کی وجہ صرف یہی تھی کہ میرا کام بہت سلو چل رہا تھا۔ ایک دن نگہت نے مجھ سے کہا۔ ''اگر آپ کو برا نہ لگے تو ایک بات کہوں؟''

وہ ہمیشہ اسی طرح بات شروع کرتی تھی، جیسے میں اس کا شوہر نہیں، کسی سلطنت کا بادشاہ ہوں، جس کی ناراضی کا خوف ہر وقت اس کے دل پر سوار رہتا ہے۔ میں نے کہا۔ ''ہاں کہو۔''

''آپ یقین نہیں کریں گے، مگر مجھے لگتا ہے، جیسے کسی نے آپ کی روزی 'باندھ' رکھی ہے۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو 'بابا گولک شاہ' کے پاس جا کر کوئی تعویذ دھاگا لے آئیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کی بندھی ہوئی روزی کھل جائے گی۔'' اس کے لہجے میں بے حد سچائی اور خلوص تھا۔ اور میں سمجھ گیا کہ وہ یہ بات کیوں کہہ رہی ہے۔ کیوں کہ میں جب بھی گھر سے نکلتا تھا یا لوٹتا تھا، میرا چہرہ اترا ہوا یا بجھا ہوا ہوتا۔ اور میرا یہ بجھا ہوا چہرہ اس سے دیکھا نہیں جاتا۔ یہ بھی اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ میں رکشے سے چار پیسے زائد کمانے کی اپنی سی پوری کوشش کرتا ہوں، مگر باوجود کوشش کے میں اس سے زیادہ رزق حاصل نہیں کر پاتا، جو میرے نصیب میں لکھا ہوتا ہے۔ شاید اس لیے اس نے مجھ سے یہ بات کی تھی کہ میں بابا گولک شاہ کے پاس سے ہو آؤں۔ میرا دل چاہا کہ میں اس کی بات پر بہت سے زور سے ہنسوں۔ وہ سیدھی سادی عورت، اپنے ذہن کے مطابق صرف اتنا ہی سوچ سکتی تھی، جتنا اس کا ذہن کام کرتا تھا۔ عورتوں کی فطرت کے مطابق وہ پیروں فقیروں پر بہت یقین رکھتی تھیں مگر میں...... ایک تو ان باتوں پر یقین نہیں رکھتا تھا کہ کوئی انسان کسی کا رزق یا روزی باندھ سکتا ہے اور دوسرا میری کسی سے ایسی دشمنی بھی نہیں تھی کہ کوئی میرے ساتھ یہ حرکت کرتا۔ سو اس حوالے سے مجھے صرف ایک ہی ذات سے شکوہ تھا اور وہ تھی رب کی ذات۔ مجھے یقین تھا کہ میری روزی صرف اسی نے تنگ کی ہوئی ہے، کسی اور نے نہیں۔ اس کی مرضی کے بغیر ایک پتا بھی ادھر سے ادھر نہیں ہو سکتا تھا، کوئی انسان کسی کی روزی کیسے باندھتا؟ مگر ہزار بار سوچنے کے باوجود بھی مجھے یہ سمجھ نہیں آتا تھا کہ آخر خدا نے میری روزی کیوں تنگ کر رکھی ہے؟ گناہ کے نزدیک میں نہیں جاتا تھا۔ نماز روزے کی میں پابندی کرتا تھا۔ اور رزق حلال سے اپنے بچوں کی میں پرورش کر رہا تھا۔ تو اس کے باوجود یہ سب میرے ساتھ کیوں ہو رہا تھا؟ نگہت کی بات سننے کے بعد میں نے دھیرے سے کہا۔ ''مجھے نہیں لگتا کہ میرے ساتھ ایسا کوئی معاملہ ہوا ہے۔ روزی تو صرف رب کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے کشادہ رزق دیتا ہے اور جسے چاہے کم۔ ہمیں صرف اسی سے دعا کرنی چاہیے۔''

میری بات سے اس نے فوراً ہی اختلاف کیا۔ ''خدا سے تو میں بھی دعا کرتی ہوں اور آپ بھی۔ اس کے باوجود آپ خود دیکھ رہے ہیں کہ حالات کسی طرح بھی قابو میں نہیں آ رہے۔ اور پھر دعا سے بھی تو خدا ہی حالات سیدھے کرتا ہے۔ اور یہ پیر فقیر لوگ بھی تو اسی کے پیارے ہیں۔ آپ بس ایک بار میرا کہنا مان کر ان کے پاس جائیں۔ اللہ نے چاہا تو

ہمارے ہاتھ دیں سے سیدھے ہوں گے۔"

میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ میں سمجھ گیا کہ اب اس کی سوئی جہاں اٹک گئی ہے، وہاں سے نہیں ہلے گی۔ چاہے میں اسے کتنا ہی کیوں نہ سمجھالوں۔ سومیں نے اسے سمجھانے کی بجائے بہلانے کا فیصلہ کرلیا۔ "اچھا ٹھیک ہے۔ میں صبح ہوتے ہی بابا گولک شاہ کے پاس سے ہو آتا ہوں۔ خوش؟"

میری بات پر وہ کھل سی اٹھی۔ "میں صبح کچھ میٹھی روٹیاں بھی بنا کر آپ کے ساتھ کردوں گی، وہ بھی لیتے جائیے گا۔ سنا ہے، بابا گولک شاہ کو میٹھی روٹیاں بہت پسند ہیں۔ اگر وہ ہم سے خوش ہوگئے تو ہمارا بیڑا پار ہو جائے گا۔"

اچانک مجھے اس کی بات سے ایک شرارت سوجھی۔ "تمہارے بابا گولک شاہ روزہ نہیں رکھتے، جو میٹھی روٹیاں بھجوا رہی ہو؟"

وہ میری بات پر خفا ہو گئی۔ "روزہ کیوں نہیں رکھتے۔ روزے تو وہ یقیناً سارے رکھتے ہوں گے۔ یہ تو اس لیے بجھوا رہی ہوں کہ وہ ہماری اس خدمت سے خوش ہو جائیں گے۔ شاید شام کو وہ اس سے روزہ افطار کرلیں یا پھر اپنے کسی مرید کو بھی دے سکتے ہیں۔ ہمارا مقصد تو ان کی خدمت کرنا ہے۔"

میں نے اس سے زیادہ بات نہیں کی۔ وہ عقیدت کی ماری ہوئی عورت تھی اور اسے کچھ کہنا بے کار تھا۔ بابا گولک شاہ کا آستانہ وہاں سے دو کلو میٹر کے فاصلے پر تھا۔ میں وہاں کئی بار جا چکا تھا۔ اپنی غرض سے نہیں، سواریوں کی غرض سے۔ کئی لوگ بابا گولک شاہ کے عقیدت مند تھے اور میں کئی بار ان کو اپنے رکشے پر وہاں چھوڑ آیا تھا۔ بابا گولک شاہ کا نام "گولک شاہ" اس لیے پڑ گیا تھا کہ انہوں نے آستانے پر ایک تین بائی تین فٹ کی بڑی سی گولک رکھی ہوئی تھی۔ اس گولک کے بارے مشہور تھا کہ وہ بہت بابرکت گولک ہے اور یہ برکت بابا گولک شاہ طفیل سے ہے۔ جو شخص اس گولک میں چار پیسے ڈالتا تھا، اس کے بگڑے ہوئے کام سنور جاتے تھے اور جو شخص اس گولک میں سے ایک روپیا بھی لے کر اپنے پاس رکھتا، اس کے تو وارے ہی نیارے ہو جاتے۔ اس کے تو ایسے نصیب سنورتے تھے کہ شاید ہی کسی کے سنورتے ہوں۔ یہ ساری باتیں ان کے عقیدت مندوں نے مشہور کر رکھی تھیں۔ اس گولک میں پیسے تو سب ڈال سکتے تھے، مگر اس میں سے نکلوا کوئی نہیں سکتا تھا۔ اس گولک کی بابرکت کسی کسی کو ہی نصیب ہوتے تھے۔ اس تین فٹ لمبی اور چوڑی گولک کا

خلائی معلومات

☆ خلاء میں سب سے پہلے سفر کرنے والے انسان کا نام یوری گیگرین ہے۔

☆ انسان نے سب سے پہلے چاند پر 21 جولائی 1969ء کو قدم رکھا۔

☆ سب سے پہلے چاند پر قدم رکھنے والوں کے نام نیل آرمسٹرانگ اور ایڈون ایلڈرن تھے۔

☆ سب سے پہلے چاند پر قدم رکھنے والوں نے وہاں دو گھنٹے چالیس منٹ کا وقت گزارا۔

☆ سب سے پہلے مصنوعی طیارہ 1957ء کو خلا میں چھوڑا گیا اس کے بعد 12 سال بعد انسان نے قدم رکھا۔

☆ سب سے پہلے نکولس کوپرنیکس نے کہا تھا کہ زمین اور دوسرے سیارے سورج کے گرد گھومتے ہیں۔

☆ سب سے پہلے خلاء میں 8 مارچ 1969ء اپالو نمبر 9 کے خلا بازوں نے ہیپی برتھ ڈے ٹو یو کا نغمہ گایا۔

☆ سب سے پہلے نظام شمسی سیارہ پلوٹو 18 فروری 1930ء کو کلائیڈ ولیم تمباخ نے دریافت کیا۔

☆ بھارت نے سب سے پہلے اپنا مصنوعی سیارہ 19 اپریل 1975ء کو خلاء میں چھوڑا۔

☆ سب سے پہلے خلاء میں جانے والی روسی کتیا کا نام لائیکا تھا جسے 13 نومبر 1957ء کو بھیجا گیا۔

☆ سب سے پہلے روس نے 1966ء میں اپنا راکٹ کامیابی سے زمین پر اتارا۔

☆ دنیا کی پہلی خلا باز خاتون ویلیٹینا ٹریشکوا نے 16 جون کو خلاء میں 46 چکر لگائے۔

انتخاب: رانا حبیب الرحمان
سینٹرل جیل لاہور

تالا جمعرات کی جمعرات کو کھولا جاتا تھا۔اور بابا گولک شاہ اپنے بابرکت ہاتھ سے اس گولک سے پیسے نکالتے تھے۔اور یہی موقع ہوتا تھا، جب کسی خوش نصیب کو اس گولک میں سے ایک دو روپے مل جاتے تو مل جاتے، ورنہ نہیں اور یہ بابا گولک شاہ کے مزاج پر منحصر ہوتا تھا کہ وہ اس میں سے کچھ پیسے کسی خواہش مند کو دینے کو تیار ہیں یا نہیں۔اس کے علاوہ گولک کی برکت حاصل کرنے کے لیے ایک دو کڑی شرائط بھی تھیں۔ان میں سے ایک تو کسی سفارش کا ہونا لازمی تھا اور دوسرا ایک کے بدلے ایک ہزار دینے کی بھی تھی۔یعنی اگر کوئی اس گولک میں سے ایک روپیا بھی لینا چاہتا تو اسے وقت اسی گولک میں ہزار روپے ڈالنے ہوتے۔اگر کسی کے پاس ہزار روپے نہیں ہیں تو وہ اس گولک میں سے ایک روپیا حاصل نہ کرسکتا اور اگر کوئی چالاکی سے گولک کے پیسے لے کر غائب ہوگیا اور اس نے اس گولک میں پیسے نہیں ڈالے تو وہ اپنے نقصان کا ذمہ دار خود ہوگا۔مگر اب تک ایسی غلطی کسی ایک نے بھی نہیں کی تھی۔کوئی شخص بھی ایسا کر کے بابا گولک شاہ کے غضب کو دعوت نہیں دے سکتا تھا۔لوگ ہر جمعرات کی جمعرات کو ہزاروں روپے اس گولک میں ڈالتے تھے اور اس کے بدلے گولک کے بابرکت پیسے حاصل کرتے تھے۔میں نے خود کبھی تحقیق کرنے کی کوشش نہیں کی تھی کہ بابا گولک شاہ سچ مچ کا کوئی پیر فقیر بندہ ہے یا فراڈ یا انسان ہے۔البتہ وہ جو بھی تھے،لوگ ان کے پاس کھنچے چلے جاتے تھے اور اپنے من کی مرادیں حاصل کرتے تھے۔اور ساتھ میں یہ بھی سننے میں آیا تھا کہ وہ دعا بھی کرتے ہیں اور بگڑے ہوئے کام سنوارنے کے لیے تعویذ دھاگا بھی دیتے ہیں۔اگر بابا گولک شاہ سچ مچ کا کوئی پیر فقیر انسان تھے، تو بھی میں ان باتوں پر یقین نہیں رکھتا تھا۔میرا صرف ایک ہی عقیدہ تھا کہ جو اور جیسا کرتا ہے،صرف اوپر والا کرتا ہے،اس کے علاوہ اور کوئی کچھ نہیں کرتا۔اسی کو ہر شے پر دسترس ہے اور وہی سب کچھ کرنے والا ہے۔کل رات جب نگہت نے مجھ سے بابا گولک شاہ کے پاس جانے کی بات کی تھی تو میرا اس وقت بالکل ارادہ نہیں تھا کہ میں اس کی بات پر عمل کروں گا۔مگر اگلے دن، نماز ظہر کے بعد تک میرا ارادہ بدل گیا۔بابا گولک شاہ کے آستانے پر جانے کے لیے مجھے ایک دو سواریاں ملیں تو میرا بھی اس طرف جانا ہوگیا اور سب کی طرح میں نے بھی اپنا رکشا ایک طرف کھڑا کیا اور بابا گولک شاہ کے آستانے میں داخل ہوگیا۔اندر داخل ہوتے ہی میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔اندر مردوں اور عورتوں کا ایک بہت بڑا ہجوم تھا، جو بابا گولک شاہ کی کرامات سے مستفید ہونے آیا تھا۔اس ہجوم میں اکثریت عورتوں کی تھی۔بابا جی اندر اپنے حجرے میں مقیم تھے اور ہر فرد اپنی باری آنے پر اندر جا رہا تھا۔اور جس حساب سے لوگ اندر جا اور آ رہے تھے، مجھے یقین ہوگیا کہ میرا نمبر آتے آتے مغرب ہوجائے گی۔دہاڑی ویسے بھی آج کل کم لگ رہی تھی اوپر سے میں وہاں رک کر اپنا اور نقصان نہیں کرسکتا تھا۔میرے اندر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہوگئی تھی۔ایک دل کہہ رہا تھا کہ میں وہاں آتو ویسے بھی گیا ہوں، کیوں نہ کوئی تعویذ دھاگا لے کر ہی وہاں سے جاؤں۔پر دوسرے ہی پل مجھے اپنے کام کا خیال آجاتا۔اگر میں یہ آدھا دن بھی وہیں گزار دیتا اور جب میں گھر جاتا تو میرے پاس ایک روپیا بھی نہ ہوتا۔کیوں کہ اب تک جو دہاڑی بنی تھی، اس سے صرف رکشے کا کرایہ اور پٹرول کا خرچا پورا ہوتا تھا۔ویسے میرے دل میں ایک خیال یہ بھی آرہا تھا کہ آج جب بابا گولک شاہ گولک کھولیں گے تو اس میں سے ایک آدھ روپیا میں بھی لے لوں گا اور اس کے بعد یقیناً مجھ پر نوٹوں کی بارش ہونا شروع ہوجاتی۔مگر دوسرے ہی پل مجھے یہ خیال آیا کہ میں اپنی یہ خواہش پوری کرنے سے قاصر ہوں۔کیونکہ اس گولک کے ایک روپے کے بدلے ایک ہزار بھرنے پڑتے اور اس وقت میرے پاس اتنے پیسے بالکل نہیں تھے۔میں نے مزید کچھ سوچنے کی بجائے، اپنی جیب سے دس روپے نکالے اور اس گولک میں ڈالنے کے بعد واپسی کے لیے مڑگیا۔ابھی میں آستانے سے باہر نہیں نکلا تھا کہ اچانک میری نگاہ ایک عورت پر پڑی اور میں ایک دم سے ٹھٹک گیا۔گو وہ سر سے پاؤں تک برقعے میں تھی مگر نہ جانے کیوں میرے دل نے کہا کہ ہو نہ ہو، وہ یقیناً نگہت ہے اور ایک پل کو میرے دل میں خیال آیا کہ میں آگے بڑھ کر اسے مخاطب کروں مگر میں دوسرے ہی پل اپنی اس سوچ پر عمل کرنے سے باز رہا۔نگہت کا بھلا وہاں کیا کام تھا؟ میں خود ہی اپنی اس سوچ پر مسکراتا ہوا رکشے میں آبیٹھا۔اس کے بعد سے رات دس بجے تک میری صرف اتنی دہاڑی بن سکی، جو روز کا معمول تھی۔اس رات میں اور نگہت سونے کے لیے لیٹے تو اس نے مجھ سے پوچھا۔''آپ بابا گولک شاہ کے آستانے پر گئے تھے؟''

''ہاں گیا تھا۔''

وہ دھیرے سے مسکرائی۔''مجھے پتا ہے۔''

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''تمہیں کیسے پتا؟''

"کیوں کہ میں بھی آج وہاں گئی تھی اور میں نے آپ کو وہاں دیکھا تھا۔"

"اور تم وہاں کیا کرنے گئی تھی؟"

اس بار وہ پھر مسکرائی۔ "کہنے کو تو کل آپ نے کہہ دیا تھا کہ آپ بابا گولک شاہ کے پاس جائیں گے۔ مگر مجھے یقین نہیں تھا کہ آپ وہاں جائیں گے۔ اور دوسرا آپ وہاں گئے بھی تو وہاں اتنا رش ہوتا ہے، آپ فوراً وہاں سے چلے آئیں گے۔ ایسا ہی ہوا نا؟"

میں اس کی بات پر حیران رہ گیا۔ "ہاں، ایسا ہی کچھ ہوا۔ پر یہ بتاؤ، تمہیں یہ سب کیسے معلوم؟"

"یہ جو ساتھ والی رضیہ ہے نا، اس نے مجھے بابا گولک شاہ کی ہر بات بتائی ہوئی ہے۔ وہ ان کی مریدنی ہے۔ وہ دو بار وہاں گئی ہے اور دونوں بار ہی اس کی من کی مراد پوری ہوئی ہے۔ اس کا شوہر بگڑا ہوا تھا اور کماتا نہیں تھا۔ مگر جب سے وہ بابا گولک شاہ کے پاس سے ہو کر آئی ہے، اس کا شوہر راہ راست پر بھی آ گیا ہے اور کمانے بھی لگا ہے۔ اب تو وہ عقیدت کے طور پر ہر جمعرات کو وہاں جاتی ہے۔ اس نے مجھ سے ذکر کیا تو میں بھی اس کے ساتھ چل دی۔ ویسے میں نے اس بارے میں آپ سے اجازت نہیں لی تھی، مگر مجھے یقین تھا کہ آپ مجھے منع نہیں کریں گے۔ اور یہ دیکھیں، میں آپ کے لیے تعویذ بھی لائی ہوں۔" اس نے اپنے آنچل کے ایک کونے میں بندھا ہوا تعویذ نکالا اور میرے ایک بازو پر باندھنے لگی۔

میں اس عقیدت کی ماری ہوئی عورت کو چپ چاپ دیکھتا رہا۔ تعویذ باندھنے کے بعد اس نے اپنے آنچل کے دوسرے کونے سے ایک روپے کا بندھا ہوا سکہ کھولا اور میری ایک ہتھیلی پر رکھ دیا۔ "یہ بابا گولک شاہ کی گولک سے آیا ہوا بابرکت روپیا ہے۔ اسے آپ اپنے بٹوے میں سنبھال کر رکھ لیں۔ اس کی خیر و برکت سے دیکھئے گا، آپ کا رزق، بارش کی طرح آپ پر برسے گا۔ اور یہ جو آپ کی بندھی ہوئی روزی ہے نا، یہ کل سے ہی کھل جائے گی۔"

میں اس کی سادگی اور یقین پر دل ہی دل میں مسکرا دیا۔ اچانک مجھے ایک خیال آیا۔ "اچھا یہ بتاؤ۔ یہ بابا گولک شاہ کی گولک کا روپیا تمہارے پاس کیسے آیا؟ اس بارے میں تو میں نے سنا تھا کہ ایک کے بدلے ہزار روپے دینے پڑتے ہیں؟"

"نہیں جی، اب یہ ہزار والی شرط ختم ہے۔ اب یہ بابرکت سکہ پانچ سو میں بھی مل جاتا ہے۔ میں بھی پانچ سو دے کر لائی ہوں۔"

"اور یہ پانچ سو کہاں سے آئے تمہارے پاس؟" اس بات پر وہ ایک لمحے کو چپ ہوئی اور پھر دھیرے سے کہا۔

"کچھ عورتیں کپڑوں کی سلائی کے پیشگی پیسے دے گئی تھیں، یہ وہی پیسے تھے۔" میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ "اور بچوں کی عید کا کیا ہوگا؟"

"وہ بھی ہو جائے گی۔ ابھی تو عید میں کافی دن پڑے ہیں۔ کل سے آپ کی بھی اچھی دہاڑی لگنے لگے گی اور میرے پاس بھی چار پیسے آ جائیں گے۔ دو چار دن بعد جا کر بچوں کے جوتے اور کپڑے لے آئیں گے۔"

"کیا تمہیں یقین ہے کہ اس ایک روپے کی وجہ سے کل سے میری اچھی دہاڑی لگے گی؟"

"مجھے ایک نہیں، سو فی صد یقین ہے۔" میں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے دل ہی دل میں دعا کی کہ کاش ایسا ہی ہو۔ نگہت کی یقین کی دیوار یونہی سلامت رہے اور اس میں بے یقینی کی دراڑ کبھی نہ آ سکے۔ مگر افسوس کہ ایسا بالکل بھی نہ ہوا۔ بلکہ اگلے دن سے تو حالات پہلے سے بھی بدتر ہو گئے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے، وہ چھبیسواں روزہ تھا۔ میں صبح سویرے سحری کھانے، روزہ رکھنے اور نماز پڑھنے کے بعد کام کے لیے گھر سے نکل کھڑا ہوا تھا۔ اس اُمید اور یقین کے ساتھ کہ میرا آج کا دن، میرے گزرے ہوئے کل سے بہتر ہو گا۔ آج میرے حصے کا وہ سارا رزق ملے گا مجھے، جو پچھلے ایک عرصے سے رکا ہوا ہے۔ مگر افسوس کہ یہ صرف میری خوش فہمی تھی، ایسا کچھ نہیں تھا۔ صبح سویرے ابھی میں نے صرف سو روپے کی ایک سواری ہی اٹھائی تھی کہ میرا چالان ہو گیا۔ اگر حقیقت کی نظر سے دیکھا جائے تو اس میں قصور صرف میرا ہی تھا۔ میں ون وے کی مخالف سمت میں جا رہا تھا۔ مگر یہ کوئی نئی یا انہونی بات نہیں تھی۔ میری طرح اور بھی بہت سے لوگ اور رکشا ڈرائیور روزانہ وہ ون وے پر جاتے تھے اور جا بھی رہے تھے۔ مگر قسمت صرف میری ہی خراب تھی کہ ٹریفک والوں کے ہاتھ صرف میں ہی لگا تھا۔ انہوں نے جونہی مجھے رکنے کا اشارہ کیا، میں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے بریک لگا دیے۔ انہوں نے مجھ سے میرا ڈرائیونگ لائسنس طلب کیا تو نہ چاہنے کے باوجود میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ میں اس ٹریفک پولیس آفیسر کے آگے گڑگڑانے لگا۔ "سر جی! یقین کریں، صبح سے صرف یہی ایک سواری اٹھائی ہے، اور وہ بھی صرف سو روپے کی۔ میرے حالات خراب جا رہے ہیں آج کل۔ بس پہلی اور آخری بار آج مجھے چھوڑ دیں۔ آج کے بعد ون وے

توڑنے کی غلطی نہیں کروں گا۔''

وہ چپ چاپ اپنا قلم چلاتا رہا۔ کچھ دیر بعد اس نے چالان میری طرف بڑھا دیا۔ ''یہ بات تمہیں ون وے توڑنے سے پہلے سوچنی چاہیے تھی۔'' اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''تمہارے حالات کے پیشِ نظر صرف دوسو کا چالان کیا ہے۔ آیندہ یہ غلطی نہ کرنا۔'' اس نے میرا لائسنس اپنے پاس رکھ لیا۔ میں چالان لے کر اپنے رکشے میں بیٹھ گیا۔ اس کے اس سنگ دلانہ رویے پر میرا دل چاہا کہ میں اس سے کہوں، وہ اس دوسو والے چالان کا مجھ پر احسان نہ کرے بلکہ اس کا جو دل کرے، وہ جرمانہ لگائے مجھے مگر میں نے اپنی اس سوچ کو خود تک ہی محدود رکھا۔ اگر میں اسے ایسا کہہ دیتا تو یہ اپنے پیروں پر کلہاڑی مارنے والی بات ہوتی۔ میں نے اپنے آنسو پونچھے اور اپنا رکشا چپ چاپ آگے بڑھا دیا۔ یقیناً وہ میری بے بسی کی انتہا تھی، جو اس دن میں اپنے آنسوؤں پر اختیار نہیں رکھ پایا۔ میرے پیچھے رکشے میں جو سواری بیٹھی ہوئی تھی، وہ ایک عمر رسیدہ شخص تھا۔ وہ ہمدردی سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ جب میں نے اسے اس کے مطلوبہ مقام پر اتارا تو اس نے مجھے سو کی بجائے دوسو تھما دیے۔ ''پتر! ان چھوٹی چھوٹی باتوں پر دل چھوٹا نہیں کرتے اور آیندہ ون وے توڑتے وقت، ادھر ادھر دیکھ کر تسلی کر لینا۔ اور یہ اضافی سو روپے میری طرف سے کچھ بھی سمجھ کر رکھ لو۔ اللہ تمہاری پریشانیاں دور فرمائے۔''

وہ مجھے دوسو روپے اور دعائیں دے کر چلے گئے۔ میں انہیں بہت دیر تک ممنونیت بھری نظروں سے تصور میں دیکھتا رہا۔ آج کے دور میں بھی ایسے لوگ موجود تھے۔ میرا صبح صبح دو سو کا نقصان ہوگیا تھا۔ آدھا نقصان اس مہربان شخصیت کی بدولت پورا ہوگیا۔ اس وقت میں اپنی خودداریت کو بھی پاس نہیں آنے دیا۔ شاید میں اسے کب کا سلا چکا تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو میں صبح صبح اس ٹریفک پولیس آفیسر کے سامنے کیوں گڑگڑاتا؟ نگہت کو سلائی مشین لا کر نہ دیتا اور بابا گولک شاہ کے آستانے پر نہ جاتا۔ ماہ رمضان کا وہ چھبیسواں روزہ اور دن میرے لیے کچھ اور مشکل ہو کر گزرہ۔ ایک چالان تو میرا صبح صبح ہوگیا تھا۔ دوسرا چالان شام کو ایک اور جگہ ہوگیا۔ حالانکہ ایسا نہیں ہوتا کہ ایک چالان کے فوراً بعد دوسرا چالان ہوجائے۔ مگر اس میں بھی میرا ہی قصور تھا۔ مجھ سے پہلے چالان والی پرچی کہیں گر گئی تھیں۔ وہ مین روڈ کی جگہ تھی۔ وہاں رکشے کا کھڑا کرنا منع تھا۔ مگر میں وہاں سواریوں کے انتظار میں کھڑا ہوا تھا اور وہیں کھڑے کھڑے میرا چالان ہوگیا حالانکہ میں نے اس ٹریفک پولیس والے کو بتایا بھی کہ میرا پہلے ہی چالان ہو چکا ہے، مگر میرے پاس سابقہ پرچی نہ ہونے کی بنا پر اس نے میرا یقین نہیں کیا اور وہیں کھڑے کھڑے مجھے دوسو کا مزید چالان بھرنا پڑا۔ اس رات جب میں گھر لوٹ رہا تھا تو اس وقت میرے پاس پیٹرول اور رکشے کا کرایہ نکال کر صرف دوسو روپے تھے۔ اور ایسا میرے ساتھ پہلی بار ہوا تھا۔ اور اس دن واپسی پر میری آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی سی لگ گئی تھی۔ شاید حالات نے مجھے اس دن، اندر سے توڑ کر، بکھیر کر رکھ دیا تھا۔ اور میرا خود پر سے ہر اختیار ختم ہوگیا تھا۔ معلوم نہیں میرے بے آواز آنسو کب تک بہتے رہے تھے۔ میں رو بھی رہا تھا اور رکشا بھی چلا رہا تھا۔ شاید میرا دل اس بات پر دکھتے ہوئے رو رہا تھا کہ سارا دن کی جان توڑ محنت کے بعد بھی میری جیب میں اتنے پیسے نہیں تھے، کہ جس سے ایک دن کے لیے ہی گھر کا گزارہ ہو پاتا۔ ایک تو ان دنوں میرا کام ویسے بھی سلو چل رہا تھا، رہی سہی کسر دو چالانوں نے پوری کر دی تھی۔ اور اس سب کا ذمہ دار میں صرف ایک ہی ہستی کو سمجھ رہا تھا اور وہ تھی رب کی ذات۔ میرا دل رہ رہ کر شکوہ کناں تھا کہ اگر خدا نہ چاہتا تو یہ سب میرے ساتھ نہ ہوتا۔ آخر خدا نے ایسا کیوں چاہا۔ آخر مجھ سے ایسا کیا گناہ سرزد ہوا کہ جس کی وہ مجھے یوں سزا دے رہا ہے؟ یا پھر یہ میری انہی نیکیوں کا صلہ ہے، جو میں پانچوں وقت نماز پڑھنے، اور جون کے گرم ترین دنوں میں روزہ رکھنے کی صورت میں کر رہا ہوں؟ میں جتنا بھی اس بارے میں سوچتا گیا، میرا ذہن اتنا ہی منتشر اور خدا سے 'باغی' ہوتا گیا۔ صبر اور برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ میں کہاں تک صبر کرتا؟ بابا گولک شاہ کی اصلیت بھی مجھ پر کھل چکی تھی۔ نہ ہی اس کا دیا گیا تعویز میرے کسی کام آیا تھا اور نہ ہی اس کی گولک سے لیا گیا وہ 'بابرکت' روپیا جسے پانے کے بعد لوگ سمجھتے تھے کہ ان پر دنیا جہان کی دولت کے دروازے کھل جائیں گے اور پیسا ان پر بارش کی طرح برسے گا۔ اس وقت مجھے راستے میں ایک بھکاری نظر آیا تو میں نے اپنی جیب سے دس روپے نکالے اور اس کے ساتھ وہ ایک روپیا اور تعویذ بھی نکالا اور اس فقیر کے ہاتھ پر رکھ کر اپنا رکشا آگے بڑھا لیا۔ مجھے اب ان دونوں چیزوں کی کوئی ضرورت نہیں رہی تھی۔ یقیناً میرے پیچھے وہ فقیر بہت دیر تک الجھا رہا ہوگا کہ دس اور ایک گیارہ روپے کی بات تو ٹھیک ہے، مگر میں وہ تعویذ اسے کس خوشی میں دے آیا ہوں؟ اس رات جب میں

گھر میں داخل ہو رہا تو میں نے اپنے اور خدا کے درمیان ایک اہم فیصلہ کرلیا تھا۔ اور وہ تھا خدا سے تعلق توڑنے کا فیصلہ۔ اس سے ہر قلبی، روحانی اور ایمانی تعلق توڑنے کا فیصلہ۔ جب میں اس کا بن کر بھی اس کے اعتاب کا شکار تھا تو پھر اس کا نہ بن کر بھی سہی۔ ویسے بھی اس نے مجھ سے نظریں پھیری ہوئی تھیں، ایسے اور سہی۔ اس رات جو مجھے دو سو بچے تھے، وہ میں نے چپ چاپ نگہت کے ہاتھ پر رکھ دیے تھے۔ اور وہ بھی بغیر کچھ کہے وہ روپے لے کر چپ چاپ کمرے میں چلی گئی تھی۔ اس نے میرے چہرے پر بکھری حالات کی کہانی صاف پڑھ لی تھی۔ اور اس سے اندازہ لگا لیا تھا کہ آج کام پہلے سے بھی کم لگا ہے۔ وہ رات، ستائیس کی رات تھی۔ یعنی ماہ رمضان کی سب سے بڑی رات۔ اس رات بہت سی مساجد اور گھروں میں رات بھر عبادات کا پروگرام تھا۔ نگہت بھی اس رات مصلے پر کھڑی بہت دیر تک نوافل ادا کرتی رہی تھی۔ اس دوران اس نے مجھ سے بھی کہا تھا۔ ''آج بڑی رات ہے۔ آپ نوافل وغیرہ نہیں پڑھیں گے؟''

میں نے اس سے جھوٹ بول دیا۔ ''نہیں، آج میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ سارے دن کا تھکا ہارا ہوں۔ بستر سے ہلنے کو بھی دل نہیں چاہ رہا۔''

نگہت نے اس کے بعد پھر مجھے کچھ نہیں کہا وہ میری تمام رات انہی سوچوں میں ڈوبتے ابھرتے ہوئے ختم ہو گئی۔ سحری سے کچھ پہلے میں رکشا لے کر نکل پڑا کہ شاید کچھ زیادہ کمائی ہو جائے۔

ابھی میں بازار میں جا کر کھڑا ہوا ہی تھا کہ دو سپاہی آ کر بولے۔ ''اوئے یہ پارکنگ کی جگہ تیرے باپ کا روڈ ہے جو اس طرح کھڑا ہو گیا۔''

ان کا لہجہ ایسا ہتک آمیز تھا کہ میں خود پر قابو نہ رکھ سکا۔ ایک تو پہلے ہی دل و دماغ جھنجلاہٹ سوار تھی میں نے بھی تپ کر جواب دے دیا بس پھر کیا تھا۔ وہ دونوں مجھے کھینچ کر تھانے لے آئے افسر کے سامنے پیش کیا میں نے اسے بھی سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ بھی کچھ سننے پر تیار نہ تھا۔ اس نے پولیس والوں سے مار پیٹ کی ایف آئی آر کاٹنے کی دھمکی دے کر حوالات میں دھکیل دیا۔ میں سر جھکائے بیٹھا حالات پر غور کر رہا تھا کہ ایک بار پھر مجھے سب انسپکٹر کے سامنے پہنچا دیا گیا۔ اس نے میرا موبائل میرے سامنے رکھنے کے بعد ایک نمبر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ تمہارے گھر کا نمبر ہے؟'' وہ نگہت کا نمبر تھا۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

''کون کون رہتا ہے تمہارے گھر میں؟''

''میری بیوی اور چار بچے۔''

''اب تم نے گھر جانا ہے یا نہیں، کل عید ہے؟'' اس نے اچانک بات بدل دی۔

''جانا تو چاہتا ہوں سر، مگر میں نے اپنے حالات آپ کو پہلے ہی بتا دیے ہیں......'' اس نے میری بات کاٹی۔ ''اس نمبر سے تمہاری بیوی کی کال آئی تھی۔ ہم نے ساری بات بتا دی ہے اسے۔ بیس کی بجائے پندرہ کہے ہیں ہم نے۔ اُمید ہے وہ تمہارے سلسلے میں جلد ہی کچھ کر کے آئے گی۔ وہ تم سے زیادہ سمجھ دار لگ رہی تھی۔''

میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ اس کی بات سے میرے دل میں ایک تیر ترازو ہو کر رہ گیا۔ میں جس بات سے ڈر رہا تھا، آخر وہی بات ہو گئی تھی۔ تقدیر نے مجھے یہاں تک ذلیل کر دیا تھا کہ میرے گھر کی عزت تھانوں تک آنے والی تھی۔ اگر انہوں نے نگہت کو یہ سب بتا دیا تھا تو یقیناً نگہت وہاں ضرور آنے والی تھی۔ وہ میرے بارے میں یہ سب جان کر بھلا گھر کیسے رک سکتی تھی؟ البتہ مجھے ایک بات کا یقین تھا کہ اگر وہ وہاں آئی بھی تو خالی ہاتھ آئے گی۔ اس کے پاس پندرہ سو تک نہیں تھے، پندرہ ہزار کہاں سے لاتی؟ مگر یہ اندازہ غلط ثابت ہوا۔ نگہت اپنے ساتھ پانچ ہزار لے کر آئی تھی۔ اس نے مجھے دیکھا تو اس کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو بھر آئے۔ اس نے پانچ ہزار سب انسپکٹر کے سامنے رکھے اور بھیگے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''صاحب جی! یہ پانچ ہزار بھی میں پتا نہیں کہاں کہاں سے کر کے آئی ہوں۔ ان کے علاوہ میرے پاس ایک روپیا بھی نہیں ہے۔ آپ میرے میاں جی کو چھوڑ دیں، میں ساری زندگی آپ کو دعائیں دوں گی۔''

اس نے وہ رقم اٹھا کر اپنی جیب میں رکھ لی۔ ''بی بی جی! ہم آپ کو پہلے ہی بتا چکے ہیں کہ آپ کے میاں نے دوران ڈیوٹی ایک پولیس والے پر ہاتھ اٹھایا ہے اور یہ کوئی معمولی جرم نہیں ہے۔ اگر ہم چاہیں تو کئی دنوں کے لیے اسے جیل میں بھجوا سکتے ہیں۔ مگر ہم آپ لوگوں کا احساس کر رہے ہیں۔ اس لیے جو جرمانہ بنتا ہے، وہ تو آپ کو بھرنا ہی پڑے گا۔ اور یہ بھی شکر کریں کہ ہم بیس کی بجائے پندرہ لے رہے ہیں آپ لوگوں سے۔ اگر یہ بھی آپ نہیں کر سکتے تو پھر رہنے دیں اسے کچھ دنوں کے لیے جیل کے اندر۔ خود ہی چھوٹ کر باہر آ جائے گا۔'' اس نے میری طرف اشارہ کیا۔ ''اور ہاں، اگر اپنے شوہر سے اکیلے میں کوئی بات کرنی ہے تو کرلو۔'' اس

نے ہم دونوں کو اکیلا چھوڑ دیا۔ نگہت کے ساتھ دس سالہ مزمل بھی آیا ہوا تھا۔ مجھے وہاں دیکھ کر ان دونوں کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔ مزمل کو اور تو اندازہ نہیں تھا مگر اتنا ضرور پتا تھا کہ میرا وہاں ہونا درست نہیں ہے۔ اس لیے مجھے وہاں دیکھ کر اس کا بھی دل بھر آیا تھا۔ ہم اکیلے ہوئے تو نگہت کی آنکھوں میں بھی رکے ہوئے آنسو چھلک اٹھے۔ ایک دوسرے سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ میں وہاں بے گناہ دھرا گیا ہوں۔ مگر میری طرح اسے بھی معلوم تھا کہ اگر میری سلامتی مقصود ہے تو اسے بھی وہی کرنا پڑے گا، جو وہ پولیس والے چاہتے ہیں۔ اور اس سلسلے میں اس سے جتنے ہو سکے تھے، وہ اتنے پیسے لے آئی تھی۔ مگر پولیس والے کسی طور پندرہ سے کم پر آمادہ نہیں تھے۔ جب تک ہم دونوں ایک دوسرے کے روبرو رہے، نہ ہی اس سے ایک لفظ کہا گیا، نہ ہی مجھ سے۔ یہاں تک کہ ہماری ملاقات کا وقت ختم ہو گیا اور وہ بغیر کچھ کہے اور سنے وہاں سے رخصت ہو گئی۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا تھا، میرا دل دکھ سے بھرتا جا رہا تھا۔ مجھے رہ رہ کر یہی خیال آ رہا تھا کہ مجھے پولیس والوں سے اس لہجے میں بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔ مجھے اس بات کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے تھا کہ اپنی طاقت کے نشے میں چور وہ لوگ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ اگر میں اس وقت ذرا سمجھ داری سے کام لیتا تو شاید میں اس وقت اس حالت میں نہ ہوتا۔ وہ ماہ رمضان کی انتیس تاریخ تھی۔ اگلی رات عید کا چاند نظر آنا تھا مگر میرا دل رہ رہ کر اس بات پر دکھنے لگا کہ میں یہ عید اپنے بچوں کے ساتھ نہیں کر سکوں گا۔ مگر یہ بھی میری بھول تھی۔ اسی وقت نگہت نہ جانے کہاں سے تھانے میں آ گئی۔ وہ اپنے ساتھ کہیں اور سے مزید پانچ ہزار کر لائی تھی۔ اس بار سب انسپکٹر نے بھی کچھ زیادہ دریا دلی دکھائی اور دس ہزار لے کر مجھے چھوڑ دیا۔ البتہ جاتے جاتے اس نے اتنا مجھے ضرور کہا۔ ''چوہدری صاحب! اگر آئندہ کہیں پولیس والوں سے آمنے سامنے ہو تو اپنے ہاتھوں کو قابو میں رکھنا، ورنہ اگلی بار حالات اس سے بھی بدتر ہو سکتے ہیں......'' میں چپ چاپ وہاں سے نکل آیا۔ اس کی یہ بات سن کر مجھے یہ اندازہ ضرور ہوا تھا، اسے یقیناً اس بات کا پتا نہیں تھا کہ میں نے اس کانسٹیبل پر ہاتھ نہیں اٹھایا تھا، یہ ان دونوں کی سازش تھی۔ اگر اسے اس بات کا پتا ہوتا تو وہ مجھ سے یقیناً آتے وقت یہ بات نہ کہتا۔ شاید اصل حقیقت سے وہ بھی لاعلم تھا۔ میں نے بھی ضروری نہیں سمجھا کہ اسے جاتے جاتے اس بارے میں کچھ سچائی بتا کر جاؤں۔ بچوں نے مجھے دیکھا تو ان کے چہرے خوشی سے کھل اٹھے۔ میں بھی انہیں اپنے سامنے پا کر خوشی سے رونے لگا۔ اس رات ہم سونے کے لیے لیٹے تو میں نے نگہت سے کہا۔ ''وہ دس ہزار کہاں سے آئے تمہارے پاس؟''

''بس آ گئے کہیں سے، آپ کو کیا۔''

''مجھے نہیں بتاؤ گی؟'' اس نے ایک گہری سانس لی۔

''تین چار ہزار تو سلائی کے ہو گئے تھے۔ ہزار روپے گھر میں پڑے تھے۔ ارادہ تھا کہ ان سے بچوں کی عید کے جوتے کپڑے خریدتی مگر...... جب اتنے پیسوں سے گزارہ نہیں ہوا تو میں نے ساتھ والی رضیہ سے پانچ ہزار ادھار لیے اور......'' میرے دل میں جیسے کوئی نوک دار چیز پوری قوت سے اتر گئی۔ میں اس کے پیار اور اس کی وفا کو بہت دیر تک دل کے ترازو میں تولتا رہا۔ کیسی وفا کی دیوی تھی وہ، جس نے میری رہائی کے لیے اپنے بچوں کی عید کی خوشیاں قربان کر دی تھیں۔ مجھے سمجھ نہیں آیا کہ میں اس سے کیا کہوں۔ کیونکہ میرے پاس کہنے کو کچھ تھا ہی نہیں۔ گو اس رات خدا یا تقدیر نے مجھ پر اتنی مہربانی کر دی تھی کہ مجھے عید گھر پر گزارنے کا موقع دے دیا تھا۔ مگر اس کے بدلے اس نے ہم سے ہمارے بچوں کی عید کی خوشیاں چھین لی تھیں۔ اس رات نگہت بہت جلد سو گئی۔ مگر میں چاہنے کے باوجود بہت دیر تک نہیں سو پایا۔ اس رات اچانک میری آنکھوں میں ایک طوفان سا اٹھا اور میری آنکھوں میں ایک عرصے کا رکا ہوا پانی اچانک ہی بہہ نکلا اور پھر ایک عجیب بات ہوئی۔ کسی نے دروازے پر دستک دی۔ اس وقت کون آ گیا یہ سوچتے ہوئے میں اٹھ گیا۔ دروازہ کھولا تو حیرانی کا شدید جھٹکا لگا۔ سامنے وہی بزرگوار کھڑے تھے جنہوں نے دو سو کا چالان ہونے پر سو روپے زاید دیئے تھے۔ میری طرف دیکھ کر بولے۔ ''برائت کے اس وقت ڈسٹرب کرنے پر معافی چاہتا ہوں معافی اس بات کی بھی مانگنی ہے کہ میرا بیٹا جو ایس آئی ہے اس کے کیے پر سچائی چاہتا ہوں۔ وہ ایس آئی میرا بیٹا ہے۔ اسی سے تمہارے بارے میں پتا چلا گھر کا پتا بھی اسی نے دیا ہے۔ یہ رہے وہ بیس ہزار جو تمہاری بیوی نے دیئے تھے۔ اس نے اس شرط پر دیئے ہیں کہ آئندہ تم کسی پولیس والے پر ہاتھ نہیں اٹھاؤ گے اور یہ ہے ساٹھ ہزار جو میں نے زکوۃ کے لیے نکالے ہیں اور اس کے اصل حقدار تم ہو؟

وہ رقم دے کر چلے گئے اور میں گنگ سا کھڑا دیکھتا رہ گیا۔

کربِ زیاں

محترم مدیر
السلام علیکم
یہ روداد میری نہیں ہے، عاطف کی ہے۔ انجانے میں کس سے کتنی بڑی بھول ہوئی۔ اس زیاں کا کرب وہ کس طرح جھیل رہا ہے اسے میں نے احاطۂ تحریر میں لایا ہے۔ آپ بھی ملاحظہ کریں کہ یہ دکھ کتنا گہرا ہے۔ اُمید ہے قارئین بھی فراموش نہیں کریں گے۔
اعجاز احمد راحیل
(ساہیوال)

میرا نام عاطف ہے۔ جب میں چار برس کا ہوا تو میرے ماں باپ قتل ہوگئے تھے۔ میری پرورش میرے دادا سائیں مہرداد نے کی تھی۔ میں انہیں بابا جانی کہتا تھا جب میں ذرا بڑا ہوا تو بابا جانی نے مجھے حیدرآباد کے ایک معروف اسکول میں داخل کروا دیا۔ میٹرک کے بعد انھوں نے کراچی کے ایک کالج میں داخلہ دلوا دیا۔ اس وقت میری عمر بائیس برس تھی۔ میں ایف ایس سی کر رہا تھا اور وہیں ہوسٹل میں ہی رہائش پذیر تھا۔ مجھے گوٹھ آنے کی اجازت دو سال پہلے ملی تھی

وہ بھی صرف دو دن کے لیے۔ اس کے بعد میں آج آرہا تھا۔

میرے بابا جانی نے مجھے بتایا تھا کہ میرے ماں باپ کو میرے سوتیلے چاچا شاہنواز نے قتل کیا تھا اور اسی دن انھوں نے اپنے سوتیلے بیٹے کو اشتعال میں آکر قتل کر دیا تھا۔ گوٹھ کا نام بابا سائیں کے نام کی مناسبت سے رکھا گیا تھا۔ وہ ایک روایتی وڈیرے اور اپنے علاقے کے کرتادھرتا تھے۔

میں نے نیشنل ہائی وے سے پجیرو نیم پختہ سڑک پہ موڑ دی۔ گاڑی سست روی سے آگے بڑھ رہی تھی۔

''بابا جانی مجھے اپنے سامنے دیکھ کر کتنا خوش ہوں گے؟'' یہ سوچ کر میرے ہونٹوں پہ بے ساختہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ کیونکہ اس دفعہ میں نے اپنے آنے کی اطلاع نہیں دی تھی۔ آنے والے لمحات کے بارے میں سوچ کر میرا دل بہت خوش ہو رہا تھا۔ اس خوشی میں، میں یہ بھول گیا کہ گوٹھ جانے والے راستے پہ مڑنے کی بجائے سیدھا آگے جا رہا ہوں۔ جب مجھے اپنی اس بھول کا احساس ہوا تو میں نے بے اختیار بریک پر پاؤں رکھ دیا۔ تب تک پجیرو کو چند مسلح افراد نے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ میں نے اپنی سائیڈ کا شیشہ نیچے کر دیا۔ ''نیچے اترو۔''

ایک تنومند شخص رائفل کی نال سے اشارہ کرتے ہوئے گرجا۔

میں گاڑی کا انجن چلتا چھوڑ کر نیچے اتر آیا۔ باہر کافی سردی تھی۔ ہر طرف خاموشی کا راج تھا۔ میں اس غیر متوقع صورتِ حال سے پریشان ضرور ہوا تھا مگر مجھے کسی قسم کا خوف نہیں تھا۔ یہ ہمارا آبائی علاقہ تھا۔ بابا جانی کو سب جانتے تھے۔ مسلح افراد کی تعداد پانچ تھی۔ ان سب کے پاس چھوٹی نال والی رائفلیں اور ٹارچیں بھی تھیں۔ گاڑی کی ہیڈ لائٹس اور ٹارچوں کی روشنی نے تاریکی کافی حد تک کم کر دی تھی۔

''کون ہو تم؟ ادھر کیا کرنے آئے ہو؟'' ان میں سے ایک رعب دار آواز میں بولا۔

''میرا نام عاطف ہے۔ سائیں مہرداد کی گوٹھ جا رہا ہوں۔'' میں نے مختصر جواب دیا۔

''وہاں کس کے پاس جا رہے ہو؟'' اسی شخص نے پھر سوال کیا۔

''اپنے بابا جانی سائیں مہرداد کے پاس جا رہا ہوں۔''

''اوہ اچھا تو تم سائیں اللہ داد کے بیٹے ہو۔''

وہ استہزائیہ لہجے میں بولا۔ ''اب تو اسے لازمی بی بی جی کے پاس لے جانا پڑے گا۔'' اس نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ میں خاموش کھڑا ان کی باتیں سنتا رہا۔

''سجاول تم جاؤ اور اپنی گاڑی بھی ادھر لے آؤ۔'' اس نے پاس کھڑے ایک شخص کو تحکمانہ لہجے میں کہا۔

اگلے ہی لمحے باقی چاروں نے مجھ پہ اسلحہ تان لیا تھا۔ دراز قامت شخص شکل ہی سے چھٹا ہوا بدمعاش لگ رہا تھا۔ میرا دل چاہا کہ ان سے بھڑ جاؤں۔ میں نے جلدی سے شرٹ کے نیچے بیلٹ میں اڑسے ماؤزر کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اگلے ہی پل ماؤزر میرے ہاتھ میں تھا۔ اچانک دراز قامت شخص جس کا نام سانول خان تھا۔ اس کی نظر میرے ہاتھ پہ پڑی۔

''خبردار کوئی غلط حرکت مت کرنا چھوکرے! ورنہ بے موت مارے جاؤ گے۔'' وہ گرجدار آواز میں بولا۔

اسی لمحے دوسرے شخص نے جھپٹا مار کر ماؤزر میرے ہاتھ سے چھین لیا۔

''چلو اب آگے بڑھو۔'' سانول خان نامی شخص نے مجھے رائفل سے ٹہوکا دیا۔

اسی اثنا میں سجاول نامی شخص بھی گاڑی لے آیا تھا۔ وہ بھی ان کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ خودکار رائفل اس کے کندھے پہ جھول رہی تھی۔

''سجاول تم اس چھوکرے کی گاڑی لے آؤ۔ ہم اس گاڑی میں جائیں گے۔''

تھوڑی دیر بعد وہ مجھے گاڑی میں بٹھا کر لے جا رہے تھے۔ گاڑی سانول خان چلا رہا تھا جبکہ مجھے پچھلی سیٹ پر دو گن بردار افراد کے درمیان بیٹھایا گیا تھا۔ بمشکل پانچ منٹ بعد گاڑی گوٹھ میں داخل ہو کر ایک حویلی کے گیٹ پہ رک گئی تھی۔ سانول خان نے ہارن بجایا تو گیٹ کھول دیا گیا۔

''ادا سانول! اتنی جلدی شکار مل بھی گیا؟'' گیٹ کھولنے والے شخص نے گاڑی کے قریب آکر پوچھا۔

دوسری گاڑی بھی حویلی میں داخل ہو گئی تھی۔ گیٹ کے دونوں اطراف کے ستونوں پہ ٹیوب لائٹس روشن تھیں۔

سانول خان نے ڈرائیونگ سیٹ والا شیشہ نیچے کر دیا تھا۔

''ہاں ادا مراد بخش! آج بڑا شکار ہاتھ آیا ہے۔'' وہ ذومعنی لہجے میں بولا۔ ''تم یہ بتاؤ بڑی بی بی جی کہاں ہیں؟''

''ادا! بڑی بی بی جی کے سر میں درد ہے۔ وہ آرام کر

رہیں ہیں۔ چھوٹی بی بی اپنے کمرے میں ہیں۔"
"فضل محمد تم شکار کو باہر نکالو۔ میں چھوٹی بی بی کو خبر دیتا ہوں۔"
وہ میرے ساتھ بیٹھے ہوئے آدمی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ پھر گاڑی سے اتر کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا حویلی کے اندر چلا گیا۔
وہ لوگ مجھے گاڑی سے اتار کر برآمدے میں لے گئے۔ مجھے ایک بار پھر رائفلز کی زد میں لے لیا گیا تھا۔
مراد بخش نامی بندہ حیرت سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔
"عاطف!" اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔
میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور اسے پہچان لیا۔ وہ ہمارے ملازم اللہ بخش کا بیٹا مراد بخش تھا۔ جسے بابا جانی نے پانچ سال پہلے حویلی سے نکال دیا تھا۔
اسی دوران میری نظر سانول خان اور اس کے ہمراہ آتی ایک لڑکی پہ پڑی۔ وہ سب گیٹ کی طرف آرہے تھے۔
وہ لڑکی اک ادا سے چلتی ہوئی قریب آتی جا رہی تھی۔ ایسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ پانی کی لہروں پہ چلتی ہوئی دھیرے دھیرے میری جانب بڑھ رہی ہے۔ میں والہانہ انداز میں اس کی طرف دیکھنے لگا۔ گو کہ اس نے خود کو گرم چادر میں ڈھانپا ہوا تھا۔ مگر اس کا اپسرائی وجود اپنی طرف متوجہ کر رہا تھا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں سیل فون نظر آرہا تھا۔ سانول خان نے شاید میری وفور اشتیاق سے اٹھی آنکھوں کا مطلب جان لیا تھا۔ تبھی وہ پاس آتے ہی رائفل کی نال سے مجھے پیچھے دھکیلتے ہوئے بولا۔ "اوے! اپنی نظریں نیچی کرو۔ ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟ چھوٹی بی بی جی اب اس کا کیا کرنا ہے؟"
پھر وہ گردن موڑ کر لڑکی سے مخاطب ہوا۔
"سانول خان! اسے ادھر کمرے میں لے آؤ۔" اس کی مترنم آواز ابھری۔ "ہم اس سے کچھ پوچھ گچھ کرنا چاہتے ہیں۔"
اس کا لہجہ پُر وقار تھا۔ بات ختم کر کے وہ شاہانہ انداز میں چلتی ہوئی گیٹ کے ساتھ موجود کمروں کی طرف بڑھ گئی۔
اس کے پیچھے رائفل بدست سانول خان بھی مجھے آگے رکھتے ہوئے چل پڑا۔
"اس کمرے میں چلے جاؤ۔ کوئی چالاکی مت دکھانا۔ ورنہ چھوٹی بی بی کے ہاتھوں مارے جاؤ گے اور یہ بھی یاد رکھنا میں باہر موجود ہوں۔" وہ رائفل کو لہراتے ہوئے زہرخند لہجے میں بولا۔

میں اسے قہر بار نظروں سے گھورتا ہوا کمرے میں داخل ہو گیا۔
وہ شعلہ جوالہ صوفے پہ بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے سامنے ٹیبل پر سیل فون پڑا ہوا تھا۔ سیل فون کے پاس ہی پسٹل رکھا ہوا تھا۔ کمرے کو انتہائی خوبصورتی سے سجایا گیا تھا۔ اس میں آرائشی لائٹس بھی لگی ہوئی تھیں۔ کمرا کافی روشن اور گرم تھا۔ فرش پہ دبیز و بیش قیمت قالین بچھا ہوا تھا۔
"ادھر بیٹھ جاؤ۔" وہ دوسرے صوفے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ اس کی رسیلی آواز نے میرے کانوں میں رس گھول دیا۔ میں دوسرے صوفے پر جا کر بیٹھ گیا اور اس کی طرف دیکھنے لگا۔
بلاشبہ وہ مجسم حسن تھی۔ حقیقی مصور کا خوبصورت شاہ کار۔
"ہاں تو اب بتاؤ ادھر کس ارادے سے آئے ہو؟ کیا سائیں مہرداد نے آپ کو یہ نہیں بتایا کہ اس گوٹھ کی طرف نہ جانا؟" وہ کٹیلے لہجے میں بولی۔ "شاید وہ سمجھتے ہیں کہ ہم دو عورتیں اس کا کیا بگاڑ سکتی ہیں؟"
"محترمہ! مجھے بالکل سمجھ نہیں آرہی آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ آپ پہلے میری بات اطمینان سے سن لیں۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔
وہ میری طرف دیکھنے لگی۔ اس کے ناک میں موجود نتھنی چمک رہی تھی۔ پھر اس نے اک ادا سے چہرے پہ آئی بالوں کی لٹ کو ہاتھ سے پیچھے کیا۔ اس کی مخروطی انگلیوں میں سونے کی دو انگوٹھیاں بہت بھلی لگ رہی تھیں۔ مجھے وہ بے حد اچھی لگی۔
میں نے اسے کراچی سے یہاں تک کا واقعہ من و عن سنا دیا۔ وہ چپ چاپ سنتی رہی۔ کچھ نہ بولی۔ جب میں خاموش ہوا تو وہ سنجیدگی سے بولی۔
"عاطف......! سانول خان نے جب مجھے بتایا تھا کہ سائیں مہرداد کا پوتا ہماری گوٹھ کی طرف آرہا تھا اسی وجہ سے اسے پکڑ کر حویلی میں لے آئے ہیں۔ مجھے کافی حیرت ہوئی تھی۔ تجسس بھی ہوا۔ مگر میں نے اپنی دادی شاہ بیگم کو آگاہ نہیں کیا۔ پتا چل جاتا تو بہت برا ہوتا۔" پھر ذرا خاموش ہونے کے بعد دوبارہ بولی۔ "میں نے آپ کے لہجے اور تاثرات سے جان لیا ہے کہ آپ نے سچ بولا ہے۔ ہم آپ کی اس بھول کو معاف کرتے ہیں۔ آئندہ اس طرف بھول کے بھی مت آنا۔ اس سے پہلے کہ دادی جان کو علم ہو آپ فوراً یہاں سے چلے جاؤ۔" وہ کافر ادا حسینہ میری طرف تنبیہہ کے انداز میں انگلی

اٹھاتے ہوئے بولی۔

میں شاہ بیگم کا نام سن کر چونک پڑا۔ مجھے اپنی سماعتوں پہ یقین نہیں آرہا تھا۔

''مطلب میں اس وقت چاچا شاہنواز کی حویلی میں ہوں؟'' میں نے استفساریہ لہجے میں پوچھا۔ میرے ذہن میں مختلف خیالات گردش کرنے لگے۔

''اس حویلی اور یہاں کے لوگوں سے آپ لوگوں کا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ سائیں شاہنواز صرف دادی شاہ بیگم کا بیٹا اور میرا باپ ہے۔''

وہ نخوت سے بولی۔ اس کی روشن پیشانی پہ سلوٹیں پڑ گئی تھیں۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ بولتا کچھ کہتا۔ اس نے بلند آواز میں باہر کھڑے شخص کو پکارا۔ ''سانول خان۔''

''جی بی بی جی!'' وہ دروازہ کھول کر فوراً کمرے میں آگیا۔ چھوٹی نال والی رائفل بدستور اس کے ہاتھ میں تھی۔

''انہیں گوٹھ سے باہر چھوڑ آؤ۔''

پھر وہ قاتل ادا حسینہ پُروقار انداز میں چلتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ میں اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ مجھے یوں لگا اس کا ہر قدم میرے دل پہ پڑ رہا ہے۔ اگلے دس منٹ میں سانول خان نے مجھے گاڑی کی چابیاں اور ماؤزر واپس کردیا اور گوٹھ سے باہر چھوڑنے کے بعد واپس چلا گیا۔

☆☆☆

میں گوٹھ سے نکلا، تو میرا ذہن مختلف خیالوں کی آماج گاہ بنا ہوا تھا۔ مجھے اپنا یوں راستہ بھول جانا بہت اچھا لگ رہا تھا۔ کیونکہ وہ حسینہ مجھے بہت اچھی لگی تھی۔ میں ونڈ اسکرین پہ اس کا عکس چاند کی طرح جھلملاتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ ہاں وہ چاند جیسی ہی تو تھی۔ ہمارے درمیان صدیوں کی دوریاں تھیں۔ بہت لمبی مسافتیں تھیں۔ میں اسے چھو نہیں سکتا تھا، پا نہیں سکتا تھا۔ ہماری گوٹھ سے ان کی گوٹھ کا فاصلہ بمشکل پچیس منٹ کا تھا...... مگر جو وقت نے فاصلہ پیدا کیا تھا۔ میں اسے چاہ کے بھی طے نہیں کرسکتا تھا۔ ہاں ہم ریل کی دو پٹڑیوں کی مانند ساتھ ساتھ چل سکتے تھے مل نہیں سکتے تھے۔ میرے دماغ میں بہت سے خیالات امڈ رہے تھے۔ اچانک میرا دل چاہا، میں زور زور سے قہقہے لگاؤں، خود پہ ہنسوں۔ صرف ایک اتفاقیہ ملاقات جو ہمارے درمیان ہوئی تھی۔ میں اس کے بارے اتنا سنجیدہ ہوگیا تھا۔ حالانکہ میں جانتا تھا کہ ہمارا ملن کبھی نہیں ہوسکتا۔ پھر اس کے بارے سوچنا بھی عبث تھا۔ مگر دل پہ اختیار کب ہوتا ہے؟ میں سارے راستے اسی کے بارے سوچتا رہا۔

اسی سوچ بچار میں رات دس بجے میں اپنی حویلی میں پہنچ گیا۔

بابا جانی کو میرے آنے کی اطلاع کی گئی۔ میں گاڑی پارک کرنے اور فریش ہونے کے بعد سیدھا ان کی خوابگاہ میں چلا گیا۔ ملازمہ نے کھانے کا پوچھا تو میں نے کھانا تیار کرنے کا کہہ دیا۔ بابا جانی مجھے اچانک اپنے سامنے دیکھ کر خوشی سے کھل اٹھے تھے۔

''عاطف بیٹا! خیر تو ہے نا؟ آج اطلاع کیے بغیر اچانک آگئے۔'' وہ مجھے اپنے کشادہ سینے سے لگاتے ہوئے بولے۔

''جی بابا جانی! سب خیر ہے۔ بس آج اچانک آپ کی یاد آئی تو چلا آیا۔ ویسے بھی کل سے کالج بند ہو رہے ہیں۔ سردیوں کی چھٹیاں ہو رہی ہیں۔'' میں ہنستے ہوئے بولا۔

پھر ہم ایک دوسرے کا حال احوال پوچھتے رہے۔ تھوڑی دیر بعد کھانا لگ گیا۔ کھانے کے دوران میں نے اپنے ساتھ پیش آنے والا واقعہ سنایا۔ ان کے چہرے پہ کرب آمیز سوچ کی پرچھائیاں ظاہر ہو کر معدوم ہوگئیں۔

''بابا جانی! پلیز مجھے بتائیں یہ سب کیا ہے؟'' میں نے اصرار بھرے لہجے میں کہا۔

''عاطف بیٹے! تم تھکے ہوئے ہو آرام کرو۔ مجھے بھی اب سونے دو کل اس موضوع پہ بات کریں گے۔'' وہ ٹالنے والے انداز میں بولے۔

میں نے بھی یہ بات محسوس کرلی تھی۔ مگر میں نے دل میں مصمم عزم کرلیا تھا کہ یہ راز جان کر رہوں گا۔ اب اس خاندانی دشمنی کے محرکات کے بارے میں جاننا از بس ضروری ہوگیا تھا۔ باتوں کے دوران میں نے کھانا کھا لیا تھا۔ کھانے کے بعد چائے کا دور چلا۔ پھر میں سونے کے لیے اپنے کمرے میں آگیا۔ میں بیڈ پہ لیٹا کروٹیں بدلتا رہا تھا۔ نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ میں اس کے بارے سوچتا رہا۔ پھر نہ جانے کب مجھے نیند آگئی۔

صبح ناشتے کی میز پہ میں بابا جانی کے ساتھ بیٹھا ناشتا کر رہا تھا۔ ہم دونوں کی آنکھیں رت جگے کی غماز تھیں۔ میں رات کافی دیر جاگتا رہا تھا کیونکہ جب سونے کے لیے بیڈ پہ لیٹا تو وہ خوب صورت چہرے اور غلافی آنکھوں والی حسینہ چشم تصور میں سامنے آموجود ہوئی تھی۔ آنکھیں بند کیں تو چشم افق پہ وہ مہتابی چہرہ طلوع ہوگیا تھا۔ میں اسی پری پیکر کو سوچتا رہا تھا پھر سوچتے سوچتے نہ جانے کب سو گیا تھا۔ موبائل پہ صبح کا الارم بجا تو میری آنکھ کھلی تھی۔ رات میں نے خواب دیکھا تھا

کہ ہم دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے کلفٹن میں گھوم رہے ہیں۔ پھر اکٹھے ساحل کی ٹھنڈی ریت پر ننگے پاؤں کافی دور تک چلتے رہے تھے۔ اتنی دور کہ آس پاس کوئی بھی نہ تھا۔ رات والا خواب یاد کر کے میں دل ہی دل میں مسکرانے لگا۔ ہم دونوں نے خاموشی سے ناشتا کیا اور چائے پینے لگے۔

''عاطف بیٹے! رات لگتا ہے میری طرح تم بھی کافی دیر جاگتے رہے ہو۔'' بابا جانی نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔''ناشتا کرتے ہوئے بھی تم مسلسل کچھ سوچتے رہے ہو۔''

''آں...... نہیں تو بابا جانی! ایسی کوئی بات نہیں۔'' میں ہڑبڑا کر بولا۔

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میری چوری پکڑی گئی ہو۔

''آج میں تمہیں سب کچھ بتاؤں گا۔ اب یہ بہت ضروری ہو گیا ہے۔'' ذرا توقف کے بعد وہ بولے۔''آؤ باغ میں چلتے ہیں۔''

صبح کے نو بج چکے تھے۔ سورج خوب چمک رہا تھا۔ آج دھند بھی نہیں تھی۔ ہم دونوں ناشتے کے بعد اکٹھے اٹھ کر حویلی سے ملحق سنگترے اور امرود کے باغ میں آ گئے۔ باغ میں مالی کے لیے ایک کمرا بنایا گیا تھا۔ ہم کمرے کے سامنے رکھے ہوئے پلنگ پہ بیٹھ گئے۔ بوڑھا مالی جس کا نام امام بخش تھا، وہ باغ میں کام کر رہا تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ آج بابا جانی اپنے ماضی کے بارے میں سب کچھ بتانا چاہتے ہیں۔ پھر وہ ماضی کی دل خراش داستان سنانے لگے۔ میں سنجیدگی سے سب سنتا رہا۔

''عاطف بیٹے......! میرے ماں باپ بچپن میں ہی فوت ہو گئے تھے۔ چاچا دراب خان نے میری پرورش کی تھی۔ جب میں جوان ہوا تو میری شادی رئیس صالح محمد کی بیٹی غلام فاطمہ سے کر دی گئی جو کہ قرار شاہ کی گوٹھ میں رہتا تھا۔ ہماری زندگی بہت سکون سے گزر رہی تھی۔ شادی کے تین سال بعد اللہ نے اولادِ نرینہ سے نوازا تھا۔ اللہ داد میرا اکلوتا بیٹا اور جاگیر کا وارث تھا۔ بیٹے کے پیدا ہونے کی خوشی میں ہم نے سب دوستوں اور رشتہ داروں کی دعوت کی تھی۔ مگر یہ خوشی کے دن شاید بہت کم تھے۔ زچگی کے دوران پیدا ہونے والے مسئلے نے غلام فاطمہ کو موت کی وادی میں دھکیل دیا۔ میں اپنی محبوب بیوی کی موت کا صدمہ جیسے تیسے جھیل گیا تھا۔''

وہ دل فگار لہجے میں اپنی زیست کی روداد سنا رہے تھے۔ ان کا گلا آخر میں رندھ گیا تھا۔ تھوڑی دیر چپ ہوئے، پھر بولے۔ وقت کا پہیا دھیرے دھیرے چلتا رہا۔ اللہ داد پانچ سال کا ہو گیا تھا۔ وہ گرمی کے دن تھے۔ گندم کی فصل پک کر تیار ہو چکی تھی۔ کٹائی کا سیزن تھا۔ میں سارا دن زمینوں پہ ہاریوں سے کام کرواتا رہا تھا۔ شام کو جب حویلی میں آیا تو اللہ داد کو گود میں لے کر بیٹھ گیا۔ ایک ملازمہ جو کہ گھر کے کام کاج اور کھانا وغیرہ بناتی تھی۔ چاچا دراب خان کا پیغام لے کر آ گئی کہ وہ بلا رہے ہیں۔ میں اللہ داد کو اٹھائے ان کے کمرے کی طرف چلا گیا۔

وہ کمرے کے آگے برآمدے میں پلنگ پہ لیٹے ہوئے تھے۔ مجھے دیکھ کر اٹھ کر بیٹھ گئے۔

''السلام علیکم...... چاچا سائیں!''

''وعلیکم السلام...... جیتے رہو بیٹا!'' انھوں نے خوشگوار لہجے میں کہا۔''آؤ ادھر میرے پاس ہی بیٹھ جاؤ۔''

وہ پلنگ پہ اشارہ کرتے ہوئے بولے۔ میں ان کے پاس بیٹھ گیا۔

''بیٹا! میں آج تم سے ایک ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔ میری بات غور سے سننا اور پھر سوچ کر جواب دینا۔'' ذرا سے توقف کے بعد وہ پھر بولے۔

''مہرداد! جب تیری چاچی فوت ہوئی تھی اس کے تین سال بعد تمہارے والد نے مجھے سمجھایا کہ اب شادی کر لو۔ کئی بار کوشش بھی کی مگر میں مسلسل انکار کرتا رہا اور شادی نہیں کی۔''

وہ اچانک اداس اداس سے نظر آنے لگے۔ ان کے چہرے پہ گزرے وقت کے پچھتاوں کا تاثر صاف محسوس ہو رہا تھا۔ میں پورے انہماک سے ان کی بات سن رہا تھا۔ وہ خاموش ہوئے تو ان کی طرف دیکھنے لگا۔

''بیٹا! اب میں سوچتا ہوں کہ میں نے غلطی کی تھی۔'' وہ چند پل خاموش ہوئے پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ ''اب وہی غلطی تم دہرا رہے ہو۔ تم جوان ہو۔ تمہارے لیے عورت کا ساتھ ضروری ہے۔ عورت کے بغیر گھر بھی اجڑا اجڑا سا لگتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم شاہ بیگم سے نکاح کر لو۔''

وہ اپنی بات ختم کر کے میری طرف دیکھنے لگے۔ مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔

''چاچا! آپ اپنے دوست رئیس مراد خان کی بیٹی شاہ بیگم کی بات کر رہے ہیں۔ جس کا شوہر سال بھر پہلے سانپ کے ڈسنے سے مر گیا تھا؟'' میں نے سوالیہ لہجے میں پوچھا۔

''ہاں مہرداد بیٹے! میں اسی بدنصیب کی بات کر رہا ہوں۔ میں نے مراد خان سے اس سلسلے میں بات کی تھی تو انہوں نے کہا کہ مہرداد سے پوچھ لو۔ میں خود اکثر سوچتا ہوں کہ دکھی شاہ بیگم پہاڑ جیسی زندگی اکیلے کیسے گزارے

گی؟ زندگی کا کیا بھروسا ہے۔ کل کلاں مجھے کچھ ہوجائے تو اس کا کون ہے۔ اب تم بتاؤ کہ تمہارا کیا ارادہ ہے؟'' وہ آس بھرے لہجے میں بولے۔

میں نے ان کی طرف دیکھا۔ مجھے ان کے چہرے پہ عجیب سی یاسیت نظر آئی۔ میں نے ان کے ہاتھوں پہ اپنے ہاتھ رکھ دیے اور بولا۔ ''چاچا! میں آپ کی خوشی میں خوش ہوں۔ آپ جو مناسب سمجھیں وہ کرلیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ شاہ بیگم کا ایک بیٹا بھی ہے۔ اس کا کیا ہوگا؟''

''اس کا بھی پوچھ لیں گے۔ کیا میں اب ان سے بات پکی کرلوں؟'' انہوں نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

میں نے ہاں کردی پھر وہ رک کر دور افق کو دیکھنے لگے جیسے ماضی وہیں کہیں پھیلا ہوا ہے۔

''پھر کیا ہوا بابا جانی؟'' میں نے بے تابی سے استفسار کیا۔

''بیٹا! ایک ماہ بعد میرا نکاح شاہ بیگم کے ساتھ ہوگیا۔ وہ اپنے بیٹے شاہنواز کو ساتھ لائی تھی۔ دن ہنسی خوشی گزرنے لگے۔ وقت کا پہیا گردش کرتا رہا۔ نکاح کے کچھ عرصہ بعد شاہ بیگم کا باپ بھی فوت ہوگیا۔ اللہ داد اور شاہنواز اکٹھے پلے بڑھے اور جوان ہوئے پھر ان کی بڑی دھوم دھام سے شادیاں ہوئیں۔ تمہارے باپ کی شادی اس کی خالہ زاد مہروز سے ہوئی تھی جبکہ شاہنواز نے سب کی مخالفت کے باوجود اپنی شادی اپنے ایک دوست شاہ بہرام کی بہن زہرہ سے کروائی تھی۔ شادی کے ایک سال بعد تم پیدا ہوئے تھے۔ جبکہ دو سال بعد شاہنواز کے ہاں ایک بیٹی پیدا ہوئی تھی۔ جس کا نام مومل رکھا گیا تھا۔ پھر سردیوں کی ایک رات تمہارے ماں باپ کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔'' جب وہ میرے ماں اور باپ کے قتل والی رات تک پہنچے تو ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ میں بھی رونے لگا۔ ماضی کے زخم پھر سے ہرے ہوگئے تھے۔

''عاطف بیٹے! وہ سردیوں کی ایک یخ بستہ رات تھی۔ میں اور شاہ بیگم کمرے میں سوئے ہوئے تھے۔ اچانک حویلی میں شور مچ گیا۔'' وہ اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بولے۔ ''شور اور چیخ و پکار کی آواز سن کر میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے جلدی سے اپنی لوڈڈ بندوق اٹھائی۔ کارتوسوں کا تھیلا کندھے میں ڈالا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔''

ذرا توقف کے بعد دوبارہ گویا ہوئے۔ ''شور کی آواز تمہارے ماں باپ کے کمرے کی طرف سے آرہی تھی۔ دو تین ملازم کمرے کے سامنے حواس باختہ کھڑے تھے۔ میں ان کی جانب بڑھتا چلا گیا۔

''سائیں جی! غضب ہوگیا ہے۔'' ایک ملازم مجھے قریب آتے دیکھ کر چلایا۔ اسی اثنا میں، میں بھی ان کے قریب پہنچ گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھے کچھ بتاتا میں اسے دھکیلتا ہوا تمھارے ماں باپ کے کمرے میں چلا گیا۔ کمرے میں لائٹ جل رہی تھی۔ وہاں کا منظر دیکھ کر میرے ہوش وحواس جاتے رہے۔ ان دونوں کو گولیوں سے چھلنی کردیا گیا تھا۔ وہ خون میں لت پت پڑے تھے۔ کمرے میں شاہنواز ہاتھ میں رائفل لیے کھڑا تھا۔ تمھاری ماں مرچکی تھی جبکہ اللہ داد آخری سانسیں لے رہا تھا۔ میں جلدی سے اس کے قریب بیٹھ گیا۔

''اللہ داد! کیا ہوا میرے بچے؟'' میں نے اس کا سر گود میں رکھتے ہوئے پوچھا۔

''بب...... با...... باب...... اجا...... جانی...... شش شا...... شاہ......''

یہ کہہ کر اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔ میں فوراً سب جان گیا۔ میں نے اپنی بندوق کو سیدھا کیا اور شاہنواز کی طرف فائر کھول دیا۔ وہ کٹے ہوئے شہتیر کی طرح نیچے گرا اور بے جان ہوگیا۔ شاہ بیگم بھی کمرے میں آگئی تھی۔ وہ روتی ہوئی اس کی لاش سے لپٹ گئی۔ اگلے دن تمھارے ماں باپ کی تدفین ہوگئی، اور ساتھ ہی شاہنواز کو دفنا دیا گیا۔ چاچا دراب خان نے علاقے کے تھانیدار کو منہ مانگی رقم دے کر اس کا منہ بند کردیا۔ شاہ بیگم بھی چپ رہی۔ پھر وہ اپنی بہو اور پوتی مومل کو لے کر اپنے باپ کی حویلی میں چلی گئی تھی۔ چھ ماہ بعد چاچا دراب خان بھی فوت ہوگئے تھے۔''

یہ سب بتا کر وہ مجھے سینے سے لگا کر بلک بلک کر رونے لگے۔ ماحول سوگوار ہوگیا تھا۔

☆☆☆

مجھے گوٹھ میں آئے چار دن ہوگئے تھے۔ میں ان چار دنوں میں بہت کچھ جان گیا تھا۔ صبح ناشتے کے بعد میں کمرے سے باہر نکلا اور لان میں آکر بیٹھ گیا۔ وہ ایک چمکیلا دن تھا۔ سرما کی سنہری دھوپ بہت بھلی لگ رہی تھی۔ میں کافی دیر تک دھوپ سے لطف اندوز ہوتا رہا، پھر اپنے کمرے میں آگیا۔ کمرے میں آکر میں نے لباس بدلا، پجیرو کی چابی اٹھائی اور باہر نکل آیا۔ پھر آہستہ آہستہ چلتا ہوا گیراج کی طرف چلا گیا۔ میں نے گاڑی کا دروازہ کھولا اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر اگنیشن میں چابی گھمائی طاقت ور انجن غرا کر اسٹارٹ ہوا۔

اگلے ہی لمحے سیاہ پجیرو حویلی سے نکلی اور دھول اڑاتی گوٹھ کے کچے راستوں پہ دوڑی چلی گئی۔ تاحد نگاہ کھیت ہی کھیت تھے۔ میں اپنی زمینوں کا چکر لگانے کے بعد ڈیرے پہ آگیا۔ وہاں کافی دیر بیٹھا رہا۔ عصر سے کچھ دیر قبل میں واپسی کے لیے نکلا۔ پجیرو ایک بار پھر جانے پہچانے راستوں پہ دوڑ رہی تھی۔ مگر اب اس کا رخ قبرستان کی طرف تھا۔ قبرستان کے پاس جاکر میں نے گاڑی باہر کھڑی کی اور پیدل چلتا ہوا اپنی ماں اور باپ کی قبروں پہ آگیا۔ ان کی قبروں کے پاس ہی چاچا شاہنواز کی قبر تھی۔ میں نے اپنے والدین کی قبروں پہ فاتحہ پڑھی اور دعا مانگی۔ دعا کے بعد جونہی اپنے چہرے پہ ہاتھ پھیرے، میرے کانوں میں گاڑی رکنے کی آواز آئی۔

میں نے آواز کی سمت دیکھا۔ دل دھک دھک کرنے لگا۔ موبل گاڑی سے اتر کر خراماں خراماں چلتی ہوئی میری جانب آرہی تھی۔

میں وفورِ اشتیاق سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ ٹھٹک کر رکی پھر دھیرے دھیرے چلتی ہوئی میرے قریب قبر کی دوسری جانب آکر رک گئی۔ میں ایک ٹک اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مجھے یوں لگا کہ میں کوئی سہانا خواب دیکھ رہا ہوں۔ سورج مغربی افق کی جانب جھک گیا تھا۔ اس کی لالی اس کے گالوں پہ اتر آئی تھی۔ سرخ وسفید چہرہ اور بھی خوبصورت لگ رہا تھا۔ میری نظریں وفورِ شوق سے اس کے خوبصورت چہرے کی طرف دیکھنے لگیں۔ اس نے اپنے نرم ونازک ہاتھ دعا کے لیے اٹھائے، گداز لب حرکت کرنے لگے۔ میرے دل میں خواہش ابھری کہ کاش یہ وقت تھم جائے۔ یہ لمحے رک جائیں۔ بس وہ میرے سامنے ایسے ہی کھڑی رہے اور میں اسے دیکھتا رہوں۔ بس دیکھتا رہوں یہاں تک کہ سانسیں تھم جائیں۔ اس نے دعا کے بعد اپنے چہرے پہ ہاتھ پھیرے اور میری طرف دیکھتے ہوئے شرارت آمیز لہجے میں بولی۔

''سوتر (کزن)! کیا آج سے پہلے کوئی لڑکی نہیں دیکھی؟''

میں جھینپ گیا۔ پھر جلدی سے نظریں جھکا کر بولا۔ ''لڑکیاں تو بہت دیکھی ہیں لیکن اپنی سوتر جیسی نہیں دیکھی۔''

میں حیران رہ گیا کہ میں نے یہ بات کیسے کہہ دی۔ اسی اثنا میں ایک رائفل بدست شخص ہمارے پاس آگیا۔ موبل سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''چھوٹی بی بی گاڑی کا ٹائر پنکچر ہوگیا ہے۔'' وہ جلدی سے بولا۔

''تو ٹائر بدل لو سیفل!'' وہ تحکمانہ لہجے میں بولی۔

''اضافی ٹائر بھی نہیں ہے چھوٹی بی بی! صبح پنکچر لگوانے کے لیے دیا تھا۔'' وہ آہستگی سے بولا۔

''اچھا تم ایسا کرو ان کی گاڑی لے جاؤ اور ٹائر لے آؤ۔'' وہ میری طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

میں نے ہاتھ میں پکڑی چابی سیفل کی طرف بڑھا دی۔ وہ چابی لے کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے کہا۔ ''آؤ آپ کی گاڑی کے پاس چلتے ہیں۔''

پھر ہم آہستہ آہستہ چلتے ہوئے قبرستان کی چاردیواری کے باہر ایک پتھر پہ آکر بیٹھ گئے۔

''اچھا اگر میں گاڑی کی چابی نہ دیتا تو......؟'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''عاطف! میں جانتی تھی کہ آپ انکار نہیں کریں گے۔'' وہ سنجیدگی سے بولی۔ ذرا توقف کے بعد دوبارہ گویا ہوئی۔ ''چلو! اچھا ہوا ہمیں کچھ وقت مل گیا۔ میں نے آپ سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔''

میں نے اس کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''کیسی باتیں؟''

اس نے بتایا۔

''دادی ماں کو پتا چل گیا تھا کہ آپ حویلی میں آئے تھے۔''

پھر وہ دادی کے ساتھ ہونے والی گفتگو کے بارے بتانے لگی۔ میں چپ چاپ سنتا رہا۔

''اس کی بات ختم ہوئی تو میں نے کہا۔ بابا جانی نے مجھے بھی بہت کچھ بتادیا ہے۔ کاش یہ سب نہ ہوا ہوتا!''

وہ میری طرف دیکھنے لگی۔

''عاطف! آپ کل ہماری حویلی میں آسکتے ہیں؟'' وہ استفساریہ لہجے میں بولی۔ ''ماں جی کو میں نے منالیا ہے اب وہ بھی آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔''

شمارہ جولائی 2016ء کی منتخب سچ بیانیاں

ہماری پیشکش......آپ کا انتخاب

☆ اول: بے حسی......اختر شہاب (کراچی)

☆ دوم: کالا علم......سائرہ (کراچی)

☆ سوم: مظلوم ظالم......کلثوم اشفاق (کراچی)

پہلے دوسرے اور تیسرے انعام کے لیے آپ بیتی منتخب کیجیے
ہم آپ کی رائے کا احترام کریں گے

یہ کہہ کر وہ جواب طلب نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔

"او کے! میں کل آنے کی کوشش کروں گا۔ نہیں تو پرسوں لازمی آجاؤں گا۔" میں نے جواب دیا۔ "اب تو ملنا اور بھی ضروری ہوگیا۔ شاید آنے والے وقت میں ہماری صلح ہو جائے۔"

وہ اچانک میرے کندھے پہ سر رکھ کے سسک سسک کر رونے لگی۔ میں اس غیر متوقع صورتِ حال سے سٹپٹا گیا۔ وہ مسلسل رو رہی تھی۔

"کیا ہوا موبل!" میں نے آہستگی سے دھیمے لہجے میں کہا۔

"عاطف! رشتوں کا ٹوٹ جانا کوئی معمولی بات نہیں ہوتی۔ جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے۔ ماں جی (شاہ بیگم) کے سوا کوئی اپنا نہیں دیکھا۔ ہمارے معاشرے میں اکیلی عورت کو بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کل کو اللہ نہ کرے، ماں جی کو کچھ ہوجائے، تو میرا کون ہے؟ آج اچانک دل میں دکھ اور خوشی کا احساس جاگ اٹھا ہے۔ مجھے ایسے لگا ہے۔ میں اب اکیلی نہیں ہوں۔ میرے اپنے بھی ہیں۔" وہ رندھے ہوئے لہجے میں بولی۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔ مجھے اس پہ بے اختیار پیار آگیا۔ میں نے چاہا کہ اس کا چہرہ ہاتھوں میں لے لوں اور اس کی روشن پیشانی پہ بے اختیار محبت کی مہر ثبت کردوں شاید اس نے میرے چہرے کے تاثرات سے دل کی بات بھانپ لی تھی۔ عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ میں شرمندہ ہوگیا۔ شام ہو رہی تھی۔

موسم سرما میں خصوصاً دسمبر میں سورج پانچ بجے کے لگ بھگ غروب ہوجاتا ہے۔ ہماری نظر قبرستان کے راستے پہ آتی ہوئی پجیرو پر پڑی، تو ہم اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ اسی اثنا میں ہم نے موبائل نمبرز کا تبادلہ کرلیا۔

پجیرو قریب آکر رک گئی تھی۔ ڈرائیور سیفل جلدی جلدی ٹائر بدلنے لگا۔ دس منٹ میں اس نے ٹائر بدل لیا۔ موبل نے میری طرف الوداعی نظروں سے دیکھا اور جیپ میں بیٹھ گئی۔ سیفل دروازہ بند کرکے دوسری طرف سے جاکر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔

جیپ کا انجن اسٹارٹ ہوا اور جھٹکا کھا کر آگے بڑھ گئی۔ میں اسے دور جاتا ہوا دیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ میں بھی پجیرو میں بیٹھ کر حویلی میں آگیا۔ شام کے سائے گہرے ہوچکے تھے۔ میں جب حویلی میں آیا تو مجھے پتا چلا کہ بابا جانی تھانیدار نبی بخش کے ساتھ کسی کام سے حیدر آباد گئے ہوئے ہیں۔ میں نے رات کا کھانا کھایا اور اپنے کمرے میں آگیا۔ ابھی بیڈ پر بیٹھا ہی تھا کہ موبائل کی گھنٹی بجی۔ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھری۔ میں نے جلدی سے ٹراؤزر کی جیب سے موبائل نکالا اور اسکرین کو دیکھا۔ بابا جانی کال کررہے تھے۔ میں نے کال ریسیو کی۔

"السلام علیکم بابا جانی!" میں مؤدبانہ لہجے میں بولا۔

"وعلیکم السلام!" انھوں نے شفقت آمیز لہجے میں سلام کا جواب دیا۔ پھر خیر خیریت پوچھنے کے بعد بولے۔ "عاطف بیٹا! ایک ضروری کام نکل آیا ہے۔ میں کل شام کو گھر آؤں گا۔ زمینوں پر چکر لگالینا۔"

میں نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ "او کے بابا جانی! جو حکم۔"

"اچھا بیٹا! خدا حافظ۔" یہ کہہ کر انھوں نے کال کاٹ دی۔ مجھے بے اختیار ہنسی آگئی۔ میں سمجھا تھا کہ موبل کی کال ہے۔ میں موبائل سینے پر رکھ کر بیڈ پر لیٹ گیا۔ شاید عاشق اس طرح دل کو تسلی دیتے ہیں۔ مجھے لیٹے ہوئے تھوڑی دیر ہوئی تھی کہ گھنٹی پھر بجنے لگی۔ موبل کا نمبر دیکھ کر میرا دل خوشی سے جھوم اٹھا۔ میں نے جلدی سے کال ریسیو کی۔ رسمی سلام دعا کے بعد اس نے مجھے بتایا۔

"ماں جی کو میں نے آپ کے بارے میں بتا دیا ہے۔ اب وقت نکال کر آجانا۔"

"موبل! بابا جانی حیدر آباد گئے ہوئے ہیں۔ ان کی واپسی کل شام ہوگی۔ میں کل ضرور آؤں گا۔"

وہ بولی۔ "یہ تو اور بھی اچھا ہوا ہے۔ میں آپ کا انتظار کروں گی۔"

اس کے لہجے سے خوشی عیاں ہو رہی تھی۔ جو میں نے بھی محسوس کرلی تھی۔

"اب اتنا بھی خوش نہ ہوں۔ کچھ خوشیاں کل کے لیے بچا کر رکھ لیں۔"

میں نے اسے چھیڑا۔ موبائل کے اسپیکر سے اس کی شوخ آواز ابھری۔

"ایک ہی مختصر ملاقات میں آپ نے مجھ پر بھروسا کر لیا، واہ سوتر جی!"

تو میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "موبل! کبھی کبھی پہلی نظر اور ایک ہی ملاقات میں انسان کو وہ مل جاتا ہے۔ جس کی وہ

آرزو رکھتا ہے۔ محبت بھی تو ایک پل میں ہو جاتی ہے۔“
اس کی دلآویز سرگوشی ابھری۔ ”اب محبت ڈھونڈنے سے نہیں ملتی۔ یہ جو آج کل کی محبت ہے نا۔ یہ محبت نہیں، ضرورت ہے۔ ضرورتیں ہمیں ایک دوسرے کے قریب کر دیتی ہیں۔ یوں سمجھ لیں ضرورت کو محبت کا لباس پہنا دیا گیا ہے۔“
”مومل! وقت بتا دیتا ہے کہ کون سچا اور کھرا ہے؟ اگر کبھی کوئی ایسا وقت آیا تو تم جان جاؤ گی کہ میں تمھاری خاطر کیا کرتا ہوں۔“ میں نے دل فگار لہجے میں کہا۔
اب میں آپ سے تم پہ آ گیا تھا۔ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی اور بولی۔ ”اچھا سوتر جی! مجھے یقین آ گیا۔“
یہ سن کر میں بچوں کی طرح خوش ہو کر بولا۔ ”شکر ہے، تمھیں میری صداقت کا یقین آ گیا۔“
پھر ہم کافی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ گھنٹا پورا ہونے والا تھا۔ اس نے مجھ سے اجازت مانگی تو میں نے اجازت دے دی۔ کال ڈراپ ہوئی تو میں مسکرانے لگا۔ موبائل سائیڈ ٹیبل پہ رکھ دیا اور کمبل اوڑھ کر بیڈ پر لیٹ گیا۔ باہر دسمبر کی رات جوبن پہ تھی۔

☆☆☆

صبح جب میری آنکھ کھلی تو دن کے دس بج چکے تھے۔ روشن دن کا آغاز ہو چکا تھا۔ دھوپ چاروں اطراف پھیلی ہوئی تھی۔ میں دن چڑھے تک سوتا رہا تھا۔
میں بیڈ سے اترا اور واش روم میں چلا گیا۔ شاور لیا تو طبیعت فریش ہو گئی۔ میں نہا کر کمرے میں آ گیا۔ لباس بدلا اور دیوار گیر آئینے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ جینز اور ہلکے گلابی کلر کی شرٹ میرے جسم پہ خوب جچ رہی تھی۔ شرٹ کے اوپر بلیک کلر کی جرسی پہن کر میں کمرے سے باہر آ گیا۔ ملازم کو ناشتے اور چائے کا کہہ کر میں لان میں کرسی پہ آ کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد ملازم ناشتا لے کر آ گیا۔ میں نے ہلکا پھلکا ناشتا کیا۔ جب ملازم ناشتے کے برتن اٹھا کر جانے لگا تو میں نے اسے کہا۔
”جان محمد بابا جانی کی شکاری بندوق لے آؤ۔ آج شکار کرنے کو دل چاہ رہا ہے۔“
وہ ”اچھا سائیں“ کہہ کر چلا گیا۔ جب وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں بندوق اور کندھے پہ کارتوسوں والا تھیلا لٹک رہا تھا۔
”یہ لیں سائیں۔“ وہ مطلوبہ سامان میرے سامنے پڑی میز پہ رکھتے ہوئے بولا۔

منی سوٹا

ریاست ہائے متحدہ امریکا کی ایک ریاست جو 1858ء میں وفاقی نظام کا جزو بنی۔ اس ریاست کے باشندے زیادہ تر اسکنڈے نیویا اور جرمنی سے آئے ہوئے لوگوں پر مشتمل ہیں۔ اس کا دارالحکومت سینٹ پال اور سب سے بڑا شہر مینا پولس ہے۔ رقبہ 84402 مربع میل ہے۔

مرسلہ: عنایت مسیح۔ کراچی

”اچھا میں اب ڈیرے پہ جا رہا ہوں۔ پھر شکار پہ نکلوں گا۔ اگر بابا جانی آ جائیں تو بتا دینا۔ ویسے میں عشاء تک آ جاؤں گا۔“ میں نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔
پھر آہستہ آہستہ چلتا ہوا چم چم کرتی سیاہ پجیرو کے پاس آ گیا۔ ملازموں نے اسے اچھی طرح صاف کیا تھا۔ میں نے دروازہ کھولا اور مسکراتا ہوا ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھ گیا۔ اگنیشن میں چابی گھمائی، انجن اسٹارٹ ہوا تو گیئر لگا کر ایکسلیٹر پہ پاؤں دبا دیا۔ پجیرو جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔ چوکیدار نے اسے دیکھ کر گیٹ کھول دیا۔ حویلی سے نکل کر پجیرو سبک روی سے ڈیرے کی طرف جا رہی تھی۔ میں نے زمینوں کا چکر لگایا۔ ہاری کھیتوں میں کام کر رہے تھے۔ گاڑی دیکھ کر لوگ سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر ماتھے پہ ہاتھ لے جا کر سلام کرتے۔ میں بھی انہیں ہاتھ کے اشارے سے سلام کا جواب دے دیتا۔ میں ڈیرے پہ آ گیا۔ وہاں تھوڑی دیر بیٹھا رہا۔ ظہر کی نماز ڈیرے پہ ادا کی اور وہاں سے شاہ بیگم کی حویلی طرف روانہ ہو گیا۔
تقریباً بیس منٹ بعد میں ان کی حویلی کے گیٹ پہ تھا۔ مراد بخش نے گیٹ کھولا تو میں گاڑی حویلی میں لے آیا۔ اسے پارکنگ میں کھڑی کر کے اس کے قریب ہی کھڑا ہو گیا تھا۔ اچانک میری نظر مومل پہ پڑی وہ میری جانب آ رہی تھی۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تو مسکرانے لگے۔ میں اس کی طرف چل پڑا۔
”السلام علیکم! زہے نصیب! ہم اپنے مہمان کو دل سے خوش آمدید کہتے ہیں۔“ وہ قریب آ کر دل پر ہاتھ رکھ کر شوخ لہجے میں بولی۔
”وعلیکم السلام!“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔
میری نظریں اس کے حسین سراپے کا جائزہ لے رہی تھیں۔ آج وہ کھلی کھلی نظر آ رہی تھی۔ اس کا شگفتہ چہرہ بہت

پیارا لگ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر دھنک رنگ بکھر گئے تھے۔ وہ میرون کلر کے کامدار ڈریس میں بہت نکھری نکھری لگ رہی تھی۔ اس کے سرخ و سفید گال دمک رہے تھے۔ اپنوں کا ملن بھی بہت راحت بخش ہوتا ہے۔ یہ تو بہت ہی اپنوں کا ملن تھا۔ جو وقت کی غلام گردشوں میں کھو گئے تھے۔ بچھڑ گئے تھے۔ اب مدت بعد یہ ملن ہونے والا تھا۔ ٹوٹے ہوئے رشتے جڑنے والے تھے۔

"آؤ! کمرے میں بیٹھتے ہیں۔" وہ شوخی سے بولی۔

میں اس کی راہنمائی میں چلتا ہوا نشست گاہ میں آگیا۔

"ادھر بیٹھ جائیں سوتر جی!" وہ اپنے مرمریں ہاتھ سے صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

"جو حکم ملکہ عالیہ!"

میں اس کا ہاتھ پکڑ کر صوفے پہ بیٹھ گیا اور اپنے ساتھ اسے بھی بٹھا لیا۔ وہ محبت پاش نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ پہلے اس نے اپنا نیچے والا ہونٹ دانتوں میں دبایا، پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"اچھا! میں ماں جی کو آپ کے آنے کا بتا کر آتی ہوں۔ ورنہ وہ خود یہاں آجائیں گی۔" وہ شرارت سے بولی۔

پھر وہ صوفے سے اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

اس کے جانے کے بعد میں ستائشی نظروں سے کمرے کو دیکھنے لگا۔ نشست گاہ کو خوب صورتی سے سجایا گیا تھا۔ جدید فرنیچر بہت خوب صورت تھا۔ کھڑکیوں پہ خوش رنگ و دبیز پردے لٹک رہے تھے۔ فرش پر بیش قیمت ایرانی قالین بچھا ہوا تھا۔ ہر چیز صاحبِ خانہ کے اعلیٰ ذوق کی عکاسی کر رہی تھی۔ میرے بالکل سامنے دیوار پہ کسی مرد کی بہت بڑی تصویر لگی ہوئی تھی۔ میں انہماک سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"یہ میرے بابا جانی ہیں۔" موبل کی آواز سن کر میں چونکا۔ میری پشت دروازے کی جانب تھی۔ اس لیے مجھے پتا ہی نہ چلا وہ کب اندر آئی تھی۔ میرے اس طرح چونکنے پہ وہ ہنس پڑی تھی۔

"ماں جی بس پانچ منٹ میں آتی ہیں۔" وہ میرے سامنے ٹیبل پہ ٹرے رکھتے ہوئے بولی۔

ٹرے میں کینو کے جوس سے بھرا ہوا شیشے کا جگ اور دو گلاس تھے۔ وہ جگ اٹھا کر گلاس میں جوس ڈالنے لگی۔

"یہ لیجیے۔"

اس نے جوس سے بھرا ہوا گلاس میرے سامنے رکھ دیا۔ میں نے گلاس اٹھالیا۔ وہ بھی دوسرے گلاس میں جوس ڈال کر پینے لگی۔ میں جوس پیتے ہوئے اس کی شفاف گردن کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ہم دونوں نے جوس پی کر گلاس رکھے ہی تھے کہ دادی جان آگئیں۔ موبل انہیں دیکھ کر کھڑی ہوگئی۔ میں نے قدموں کی آہٹ سن لی تھی۔ جب اس نے دروازے کی جانب دیکھا تو میں بھی کھڑا ہوگیا۔ وہ پُر وقار انداز میں چلتی ہوئی ہمارے قریب آگئیں۔ گو کہ ان کی عمر ساٹھ سے تجاوز کر چکی تھی مگر وہ قابلِ رشک صحت کی مالک تھیں۔ سرخ و سفید رنگت، جھریوں سے پاک چہرہ بے داغ جلد...... آنکھوں پہ نفیس چشمہ ان کی خوب صورتی میں اضافہ کر رہا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اپنا سر ان کے سامنے جھکا دیا۔ انھوں نے شفقت سے میرے سر پہ ہاتھ پھیرا۔

"بیٹھ جائیں دادی ماں۔" میں نے مؤدبانہ لہجے میں کہا۔

انھوں نے بے ساختہ میری طرف دیکھا اور آگے بڑھ کر مجھے سینے سے لگا لیا۔

"عاطف...... میرے بچے!" وہ رقت آمیز لہجے میں بولیں۔

وہ مجھے سینے سے لگا کر رونے لگیں۔ دل میں نجانے کب کے دکھ جمع تھے جو آنسوؤں کی صورت میں بہہ رہے تھے۔ میری آنکھوں میں بھی آنسو آگئے تھے۔

موبل نم آنکھوں سے ہم دونوں کو دیکھ رہی تھی۔ پھر وہ آگے بڑھی۔

"ماں جی! چپ ہو جائیں پلیز! اپنے آنسو پونچھ لیں۔" وہ ان کا ہاتھ پکڑ کر صوفے پہ بٹھاتے ہوئے بولی۔

پھر خود ہی چادر سے ان کے آنسو پونچھنے لگی۔ کچھ دیر تک ہم باتیں کرتے رہے۔ پھر ملازمہ نے کھانا لگنے کی اطلاع دی۔ ہم تینوں نشست گاہ سے اٹھ کر کھانے کی میز پہ آگئے۔ کھانے کی اشتہا انگیز خوش بو نے میری بھوک چمکا دی۔ میز پہ انواع و اقسام کے کھانے موجود تھے۔ موبل نے بھنا ہوا دیسی مرغ پلیٹوں میں نکال کر ہمارے آگے رکھ دیا۔ وہ خود بھی کھانے لگی۔ سب خاموشی سے کھانا کھاتے رہے۔

"یہ بھی لیجیے۔" موبل میرے سامنے سندھی بریانی کی پلیٹ رکھتے ہوئے بولی۔

بریانی بہت مزے دار تھی۔ میں نے خوب سیر ہو کر کھانا کھایا۔ دادی جان بھی مجھے اصرار کر کے کھلاتی رہیں۔ ملازمہ کھانا کھانے کے بعد برتن سمیٹ کر لے گئی۔ کھانے کے بعد دودھ پتی کا دور چلا۔ پھر باتوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔

"عاطف بیٹا! آج میں اس انسان سے ملواؤں گی، جو ہماری تباہی کا اصل ذمہ دار ہے۔"

"وہ کون ہے دادی جان!" میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"سنو بیٹا میں شروع سے سب کچھ بتاتی ہوں۔"

پھر وہ ماضی کی کتاب کے اوراق پلٹنے لگیں۔ میں دادی جان کی طرف غور سے دیکھنے لگا۔ وہ کسی گہری سوچ میں مستغرق تھیں۔ بولیں۔

"عاطف بیٹا! میرے دل پہ برسوں سے ایک بوجھ ہے۔ شاید آج وہ اتر جائے اسی لیے کہ یہ راز برسوں بعد کھلا ہے جس نے کئی جانیں لے لی ہیں۔ دو خاندانوں کے بیچ دشمنی، خونی دشمنی کا باعث بنی۔ میں آج اس بوجھ کو اتار پھینکنا چاہتی تھی۔"

"کیسا بوجھ ماں جی!"

"بیٹا! ماضی میں ہم سب سے ایک بھول ہوئی ہے۔ اس بھول کا بوجھ......" وہ دور کہیں خلاؤں میں دیکھتے ہوئے بولیں۔ "تمھارے چاچا شاہنواز سے بھول ہوئی کہ شاہ بہرام کی بہن سے شادی کی۔ پھر تمھارے دادا جان سے بھول ہوئی۔ اس نے میرے بیٹے کو قتل کر دیا۔ جب کہ تمھارے ماں باپ کو شاہنواز نے قتل نہیں کیا تھا۔ پھر مجھ سے بھول ہوئی، بڑی حویلی چھوڑ کر ادھر آ گئی۔ کچھ دن پہلے مومل سے بھی بھول ہوئی۔ اس نے مجھے اس رات آگاہ نہیں کیا جب کہ میں خود بڑی حویلی والوں سے رابطہ کرنا چاہتی تھی۔ مومل کو میں نے کہا تھا کہ اگر ہو سکے تو عاطف تک کسی طرح پیغام پہنچا دو کہ میں تم سے ملنا چاہتی ہوں۔ پھر قبرستان میں تم دونوں کی اتفاقیہ ملاقات نے ہمیں اکٹھا کر دیا ہے۔"

میں اور مومل چونک کر ان کی طرف دیکھنے لگے۔

"ماں جی! پھر چاچا اللہ داد کو کس نے قتل کیا تھا؟" مومل نے سوالیہ لہجے میں پوچھا۔

"اللہ داد اور مہروز کا قاتل تمھارا ماموں شاہ بہرام ہے۔" وہ کٹیلے لہجے میں بولیں۔

"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں ماں جی! اور ماموں شاہ بہرام کہاں ہیں؟"

"ہاں بیٹی! یہ سچ ہے اور شاہ بہرام اسی حویلی میں ہے۔" انھوں نے تلخ لہجے میں انکشاف کیا۔ ہم دونوں حیران نظروں سے ان کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ خاموش تھیں۔ پھر انھوں نے سیل فون پہ کوئی نمبر ملایا اور رابطہ ہونے پہ کہا۔

"سیفل! تہ خانے والے کمرے میں پہنچو۔ میں وہیں آ رہی ہوں۔"

وہ اٹھتے ہوئے بولیں۔ ہم دونوں بھی کھڑے ہو گئے۔ ہم تینوں آگے پیچھے چلتے ہوئے ایک کمرے میں آ گئے۔ سیفل اس کمرے میں پہلے سے موجود تھا۔ وہ ہمیں دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔ دادی جان نے اسے اشارہ کیا۔ وہ جلدی سے آگے بڑھا اور کمرے کے کونے پہ جا کر فرش پر جھک گیا۔ اس نے فرش پہ بچھی چٹائی سائیڈ پہ کی اور تختہ اوپر اٹھا کر نیچے اتر گیا۔

"بیٹھ جاؤ۔" دادی جان پلنگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولیں۔

وہ خود بھی کرسی پہ بیٹھ گئیں۔ تھوڑی دیر بعد زنجیر چھنکنے کی آواز آئی۔ میری نظریں فرشی دروازے پہ جمی ہوئی تھیں۔ دو منٹ بعد سیفل باہر نکل آیا۔ اس کے ہاتھ میں زنجیر تھی۔ وہ فرشی دروازے پہ کھڑا ہو گیا۔ اگلے ہی لمحے دروازے سے ایک جھاڑ جھنکاڑ بالوں والا کمزور شخص باہر نکلا۔ اس کے ہاتھ زنجیر سے بندھے ہوئے تھے۔ وہ دادی جان کو دیکھتے ہی گڑ گڑانے لگا۔

"خاموش ہو جاؤ خبیث انسان!" وہ شعلہ بار نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے دھاڑیں۔

وہ چپ ہو گیا تاہم اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

"عاطف! یہ شاہ بہرام ہے۔ اس کمینے نے تمھارے ماں باپ کو قتل کیا تھا۔ اسی کی وجہ سے میرا بیٹا شاہنواز مارا گیا تھا۔" وہ غصے سے کانپتی ہوئی آواز میں بولیں۔ "سنو! وہ سب کیسے ہوا تھا؟ شاہنواز بچپن ہی سے اکھڑ مزاج تھا اور ضدی تھا۔ جب میرے شوہر کی موت واقع ہوئی تو بابا جانی مجھے اپنی حویلی میں لے آئے تھے۔ اس کے کچھ عرصے بعد میرا نکاح تمھارے دادا سائیں مہر داد سے ہوا تھا۔ تمھارا باپ اللہ داد اور شاہنواز جوان ہوئے تو ہم نے ان کی شادیوں کا سوچا۔ تمھارے باپ کی شادی ہماری پسند سے ہوئی تھی۔ ہم مہروز کی بہن آسیہ یعنی تمھاری خالہ سے شاہنواز کی شادی کرنا چاہتے تھے۔ جب اس سے بات کی تو اس نے صاف انکار کر دیا۔ ان دنوں شاہ بہرام اور اس کی گاڑھی چھنتی تھی۔ اس نے ہمیں واضح لفظوں میں کہہ دیا کہ وہ اس کی بہن سے شادی کرنا چاہتا ہے۔" وہ شاہ بہرام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کٹیلے لہجے میں بولیں۔

میں یہ دل خراش روداد غور سے سن رہا تھا۔

"شاہنواز کے صاف انکار کے بعد ہم نے اس کی شادی زہرہ سے کردی۔ زہرہ نے پتا نہیں ایسا کیا جادو کیا تھا۔ وہ اس کا مرید بن گیا۔ وقت گزرتا رہا۔ پھر اس رات جب تمھارے ماں باپ کا قتل ہوا تو تمھارے دادا نے شاہنواز کو مار دیا۔ میں زہرہ اور موبل کو اس حویلی میں لے آئی تھی اور اعلان کردیا تھا کہ میں اپنے بیٹے کا بدلہ ضرور لوں گی۔" وہ دل فگار لہجے میں بولیں۔

میں اور موبل پورے انہماک سے ماضی کی دلخراش روداد سن رہے تھے۔ جبکہ شاہ بہرام سر جھکائے خاموش بیٹھا ہوا تھا۔

"شاہ بہرام اپنی بہن کے پاس اکثر آنے لگا۔ میں نے اپنی حفاظت کے لیے گارڈ رکھ لیے تھے۔ جو حویلی میں ہمہ وقت رہتے تھے۔" ذرا توقف کے بعد وہ دوبارہ گویا ہوئیں۔

"وہ فروری کی ایک اداس سی شام تھی۔ شاہ بہرام بھی آیا ہوا تھا۔ میرا دل اچانک گھبرانے لگا۔ میں اپنے کمرے سے نکل کر برآمدے میں آگئی۔ پھر یوں ہی چلتے چلتے زہرہ کے کمرے کے قریب آئی تو ٹھٹک کر رہ گئی۔ شاہ بہرام ہنستے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"اب اس بوڑھی کا کام تمام کرنا باقی ہے۔ پھر یہ حویلی اور زمینیں ہماری ہوجائیں گی۔"

جو کچھ میں نے سنا وہ حیران کردینے کے لیے کافی تھا۔ میں تجسس کے مارے کھڑکی کے ساتھ کان لگا کر کھڑی ہوگئی۔

"اللہ داد اور اس کی بیوی کو میں نے جب قتل کیا تھا۔ اس نے مجھے پہچان لیا تھا۔ اسی اثنا میں شاہنواز بھی آگیا تھا۔ تو میں وہاں سے کھڑکی کے راستے کھسک گیا تھا۔ جب وہ مرتے ہوئے شاہ...... شاہ کہہ رہا تھا۔ تو میں کھڑکی کے ساتھ کھڑا تھا۔ سائیں مہرداد سمجھا کہ ان دونوں کو شاہنواز نے قتل کیا ہے۔ اس نے اسے قتل کردیا۔"

"شاہ بہرام کا مکروہ قہقہہ گونجا۔ ساری بات میری سمجھ میں آگئی مگر میں نے فوری کارروائی سے گریز کیا اور آکر اپنے بیڈ پر لیٹ گئی۔ میں چاہتی تھی کہ کسی طرح سائیں سے ملاقات ہو جائے۔ میں نے بڑی حویلی کے ایک ملازم اللہ بخش سے رابطہ کیا اور اسے کہا کہ مجھے آکر ملے۔ اس بات کا علم سائیں مہرداد کو ہوا تو اس نے اللہ بخش کو بڑی حویلی سے نکال دیا اور دشمنی کا پودا پھلتا پھولتا گیا۔ میرے کئی ہاری مارے گئے تھے۔"

وہ تھوڑی دیر خاموش ہوئیں پھر کھا جانے والی نظروں سے شاہ بہرام کی طرف دیکھتے ہوئے بولیں۔

"میں اپنے طور پر بہرام کو تلاش کرتی رہی لیکن اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ حقیقت مجھ پر عیاں ہوچکی ہے شاید یہ بات اس تک زہرہ نے پہنچائی تھی کیونکہ ایک رات زہرہ موبل کو چھوڑ کر فرار ہوگئی۔ کہاں گئی؟ میں نہیں جانتی۔ نہ جاننا چاہتی ہوں۔"

یہ سب بتا کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ روتے روتے بولیں۔ "ایک روز مجھے پتا چلا کہ بہرام حیدرآباد میں ہے۔ یہ ابھی کچھ دن پہلے کی بات ہے۔ میں نے سانول سجاول اور سنیل کی مدد سے اسے اغوا کرلیا اور یہاں لاکر بند کردیا۔ تمہارے دادا سے جب بھی رابطہ کرنا چاہا تو انہوں نے انکار کردیا وہ مرد ہیں ناں اس لیے انا زیادہ عزیز ہے ان کو میرا گھر چھوڑ کر آنا برا لگا ہے۔

☆☆☆

عصر کے کچھ دیر بعد میں حویلی سے روانہ ہوا تو موبل بھی میرے ساتھ آئی تھی۔ ہم تینوں نے آئندہ کا لائحہ عمل سوچ لیا تھا۔ میں نے بابا جانی کو مناسب وقت پہ حقیقت سے آگاہ کرنا تھا۔ جب وہاں سے رخصت ہونے لگا تو میں نے کہا۔

"دادی جان! آج کافی دیر حویلی سے باہر رہا ہوں۔ میں ملازم کو شکار کا بتا کر آیا تھا۔ اس لیے خالی ہاتھ تو وہ لوگ مجھ پر ہنسیں گے کہ شہر میں رہ کر میں شکار کرنا بھول گیا ہوں۔ اب کچھ وقت شکار پہ لگ جائے گا۔"

انھوں نے سیفل اور سانول خان کو میرے ساتھ بھیج دیا کیونکہ وہ اکثر شکار کرنے جاتے تھے۔ موبل بھی ضد کرنے لگی کہ وہ بھی ساتھ جائے گی۔ دادی نے کہا بھی کہ وہاں کیا کرے گی تو موبل بولی کہ میں اپنے شوہر کو گولی چلاتے دیکھوں گی، کہیں یہ شہر میں رہ کر یہ سب بھول تو نہیں گیا۔ اس کی معصومانہ خواہش پر دادی بھی مسکرادیں اور اسے اجازت مل گئی۔ اب وہ میرے برابر بیٹھی ہوئی تھی۔ سجاول خان اور سانول والی جیپ آگے تھی۔ ہماری گفتگو جاری تھی۔

"عاطف اس رات میں نے ماں جی کو جان بوجھ کے آپ کے بارے میں نہیں بتایا تھا کیونکہ میں جانتی تھی اگر ان کو پتا چل گیا تو بات بہت آگے تک چلی جائے گی۔ میں سمجھ رہی تھی کہ وہ بڑی حویلی والوں کو اپنا دشمن سمجھتی ہیں۔ سانول خان نے جب آپ کے بارے میں بتایا تو میں نے پہلے خود چھان بین کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ یہی سوچ کر میں خود چلی آئی تھی۔ جب میں نے آپ کو دیکھا تو آپ مجھے بہت اپنے اپنے لگے۔ کمرے میں بات چیت کے دوران آپ کے شائستہ لہجے

اور گفتگو کے انداز نے مجھے متاثر کیا۔ میں چاہتی تھی کہ اس سے پہلے ماں جی کو پتا چلے آپ چلے جائیں۔ اسی لیے آپ کو حویلی سے جلدی نکال دیا تھا۔ میں عجب کش مکش کا شکار تھی۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے کسی آب و گیاہ صحرا میں۔ اچانک سایہ دار شجر نظر آ گیا ہو۔ اس رات میری آنکھوں کے پپوٹے بھاری ہو گئے تھے۔ مگر نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔"

میں یہ سب سن کر مسکرانے لگا۔ پندرہ منٹ بعد گاڑیاں ایک صحرا نما جگہ پہ رک گئیں۔ جہاں تا حد نگاہ کافی خودرو جھاڑیاں بھی نظر آ رہی تھیں۔ ہم سب گاڑیوں سے نیچے اتر آئے۔

"سائیں! اس جگہ پہ خرگوش، تیتر اور بٹیر بکثرت پائے جاتے ہیں۔" سانول خان بتانے لگا۔

میں نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ پھر ہم چاروں پیدل چلتے ہوئے جھاڑیوں کی طرف چل پڑے۔ ہم تینوں کے پاس شکاری بندوقیں تھیں جبکہ موہل خالی ہاتھ تھی۔ ہم اکٹھے چلتے رہے پھر ایک جگہ پہ آ کر دو ٹولیوں میں بٹ گئے۔ میں اور موہل ایک طرف آگے بڑھ گئے۔ ذرا آگے جا کر موہل نے کہا۔

"عاطف! آپ اس طرف دیکھیں میں ادھر جاتی ہوں۔"

میں آگے بڑھتا گیا۔ وہ پیچھے رہ گئی تھی۔ ایک گھنٹے کی تگ و دو کے بعد آخر ایک خرگوش نظر آ گیا۔ خرگوش جسامت میں کافی بڑا تھا۔ وہ تیزی سے دوڑتا ہوا جھاڑیوں کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اپنی جان بچانے کی فکر ہر جاندار کو ہوتی ہے۔ سو وہ بھی اپنی سی کوشش کر رہا تھا۔ میں بندوق ہاتھوں میں تھامے دوڑتے ہوئے اس کا پیچھا کرنے لگا۔ خرگوش جھاڑیوں کے بالکل قریب پہنچ گیا تھا اور کسی بھی لمحے غائب ہو سکتا تھا۔ میں ماہر نشانہ باز نہیں تھا۔ ہدف بھی متحرک تھا۔ میں نے بندوق کو جھٹکا دے کر سیدھا کیا اور اس کا رخ جھاڑیوں کی جانب کر کے لبلبی دبا دی۔

اگلے ہی لمحے زوردار دھماکے کے ساتھ دلخراش نسوانی چیخ میری سماعتوں سے ٹکرائی۔

"یا اللہ خیر۔" میرے منہ سے بے ساختہ یہ الفاظ نکلے۔ آواز جھاڑیوں کی جانب سے آئی تھی۔ میں تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا جھاڑیوں کی طرف چلا گیا۔ خرگوش جھاڑیوں میں کہیں غائب ہو گیا تھا۔ جھاڑیوں کی دوسری جانب میری آنکھوں کے سامنے جو منظر تھا اسے دیکھ کر اوسان خطا ہو گئے۔

"موہل!" میں ہذیانی انداز میں چیختا ہوا اس کی طرف

بھا گا۔ موبل کا سینہ اور گردن کارتوس کے چھروں سے چھلنی ہو چکا تھا۔ میں اس کا سر اپنی ران پہ رکھے اسے آوازیں دے رہا تھا۔ مگر وہ لحہ بہ لحہ زندگی سے موت کی طرف سفر طے کر رہی تھی۔ موت جیت رہی تھی۔ زندگی ہار رہی تھی۔ میں اس کے گال تھپتھپانے لگا۔

''موبل! پلیز آنکھیں کھولو۔ تم کب ان جھاڑیوں کے پیچھے چلی گئی تھیں...... یہ کیا ہو گیا...... میں تمہیں مرنے نہیں دوں گا۔'' میں نے روتے ہوئے کہا۔

اس نے شاید میری صدا سن لی تھی۔ کراہتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔

''قسمت سے کوئی لڑ نہیں سکتا آپ چلے جاؤ۔ وہ ...... وہ آپ کو مار ڈالیں گے۔ پتا نہیں میں ...... کیوں...... خرگوش...... کو پکڑنے دوڑ پڑی تھی۔'' وہ اٹک اٹک کر بمشکل بولی۔ اس کا جسم جھٹکے کھانے لگا تھا۔ ''جاؤ پلیز عاطف! پلیز چلے جاؤ۔''

پھر اس کے جسم نے آخری جھٹکا لیا۔ اس کی کھلی آنکھیں میرے چہرے پہ ثبت تھیں۔

''چھوٹی بی بی!'' سانول خان بلند آواز میں پکارتا ہوا ہماری طرف آرہا تھا۔ ''میں نے آپ کی چیخ سنی ہے۔ لیکن اس بدبخت نے دھوکا تو نہیں دیا اگر ایسا ہوا ہے تو میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' میں نے اس کی کھلی آنکھوں پہ ہاتھ رکھ دیا۔ اس کا سر زمین پہ رکھ کر جھاڑیوں میں چھپتا چھپاتا پجیرو کے پاس آگیا۔ میں جلدی سے ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس وقت سانول یا اس کے ساتھیوں سے الجھوں پہ وقت جوش سے کام لینے کا نہیں ہے لاش دیکھتے ہی وہ گھبرا اٹھے گا اور پھر اسے سنبھالنا مشکل ہو جائے گا۔ اسی لیے میں نے انجن اسٹارٹ کیا اور تیزی سے گاڑی موڑ کر ایکسیلیٹر دبا دیا۔ پجیرو دھول اڑاتی برق رفتاری سے آگے بڑھتی چلی گئی۔ دور مغربی افق پہ سورج غروب ہو رہا تھا۔ مجھے آسمان کی لالی میں اپنی محبوبہ کا خون ملا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

☆☆☆

میں حویلی پہنچا گیراج میں پجیرو کھڑی کر کے اترا ہی تھا۔ بابا جانی کی گاڑی حویلی کے گیٹ میں داخل ہوگئی۔ میں تیزی سے ان کی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ ان کی نظر مجھ پہ پڑی تو وہ گاڑی رکوا کر نیچے اتر آئے اور ڈرائیور کو ہاتھ کے اشارے سے گاڑی آگے لے جانے کو کہہ دیا۔

''عاطف بیٹے! خیر تو ہے نا؟'' جب میں قریب پہنچا تو انھوں نے بے تابی سے پوچھا۔

''بابا جانی! موبل مرگئی ہے وہ میرے ہاتھوں قتل ہوگئی ہے۔'' میں نے بہ مشکل کہا۔

''کون موبل؟'' وہ جلدی سے بولے۔

''میں چاچا شاہنواز کی بیٹی موبل کی بات کر رہا ہوں بابا جانی!'' پھر میں نے سارا واقعہ سنا دیا تاہم حویلی جانے والی بات گول کر گیا۔

''تو اس میں پریشانی والی کون سی بات ہے؟ تم نے شاہنواز کی نسل ختم کر کے آج میرا کلیجہ ٹھنڈا کر دیا ہے۔ جیتے رہو میرے شیر!'' وہ آگے بڑھ کر مجھے اپنے کشادہ سینے سے لگا کر میری پشت تھپتھپاتے ہوئے بولے۔

''بابا جانی! وہ......'' میں انہیں اب اصل بات بتانا چاہتا تھا۔

انھوں نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور موبائل پہ کوئی نمبر ڈائل کرنے لگے۔

''ہیلو نبی بخش! آپ چوکی پہنچ گئے ہیں؟''

میں خاموش کھڑا تھا۔

''اچھا پھر آپ ایسا کریں حویلی میں آجائیں۔'' یہ کہہ انھوں نے کال کاٹ دی۔ ابھی کال منقطع ہوئے بہ مشکل دس منٹ ہی ہوئے ہوں گے۔ سب انسپکٹر نبی بخش حویلی میں آگیا۔ وہ گوٹھ کے قریب چوکی پہ تعینات تھا۔ وہ ابھی راستے میں ہی تھا اور وہیں سے واپس آگیا تھا۔ ہم بابا جانی کی ہمراہی میں نشست گاہ میں آگئے۔

''نبی بخش! ایک ضروری کام نکل آیا ہے۔ انعام کی فکر نہ کرنا۔ منہ مانگا مل جائے گا؟'' بابا جانی نے بیٹھتے ہی گفتگو کا آغاز کیا۔

''جی سائیں! حکم کریں۔ ہم تو آپ کے خادم ہیں۔'' وہ حریصانہ لہجے میں بولا۔

پھر انھوں نے سارا واقعہ سنا دیا۔ نبی بخش خاموشی سے سنتا رہا۔

''سائیں! میں ابھی شاہ بیگم کی حویلی کی طرف نکلتا ہوں۔ وہ لاش اٹھا کے لے گئے ہوں گے۔ واپس آکر عاطف کو چوکی لے جاؤں گا۔ دو چار دن اسے خانہ پری کے لیے حوالات میں رکھنا پڑے گا۔'' وہ خوشامدانہ لہجے میں بولا۔

''اچھا! ٹھیک ہے۔ اتنا خیال رکھنا کہ پوسٹ مارٹم نہ ہو۔'' بابا جانی نے بھید بھرے لہجے میں کہا۔

''اچھا سائیں! اب میں چلتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ کھڑا

عید کے خوشنما رنگوں سے سجا پاکیزہ اگست 2016 کا عید نمبر
ماہنامہ پاکیزہ کراچی
رفعت سراج کا نیا سلسلے وار ناول
یہ کہاں بچیں کہ دل ہے ایک اچھوتے اور پراثر بیان کے ساتھ
انجم انصار، در ثمن بلال و مدیحہ شاہد کے مسحور کن قسط وار سلسلے
نایاب جیلانی کے منی ناول کی رازوں سے پردے اٹھاتی آخری قسط
فاخرہ گل کا دلکش مکمل ناول محبت ہے سمندر سی
اختر شجاعت کا پرفکر مضمون تکبر، غضب الٰہی
فسانہ نہیں حقیقت ہے یہ
میں سب کی ہردلعزیز، شہروزی کی نیلو فر عباسی
بنیں ہماری مہمان
ساون کی باتیں، شائستہ زریں کے پرکشش سروے میں
اس کے علاوہ
شمیم فضل خالق، شائستہ عزیز، پروین عذرا تشنہ، فرحین اظفر،
رفاقت جاوید، رفعت شبانہ و دیگر مایہ ناز لکھاریوں کی دلفریب تحریریں
اس کے ساتھ ساتھ خوب صورت موضوعات و حکایات لیے دل خوش کن سلسلے صرف آپ جیسے خوش ذوق قارئین کے لیے

ہوگیا۔

”او کے! تم جاؤ اور ہاں جب شاہ بیگم کی حویلی پہنچو، تو مجھے مس کال دینا۔ میں کال کروں گا۔ تم کال ریسیو کر کے موبائل ہاتھ میں رکھنا۔ میں اس کی باتیں سنتا رہوں گا۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے۔

نبی بخش کے جانے کے بعد ہم وہیں بیٹھے رہے۔ بیس پچیس منٹ بعد بابا جانی کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ انھوں نے فوراً کال بیک کی۔ دوسری طرف سے کال فوری ریسیو کر لی گئی۔ بابا جانی نے موبائل کا اسپیکر آن کر دیا تھا۔ ”سائیں میں حویلی پہنچ گیا ہوں۔“ نبی بخش کی سرگوشی ابھری۔ لحاتی توقف کے بعد بولا۔ ”حویلی میں کہرام مچا ہوا ہے۔ شاہ بیگم موبل کی لاش سے لپٹ کر دھاڑیں مار مار کے رو رہی ہے۔ وہ اس کے خون آلود چہرے کو چوم رہی تھی۔ جب میں لاش کا معائنہ کر رہا تھا۔ وہ روتے روتے اچانک اٹھی اور موبل کی خون آلود لاش کو دیکھ کر زہر خند لہجے میں بولی۔ موبل...... میری بچی! تیرا خون رائیگاں نہیں جائے گا۔ میں اس .... کو اپنے ہاتھوں سے ماروں گی۔“

”اچھا دیکھ لوں گا اسے بھی، میرے ہوتے ہوئے عاطف کا کوئی بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔“

میں دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو خاموشی سے سن رہا تھا۔

”سائیں! شاہ بیگم کے غصے سے لگتا ہے۔ وہ کچھ نہ کچھ کرے گی۔ اب محتاط رہنا ہوگا۔ اس وقت میں نشست گاہ میں بیٹھا ہوا ہوں، شاہ بیگم کسی وقت بھی آسکتی ہے۔ بہتر ہے ہم لمبی گفتگو سے گریز کریں۔“ اسپیکر سے اس کی مکارانہ آواز ابھری۔

بابا جانی نے اس کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔

”اچھا ٹھیک ہے، میں کال پہ رہوں گا۔“

تھوڑی دیر بعد دادی جان بھی آگئیں۔

”بی بی جی! مجھے بہت افسوس ہو رہا ہے۔ میں معذرت خواہ ہوں۔ آپ کو تکلیف دی۔ بہر حال قانونی کارروائی تو کرنا پڑتی ہے۔“ وہ آہستگی سے بولا۔

اسپیکر آن ہی تھا۔ ہم بآسانی اس کی بات سن رہے تھے۔

”تھانیدار صاحب! ہم سمجھتے ہیں کہ یہ سب تقدیر میں لکھا تھا۔ اس میں کسی کا کوئی قصور نہیں ہے۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔

بابا جانی ان کی بات کرنے کے انداز سے چونک گئے تھے۔

”بی بی جی! سائیں مہرداد کے پوتے کو جائے وقوعہ سے کچھ فاصلے پہ ہم نے گرفتار کر لیا ہے۔ وہ فرار ہو رہا تھا۔ ہم کسی کام سے کہیں جا رہے تھے۔ فائرنگ کی آواز سن کر ہم رکے تو اچانک اس کی گاڑی نظر آگئی۔ ہم نے تعاقب کر کے پکڑ لیا۔ اب وہ حوالات میں ہے۔“ نبی بخش بات بناتے ہوئے بولا۔

مجھے اس کی مکاری اور جھوٹ پہ حیرت کا جھٹکا لگا۔ اگلے ہی لمحے دادی شاہ بیگم کی پاٹ دار آواز نے مجھے جہانِ حیرت سے واپس لے آئی۔

”تھانیدار صاحب! آپ اسے چھوڑ دیں۔“ ان کے لہجے کی سفاکی محسوس کر کے میری ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہر دوڑ گئی۔

میں اٹھ کر اپنے کمرے میں آکر بیڈ پر لیٹ گیا۔ میں سوچنے لگا کہ کل بابا جانی کو تمام حقیقت بتا دوں گا۔ انسان بہت کچھ سوچتا ہے۔ منصوبے بناتا ہے...... تقدیر انسان پہ ہنستی ہے۔

میں بستر پہ لیٹا کروٹیں بدلتا رہا۔

رات بارہ بجے دروازے پر دستک ہوئی۔ میں اٹھا، دروازہ کھولا۔

”بڑے سائیں کی طبیعت خراب ہوگئی ہے۔ وہ آپ کو بلا رہے ہیں۔“ ملازم جان محمد نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

ہم تیزی سے آگے پیچھے چلتے ہوئے بابا جانی کے کمرے میں آگئے۔ وہ بیڈ پہ آنکھیں بند کیے لیٹے ہوئے تھے اور اپنے سینے کو زور زور سے مسل رہے تھے۔

”کیا ہوا بابا جانی؟“ میں نے جلدی سے پوچھا۔

میری آواز سن کر انہوں نے آنکھیں کھولیں، بہ مشکل بولے۔ ”عاطف یار! اچانک دل میں درد ہونا شروع ہوگیا ہے۔“

”سائیں! میں گاڑی نکالتا ہوں۔“ پاس کھڑا ڈرائیور جلدی سے بولا۔

کچھ دیر بعد ہم حیدر آباد کی طرف جا رہے تھے۔ ابھی ہم نے تین، چار کلومیٹر کا فاصلہ طے کیا تھا۔ بابا جانی کی طبیعت زیادہ خراب ہوگئی۔ تکلیف کی شدت سے وہ کراہنے لگے۔ ان کو سانس لینے میں دقت ہو رہی تھی۔ وہ منہ کھول کر سانس لینے لگے۔ گاڑی دوڑ رہی تھی، دوڑتی رہی۔ پھر اچانک ہی زندگی کی گاڑی رک گئی۔ ہم نے آدھا فاصلہ طے کیا تھا۔ کہ بابا جانی کی موت واقع ہوگئی۔ ہم ان کی لاش لے کر واپس آگئے۔

☆☆☆

اگلا دن بہت سوگوار تھا۔ بابا جانی کی ناوقت موت سے مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا، جیسے میرے سر سے سائبان اٹھ گیا ہو۔ ہاں! وہ سائباں ہی تو تھے جنہوں نے مجھے زمانے کی تپتی

دھوپ سے بچایا ہوا تھا۔ وہ ٹھنڈی اور گھنی چھاؤں تھے۔ موہل کا اپنے ہاتھوں قتل ہونا...... دہری اذیت تھا۔ جانے والے چلے جاتے ہیں...... پیچھے رہ جانے والے روز مرتے، جیتے ہیں۔ موہل کا جنازہ دس بجے ہوا تھا۔ میں اس کا آخری دیدار بھی نہ کرسکا۔ بابا جانی کا جنازہ ظہر کی نماز کے بعد ادا کیا گیا۔ دونوں کو ایک ہی قبرستان میں دفن کیا گیا، جو کہ تین گوٹھوں کا مشترکہ تھا۔ تدفین کے بعد میں حویلی واپس آگیا۔ مہمان آتے جاتے رہے۔ سب مجھے دلاسہ دیتے اور چلے جاتے۔ میری آنکھیں رو رو کر سرخ ہوچکی تھیں۔ رات تو میں روتا رہا، سسکتا رہا، آہیں بھرتا رہا۔ صبح ہوئی۔ تعزیت کرنے والے آتے رہے۔ پھر شام ہوگئی۔ رات بھی عذاب بن کے اتری تھی۔ تنہائی ڈستی رہی۔ وقت گزر جاتا ہے، گزر رہا تھا۔ سات دن گزر گئے۔

ان سات دنوں میں، میں ٹوٹ کر بکھر گیا تھا۔ موہل اور بابا جانی کی اچانک اموات میرے لیے بہت بڑا شاک تھیں۔ یہ بات مجھے کسی پل چین نہیں لینے دیتی تھی کہ میری محبوبہ میرے ہاتھوں مری ہے۔ وہ جو میرے لیے، بہت معتبر تھی۔

اس دن میرا دل بہت اداس ہو رہا تھا۔ میں نے گاڑی نکالی اور قبرستان کی طرف چل پڑا۔ جب قبرستان میں پہنچا تو سورج ڈوبنے والا تھا۔ بابا جانی اور اپنے باپ ماں کی قبروں پہ فاتحہ خوانی اور دعا کے بعد میرے قدم بے اختیار موہل کی قبر کی طرف اٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد میں بیری کے نزدیک کچی قبر کے پاس پہنچ گیا۔ اس کی قبر گلاب کے پھولوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ میں قبر کے دائیں جانب کھڑا رو رہا تھا۔ ہاں...... دائیں جانب جس طرف موہل کا چہرہ تھا۔ میرا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔

''موہل! تم چلی گئی ہو۔ میرا اب کوئی نہ رہا۔ کب تک دردسہوں گا۔ مجھے بھی بلالو۔'' میں نے روتے ہوئے کہا۔

قبر خاموش تھی۔ کوئی جواب نہیں آیا۔ مرنے والے کب بولتے ہیں بھلا؟ میں ابھی کھڑا ہوا ہی تھا کہ فائر کی سماعت شکن آواز ابھری۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے دہکتے ہوئے انگارے میرے داہنے گھٹنے میں گھس گئے ہوں۔ میں لڑکھڑا کر پھولوں سے ڈھکی قبر پہ گر پڑا۔ گرتے ہوئے میں نے سجاول کی چیخ سنی تھی۔ وہ چیختا ہوا دوڑا تھا کسی کو منع کرتے ہوئے۔ قبر کی مٹی میرے لہو سے سرخ ہوگئی۔ اسی لمحے میری بجھتی ہوئی آنکھوں کے سامنے دادی جان آکر کھڑی ہوگئیں۔

''کیا تم لوگوں نے سمجھا تھا کہ میری موہل کا خون رائیگاں جائے گا؟ کیا تم سمجھتے تھے کہ شاہ بیگم اتنی کمزور ہوگئی کہ بدلہ نہیں لے پائے گی؟ ہاں! تم بھول گئے تھے۔ عورت جب انتقام لیتی ہے تو نسلیں اجاڑ دیتی ہے۔''

ان کی سفاک آواز سن کر میں نے آنکھیں کھولیں، اپنی ہمت مجتمع کی اور نقاہت سے بولا۔

''دادی ماں! ہاں...... ہم سب بھول گئے تھے۔ میں بھی بھول گیا کہ ایک خرگوش پر گولی چلادی موہل کے دھوکے میں اگر مجھے علم ہوتا کہ میری چلائی گولی خرگوش کے ساتھ ساتھ میری موہل کی زندگی کا چراغ گل کردے گی۔ تو میں کبھی فائر نہ کرتا۔ آہ موہل میری زندگی تھی۔ میری محبت تھی۔ ہماری محبت نفرتوں کے تمام در بند کردیتی۔ آج باقی کچھ نہیں بچا۔''

میں نے اپنی بند ہوتی آنکھوں سے دیکھا۔ وہ حیرت سے میری طرف دیکھ رہی تھیں۔ پھر شاید انہیں یقین آگیا تھا۔ ان کے برابر میں سجاول کھڑا کچھ بول رہا تھا مگر میں سن نہ پایا میرا ذہن تاریکی کی عمیق گہرائیوں میں ڈوب گیا۔

☆☆☆

مجھے جب ہوش آیا تو ذہن میں بے اختیار یہ خیال ابھرا۔

''کیا میں زندہ ہوں؟''

میں نے ارد گرد نظر دوڑائی۔ میرے دل میں طمانیت اور خوشی کا احساس ہوا۔ میں کسی اسپتال میں تھا۔ بیڈ کے نزدیک اسٹینڈ پہ بلڈ اور گلوکوز کی ڈرپس لٹکی ہوئی تھیں، جو قطرہ قطرہ میرے جسم میں منتقل ہو رہی تھیں۔ سامنے دیوار گیر کلاک پر نو بج گئے تھے۔

''مجھے یہاں کون لایا ہوگا؟'' میں زیر لب بڑبڑایا۔

مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر پاس کھڑی نرس جلدی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔ اگلے ہی لمحے وہ ایک ڈاکٹر کو لے کر کمرے میں داخل ہوئی۔ ڈاکٹر قریب آکر مسکرایا، پھر بولا۔

''کیسے ہو ینگ مین؟''

''جی ٹھیک ہوں۔''

وہ چیک اپ کرنے لگا۔ میرے گھٹنوں میں درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ تاہم یہ درد قابل برداشت تھا۔ کچھ دیر بعد درد شدت سے ہونے لگا۔ میں نے درد کے بارے بتادیا۔ چیک اپ کے بعد وہ کسی سے کال پہ بات کرنے لگا۔

''جی بیگم صاحبہ ہوش آگیا ہے۔''

میں اس کی بات سن کر چونکا۔ ''ڈاکٹر صاحب! مجھے یہاں کون لایا ہے؟''

''ینگ مین! میں نے شاہ بیگم صاحبہ کو اطلاع بھجوادی ہے۔ وہ

آتی ہی ہوں گی۔ انھوں نے ہی آپ کو ایڈمٹ کروایا ہے۔"
میں حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔
ڈاکٹر نے نرس کو کوئی انجکشن لکھ کر دیا۔ وہ تیزی سے باہر چلی گئی مگر جلد ہی واپس آ گئی۔ پھر اس نے میرے بازو میں انجکشن لگا دیا۔ وہ جونہی انجکشن لگا کر فارغ ہوئی، دادی جان بھی کمرے میں آ گئیں۔
میری نظریں دروازے کی طرف تھیں۔ وہ تھکے تھکے قدموں سے چلتی ہوئی بیڈ کے قریب آ کر رک گئیں۔ وہ میری طرف دیکھ رہی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ آگے بڑھیں۔ میرے سر پہ ہاتھ پھیرنے لگیں۔ جھک کر میری پیشانی چومی۔ میں خاموش لیٹا، ایک ٹک ان کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔
"عاطف بیٹا! کیسے ہو؟" ان کی فرطِ جذبات سے لرزتی آواز میری سماعتوں سے ٹکرائی۔
"دادی ماں!" اس سے آگے میں کچھ نہ بول پایا۔ میرا گلا رندھ گیا۔
"بیگم صاحبہ! میرے ساتھ آئیں۔" ڈاکٹر نے مداخلت کی۔ وہ چپ چاپ اٹھیں۔ ڈاکٹر کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گئیں۔ میں الجھ گیا تھا، سوچنے لگا۔
"شاید دادی جان کو میری بے گناہی پہ یقین آ گیا ہے۔"
ان کی واپسی آدھے گھنٹے بعد ہوئی۔ وہ میرے پاس آ کر بیٹھ گئیں، بولیں۔ "عاطف بیٹا! ڈاکٹر صاحب سے تفصیلی بات ہوئی ہے۔ تمہارا خون زیادہ بہنے کی وجہ سے آپریشن نہیں ہو سکتا۔ ان کا کہنا ہے چار پانچ دن بعد آپریشن ہوگا۔ پیٹ کا زخم معمولی ہے۔ تاہم گھٹنوں کا آپریشن ناگزیر ہے۔ اب میں گوٹھ جا رہی ہوں۔ کل صبح واپس حیدرآباد آؤں گی۔ سجاول یہیں رہے گا۔"
لحاتی توقف کے بعد انھوں نے کہا۔
"بیٹا! ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔" یہ کہہ کر وہ رو پڑیں۔
"دادی جان! پلیز چپ ہو جائیں، نہ روئیں۔ یہ سب تقدیر کے کھیل ہیں۔" میں انہیں روتا دیکھ کر تڑپ گیا تھا۔
پھر وہ چلی گئیں۔ اسی رات حویلی کے دو ملازم بھی آ گئے۔ مجھے ان کی زبانی پتا چلا تھا کہ دادی جان بڑی حویلی میں گئی تھیں۔
پانچ دن بعد میرے گھٹنوں کا آپریشن ہوا تھا۔ دادی جان روز اسپتال آتی تھیں۔ مجھے پچیس دن بعد اسپتال سے ڈسچارج کر دیا گیا۔ میں بڑی حویلی شفٹ ہو گیا۔ دادی جان بھی دس پندرہ دن بعد مستقل ادھر آ گئی تھیں۔

آپریشن کامیاب نہ ہو سکا۔ اب وہیل چیئر میرا سہارا ہے۔ وقت پانی کی طرح مخصوص رفتار سے بہتا رہا۔ دن گزرتے رہے۔ شاہ بہرام بھی مر گیا مگر اس کی لگائی ہوئی آگ میں ہم سب جل رہے ہیں کہ نہ میرے والدوالدہ قتل ہوتے، نہ دادی، مومل الگ ہوتیں اور نہ میں اس کے لیے اس شدت سے بے تاب ہوتا کہ شکار جیسے خطرناک کھیل میں اسے بھی ساتھ لے جاتا اور نہ وہ خونی حادثہ رونما ہوتا۔
ایک شام دادی جان اور میں لان میں بیٹھے تھے، باتوں باتوں میں مومل کا ذکر چھڑ گیا۔
"عاطف بیٹا! مومل کی موت نے مجھے یکسر بکھیر دیا تھا۔ میرے لیے یہ بہت بڑا صدمہ تھا۔ ایسا صدمہ جس نے میری روح کو گھائل کر دیا تھا۔ اس کی تدفین کے دو دن بعد میں نے سجاول خان اور سانول خان کو تمہارے پیچھے لگا دیا تھا۔ کہ تم جب بھی حویلی سے نکلو مجھے آگاہ کیا جائے۔"
ذرا توقف کے بعد وہ بکھرے لہجے میں بولیں۔
"وہ دونوں اپنی ڈیوٹی بخوبی سرانجام دے رہے تھے۔ اس دن شام سے کچھ دیر قبل میرے موبائل کی گھنٹی بجی، موبائل کی اسکرین پہ سجاول کا نمبر دیکھ کر میں نے جلدی سے کال ریسیو کر لی۔ اس نے بتایا کہ تم اپنی گاڑی پہ حویلی سے نکلے ہو۔ گاڑی کا رخ قبرستان کی طرف ہے۔ میں نے جلدی سے الماری میں پڑا اعشاریہ تیس کا ریوالور اٹھایا، میگزین میں گولیاں ڈالیں اور ڈرائیور کو ساتھ لے کر قبرستان پہنچ گئی......"
ان کی آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے۔
"عاطف بیٹا! جب میں نے تمہیں مومل کی قبر کے پاس کھڑے دیکھا۔ مجھے حیرت ہوئی تھی۔ تاہم میں سرتاپا انتقام کی آگ میں دہک رہی تھی۔ میری آنکھوں کے سامنے میری مومل کا قاتل کھڑا تھا۔ میں نے فائر کھول دیا۔ پھر میں تمہارے قریب گئی۔ تم نے جو باتیں کیں، میں سن کر ششدر رہ گئی پھر سجاول نے وہ الفاظ بھی بتائے جو تم نے کچھ لمحے پہلے ادا کیے تھے اور مجھے تمہارے لہجے کی صداقت پہ یقین آ گیا۔ میں سجاول اور سانول خان کی مدد سے تمہیں اسپتال لے گئی۔"
یہ سب بتا کر وہ سسک سسک کر رونے لگیں۔ میری آنکھوں سے بھی ساون برس رہا تھا۔ اب ہم اکثر روتے ہیں۔ میں اور دادی ماں اب اکٹھے ہی رہتے ہیں۔ تقدیر نے مجھے عمر بھر کے لیے معذور کر دیا ہے۔ اب ہم دونوں کے پاس پچھتاوے اور کربِ زیاں کے سوا کچھ نہیں بچا ہے۔

ذرا سوچیں

جناب معراج رسول
السلام علیکم
کافی عرصے بعد ایک اور روداد کے ساتھ حاضر ہوا ہوں۔ اتفاق کی بات ہے کہ اس روداد کا ایک کردار میں خود بھی ہوں۔ ساجدہ اور کاشف دونوں کے والد میرے دوست تھے یہ واقعہ انہی دونوں کا ہے۔ گو کہ یہ واقعہ اخباروں میں کچھ اور طرح سے آیا ہے۔ میں نے صد فیصد صحیح واقعات ہی لکھے ہیں۔

جنید احمد
(کراچی)

بہت ہی دکھ بھری کہانی ہے۔اور اس کہانی کے ساتھ ایک سوالیہ نشان بھی ہے۔ یہ واقعہ بہت سے لوگوں کو سوچنے پر مجبور کر گیا ہے۔ میں ان دونوں کو جانتا تھا۔

لڑکی کا نام ساجدہ تھا اور لڑکے کا نام کاشف۔ دونوں ہی ہمارے محلے کے تھے۔ میں ان کے والدین کو بھی جانتا تھا۔

لڑکی کے باپ کا نام مختار تھا اور لڑکے کے باپ کا نام امتیاز۔ بظاہر دونوں بہت شریف، سیدھے سادے، کسی

زمانے میں دونوں ایک دوسرے کے دوست بھی ہوا کرتے تھے۔ بلکہ ہم تینوں ہی دوست تھے۔ میں، مختار اور امتیاز۔

ہم نے بہت وقت ایک ساتھ گزارا تھا۔ زندگی اس زمانے میں بہت سبک رفتار ہوا کرتی۔ دوستوں کے درمیان کوئی انا نہیں۔ کوئی تکبر نہیں۔ کوئی تکلف نہیں۔

پھر یہ ہوا کہ یہ سکون درہم برہم ہوگیا۔ یہ تبدیلی ایسی تھی جیسے پُرسکون جھیل کے پانی میں پتھر پھینک دیا جائے۔ ایک آواز، چھناکا اور اس کے ساتھ لہروں کا شور۔

ایسا ہی کچھ اس وقت ہوا جب زلیخا نام کی ایک لڑکی مختار اور امتیاز کے درمیان آ گئی۔ وہ بہت خوب صورت لڑکی تھی اور جتنی خوب صورت تھی اتنی ہی چالاک بھی تھی۔ میں تو خیر اس کے جال اور اس کی حرکتوں سے دور رہا تھا لیکن وہ دونوں اس میں دل چسپی لینے لگے تھے اور وہ دونوں کو بے وقوف بنائے جا رہی تھی۔

پتا نہیں اس قسم کے معاملات اچھے اچھوں کی آنکھوں پر پٹی کیوں باندھ دیتے ہیں۔ ان دونوں کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ دونوں سمجھدار، عقل مند، اس کے باوجود دونوں اس لڑکی کے چکر میں آکر ایک دوسرے کے دشمن بنتے چلے گئے۔

جی ہاں، گہری دوستی باقاعدہ دشمنی میں تبدیل ہوتی چلی جارہی تھی۔ میں نے یہ محسوس کرلیا تھا اور ان دونوں کو سمجھایا کرتا۔ ”خدا کے بندو تم کس چکر میں ہو۔ وہ صرف بے وقوف بنا رہی ہے اور کچھ بھی نہیں۔“

لیکن وہ بھوت ہی کیا جو اتنی آسانی سے اتر جائے۔ میں ان دونوں کی اس نفرت اس تلخی کی کہانی نہیں سناؤں گا کیونکہ اصل کہانی تو اس کے بہت بعد کی ہے۔

دونوں پہلے پہل تو ایک دوسرے سے بے زار ہوئے۔ پھر یہ بے زاری آہستہ آہستہ تلخیوں میں بدلنے لگی۔ تلخیاں بڑھ کر نفرتوں میں بدل گئیں اور نفرتیں دشمنی میں اس وقت تبدیل ہو گئیں جب دونوں نے ایک دوسرے پر باقاعدہ حملہ کر دیا تھا۔

اس کی ابتدا مختار نے کی تھی۔ وہ ویسے ہی غصے کا تیز تھا۔ اس نے پہلے امتیاز پر چاقو کے وار کیے۔ امتیاز مغرب کے بعد اپنے گھر سے باہر نکل رہا تھا۔ گلی میں اندھیرا تھا کہ مختار نے اس پر حملہ کر دیا۔ مختار پہلے ہی سے ایک کیبن کی آڑ میں چھپا ہوا تھا۔

امتیاز کو دو ہاتھ لگے تھے۔ اندھیرے کے باوجود امتیاز نے مختار کو پہچان لیا تھا۔ مختار تو اس کو زخمی کر کے فرار ہو گیا تھا۔ محلے والوں نے امتیاز کی چیخیں سن کر اس کی مدد کی تھی۔ اسے اسپتال پہنچایا گیا جہاں اس کے شانے میں کئی ٹانکے لگے۔

اس موقع پر پولیس والے امتیاز سے پوچھتے رہ گئے کہ کیا اسے کسی پر شک ہے یا اس نے حملہ آور کو دیکھا تھا لیکن امتیاز انکار میں جواب دیتا رہا۔

صرف مجھے اندازہ تھا کہ امتیاز غلط بیانی سے کام لے رہا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس پر حملہ کرنے والا کون ہے۔

مجھے یہ بھی اندازہ تھا کہ امتیاز کی یہ پردہ پوشی بلاوجہ نہیں ہے۔ اس نے اس کیس کو اپنے طور پر نمٹانے کا ارادہ کرلیا ہے۔ کیونکہ میں امتیاز کے تیور سے اچھی طرح واقف تھا۔ وہ بظاہر بھڑک اٹھنے والا نہیں تھا۔ بلکہ وہ غصہ اور نفرت کی آگ کو اپنے سینے میں پروان چڑھاتا رہتا تھا۔ اس کی پرورش کرتا تھا اور موقع پا کر اپنا بدلہ لے لیتا تھا۔

امتیاز کا بروقت علاج ہو گیا تھا۔ ویسے بھی اس کے زخم کچھ ایسے نہیں تھے کہ اس کی زندگی کا خطرہ ہوتا۔ میں نے ایک دن امتیاز سے پوچھا۔ ”یار! ایک بات بتا کیا تو نے واقعی حملہ کرنے والے کو نہیں دیکھا تھا؟“

”نہیں یار، میں نہیں دیکھ سکا۔“ اس نے جواب دیا۔

”میری طرف دیکھ کر بات کر۔“ میں نے کہا۔

”تیری ہی طرف دیکھ رہا ہوں۔“

”دیکھ امتیاز جو کچھ بھی تیرے دل میں ہے اس کو فراموش کردے، کوئی فائدہ نہیں ایسی باتوں کا۔“

”میرے بھائی میرے دل میں کچھ نہیں ہے۔“

پھر کئی دنوں کے بعد پتا چلا کہ کچھ لوگوں نے مختار پر حملہ کر کے اس کی ٹانگ توڑ دی تھی۔ میں سمجھ گیا تھا کہ یہ سب کیا تھا۔ مختار کی ٹانگ فریکچر ہو گئی تھی۔ بعد میں وہ بھی ٹھیک ہو گیا اور لطف کی بات یہ تھی کہ جس بدمعاش لڑکی کے لیے وہ دونوں ایک دوسرے کے دشمن ہو گئے تھے اس نے کسی اور سے شادی کر لی تھی۔

پھر برسوں گزر گئے۔ ان دونوں کی شادیاں ہو گئیں اولادیں ہوئیں۔ وہ بھی جوان ہو گئیں۔ خود میں بھی صاحب اولاد ہو گیا۔

لیکن ستم یہ ہوا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے دشمن ہی رہے۔ میں نے لاکھ کوشش کی کہ ان کے درمیان صلح ہو جائے۔ دونوں پھر ایک دوسرے کے دوست بن جائیں

لیکن ایسا نہیں ہوسکا۔ دونوں کسی طرح بھی ایک دوسرے سے تعلق استوار کرنے کے لیے راضی نہیں ہوئے۔

یہ معاملہ انا کا ہو گیا تھا اور انا بھی ایسی جو ایک دوسرے کے خون کی پیاسی ہو رہی تھی۔ جب کہ میں ان دونوں کے درمیان شٹل کاک بنا ہوا تھا۔

میری دوستی دونوں سے تھی۔ میں دونوں کے گھر جایا کرتا۔ اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ۔ خود وہ دونوں بھی اپنی بیویوں اور بچوں کے ساتھ میرے پاس آیا کرتے تھے۔ بہت کوشش کی کہ عید بقرعید میں تو ایک دوسرے کے ساتھ ہو جائیں لیکن ایسا ممکن ہی نہیں ہوسکا۔

مختار کے تین بچے تھے۔ بڑا بیٹا تاجدار انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ اس سے چھوٹی بہت ہی پیاری سی بچی تھی شہنیلا جو فرسٹ ایئر میں تھی۔ اس کے بعد ایک اور بیٹا تھا جو اسکول جایا کرتا۔ امتیاز کے چار بیٹے تھے۔ ان کے یہاں بیٹی نہیں تھی جس کی اسے خواہش رہا کرتی۔

اس کا ایک بیٹا جنید کالج میں تھا۔ جب کہ اس سے چھوٹے اسکول جایا کرتے تھے۔ یہ تھا ان دونوں کے گھر کا حال۔

دونوں کی اولادیں بہت نیک اور سعادت مند تھیں۔ خاص طور پر مختار کی بیٹی شہنیلا مجھے بہت پسند تھی۔ میں اسے اپنی بہو بنانا چاہتا تھا۔ انتہائی حسین، نکھرا اور فرمانبردار قسم کی بچی تھی۔ وہ فرسٹ ایئر میں پڑھ رہی تھی۔

ایک دن میں کھانا کھانے کے لیے ایک ریسٹورنٹ میں داخل ہو گیا۔ میں عام طور پر اس قسم کی حرکتوں سے پرہیز ہی کیا کرتا ہوں۔ لیکن اس دوپہر کو بھوک بھی بہت لگ رہی تھی اور ایک صاف ستھرا ہوٹل بھی دکھائی دے گیا تھا۔ اس لیے میں اس میں داخل ہو گیا اور داخل ہوتے ہی میں نے ان دونوں کو ایک میز پر دیکھ لیا۔ دونوں سے مراد مختار کی بیٹی شہنیلا اور امتیاز کا بیٹا جنید۔

میں ایک لمحے کے لیے بھونچکا رہ گیا تھا۔ وہ دونوں اپنے آپ میں مگن تھے۔ اس لیے انہوں نے میری طرف دھیان نہیں دیا تھا۔

میں نے اس ہوٹل میں بیٹھنا مناسب نہیں سمجھا اور باہر آ گیا۔ کسی وقت بھی وہ مجھے دیکھ سکتے تھے اور خوامخواہ شرمندہ ہو جاتے۔

وہ دونوں ایک ساتھ بیٹھے ہوئے بہت بھلے لگ رہے تھے اور میں ان دونوں کو جانتا تھا۔ ان دونوں کے باپ کو جانتا تھا۔ امتیاز اور مختار لیکن شاید ان بے چاروں کو یہ نہیں معلوم تھا کہ ان کے باپ ایک دوسرے کے لیے کیا ہیں لیکن بلا کی دشمنی دونوں کے درمیان ہے۔

خدا کے کھیل بھی نیارے ہوا کرتے ہیں۔ بہت ممکن تھا کہ خدا ان دونوں بچوں ہی کے ذریعے امتیاز اور مختار کو ملوانا چاہتا ہے۔

ایسی تو ہزار کہانیاں ہیں۔ ہزاروں واقعات تھے۔ کٹر دشمنیاں بچوں کے آگے سرنڈر کر جاتی تھیں۔ بچوں کی محبتیں اس آگ کو سرد کر دیا کرتی ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ دونوں کے درمیان ایسی ہی محبت ہو جو پتھروں کو موم کر دینے کی صلاحیت رکھتی ہو۔

اس کے بعد وہ دونوں مجھے ایک شام ایک پارک میں دکھائی دے گئے۔ ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے روش پر ٹہلتے ہوئے۔ اس وقت ان دونوں کے چہروں پر خوشیوں کے بے شمار رنگ اترے ہوئے تھے۔ دور ہی سے نظر آ رہا تھا کہ ان کی آنکھوں میں پیار کی شمعیں روشن ہیں۔ دونوں ہنس رہے تھے۔ مسکرا رہے تھے اور ان کے ساتھ جیسے پورا ماحول

منوڑہ

محمد بن قاسم کے ساتھ مجاہدین نے جب راجا داہر کے ظلم واستبداد کو ختم کرنے کے لیے صحرائے سندھ کو اپنے گھوڑوں کی ٹاپوں سے روندا تو اس وقت کراچی کے قریب ایک جزیرہ، یہ تقریباً ایک میل لمبا اور سطح بحر سے ایک سو فٹ اونچا ہے۔ یہ مچھیروں سے آباد تھا۔ سمندر کی پہنائیوں میں رات کے وقت یہ بستی روشنی سے جگمگا اٹھتی تھی چنانچہ عربوں نے اسے النورہ کا نام دیا جو بگڑتے بگڑتے منورہ بن گیا۔ 1887ء میں جب ساحل کراچی کے منتظم محکمے کراچی پورٹ ٹرسٹ کی بنیاد ڈالی گئی تو جہازوں کو روشنی دکھانے کے لیے لائٹ ہاؤس تعمیر کیا گیا۔ اس کی تعمیر کا کام 1909ء میں مکمل ہوا۔ اس کی بلندی 150 فٹ ہے اس کی روشنی 70 میل تک جہازوں کی رہنمائی کرتی ہے۔ قبل ازیں پاکستان نیوی کے صدر دفاتر یہیں تھے لیکن بعد ازاں اسلام آباد منتقل کر دیئے گئے تو اس کی حیثیت علاقائی دفتر کی سی رہ گئی۔ تالپور حکمرانوں نے یہاں ایک قلعہ بھی تعمیر کرایا تھا۔ پورٹ ٹرسٹ نے یہاں ایک ورکشاپ بھی قائم کی ہے۔

مرسلہ: احمد علی زیدی۔ سرگودھا

رنگ بدلتی فلمی دنیا

بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے۔ یہ تو آپ نے سنا ہوگا مگر اس حقیقت سے آپ انکاری نہیں ہوں گے کہ زمین بھی اپنے رنگ روپ بدلنے میں آسمان سے پیچھے نہیں۔

برصغیر میں سب سے پہلی فلم جو بنی وہ راجا ہریش چندر تھی۔ یہ پہلی خاموش فلم تھی جو 1913ء میں بنی تھی۔ جسے دادا صاحب پھالکے نے بنائی تھی۔ انہیں اس فلم کے بنانے میں جو دشواریاں پیش آئی تھیں ان میں سب نمایاں فی میل کیریکٹرز کے لیے عورتوں کا حصول تھا۔ ان دنوں عورتوں کا فلم میں کام کرنا انتہائی گری ہوئی بات سمجھی جاتی تھی۔ ہر طبقہ اور ہر مذہب کے لوگوں کا یہی خیال تھا۔ لہٰذا عورتوں کے رول بھی دادا صاحب نے مردوں سے کروائے۔ اس فلم میں بس ایک لڑکی نے کام کیا تھا جس کا نام منداکنی تھا۔ اس کی عمر سات سال تھی اور وہ دادا صاحب پھالکے کی بیٹی تھی۔ بعد میں منداکنی ہی خاموش فلموں کی پہلی ہیروئن بنی۔

ذرا سوچیے وہ دور اور آج کا دور۔ فلم ہی نہیں، شوبز کے ہر شعبے میں عورتوں کی بھرمار، ہر طبقہ، ہر مذہب، ہر اسٹیٹس کے لوگوں کی یہی خواہش کہ ان کے گھر کی لڑکیاں اور خواتین ہر طرح کی ثقافتی سرگرمیوں میں پیش پیش رہیں۔ فلموں میں کام کرنے کے لیے تو صاحب حیثیت اور معزز اور پڑھے لکھے افراد کی لڑکیاں زیادہ سے زیادہ کوشاں ہوتی ہیں۔ اب تو انہیں فلم انڈسٹری میں قدم رکھنے کے لیے فلم اکیڈمیز کی تعلیم بھی حاصل کرنی پڑتی ہے۔

آپ کی دلچسپی کے لیے ایک اور مثال۔ دادا صاحب پھالکے نے اپنی بیٹی منداکنی کو فلمی اداکارہ بنا کر عوام کو جس جرأت

مسکرا رہا تھا۔ ہنس رہا تھا۔

میری تو یہ خواہش تھی کہ میں شہنیلا کو اپنی بہو بناؤں گا لیکن اب دونوں کو اس ترنگ میں دیکھ کر میں دعا کر رہا تھا کہ خدا ان دونوں کی محبت کو پروان چڑھا دے۔

ایک بار پھر وہ دونوں مل گئے اور اس بار کچھ ایسا ہوا کہ نہ تو وہ مجھ سے چھپ سکی اور نہ ہی میں ان سے آنکھ بچا سکا۔ وہ دونوں اچانک ہی میرے سامنے آگئے تھے۔

دونوں مجھے دیکھ کر بوکھلا گئے تھے۔ خاص طور پر شہنیلا، وہ بری طرح نروس ہوگئی تھی۔ ”انکل یہ...... یہ میرے کلاس فیلو ہیں۔“ اس نے کانپتی ہوئی آواز میں بتایا۔ ”ابھی اچانک راستے میں مل گئے تھے۔“

”میں سب جانتا ہوں۔“ پھر میں نے جنید کی طرف دیکھا۔ ”جنید تم دونوں میرے ساتھ آؤ۔“

”انکل کیا آپ جنید کو جانتے ہیں؟“

”ہاں جس طرح میں تمہیں جانتا ہوں اس کا باپ بھی میرا دوست ہے۔“

اس دوران جنید شرمندہ ہو کر یا احتراماً سر جھکائے کھڑا رہا تھا۔ مجھے ان دونوں پر واقعی پیار اور ترس آرہا تھا۔

میں ان دونوں کو اپنے ساتھ لے آیا تھا۔

”ہاں اب بتاؤ اور مجھ سے گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ مختار اور امتیاز دونوں میرے دوست ہیں۔ کسی وجہ سے دونوں کے درمیان ناراضی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ تمہاری محبت اس ناراضی کو ختم کردے۔“

اور اس وقت وہ دونوں اپنی اپنی جگہ سے اٹھے اور میرے گھٹنوں کے پاس آکر بیٹھ گئے۔ بالکل بچوں کی طرح جس طرح بچے ضد کیا کرتے ہیں۔

میں نے پیار سے ان کے سروں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ”تم دونوں پریشان نہ ہو۔ تم میرے اپنے بچے ہو۔ شاید قدرت بھی یہی چاہتی ہے۔ اس لیے تم دونوں کو ایک ہی کالج میں بھیج دیا تاکہ تم ایک دوسرے کو پسند کرسکو۔ میں پوری کوشش کروں گا کہ تمہاری محبت کی کہانی کو انجام تک پہنچا دوں۔“

دونوں نے میرے ہاتھ تھام لیے۔ اس وقت شہنیلا کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

لیکن نتیجہ میری اُمیدوں کے برعکس ہوا تھا۔ سب سے پہلے میں مختار سے ملا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ ”مختار تو میری ایک بات مانے گا۔“

کی دعوت دی تھی اس کا نتیجہ خاطر خواہ نکلا اور آہستہ آہستہ خواتین فلموں میں اداکاری کرنے لگیں۔
میں جو واقعہ بتانے جا رہی ہوں یہ اس دور کی بات ہے جب ہیروئن کو پانچ روپے روزانہ معاوضہ دیا جاتا تھا۔ اس زمانے کی ایک ہیروئن تھی مس سندر بالا۔ اس اداکارہ کو مدراس میں بنائی جانے والی ایک خاموش فلم میں کام کرنے کا معاوضہ ایک لاکھ روپے ادا کیے گئے۔ اس زمانے میں ایک لاکھ کی قدر و قیمت کیا ہوگی ذرا سوچیے مگر سندر بالا کو اتنی خطیر رقم کیوں دی گئی؟ اس لیے اسے یہ معاوضہ دیا گیا تھا کہ تقریباً آدھی فلم میں اسے نیم برہنہ دکھایا گیا تھا۔ فلم کی نمائش کے بعد اس اداکارہ کے خلاف زبردست عوامی احتجاج ہوا۔ اس کا سماجی بائیکاٹ کر دیا گیا جس کے نتیجے میں مس سندر بالا کو فلموں سے کنارہ کشی کرنے کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہ تھا۔
آپ اس واقعے کو پیش نظر رکھ کر آج کی فلموں اور ان میں کام کرنے والی اداکاراؤں کا جائزہ لیں۔ وقت کتنا بدل گیا ہے۔ حالات کتنے تبدیل ہو گئے ہیں۔ بالی ووڈ ہو یا بالی ووڈ یا لالی ووڈ۔ کہیں کی فلم دیکھ لیجیے۔ عورت کے جسم کی نمائش سے عاری نہیں ملے گی۔ بالی ووڈ کی فلموں کی خصوصیت گلیمر ہے اور گلیمر سے مراد عریانی کے علاوہ کچھ اور نہیں۔ بے چاری سندر بالا کو تو نیم برہانہ دکھانے کی سزا دی گئی تھی مگر بالی ووڈ کی فلموں میں تو اداکاراؤں کو مکمل برہنہ دکھایا جاتا ہے۔ چڈی اور بانگیہ کے نام پر دو دھجیوں کے تکلف کا احسان کیا جاتا ہے جس فلم میں دیکھنے اور دکھانے کا جتنا مصالحہ ہوتا ہے وہ اتنی ہی زیادہ کامیابی حاصل کرتی ہے۔ جن فلموں میں دیکھنے اور دکھانے کی چیزیں نہیں ہوتیں انہیں آرٹ فلم کہا جاتا ہے اور وہ کروڑوں کا بزنس نہیں کرتیں۔

مرسلہ: عائشہ انور۔ کراچی

''یار میں نے کبھی تیری بات سے انکار کیا ہے۔''
''مجھے شہنیلا بہت پسند ہے۔'' میں نے کہا۔
''میں سمجھ گیا۔'' مختار ہنس پڑا۔ ''وہ میری نہیں تیری بھی بیٹی ہے۔''
''تو پھر میں چاہتا ہوں کہ اس کی شادی جنید سے ہو جائے۔'' میں نے کہا۔
''کون جنید۔'' مختار نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ''تیرے بیٹے کا نام تو جنید نہیں ہے؟''
''میں امتیاز کے بیٹے جنید کی بات کر رہا ہوں۔'' میں نے بتایا۔ ''وہ بہت اچھا ہے۔ بہت مہذب......''
''بس بس۔'' مختار نے میری بات کاٹ دی۔ ''اب آگے کچھ مت کہنا۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے۔''
''پاگل ہو گیا ہے تو۔ برسوں کی دشمنی دل میں لیے بیٹھا ہے۔ ختم کر اس قصے کو اب نئی نسل کی طرف دیکھ۔''
''میں گلا گھونٹ کر مار دوں گا اپنی اولاد کا لیکن یہ رشتہ نہیں کروں گا۔''
میں جتنا سمجھانے کی کوشش کرتا وہ اتنا ہی بھڑکتا چلا جاتا۔ تنگ آکر میں نے امتیاز کی طرف جانے کا فیصلہ کر لیا۔
اگر امتیاز مان جاتا تو پھر چاہے مختار مانے یا نہ مانے میں شہنیلا کا سرپرست بن کر اس کی شادی کروا دیتا۔ بعد میں چاہے جو بھی ہوتا رہے۔
لیکن امتیاز کا بھی یہی ردعمل تھا۔ وہ کسی طور اس رشتے کے لیے تیار ہی نہیں تھا۔ میں دونوں پر لعنت بھیج کر واپس آ گیا۔
میں نے ان دونوں سے یہ وعدہ کیا تھا کہ میں ان کی محبت انہیں دلا کر رہوں گا لیکن اس وعدے کو پورا کرنے میں بری طرح ناکام ہو رہا تھا۔
عجیب پاگل لوگ تھے۔ محبت کی راہ میں رکاوٹ بننے والے مجھے کبھی اچھے نہیں لگے۔
میں نے ان دونوں سے کچھ نہیں چھپایا۔ صاف صاف بتا دیا کہ دونوں کے باپ پاگل ہو رہے ہیں اور کسی طرح اس رشتے کے لیے تیار نہیں ہیں۔
پھر میں نے دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔ ''تم دونوں پریشان مت ہو۔ میں تم دونوں کو تمہاری منزل پر پہنچا کر رہوں گا۔''
''انکل! مجھے یقین ہے کہ ہم اپنی منزل کو پا کر ہی

رہیں گے۔" جنید نے کہا۔ "ہم نے قسم کھا رکھی ہے کہ زندہ ہیں تو ایک ساتھ۔ مریں گے تو ایک ساتھ۔"

"بس یہ جذبہ برقرار رہے نا تو منزل مل ہی جاتی ہے۔ دیکھتا ہوں یہ دونوں کب تک راستے کی رکاوٹ بنتے ہیں۔"

پھر کئی دن گزر گئے۔ میں مختار اور امتیاز سے نہیں ملا۔ ایک دن مختار کا فون آگیا۔ "کیا بات ہے یار، تو منہ چھپا... کر بیٹھ گیا ہے۔ فون کا جواب بھی نہیں دیتا۔"

"اس لیے کہ تم نے میری بات نہیں رکھی۔" میں نے کہا۔

"اس بات کے علاوہ کوئی اور بات کر۔ ویسے تیرے لیے جان بھی حاضر ہے۔"

"رہنے دے ایسی باتیں۔ جو شخص اپنی بیٹی کو خوش نہ دیکھ سکے وہ کسی اور کو کیا دیکھ سکتا ہے۔"

"بس یار! اب اس موضوع پر بات مت کرو۔ تم کو ملنا ہو تو ملو ورنہ رہنے دو۔"

امتیاز کا بھی فون آیا۔ اس کو بھی یہی شکوہ تھا کہ میں نے ملنا کیوں چھوڑ دیا ہے اور جب میں نے جنید اور شہنیلا کے حوالے سے بات کی تو وہ بھی اکھڑ گیا۔ "نہیں یار، یہ تو نہیں ہوگا۔ اس کے علاوہ جو چاہے وہ کہہ لو۔"

"تو پھر میری طرف سے تم دونوں جہنم میں جاؤ۔" وہ ہیلو ہیلو کہتا رہا لیکن میں نے فون بند کر دیا تھا۔

اب میرے پاس وہی راستہ تھا۔ یعنی ان دونوں کا سرپرست بن کر کسی طرح بھی ہو۔ دونوں کی شادی کرا دوں۔ بعد میں چاہے کچھ بھی ہوتا رہے۔

میں نے جنید کو فون کیا لیکن اس کا موبائل بند مل رہا تھا۔ میں اس سے یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ وہ کل صبح شہنیلا کو لے کر میرے پاس آجائے۔ پھر ہم وہاں سے کورٹ چلے جاتے لیکن اس کا موبائل مسلسل بند مل رہا تھا۔

شہنیلا کو فون کیا۔ اس طرف بھی یہی صورتِ حال تھی۔ بہر حال یہ کام تو کرنا ہی تھا۔ ایک دن اور سہی۔

دوسری صبح ناشتے کے دوران میں نے جب ٹی وی کھولا تو ایک خبر سامنے آئی۔

ایک کالج سے ایک لڑکا اور ایک لڑکی کی لاشیں ملی ہیں۔

ابتدائی رپورٹ کے مطابق لڑکے نے پہلے لڑکی کو گولی مار کر ختم کیا پھر اپنے آپ کو گولی ماری تھی۔

ان دونوں کی لاشیں کالج کی کینٹین سے ملی تھیں۔ اس خبر کو سن کر میں دھک سے رہ گیا تھا۔ خدا خیر کرے۔ کون ہو سکتے تھے وہ دونوں۔

میں سکتے کے عالم میں ٹی وی کے سامنے ہی بیٹھا رہا تھا۔ ابھی تک ان دونوں کے نام سامنے نہیں آئے تھے۔

لیکن دل میں ایک کھٹکا سا ضرور تھا۔ جیسے کوئی پکار پکار کر بتا رہا تھا کہ یہ وہی دونوں ہیں۔ دو محبت کرنے والے۔ انہوں نے اپنی منزل پالی تھی۔ انہوں نے ہمیں بتایا تھا کہ وہ ایک دوسرے کے بغیر رہ نہیں سکتے تھے۔

میری نگاہیں ٹی وی اسکرین پر تھیں۔ سلائیڈ پر دوسری خبریں آرہی تھیں۔ پھر وہ خبر بھی آگئی جس کا اندیشہ تھا۔ ان دونوں لاشوں کو شناخت کر لیا گیا تھا۔ وہ وہی دونوں تھے۔ شہنیلا اور جنید، جنید شہنیلا نام اسکرین پر آرہے تھے اور میں سر تھامے بیٹھا تھا۔ ذہن میں صرف سائیں سائیں ہو رہی تھی۔ کوئی ردِعمل نہیں۔ کوئی کیفیت نہیں۔ ایک سکتے کی سی کیفیت تھی۔ میرے خدا ان دونوں پر یہ کیسا ظلم ہوا تھا۔

بہت دیر، بہت دیر کے بعد جب مجھے ہوش آیا تو مختار کے گھر پہنچ گیا۔ وہاں ایک ہنگامہ برپا تھا۔

شہنیلا کی لاش پوسٹ مارٹم کے بعد گھر والوں کے حوالے کر دی گئی تھی۔ مختار کا بہت برا حال ہو رہا تھا۔ شہنیلا اس کی چہیتی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ دوڑ کر مجھ سے لپٹ کر بلک بلک کر رونے لگا۔ میں نے اپنے آنسوؤں کو ضبط کرتے ہوئے کہا۔ "یار! اب اس میں رونے والی کون سی بات ہے۔ تیری تو فتح ہوئی ہے نا۔ تیری ضد کی فتح۔ تیری انا کی فتح، تیری دشمنی کی فتح اور اس جنگ میں اپنوں کو قربانی تو دینی ہی پڑتی ہے۔ جو ہوا اسے بھول جا اور بس یہ سوچ کر خوش ہو جا کہ تو نے اپنے دشمن کے بیٹے کو کامیاب نہیں ہونے دیا۔ اس کی شادی اپنی بیٹی سے نہیں ہونے دی۔ یہ بہت بڑی فتح ہے۔ مبارک ہو تجھ کو۔" وہ تڑپ تڑپ کر روتا رہا اور میں اسے چھوڑ کر چلا آیا۔ میرا دل ہی بیٹھ چکا تھا۔ میں امتیاز کی طرف بھی نہیں گیا اور آج تک ان دونوں کی طرف نہیں گیا ہوں۔

ایسے انا پرستوں سے نفرت سی ہو گئی ہے جو برسوں کی ناراضی اور تلخی کی پرورش کرتے رہتے ہیں۔ میں لڑکا اور لڑکی کی اس قسم کی محبت اور شادی وغیرہ کے حق میں نہیں ہوں لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ جب اس قسم کی کوئی بات ہو جائے تو والدین کو ہٹ دھرمی سے کام نہیں لینا چاہیے۔

دوراہا

جناب ایڈیٹر سرگزشت

السلام علیکم

اُمید ہے میری ارسال کردہ سرگزشت آپ کے معیار پر پوری اترے گی۔ یہ سرگزشت حسن علی کی ہے۔ ثمینہ اور ربیعہ صدیقی کی ہے۔ اس سرگزشت میں عورت کا پندار ہے۔ مرد کی جھوٹی انا ہے۔ حاکمیت کا چہرہ ہے۔ مرد اور عورت گاڑی کے دو پہیے ہوتے ہیں پھر بھی مرد حاکمیت کے زعم میں گاڑی تباہ کرلیتا ہے۔

زویا اعجاز

(لاہور)

صبح سے گھر میں ایک نامانوس چہل پہل تھی۔ ٹیلیفون اور دروازے کی گھنٹیوں میں گویا مقابلہ جاری تھا۔ اہلِ خانہ چمکتے چہروں اور مسکراتے لبوں کے ساتھ بے حد پُرجوش تھے لیکن میں اس ہنگامے میں خاموشی کا ہمرکاب بنا صحن کے انتہائی کونے میں کرسی پر نیم دراز سب کی سرگرمیوں کو بے تاثر نظروں سے تک رہا تھا۔ جانے کیوں آج مجھے اپنے ذہن کی کوئی رو منقطع محسوس ہو رہی تھی۔ برسوں کے مانوس چہرے اجنبی دکھائی دے رہے تھے۔ چند ثانیوں بعد مجھے اپنے عقب

میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا لیکن میں نے پلٹ کر دیکھنے کی زحمت گوارا نہ کی۔ تبھی ایک شناسا سا آواز سماعت میں پڑی۔ ''مبارک ہو بھائی جان!!''

میں نے گردن ترچھی کر کے جذبات سے عاری لہجے میں جواب دیا۔ ''ہوں! خیر مبارک!''

''بھابی کہاں ہیں؟ انہیں بھی تو مبارک دوں۔'' اسی شناسا آواز نے مجھے مخاطب کیا۔

''مجھے نہیں معلوم کہاں ہے۔ ہوگی یہیں کہیں کسی رشتے دار کے پاس کھڑی، یا فون پہ چپکی۔ خود ہی جا کر دیکھ لو۔'' میں جھٹکے سے اٹھ کر اندر کمرے کی طرف بڑھ گیا اور مجھے علم تھا کہ میری بہن تاسف سے کھڑی میرے اس نامعقول رویے کی توجیح تلاش کرتی رہ گئی ہوگی۔

☆☆☆

''جی آپی!! کوئی بات نہیں۔ آپ نے فون پہ یاد رکھا یہی بہت ہے میرے لیے۔'' ثمینہ اس وقت موبائل سر اور کندھے کے درمیان دبائے چائے کپوں میں انڈیل رہی تھی۔ الوداعی کلمات کہتے ہوئے اس نے فون بند کر کے سلیب پر رکھا تو نظر کچن کے دروازے پر کھڑی نند منزہ پر پڑی۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرائی اور خوشدلی سے بولی۔ ''ارے! یہاں کیوں کھڑی ہو؟ آؤ اندر چل کر بیٹھتے ہیں آرام سے۔''

منزہ اس کی چمکتی آنکھوں میں دیکھ کر بولی۔ ''بہت مبارک ہو بھابی آپ کو۔ اللہ نے بڑا اجر دیا ہے آپ کو۔''

''خیر مبارک منزہ! تمہیں بھی بھتیجے کا میڈیکل یونیورسٹی میں داخلہ بہت مبارک ہو۔'' ثمینہ کے لہجے کی کھنک مجھے بخوبی محسوس ہو رہی تھی۔

☆☆☆

کمرے میں اس وقت خاموشی اور سناٹے کی پرشور موجودگی میرے اعصاب کو بوجھل کر رہی تھی۔ دل میں ایک کانٹا سا گڑا تھا جس کی چبھن مجھے بے چین کر رہی تھی۔ اضطراب کی لہریں رگ و پے میں حشر برپا کیے ہوئے تھیں۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ اپنے سامنے موجود ہر شے کو تہس نہس کر دوں۔ عجیب سی گھٹن تھی جس نے دل و دماغ کا احاطہ کر کے بیگانگی اور بیزاری طاری کر رکھی تھی۔ تبھی فون کی گھنٹی نے میری توجہ اپنی جانب مبذول کروالی لیکن اسکرین پر جگمگانے والے نام اور نمبر کو دیکھ کر میری کوفت دو چند ہو گئی۔ میں اس کال کو سننے کے موڈ میں بالکل بھی نہ تھا لیکن مجھے علم تھا کہ دوسری جانب کوئی ''لاثانی ڈھیٹ'' موجود ہے جس کے دماغ میں کلبلانے والا کیڑا اب یونہی اسے متواتر فون کرنے پر اکساتا رہے گا۔ ایک بوجھل سانس لے کر میں نے کال ریسیو کر لی اور متوقع فقرات نے میرا حلق مزید کڑوا کر دیا۔ ''بیٹے کی کامیابی کے جشن سے فرصت مل جائے تو ہمیں بھی یاد کر لیجیے گا۔''

''فکر نہ کرو۔ تم خود کو کبھی فراموش نہیں ہونے دو گی۔'' میں نے بیزاری سے اپنی دوسری بیوی ربیعہ سے کہہ کر فون بند کر دیا۔ جی ہاں! وہ میری بیوی تھی اور پہلی شادی کی طرح میرا عقد ثانی بھی پسندیدگی کا نتیجہ تھا۔ آپ شاید میرے دماغی توازن پر تشکیک کا اظہار کریں گے لیکن میں جو کچھ کہوں گا سچ کہوں گا۔ سچ کے سوا کچھ بھی نہ کہوں گا۔

☆☆☆

میرا نام حسن علی ہے۔ ہمارا خاندان پنجاب کے ایک مضافاتی شہر میں کئی دہائیوں سے مقیم اور ایک تناور شجر کی طرح اپنی جڑوں سے پیوست رہا ہے۔ میرے دادا ریاست علی بھاری بھرکم، سرخ و سپید رنگت اور انتہائی بارعب شخصیت کے حامل تھے۔ وہ حسنِ یوسف کا عکس تھے۔ اس خصوصی ''انعام'' کی وہ بالکل بے توقیری نہیں کرتے تھے۔ نوجوانی میں لاتعداد رنگین داستانیں رقم کیں لیکن شادی کا قرعہ فال ان کی ماموں زاد رشیدہ بیگم کے نام نکلا۔ جب تک ان کے والد حیات رہے، داستانِ محبت محض شوقین مزاجی تک محدود رہیں۔ والد کی زندگی کا سورج غروب ہوتے ہی ان کی زندگی میں ایک نیا آفتاب طلوع ہوا۔ آفتابہ خانم نامی یہ خاتون ان کی دیرینہ 'شناسا' تھیں جنہیں بڑے چاؤ سے وہ شریکِ حیات بنا کر گھر میں لے آئے۔ دادی جان نے سمجھداری کا ثبوت دیتے ہوئے کسی معزول ملکہ کی مانند اپنا اقتدار ان کے حوالے کر دیا اور خود مصلیٰ نشین ہوگئیں۔ مگر وہ بات الگ اس شادی کا خمار بھی چار دن کی چاندنی کے مصداق بعدازاں اندھیری رات میں ڈھل گیا۔

دادا جی ایک 'روشن خیال' انسان تھے لہٰذا اپنی اولاد کے ذرا سا قد نکالتے ہی انہوں نے واضح الفاظ میں کئی نادر پند و نصائح ان کے گوش گذار کیے۔ ''میرے چن پترو!! عورت ذات صرف اور صرف ہماری سیوا کے لیے پیدا کی گئی ہے۔ اس کائنات میں نوع انسانی کی تخلیق بابا آدمؑ سے ہوئی تھی جن کے لیے اماں حواؑ کو بطور رفیق زندگی عطا کی گئی۔ تو عورت کی پیدائش کا مقصد ہی مرد کی خدمت گذاری ہے۔ بے

چوں چرا خدمت گزاری۔"

ارے!!! آپ چونکیے مت۔ دادا جی کے عقائد و نظریات ان کی ذاتی پسند ناپسند کی کسوٹی میں ڈھل کر پختہ اور ناقابلِ ترمیم بن چکے تھے۔ اسی روشن خیالی اور نظریات کے سائے میں میرے والد اور چچا پروان چڑھے۔

☆☆☆

میرے والد صداقت علی انتہائی 'ہونہار' سپوت تھے۔ انہوں نے اپنی آبائی تعلیمات کو مکمل سنجیدگی اور لگن سے اپنا کر زندگی کا لائحہ عمل تشکیل دیا۔ ان کی شادی بھی خاندان ہی میں طے پائی۔ ہمارے خاندان کی خواتین میں 'صبر و شکر' کا تناسب دیگر ہم جنسوں سے زیادہ تھا۔ شوہر کو عملی طور پر مجازی خدا کا رتبہ حاصل تھا۔ ابا جی نے بھی خاندانی روایات کی مکمل پاسداری کرتے ہوئے گھریلو خواتین کو مکمل اپنے دباؤ میں رکھا۔ میں ان کا اکلوتا فرزند تھا اور میری ایک ہی بہن تھی۔ بچپن ہی سے میں نے ابا جی اور چچاؤں کی آمد پر گھر میں کرفیو آرڈر کا سا سماں دیکھا تھا۔ ان کی پیشانیاں بے شکن رکھنے کے لیے بھی خواتین کسی پھرکی کی مانند ان کے احکامات بجا لاتی تھیں۔ اکلوتا ہونے کے باعث میری اہمیت بھی مسلمہ تھی۔ ابا جی نے میری 'خصوصی تربیت' میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ وہ ہمیشہ ایک ہی بات دہرایا کرتے تھے۔ "حسن پتر!! تم میرے شیر جوان ہو۔ مرد کبھی جھکتا نہیں ہے۔ پتا ہے کیوں؟"

میں لاعلمی سے انہیں سوالیہ نظروں سے تکتا رہتا تو وہ شفقت سے میرا سر تھپک کر کہتے۔ "ہمارا مذہب کہتا ہے کہ مرد کا درجہ بلند ہے، عورت پر حاکم ہے۔ لہٰذا حکمران جھکتے ہیں نہ ٹوٹتے ہیں بلکہ اپنی رعایا کو مطیع و فرمانبردار بناتے ہیں۔"

میں جوابی طور پر سنجیدگی سے سر ہلا دیتا۔ آٹھ سال کی عمر تک پہنچا تو ابا جی نے اپنی سلطنت کا دائرہ کار وسیع کرنے کی غرض سے دوسری شادی کر لی۔ اس موقع پر ازل سے خاموش میری والدہ نے کافی لے دے کی۔

"آپ کی کون سی ایسی ضرورت تھی جو میں پوری نہیں کر رہی تھی میاں جی! بلا جواز شادی کرنے کی کیا منطق ہے بھلا؟"

"کس نے کہا بلا جواز کی ہے میں نے شادی" ابا جی دھاڑ کر بولے۔ "چار شادیوں کا مجاز ہوں۔ شریعت کا حکم بجا لایا ہوں میں اگر تجھے کوئی مسئلہ ہے تو ابھی اسی وقت نکل جاؤ میرے گھر سے۔"

ان الفاظ نے اماں کی زبان پر قفل لگا دیا اور وہ آنکھوں میں آنسو لیے اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ میرے دونوں چچاؤں نے بھی اپنی روایات کی پاسداری کی لہٰذا عوام کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا جس سے گھر کی کشادگی بھی اچھی خاصی متاثر ہوئی۔ باہمی رضامندی کے تحت کاروبار اور گھر کے حصے بخرے کرنے کے بعد سب چین کی بانسری بجانے لگے۔ میرا باقی ماندہ بچپن ابا جی کے زیر سایہ "رموزِ حکمرانی" سیکھتے ہوئے گزر گیا۔ میں ان کا اکلوتا جانشین تھا۔ میری سوتیلی والدہ کے ہاں صرف ایک ہی بیٹی کی ولادت ہوئی تھی۔

نوجوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی میں ایک "خودمختار حکمران" بن چکا تھا اقتدار کا نشہ سر چڑھ کر بولتا تھا اس ضمن میں ابا جی کا مکمل تعاون میرے ہمراہ تھا۔ کالج میں دریافت کا ایک نیا جہان اپنی بانہیں وا کیے میرا منتظر تھا جہاں میں نے اپنی قوت تسخیر سے فتوحات کے خوب جھنڈے گاڑے۔

میں حسن علی تھا۔ ایک پیدائشی فاتح۔ تو بھلا کیونکر تسخیر نہ کرتا؟

☆☆☆

کمرے کا دروازہ کھلنے کی آہٹ نے میری توجہ یکدم اپنی جانب مبذول کروالی۔ مانوس قدموں کی چاپ نے ذہنی خلفشار مزید بڑھا دیا۔ ترچھی نظر سے دیکھا تو ثمینہ انتہائی مگن انداز میں الماری کھولے کپڑے سمیٹتی نظر آئی۔ کچھ دیر تو میں اس کی پشت پر نظریں جمائے اسے گھورتا رہا۔ جب ضبط کا یارا نہ رہا تو کہا۔ "ایک تو کریلا اوپر سے نیم چڑھا۔ مزاج تو پہلے ہی نہ ملتے تھے تمہارے۔ اب بیٹے کی کامیابی کے بعد تو تیور مزید بدل جائیں گے۔"

"کرم ہے ذاتِ باری تعالیٰ کا جس نے یہ خوشی دکھائی۔ ورنہ میری کیا بساط تھی بھلا؟" وہ اپنے مخصوص ٹھنڈے لہجے میں بولی۔ اس کا یہی انداز تو مجھے ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ لیکن سچ تو یہ تھا کہ اسی بے نیاز رویئے اور ٹھنڈے مزاج نے مجھے اس کی جانب مائل کیا تھا۔

حیران مت ہوں۔ میں نے کہا ناں میں سچ کے سوا کچھ بھی نہ کہوں گا۔

☆☆☆

کالج کا بےفکرا اور خوش باش دور ختم ہوا تو گھریلو معاملات پر پہلی مرتبہ سنجیدگی سے غور کیا۔ چمڑے کا آبائی کاروبار الللے تللوں کی نذر ہو چکا تھا۔ ابا جی کی جسمانی حالت اب زیادہ محنت و مشقت کی اجازت نہ دیتی تھی۔ ایک روز انہوں نے مجھے اپنے پاس بلوا بھیجا اور گہرے متفکر لہجے میں گویا

ہوئے۔ ”مستقبل کے بارے کیا حکمتِ عملی طے کی ہے حسن پتر!“

”نوکری کرنے کا مزاج بالکل نہیں میرا۔ آپ بخوبی جانتے ہیں“ میں نے تنگ کر جواب دیا۔ ”اور اپنے کاروبار کے حالات بھی آپ کے سامنے ہی ہیں۔ ڈوبتی ہوئی ناؤ ہے۔“

”تو پھر کیا کرنا چاہتے ہو؟“ انہوں نے مسکرا کر پوچھا۔

”میں ایک کوچنگ سینٹر قائم کرنا چاہتا ہوں۔ میرے دو دوست بھی میرے ساتھ شراکتی بنیادوں پر عملی طور پر شامل ہوں گے۔“

”ہوں! ٹھیک ہے۔ صادق مجھ سے کاروبار کا حصہ خریدنے کا خواہشمند ہے۔ اسی رقم سے اپنا کوچنگ سینٹر سیٹ کر لینا۔“ انہوں نے چھوٹے چچا کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔

”تو آپ کیا کریں گے پھر؟“

”آرام کروں گا یار!! میرا بیٹا ہے ناں اب میری قوت۔ میں پوتے پوتیاں کھلاؤں گا۔“ نواسے نواسیوں کی فوج میں گھرے ابا جی کی اس خواہش کی شدت میں بخوبی محسوس کرسکتا تھا۔

☆☆☆

کوچنگ سینٹر کا قیام ہمارے اندازوں سے بڑھ کر کٹھن ثابت ہوا تھا۔ شہر بھر کے گلی کوچوں میں کھمبیوں کی طرح جا بجا موجود ایسے اداروں کے باعث اپنے سینٹر کی ساکھ بنانے میں ہم بھی دوستوں کے چودہ طبق روشن ہو گئے تھے۔ اور اسی دوران میری ملاقات ثمینہ سے ہوئی۔

ثمینہ خالد متوسط گھرانے کی ان ہزاروں لڑکیوں جیسی تھی جو اپنی پڑھائی کے اخراجات پورے کرنے کے لیے جز وقتی ملازمت کا سہارا لیتی تھیں۔ اس کا نپا تلا اندازِ گفتگو، پُر اعتماد لب ولہجہ اور صنفِ مخالف سے خائف نہ ہونے کی صفات نے مجھے بہت متاثر کیا تھا۔ وہ ان تمام تر لڑکیوں سے منفرد تھی جو آج تک میری زندگی میں کسی نہ کسی طور شامل رہی تھیں۔ خاندان میں کئی رشتے ہونے کے باعث ابا جی کو قائل کرنا ذرا مشکل ضرور ثابت ہوا لیکن جیت بالآخر میری ہی ہوئی۔ ثمینہ کا حصول اب مجھے بے حد آسان دکھائی دے رہا تھا لیکن اس کے والدین نے سوچ بچار کے لیے وقت کی مانگ رکھ کر میرا دماغ بھک سے اڑا دیا۔ ”کس چیز کی کمی تھی آخر مجھ میں؟ حسن علی کے تسخیر کے زعم پر پڑنے والی یہ پہلی ضرب مجھ سے قطعی برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ اور ٹھیک اسی پل میں نے اپنے ذہن میں ایک لائحہ عمل تشکیل دے دیا۔

☆☆☆

کریانہ اسٹور کے مالک خالد احمد نے کچھ ہفتوں بعد اپنی بیٹی کے لیے میرا رشتہ قبول کرلیا اور اسی دن سے اس کی ملازمت بھی ختم کروا دی۔ منگنی کی رسم کے دوران ان کے خاندان کا محبت جتاتا انداز مجھے کوفت زدہ کر رہا تھا۔ میرے دل میں ان کے لیے ایک گرہ پڑ چکی تھی جس نے ایک بے حسی طاری کردی تھی لیکن ابھی اپنے پتے ظاہر کرنے کا وقت نہ آیا تھا لہٰذا ان کی محبت کا جواب مصنوعی خوش خلقی سے دیتا رہا۔ وہ بار بار اسٹیج پر کسی نہ کسی رشتے دار کو متعارف کروانے لے آتے اور انتہائی فخریہ انداز میں اسے کہتے۔ ”حسن علی سے ملیے بھئی! بہت قابل اور ہونہار ہیں ہمارے داماد۔ ہماری کسی نیکی کا اجر ہیں یہ۔“

میں مسکرا کر ان سے علیک سلیک کرتا رہا لیکن اپنے دل میں ایک جملہ ضرور دہراتا تھا۔ ”حسن علی سے ابھی ملے ہی تو نہیں آپ! اسی سے تو ملوانا ہے آپ کو قبلہ!“

☆☆☆

”یہ لوگ سمجھتے کیا ہیں خود کو آخر؟“ میں نے جھنجلا کر اپنی والدہ سے کہا۔

”ٹھیک ہی تو کہہ رہے ہیں وہ بیٹا۔ حق بجانب ہیں وہ اس معاملے میں۔ پھر دو ہی ماہ کی تو بات ہے۔“ وہ نرمی سے مجھے شانت کر رہی تھیں لیکن میرے وجود میں پنپنے والا آتش فشاں اب مزید بڑھ چکا تھا۔

منگنی کے بعد میں ثمینہ سے گفت وشنید کا خواہشمند تھا اور اسی مقصد کے لیے میں نے ایک مہنگا اور جدید موبائل فون اسے تحفتاً بھجوایا تھا۔ میرا گمان تھا کہ بیٹی کی اس قدر پذیرائی پر وہ لوگ خوشی سے پھولے نہ سمائیں گے لیکن اس کے والدین نے یہ کہہ کر موبائل لوٹا دیا۔ ”ہماری روایات اس بات کی اجازت نہیں دیتی بہن جی!! گھر میں اور بھی جوان بچیاں ہیں ان پر کیا اثر پڑے گا۔ ہم حسن بیٹے سے خود معذرت کر لیتے ہیں۔ لیکن آپ بھی معاملے کی نزاکت کو سمجھیے۔ ابھی نامحرم ہی تو ہیں وہ ثمینہ کے لیے۔“

میرے تن بدن میں اس قدر اہانت سے آگ لگ چکی تھی۔ مجھے ثمینہ کی بزدلی پر بھی شدید تاؤ تھا۔ کیا میری اتنی بھی اہمیت نہ تھی اس کی زندگی میں کہ وہ اپنے والدین کو قائل کر لیتی۔ پھر اگلے ہی پل کچھ عرصہ پہلے سوچے گئے منصوبے کا خیال آتے ہی میرے دل و دماغ کو سکون مل گیا۔

☆☆☆

روایتی انداز میں نبھائی جانے والی تمام تر رسموں کے بعد ثمینہ خالد اب ثمینہ حسن بن کر میری خوابگاہ میں موجود تھی۔ منہ دکھائی کا تحفہ دیتے ہی میں نے اسے دو ٹوک الفاظ میں ایک بات واضح کر دی تھی۔ ''میں حکم عدولی برداشت نہیں کر سکتا ثمینہ۔ اگر تمہیں گھر کا سکون درکار ہے تو کبھی میری کسی بات سے انحراف مت کرنا ورنہ تمہارے لیے اچھا نہیں ہوگا۔''

''آپ کو کبھی مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ آپ میرے مجازی خدا ہیں آپ کا ہر حکم سر آنکھوں پر رکھوں گی۔'' وہ اعتماد سے بولی۔

''ویری گڈ!! بس اسی بات پہ کاربند رہنا ہمیشہ۔'' میں نے معنی خیز انداز میں اسے جتایا لیکن اس نے بے تاثر انداز میں محض اثبات میں سر ہلا دیا۔

ثمینہ کے ساتھ زندگی کے اس نئے سفر کا آغاز بہت خوشگوار ثابت ہوا تھا۔ وہ بلاشبہ مجھے بے حد چاہتی تھی اور میری ہر ضرورت کا خیال رکھتی تھی۔ کوچنگ سینٹر کے لیے شب و روز کی جانے والی محنت کے بعد اس کا وجود صحرا میں کسی نخلستان کی سی ٹھنڈک دیتا تھا لیکن میری زخمی انا پھن پھیلائے اس کیف و سرور بھری زندگی کو کہیں نہ کہیں زہر آلود کیے رکھتی تھی۔ بالآخر مجھے اس بے کلی کی تسکین کا موقع مل ہی گیا۔

ثمینہ کی چھوٹی بہن کی منگنی کی رسم کے لیے اس کے والدین مجھے خصوصی طور پر مدعو کرنے آئے تھے۔ ان کی محض چار بیٹیاں تھیں لہٰذا وہ مجھے قائم مقام بیٹے کے طور پر شرکت کے متمنی تھے۔ لیکن میں نے وہی کیا جو میں نے عرصہ دراز سے سوچ رکھا تھا۔ اس روز میں نے واپسی میں دانستہ تاخیر کر دی اور متوقع فون کالز سے اجتناب کے لیے فون بھی آف کر دیا۔ گھر پہنچ کر اس کے چہرے پر موجود بے چینی دیکھ کر ایک نا قابلِ بیان فرحت محسوس ہوئی

''کہاں رہ گئے تھے آپ؟ ابو کے کتنے ہی فون آچکے ہیں۔ وہ منتظر ہیں ہمارے کب سے۔''

''مصروف تھا میں کچھ۔'' میں نے رکھائی سے کہا۔

''تو مجھے بتا ہی دیتے۔ میں امی کے ساتھ چلی جاتی۔'' وہ شدید اضطراب کا شکار دکھائی دے رہی تھیں۔

''نہیں جاؤ گی تم وہاں...... بس۔'' میرے درشت لہجے نے اسے یکدم بوکھلا دیا۔

''لیکن کیوں آخر؟''

''نامحرم ہے تمہارا بہنوئی تمہارے لیے۔ مجھے نہیں پسند تمہارا یوں سج سنور کر اس کے سامنے جانا۔'' میں نے اس کی تیاری پر چوٹ کرتے ہوئے کہا تو وہ ساکت رہ گئی۔ ''اب جاؤ اور اتارو یہ الا بلا'' میں اطمینان سے کہہ کر ٹی وی میں مشغول ہو گیا۔ خالد احمد کے بے بس چہرے کا تصور طبیعت میں عجیب سی ترنگ پیدا کر رہا تھا۔ بالآخر وہ صیاد اپنے ہی دام میں آچکا تھا۔

☆☆☆

رفتہ رفتہ ثمینہ پر غیر محسوس انداز میں میکے جانے کی راہیں میں مسدود کرتا جا رہا تھا۔ وقت مزید آگے سرکا تو ابوبکر کی آمد سے ابا جی کی دیرینہ خواہش کی تکمیل نے گھر بھر میں خوشیوں کی لہر دوڑا دی۔ نومولود کی ولادت پر اس کے ننھیال والوں نے اپنی بساط کے مطابق تحائف کا ڈھیر لگا دیا۔ خالد احمد نے مجھ سے بغلگیر ہوتے ہوئے ملتجی انداز میں کہا۔ ''حلیمہ کی شادی کی تاریخ طے کرنے اس اتوار آنا چاہتے ہیں اس کے سسرال والے۔ آپ بھی ضرور آئیے گا۔''

''اچھا دیکھوں گا۔ وقت ملا تو آجاؤں گا۔'' میں نے جان چھڑاتے ہوئے کہا۔

''لیکن میں نے آپ ہی کی شرکت یقینی بنانے کے لیے اتوار کا دن مقرر کیا ہے۔ آپ کو فراغت ہوگی ناں تب۔'' اس کا ملتجی لہجہ میرے لیے انتہائی فرحت بخش تھا۔

''مجھے اور بھی بہتیرے کام ہیں۔ کہہ دیا ناں وقت ملا تو آجاؤں گا۔'' میں سرد مہری سے کہہ کر وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا۔

میری توقع کے عین مطابق ثمینہ مجھ سے اس رویئے کا گلہ کیے بغیر نہ رہ سکی اور میں تو پہلے ہی موقع کی تلاش میں تھا ایک صبر آزما انتظار کے بعد بالآخر سابقہ حسابات چکتا کرنے کا وقت آچکا تھا۔

''یہی پٹیاں پڑھانے آتے ہیں تمہیں وہ کہ شوہر کے ساتھ بحث کرو۔ اسے کٹہرے میں لا کھڑا کرو۔'' میں نے خشونت سے کہا۔

''انہوں نے تو ایسا کچھ بھی نہیں کہا مجھ سے۔ میں تو اپنے طور پہ کہہ رہی ہوں آپ سے۔ کیا اتنا بھی حق نہیں میرا؟''

''دودھ پیتا بچہ نہیں میں۔ خوب جانتا ہوں کہ انھی کی کرم فرمائیاں ہیں یہ۔ ورنہ تمہیں اچھی طرح یاد ہونا چاہیے کہ میں حکم عدولی برداشت نہیں کرتا۔''

''کیا ہو گیا ہے حسن آپ کو؟ میں تو بس اتنا کہہ رہی ہوں۔'' وہ روہانسی ہو چکی تھی لیکن میں نے یکدم اس کی بات

کاٹ کر کہا۔ ''اب زبان درازی کی کسر رہ گئی تھی وہ بھی شروع کر دی تم نے۔'' میں نے اسے ہر طرف سے گھیر لیا تھا۔ ''بس آج کے بعد تم اپنے والدین سے ملو گی نہ وہ یہاں آئیں گے۔ اپنا فون بھی میرے حوالے کروا بھی۔ شادی سے پہلے بھی فون کے بغیر رہتی ہی تھی ناں! اب بھی رہ لوگی۔'' میں اطمینان سے اس کا موبائل آف کرتے ہوئے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

حسن علی کو بھلا کبھی زندگی میں کسی محاذ پر شکست ہوئی تھی جواب ہو جاتی۔ میں تو ایک فاتح تھا، حکمران تھا اور ثمینہ میری مطیع۔ اس نے چارو نا چار خاموشی سے میرے مطالبات تسلیم کر لیے تھے لیکن میں اسے گڑگڑاتا دیکھنے کا شدید متمنی ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے بچپن ہی سے اپنے گھر میں خواتین کا ایک مخصوص رویہ اور ردِعمل دیکھا تھا۔ ثمینہ کا ٹھنڈا انداز مجھے غیر فطری محسوس ہوتا تھا۔ اس کی خاموشی مجھے بے کل کر دیتی تھی۔ اماں نے اس موقع پر بہو کی حمایت میں مجھے کافی پند و نصائح کیے۔ ''کیوں کر رہے ہو حسن تم ایسا؟ اپنے پرکھوں سے بھی چار ہاتھ آگے نکلے تم تو۔ مت دو اتنی اذیت اسے۔ کچھ تو خیال کرو۔ اس نے کبھی تیری بہنوں اور گھر ماں باپ کے ساتھ کوئی فرق روا نہیں رکھا۔ تم کس بات کی آخر سزا دے رہے ہو اسے؟'' ان کی آواز بھیگنے لگی۔ تاہم ابا جی کی کڑکدار آواز نے انہیں یکدم سہما دیا۔

''وہ شوہر ہے اس کا۔ سیاہ و سفید کا مختار کل۔ تم اپنی زبان بند رکھو تو بہتر ہوگا۔ وہ جو کر رہا ہے ٹھیک کر رہا ہے۔''

ابا جی کے اس حمایتی بیان نے مجھے مزید تقویت دی اور میں مکمل بے فکری سے اپنے ''لائن آف ایکشن'' کا دائرہ کار بڑھاتا رہا۔ وقت اپنی مخصوص رفتار سے منازل طے کرتا رہا اور اگلے ہی سال حذیفہ کی پیدائش نے گھر بھر میں خوشیوں کی لہر دوڑا دی۔ اس موقع پر خالد احمد اپنی اہلیہ کے ہمراہ پھر آن موجود تھا۔

''کوئی غلطی کوتاہی ہوگئی ہو ہم سے تو دست بستہ معافی کے خواستگار ہیں۔ لیکن اس طرح ہمیں سزا مت دو بیٹا۔ بڑھاپے میں اولاد کا دکھ ہم سے مزید نہیں سہا جا سکتا۔'' اس نے ہاتھ جوڑ دیے تھے۔

''دکھ!! کون سا دکھ دیا ہے میں نے آپ کی بیٹی کو۔ اچھی خاصی سکھی ہے اپنے گھر میں۔ لیکن اگر آپ اسے مزید کوئی سکھ دینا چاہتے ہیں تو لے جایئے بصد شوق اپنے ساتھ۔''

وہ خاموشی سے افسردہ چہرے لیے لوٹ گئے۔ اس رات ثمینہ نے پہلی مرتبہ انتہائی بپھرے ہوئے انداز میں مجھے آڑے ہاتھوں لیا۔

''چاہتے کیا ہیں آخر آپ؟ کیوں اتنا خوار کر رہے ہیں میرے والدین کو؟''

''ہر عمل کا ایک ردِعمل ہوتا ہے ثمینہ۔ یہ انھی کے اعمال کا پھل ہے۔'' میں نے سکون سے کہا۔

''کون سے ایسے عمل سرزد ہو گئے ان سے؟ اپنی روایات کی پاسداری ہی تو کی تھی انہوں نے۔''

''میں کچھ نہیں جانتا۔ میں تمہیں اپنا فیصلہ سنا چکا ہوں۔ تمہیں اپنے والدین سے قطع تعلق کرنا ہوگا۔ ہمیشہ کے لیے۔'' میں نے چڑ کر کہا۔

''والدین جیتے جی نہیں چھوڑے جا سکتے حسن! یہ ضد کیوں لگائے بیٹھے ہیں آپ؟ وہ خود چل کر آپ کے پاس آئے ہیں۔ معافی بھی مانگ لی ہے۔ آپ کا دل کیوں نہیں پسیج رہا؟ بس کر دیجیے پلیز!''

''تم چھوڑو گی انہیں یا نہیں؟''

کمرے میں یکدم سناٹا در آیا جسے اس کی بوجھل آواز نے چھناکے سے توڑا۔ ''نہیں!! میں انہیں چھوڑ سکتی۔ ان کے حقوق ہیں مجھ پر۔ میں بلاجواز انہیں دکھی نہیں کر سکتی۔''

میرے اندر ابھرنے والی طیش کی شدید لہر نے میرے اعصاب سنسنا دیے اور میں نے سرسراتے لہجے میں اس کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا۔ ''ٹھیک ہے ثمینہ بیگم!! اب جو ہوگا اس کی ذمہ داری تمہی پر ہوگی۔ یاد رکھنا۔''

☆☆☆

ثمینہ کے اس انکار نے میرے اندر ایک طوفان برپا کر دیا تھا۔ اپنے والدین کو فوقیت دے کر اس نے میری انا بری طرح مجروح کی تھی۔ اور اب میں اسے زچ کرنے کا کوئی موقع ضائع نہیں کرتا تھا۔ اماں کے علاوہ گھر کی دیگر خواتین کی اخلاقی معاونت بھی میرے ہمراہ تھی۔ وہ ایسا مقتدر طبقہ تھیں جن کی نظر میں ثمینہ کی بغاوت لاحاصل تھی اور وہ اس سے اپنا لاشعوری موازنہ جاری رکھتی تھیں۔

میں نے گھریلو اخراجات کی رقم میں اچھی خاصی کٹوتی کرنی شروع کر دی۔ پہلے کئی ماہ تو اس کی خاموشی کا قفل نہ ٹوٹا لیکن جب رقم کا تناسب مزید کم ہوا تو وہ بلبلا اٹھی۔ ''خدا کا خوف کریں حسن! یہ اتنے سے پیسوں میں کیسے گزارا کروں گی میں بچوں کے اتنے اخراجات ہیں۔ کیسے پورا کروں گی میں

سب؟"

"یہ تمہارا دردِ سر ہے میرا نہیں۔" میں نے بے نیازی سے کندھے اچکا دیے۔

"اتنے بھی کیا حالات خراب ہوگئے ہیں اکیڈمی کے؟ جو یوں کٹوتیاں کر رہے ہیں آپ؟"

"میں تمہیں جواب دینے کا پابند نہیں ہوں۔ اب جاؤ میرا دماغ مت چاٹو۔" وہ ضبط سے ہونٹ بھینچے پلٹ گئی۔

وقت اسی آنکھ مچولی میں کئی پڑاؤ طے کر گیا۔ بچے شعور کی سرحدوں پر پہنچ چکے تھے۔ امی اور ثمینہ اب کچھ عرصے سے تبدیلیٔ رہائش پر مصر تھیں۔ وہ ایک ہی بات دہرایا کرتیں۔

"بچے بڑے ہو رہے ہیں اب حسن! ایک کمرے میں ان کے ساتھ رہائش مناسب نہیں لگتی۔ کوئی کشادہ گھر لے لینا چاہیے اب۔" میں سنی ان سنی کر دیتا۔

ثمینہ پہلے پہل تو التجا کرتی رہی لیکن پھر اس نے مجھ سے اجتناب برتنا شروع کر دیا۔ میں اس کے اس عمل کے ماخذات سے بخوبی واقف تھا مگر میں بھی کیا کرتا۔ وہ ایک بار اپنی اور اپنے والدین کی غلطی کا اعتراف کر لیتی تو میرے سر میں یہ سودا بھی نہ سماتا۔

☆☆☆

بچوں کی پڑھائی نے رفتہ رفتہ ثمینہ کو مجھ سے مزید دور کر دیا اور میں اپنی منفی سوچوں میں گھرا ایک ناقابلِ بیان تنہائی محسوس کرنے لگا۔ بچپن سے دیکھے گئے واقعات میرے ذہن میں آج بھی نقش تھے۔ عورت کا یہ اٹل روپ میرے لیے ایسا کوہ ہمالیہ تھا جسے بہرصورت مجھے سر کرنا تھا۔ اب خدا جانے موروثی اثر تھا یا تنہائی اور انا پرستی نے مجھے میرے محور سے بھٹکا دیا تھا، میں غیر محسوس طریقے سے ربیعہ کی طرف مائل ہونے لگا۔

ربیعہ صدیق میرے کوچنگ سینٹر میں کمپیوٹر آپریٹر تھی جس کا سب سے خاص وصف یہ تھا کہ وہ مجھے بے حد اہمیت دیتی تھی۔ ہمارے مابین بہت جلد گہری ذہنی ہم آہنگی پروان چڑھ گئی۔ وہ ایک مطلقہ تھی جسے شوہر کی شکی طبیعت کے باعث علیحدگی کا فیصلہ لینا پڑا۔ دوستی اور تعلق کا دائرہ وسیع تر ہوا تو اس نے مجھے اپنے گھر مدعو کیا۔ اس کے والدین کا شفیق اور دوستانہ انداز مجھے ہواؤں میں اڑائے رکھتا تھا۔ ثمینہ سے دوری بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی اور ربیعہ میرے حواسوں پر مکمل سوار ہو چکی تھی۔

اس کے والد سے اشاروں کنایوں میں اپنے رشتے کی بات کی تو وہ فرطِ محبت سے بغلگیر ہوتے ہوئے بولے۔ "میں آپ کو انکار کیسے کر سکتا ہوں حسن صاحب؟ میری خوش قسمتی ہے کہ آپ میری بیٹی کا ہاتھ تھامنا چاہتے ہیں۔" اس کے جذبات سے گندھے لہجے نے برسوں پرانی ایک چوٹ کی تسکین کر کے میرا وجود ہلکا پھلکا کر دیا۔

نکاح کی ایک سادہ سی تقریب میں ربیعہ کے جملہ حقوق بھاری حق مہر کے عوض اپنے نام کروا کے میں نے اسے ایک الگ کرائے کے فلیٹ میں منتقل کر دیا۔ مجھے واثق یقین تھا کہ یہ خبر سن کر ثمینہ کے مزاج ضرور ٹھکانے آجائیں گے اور تبھی اسے اپنی غلطیوں کا احساس ہوگا۔ عورت میں شراکت برداشت کرنے کا عنصر ناپید ہے۔ لیکن جو ہوا وہ میرے گمان

کی سرحدوں سے پرے تھا۔

☆☆☆

میں اپنی شادی کی خبر کسی خاص موقع اور مکمل اہتمام کے ساتھ ثمینہ کے گوش گزار کرنا چاہتا تھا اور وہ موقع اس نے مجھے خود ہی فراہم کر دیا۔ اس کی چھوٹی بہن کی شادی کے سلسلے میں وہ کچھ دن اپنے میکے میں گزارنا چاہتی تھی اور مجھ سے اجازت کی طلبگار بنی ناشتا لیے کھڑی تھی۔ دونوں بچے اسکول جا چکے تھے۔ میں نے کمال سخاوت سے اسے ایک ہفتہ وہاں رہنے کا عندیہ دیا تو اس پر شادی مرگ کی کیفیت طاری ہوگئی۔

"آپ بھی لگاتے رہیے گا چکر۔ بچی بہت پوچھتے ہیں آپ کی بابت۔" اس نے اپنا سابقہ مطالبہ ایک بار پھر دہرایا۔

"نہیں! میں نہیں آپاؤں گا۔ مجھے اسلام آباد جانا ہے کسی کام کے سلسلے میں۔"

"خیریت! اچانک یہ پروگرام کیسے بن گیا؟" وہ متجسس لہجے میں بولی۔

"ہاں! خیریت ہی ہے۔ میرا ہنی مون پروگرام ہے بس۔" میں نے سرسری طور پر کہا۔

اس کے وجود پر یکدم متزلزل کیفیت طاری ہوگئی۔ چہرے پہ کھنڈی زردی اور پل بھر میں خشک پڑتے ہونٹ اس کے اندرونی خلفشار کا بخوبی حال بیان کر رہے تھے۔ چند لمحوں بعد وہ عجیب بکھرے ہوئے لہجے میں بولی۔ "آپ نے وہی کہا ناں؟ جو میں نے سنا۔ ایک بار پھر سے دہرایئے اپنے الفاظ۔"

"ہاں!! تم نے ٹھیک سنا ہے۔ میں نے شادی کر لی ہے۔" میں نے اس کی کیفیت سے بھرپور حظ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ناشتے کی ٹرے ایک چھناکے سے اس کے ہاتھ سے پھسل کر نیچے جا گری اور وہ بے دم ہو کر گھٹنوں کے بل بیٹھ کر بری طرح بلکنے لگی۔ اس کی کراہیں سن کر دیگر اہلخانہ گھبرا کر اپنے کمروں سے نکل آئے۔

"کیا ہو گیا ہے صبح صبح؟ کیوں اتنا ہنگامہ برپا کر رکھا ہے؟" ابا جی بے زاری سے بولے۔

"کچھ نہیں ابا جی!" میں نے اطمینان سے کہا۔ "اپنی شادی کی خبر دی ہے اسے بس۔ تو یوں ڈرامے شروع کر دیئے ہیں اس نے۔"

ابا جی کھلکھلا کر ہنسے اور بولے۔ "بس اتنی سی بات! جھلی نہ ہو تو۔ ارے!! مرد بچہ ہے ایک کیا چار کر سکتا ہے۔"

ثمینہ نے جھٹکے سے سر اٹھایا اور تڑخ کر بولی۔ "کس بنا پر کر سکتے ہیں؟ کیا میں مر گئی تھی یا کوئی معذوری لاحق ہو گئی تھی مجھے جو ان کے حقوق پورے نہ کر پاتی۔"

"ہاں! معذور ہی ہو تم۔ ذہنی اور جذباتی معذور...... تمہیں شوہر کو راضی کرنا آیا ہی نہیں کبھی بھی۔" میں نے بپھر کر کہا۔

"آپ کی خوشی؟ انسانی فطرت اور شرعی احکام سے بہت بالاتر ہے میاں جی! میں بے حد عام سی عورت ہوں۔ میں اپنے پیدا کرنے والوں کو نہیں چھوڑ سکتی۔ ان کی رسوائی کا موجب بن کے دوزخ کا ایندھن نہیں خرید سکتی۔ میں نے کبھی آپ کے والدین کے ساتھ کوئی فرق روا نہ رکھا۔ لیکن آپ نے سب کچھ بے مول کر دیا۔"

"شریعت اجازت دیتی ہے مجھے تو تم کون ہوتی ہو مجھے روکنے والی؟"

"درست فرمایا آپ نے۔ مرد ایک نہیں چار شادیوں کا شرعی طور پر مجاز ہے لیکن ذات باری تعالیٰ نے جہاں یہ حکم دیا ہے اسی مقام پر زوجین کے حقوق بھی بتائے ہیں۔ لیکن آپ نے تو محض مطلب براری کے لیے ان احکامات کو موم کا سانچہ بنا رکھا ہے۔"

"زیادہ عالمہ مت بنو اب تم۔" میں نے چڑ کر کہا۔ "یہ تمہاری ہی غلطیوں کی سزا دی ہے میں نے تمہیں۔ اب بھگتو بس۔" میں ناشتے کی ٹرے کو ٹھوکر مار کر وہاں سے چلا گیا۔

☆☆☆

اسلام آباد سے واپسی پر گھر میں ایک نیا ہنگامہ میرا منتظر تھا۔ ثمینہ نے اپنے میکے میں ہی رہنے کا فیصلہ کر کے سبھی کو انگشت بدنداں کر دیا تھا۔ اس کا یہ انتہائی ردِعمل مجھے مزید طیش دلا گیا۔

"سمجھتی کیا ہے خود کو آخر؟ کون سا گناہ سرزد ہو گیا تھا مجھ سے جو یوں گھر چھوڑ کر چلی گئی ہے وہ۔ شادی ہی تو کی ہے میں نے۔"

"اچھا نہیں ہوا بہرحال یہ۔" ابا جی کے چہرے پر بھی گھمبیر سنجیدگی طاری تھی۔

ربیعہ کو علم ہوا تو وہ بھی ناک بھوں چڑھاتے ہوئے بولی۔ "اتنا تکبر کیوں ہے آخر آپ کی بیوی میں؟ طلاق بھجوا دیں اسے۔ قدر ہی نہیں اسے آپ کی۔"

"نہیں! ہرگز نہیں! طلاق تو میں کبھی نہیں دوں گا۔ یوں ہی سسکا سسکا کر ماروں گا۔"

"اچھا چلیں چھوڑیں بھی۔ میرے ساتھ تو موڈ ٹھیک

رکھیں ناں اب۔‘‘ اس نے اٹھلا کر کہا۔

میرا زیادہ تر وقت اب اسی کے ساتھ گزرتا تھا۔ اس کے ناز و انداز اور وارفتگی مجھے بے خود کر دیا کرتی تھی اور میں اس کی ہر بات مانتا چلا جاتا تھا۔ ہفتے میں ایک آدھ بار گھر کا چکر لگتا تو امی اور ابا جی کے سنجیدہ چہرے اور گھر پر چھائی خاموشی ملول کرنے لگتے تھے۔ ایک روز ابا جی نے اپنے پاس بٹھا لیا اور نقاہت سے بولے۔ ’’میں یہ نہیں کہتا کہ تو نے غلط کیا لیکن ابوبکر اور حذیفہ کے بنا میرا دل نہیں لگتا۔‘‘

’’تو مل آئیں ان سے ایک بار۔‘‘ میں نے نظریں چرا لیں۔

’’گئے تھے ہم دونوں۔ وہ بالکل ویسے ہی تپاک سے ملی لیکن واپسی کے ذکر پر پتھر بن جاتی ہے۔ نوکری کرنے لگ گئی ہے اب ایک بار کوشش تو کر جا کے بیٹا! میرے بچوں کو واپس لے آ۔‘‘ ان کا لہجہ ملتجی ہو گیا۔

میں نے بادل ناخواستہ ہامی بھر لی اور ان کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ خالد احمد کے گھر کا ماحول آج بھی ویسا ہی تھا۔ اس نے پھیکی سی مسکراہٹ سے ہمارا خیر مقدم کیا اور ڈرائنگ روم میں بٹھا کر بچوں کو اندر بھیج دیا۔ وہ دوڑتے ہوئے وارفتگی سے میرے سینے میں آسمائے تو مجھے بھی خود پر ضبط کرنا مشکل ہو گیا۔ فرطِ محبت سے انہیں بھینچ کر خوب پیار کیا۔ کچھ لمحوں بعد ثمینہ چائے کے لوازمات لے کر داخل ہوئی اور خاموشی سے چائے بنانے لگی۔ اس کی سنجیدگی پہلے سے کئی گنا بڑھ چکی تھی۔ ابا جی ہولے سے کھنکار کر بولے۔ ’’گھر چلو بیٹا۔ حسن خود آیا ہے لینے اب تمہیں۔‘‘

امی بھی اس کے قریب جا کر بیٹھ گئیں اور نرمی سے بولیں۔ ’’تو میری بڑی سیانی دھی ہے ثمینہ۔ گھر یوں نہیں چھوڑے جاتے۔ تیری بہنیں ابھی کنواری ہیں۔ کوئی بھی جذباتی فیصلہ کرنے سے پہلے ان کے مستقبل کو بھی ذہن میں رکھنا۔ جو ہو گیا وہ تبدیل تو نہیں ہو سکتا۔ لیکن بہت کچھ غلط ہونے سے اب بھی روکا جا سکتا ہے۔‘‘

’’میری کچھ شرائط ہیں امی جی! اگر تسلیم کرتے ہیں سب۔ تو میں تیار ہوں واپس جانے کے لیے۔‘‘ وہ اٹل انداز سے بولی۔

’’رسی جل گئی مگر بل نہ گئے۔ بولو کیا شرائط ہیں تمہاری؟‘‘ میں نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ ابا جی نے میرا گھٹنا دبا کر التجائیہ نظروں سے خاموش رہنے کا اشارہ کر دیا اور ثمینہ سے مخاطب ہو کر بولے:

’’ٹھیک ہے بیٹا! مجھے منظور ہیں تمہارے مطالبات۔ کھل کر کہو جو کہنا چاہتی ہو۔‘‘

’’میں اپنی جاب جاری رکھوں گی۔ میرے بچے کبھی بھی ان کی منکوحہ سے نہیں ملیں گے اور نہ وہ کبھی میرے گھر آئے گی۔‘‘ وہ مجھے مکمل نظر انداز کر کے بولی۔ ’’گھر میرے بچوں کے نام کر دیں اور ان کا معقول جیب خرچ مقرر کیا جائے۔ میں ان سے کسی قسم کا ذاتی تعلق نہیں رکھنا چاہوں گی۔ ان کی کمائی کی ایک بھی پائی اپنی ذات پر خرچ نہیں کروں گی۔‘‘

میں کینہ توز نظروں سے محض اسے گھور کر رہ گیا۔

☆☆☆

ابا جی کی بچوں کے ساتھ وابستگی دیکھ کر میرے ذہن میں ثمینہ کے پندار کو ٹھیس لگانے کی نئی حکمتِ عملی پروان چڑھنے لگی۔ ربیعہ اور میری اولاد سے بخوبی معزولی کا پروانہ تھما سکتی تھی لیکن ربیعہ تھی کہ اس معاملے میں سنجیدہ ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ وہ اب بھی ہنی مون پیریڈ کے زیرِ اثر رہنے کی خواہشمند تھی۔ نت نئی فرمائشوں اور ہمہ وقت اخراجات سے کبھی کبھی طبیعت اوبنے لگتی تھی تاہم کچھ بھی کہنے سے اجتناب ہی برت رہا تھا۔

شادی کو دو سال ہو چکے تھے لیکن تا حال اولاد کی کوئی نوید نہ تھی۔ میرے بارہا اصرار پر بھی وہ طبی معائنے کے لیے رضامند نہ ہوتی تھی۔ اس کی ضدی طبیعت سے میرا چڑچڑا پن عود آنے لگا تھا اور ہمارے مابین اکثر تلخ کلامی ہونے لگی۔ ابوبکر اور حذیفہ کے ساتھ گزرنے والا وقت اس کا مزاج برہم کر دیتا تھا لیکن اپنی اولاد کے تذکرے پر وہ منہ میں گھنگنیاں ڈال لیتی تھی۔ عجیب عورت تھی وہ بھی۔ شاید میری قسمت میں عجیب و غریب عورتیں ہی لکھی گئی تھیں۔ خاندان میں شادی نہ کرنے کا ملال اب اکثر گھیرے رہتا تھا۔

انصاف کے تمام تر تقاضے نبھاتے ہوئے میں نے دونوں گھروں میں قیام کے ہفتہ وار دن مقرر کر رکھے تھے لیکن اس دن بچوں کے سالانہ رزلٹ کے بعد ان کی فرمائش پر انہیں ڈنر کروانے میں وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا اور ربیعہ کے پاس پہنچنے میں تاخیر ہو گئی۔ گھر میں داخل ہوتے ہی اس کی تیوریوں پہ بل دیکھ کر میں بے حد کوفت زدہ ہوا۔ ’’آ گئے آپ کو یاد میری؟ اب بھی نہ آتے۔ یہ چند گھنٹے جو کسی خیرات کی طرح مجھے سونپنے آئے ہیں، اپنے بیوی بچوں کو ہی سونپ آتے۔‘‘

’’نہیں بھئی! آج تمہارے ساتھ وقت گزارنا تھا تو پھر وہاں کیسے رہ لیتا بھلا؟‘‘ میں نے بڑی مشکل سے ضبط کرتے

ہوئے کہا۔

"میں جانے کتنے دن سے جنریٹر خریدنے کا کہہ رہی ہوں لیکن آپ کو بچت یاد آجاتی ہے۔ آج بیوی بچوں پر پیسے اڑاتے ہوئے کہاں تھی آپ کی بچت اسکیم؟" وہ آج اپنے حواسوں میں نہیں لگ رہی تھی۔

"تو تم بھی دے دو مجھے اولاد کا تحفہ۔ کتنی بار کہہ چکا ہوں تم سے میں؟" میں نے اسے سامنے سے دھکیلتے ہوئے کہا۔

"نہیں دے سکتی! اگر دے سکتی اولاد تو سہیل کیوں طلاق دیتا مجھے؟" وہ ہذیانی انداز میں بولی۔

میرے سر پر یکدم کوئی آسمان ٹوٹ پڑا اور میں نے بھی چیخ کر جواب دیا۔ "تو کیا تم لوگ مجھے بے وقوف بناتے رہے اتنا عرصہ؟"

"آہستہ بولیے حسن علی! میں ثمینہ نہیں ہوں جو آپ کی ہر کڑوی کسیلی برداشت کرلوں۔" وہ تن کر بولی۔

"تم ثمینہ ہو بھی نہیں سکتی کبھی۔ اس میں لاکھ عیب سہی لیکن وہ جھوٹی اور منافق نہیں ہے کم از کم۔" آج پہلی بار میں نے اعتراف کر ہی لیا۔

☆☆☆

میرے احساس برتری اور جذبہ تسخیر کو لگنے والی یہ چوٹ مجھ سے برداشت نہیں ہو پار ہی تھی۔ ربیعہ کو طلاق دینے کی صورت میں مقرر شدہ حق مہر کی ادائیگی کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ زندگی نے ایک عجیب دوراہے پر لا کھڑا کیا تھا۔ فطری رجحان کے تحت میرا جھکاؤ ثمینہ کی طرف ہونے لگا لیکن اس سے مصالحت کی کوششیں بھی بے سود ثابت رہیں۔ میری ہر بات کے جواب میں وہ چُپ بیٹھی رہتی اور ایک ہی جملے میں مجھ پہ گھڑوں پانی گرا دیتی۔ "یہی باتیں آپ اپنی دوسری بیوی سے بھی کرتے ہوں گے۔ مجھے گھن آتی ہے آپ کے الفاظ سے حسن! بس کر دیجیے اب۔ اور کتنا گرائیں گے آپ خود کو میری نظروں میں؟" وہ تاسف سے کہتی وہاں سے چل دیتی۔

سالہا سال گزرتے چلے گئے ربیعہ سے میرا رشتہ ہر گزرتے دن کے ساتھ کھوکھلا ہوتا گیا۔ میرے لیے کہیں کوئی جائے امان اور سکون نہ تھا۔ وقت کے صحرا میں کڑی دھوپ کی آبلہ پا مسافت کے ساتھ اپنے محور سے بھٹکنے کا خمیازہ ابھی مزید جانے کب تک بھگتنا تھا۔

☆☆☆

ابوبکر کے میڈیکل یونیورسٹی میں داخلے کی خوشی میں دیا

جانے والا ظہرانہ ختم ہو چکا تھا۔ ثمینہ کے روم روم سے خوشی چھلک رہی تھی بچوں کے گرد دیوانہ وار گھومنے والی ثمینہ مجھ سے آج بھی صدیوں کے فاصلے قائم رکھے ہوئے تھی۔ صرف ہماری اولاد ہی ایسی کڑی تھی جس کی بدولت ہمارا ربط قائم تھا۔ اس نے کبھی بھی انہیں مجھ سے بدظن کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ اولاد کی مثبت تربیت ان کی کامیابیوں سے ہی عیاں تھی۔ بچوں کے اصرار پر سہ پہر کے بعد ہم مشہور تفریحی پارک میں موجود تھے۔ میں نے ایک بوجھل سانس لے کر اسے مخاطب کر کے کہا۔ "میں تمہارا مجازی خدا ہوں ثمینہ! یوں بیگانہ رہ کر تم کیوں خود کو گنہگار کر رہی ہو؟"

"مجازی خدا کا مطلب سمجھتے ہیں آپ؟" وہ تیکھے انداز سے بولی۔ "لیکن ایک آپ ہی پہ موقوف نہیں۔ سبھی شوہر حضرات خود کو مجازی خدا تو کہلواتے ہیں لیکن ان کے اندر بسنے والا چھوٹا سا رب یہ بھول جاتا ہے کہ خدا اپنی مخلوق پر غفور و رحیم ہے۔ شفیق و کریم ہے۔ مرد صرف جبر و قہر سے مخلوق کو مطیع بنا کر ان کی عزت نفس روندتا چلا جاتا ہے۔ محبت بلا شبہ بہت خوبصورت ہوتی ہے مگر عزت انمول ہوتی ہے۔ جب عزت ہی باقی نہ رہے تو ہر رشتہ بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔"

"اب بھی سب کچھ ٹھیک ہو سکتا ہے اگر تم کوشش کرو تو۔" میں نے جھٹ سے اسے تجویز دی۔

"میں چاہ کر بھی پہلے کی طرح آپ سے پیش نہیں آسکتی" اس نے تھکی ہوئی آواز لیے کہا۔ "اعتبار کا شجر ایک بار بنجر ہو جائے تو کبھی نمو نہیں پا سکتا...... کبھی بھی نہیں۔ اور آپ نے اعتبار ہی نہیں، میرا مان، بھرم اور وفا سب کچھ بے مول کر دیا۔ آپ کی خواہش غیر فطری تھی حسن۔ ایک بار تو سوچا ہوتا کہ کیا آپ اپنے والدین کو جیتے جی چھوڑ سکتے تھے؟ میں اگر غلط تھی تو ایک بار میرا مؤقف غیر جانبداری سے سنا تو ہوتا۔ کچھ اپنی کہتے، کچھ میری سنتے۔ لیکن آپ نے حاکمیت کے زعم میں مجھے براہ راست پھانسی ہی دے دی۔ اب محض ایک ماں زندہ ہے۔ بیوی تو کب کی نابود ہو چکی ہے۔ اور مردے احساسات نہیں رکھتے۔" وہ فون کی بجتی گھنٹی کی طرف متوجہ ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

پارک میں شام کی سرمئی چادر دھیرے دھیرے ہر شے پہ حاوی ہونے لگی تھی اور ایسی ہی ایک شام میرے وجود کو بھی اپنی لپیٹ میں لیتی جا رہی تھی۔

جانے کیوں؟

محترم مدیر

السلام علیکم

ہمارے ہاں ایک دلدوز واقعہ رونما ہو گیا تھا جسے اخبارات نے خوب اچھالا تھا لیکن حقیقت پھر بھی کھل کر سامنے نہیں آئی تھی۔ مکمل واقعات یکجا کر کے کہانی کے انداز میں بھیج رہا ہوں۔ اُمید ہے قارئین کے سبق کی خاطر اسے ضرور شائع کریں گے۔ انسان سمجھ نہیں پاتا کہ اس کے عمل سے کیا کچھ نہیں ہو جائے گا۔

محمد کبیر عباسی

(مری)

نومبر کی آخری رات دھیرے دھیرے سرک رہی تھی۔ بارہویں رات کا تقریباً مکمل چاند اپنی چمک دکھانے کے بعد مغرب کی طرف جھک رہا تھا۔ اس کی زرد روشنی میں درختوں اور پہاڑیوں کے ہیولے عجب پُراسرار سا منظر پیش کر رہے تھے۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی جس کی وجہ سے پتے سرسرا رہے تھے۔ مگر اس آواز پر پہاڑی نالے کی پُرشور آواز غالب تھی۔

اخلاق احمد اچھی خاصی سردی کے باوجود پچھلے ایک گھنٹے

سے صحن میں ٹہل رہا تھا۔ اس نے ایک چادر لپیٹ رکھی تھی۔ اس کے پُرسوچ چہرے پہ گھمبیرتا چھائی ہوئی تھی۔ دانت بھینچے ہوئے تھے اور کنپٹی کی رگیں پھولی ہوئی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کسی بہت اہم فیصلے پر پہنچنا چاہ رہا ہو مگر اس فیصلے پر عمل درآمد بہت مشکل ہو۔ چل چل کے اس کی ٹانگیں شل ہو چکی تھیں مگر اسے جیسے کسی چیز کی پروا ہی نہیں تھی۔

اس کے ذہن میں اپنے پڑوسی کی آواز گونج رہی تھی۔

"تم کیسے مرد ہو جس سے اپنی بیوی اور بیٹی کنٹرول نہیں ہو رہی۔ تم جیسے بے غیرت شخص کو تو ڈوب مرنا چاہیے۔"

"تم کیسے مرد ہو...... تم کیسے مرد ہو......" اس کے ذہن میں یہ جملہ ہتھوڑے کی طرح بار بار لگنے لگا۔

اس کی کنپٹی کی رگیں مزید پھول گئیں۔ ایسا لگنے لگا جیسے آخر کار وہ کسی فیصلے پر پہنچ گیا ہو۔ وہ چلتے چلتے رکا اور کمرے کے دروازے کو گھورنے لگا۔ اچانک زرد چاندنی پہ اندھیرا غالب آگیا۔ چاند کسی بدلی کے پیچھے چھپ گیا تھا۔

وہ چند لمحے دروازے کو گھورنے کے بعد تیزی سے کمرے کی طرف بڑھا۔ دروازہ کھول کے وہ اندر داخل ہوا تو گہرے اندھیرے نے اس کا استقبال کیا۔

☆☆☆

زرینہ کروٹیں بدل بدل کی تھک چکی تھی۔ مگر نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ کافی دیر پہلے اس کا شوہر گھر سے باہر نکل رہا تھا تو دروازے کی آواز سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ عام طور پہ دن بھر کام کاج کرنے کے بعد جب رات کو لیٹتی تھی تو فوراً ہی نیند کی آغوش میں گم ہو جاتی تھی۔ طوفان آئے یا زلزلہ اس کی آنکھ نہیں کھلتی تھی۔ مگر آج رات ہلکی سی آہٹ سے ہی اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ اخلاق احمد کا رویہ اسے پریشان کر رہا تھا۔ وہ شام سے پریشان تھی۔ حسب معمول گھر آکے نہ اس نے کسی بچے کو ڈانٹا نہ اسے کوئی طعنہ دیا۔ اسے گہری چپ لگی ہوئی تھی۔ وہ اسے عجیب نظروں سے دیکھے جا رہا تھا۔ پچھلے چند سال سے تو وہ اسے بالکل خاطر میں نہیں لاتی تھی مگر آج اس کی نظروں میں نجانے ایسا کیا تھا کہ اس کا دل انجانے اندیشوں سے ڈولنے لگا۔ بیس سالہ شادی شدہ زندگی میں زرینہ نے اسے کبھی اس موڈ میں نہیں دیکھا تھا۔

رات کا کھانا خاموشی سے کھا کے وہ لیٹ گیا۔ اس کمرے میں تین چار پائیاں تھیں۔ ایک پر زرینہ اپنے چھوٹے بیٹے کے ساتھ لیٹتی تھی۔ اور دوسری پہ اخلاق۔ تیسری چار پائی تھوڑا ہٹ کے ایک کونے میں لگی تھی اور عموماً ہفتے میں ایک بار ہی استعمال ہوتی تھی۔ مگر جب سے اس کے دو بیٹے ننھیال گئے تھے اخلاق کے حکم کے مطابق اس کی بڑی بیٹیاں اس چار پائی پہ لیٹنے لگی تھیں۔ وہ چاروں بہن بھائی اس سے پہلے دوسرے کمرے میں لیٹتے تھے۔

وہ لیٹ کے خالی نظروں سے چھت کو دیکھنے لگا۔ زرینہ کا تھکن سے جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا سو پریشانی کے باوجود اس کی آنکھ جلد لگ گئی۔

رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی جب اس کی آنکھ دروازے کی آواز سے کھلی۔ اس نے اخلاق کو کمرے سے باہر جاتے دیکھا تو وہ فکر مند ہوگئی۔ وہ رفع حاجت کے لیے باہر گیا ہوگا۔ اس نے خود کو تسلی دی مگر کافی دیر کے بعد بھی واپس نہ آیا تو اس کا دل انجانے اندیشوں سے لرزنے لگا۔ کافی دیر انتظار کرنے کے بعد آخر کار وہ اٹھی۔ وہ صحن میں ٹہل رہا تھا۔ چاندنی میں اس کے چہرے کے تاثرات زرینہ کو خوفزدہ کر رہے تھے۔ اس لیے اسے بات کرنے کی ہمت ہی نہیں ہوئی۔ وہ واپس آکر لیٹ گئی۔

اچانک اسے ایک چیختی ہوئی آواز سنائی دی۔ اس کا دل اچھل کے حلق میں آگیا۔ یہ لومڑی کی آواز تھی جو نحوست کی علامت سمجھی جاتی ہے۔ وہ ویسے بھی کافی توہم پرست تھی۔ لومڑی کی آواز سن کے کتے بھونکنے لگے۔ اس کا دل بے طرح ہولنے لگا۔

جب کبھی بھی لومڑی بولتی ہے۔ کچھ برا ضرور ہوتا ہے۔ اس نے سوچا۔

"اللہ خیر کرے پتا نہیں کیا ہونے والا ہے۔"

بے اختیار ہی اس کے لبوں پہ دعا مچلی۔

اسے پھر اخلاق کا رویہ پریشان کرنے لگا۔ اس نے بڑی مشکل سے ایک بار پھر ہمت کی اور چار پائی سے اٹھی۔ چار پائی چرچرائی تو اس کا سات سالہ بچہ ابرار جو اس کے ساتھ ہی لیٹا تھا کسمسایا۔ وہ چند لمحوں تک کھڑی اسے دیکھتی رہی۔ جب وہ واپس سو گیا تو اس نے احتیاط سے چپل پہنے اور دروازے کی طرف بڑھی۔ دروازہ کھولتے ہوئے بھی اس کی کوشش تھی کہ آواز کم سے کم پیدا ہو مگر پرانے وقتوں کے بھاری بھر کم دروازے کی چرچراہٹ سناٹے میں کافی زور سے گونجی۔ اس کا دل دھڑکا۔

اس نے مڑ کے کمرے پہ نگاہ ڈالی دوسری چار پائی پر اس کی دو بیٹیاں اکٹھی سوئی ہوئی تھیں۔ تانیہ کی عمر سولہ سال تھی جبکہ نورین اٹھارہ سال کی ہو چکی تھی۔

اس کے دو بیٹے اپنے ننھیال گئے ہوئے تھے۔ دروازے کی آواز سے اس کی دونوں بیٹیوں کی نیند میں تو کوئی خلل واقع نہیں ہوا تاہم ابرار کی آنکھ کھل گئی۔

”امی، امی۔“ وہ اسے آوازیں دینے لگا۔

وہ اس کے پاس جا کے اسے تھپکنے لگی کچھ دیر بعد وہ سو گیا تو وہ پھر سے دروازے کی طرف پلٹی۔ اس نے پہلا قدم باہر رکھا ہی تھا کہ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے نے اس کے بدن میں جھرجھری سی بھر دی۔ اس نے چادر اچھی طرح لپیٹ کے باہر نگاہ ڈالی مگر صحن خالی تھا۔

وہ شاید دوسرے کمرے میں آ کے سو گیا ہے۔

اس نے اندازہ لگایا دونوں کمروں کے بیچ میں بھی ایک دروازہ تھا۔ اس سے روشنی چھن چھن کے باہر آ رہی تھی۔ جب وہ کمرے سے باہر گئی تھی اس وقت اس کمرے کی لائٹ بجھی ہوئی تھی۔ اس نے دروازے پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ دروازہ کھل گیا۔ وہ اپنے زور میں زرا سا لڑکھڑائی۔ اخلاق اسے دیکھتے ہی پیچھے ہٹ گیا۔ زرینہ نے سنبھل کے نگاہ اوپر کی تو اندر تک لرز گئی۔ اس کی آنکھیں لال انگارہ ہو رہی تھیں چہرے کے وحشیانہ تاثرات کسی درندے کی مانند لگ رہے تھے۔ اس نے ایک ہاتھ پیچھے کیا ہوا تھا۔ اچانک اس نے ہاتھ سامنے کیا۔ زرینہ کی نگاہ اس کے ہاتھ میں پکڑی چیز پر پڑی تو بے اختیار ہی اس کے منہ سے ایک زوردار چیخ بلند ہوئی جو سناٹے کی چادر چیرتی پہاڑی نالے کے شور میں کہیں گم ہو گئی۔

☆☆☆

اخلاق احمد چھ بہن بھائیوں میں سب سے بڑا تھا۔ اس سے چھوٹی دو بہنیں اور پھر تین بھائی تھے۔ اس کا باپ بس ڈرائیور تھا۔ بس کسی اور کی تھی اس وجہ سے ان کا گزارہ مشکل سے ہی ہو رہا تھا۔ اس کی ماں نے کچھ مال مویشی رکھے ہوئے تھے۔ جن سے کچھ اضافی آمدنی ہو جاتی تھی۔ گھر کے کام کاج اور مال مویشیوں کی دیکھ بھال کے بعد اس کے پاس اتنا وقت ہی نہ بچتا کہ وہ بچوں پہ کچھ توجہ دے سکتی۔ وہ سب سرکاری اسکول میں داخل تھے۔ بچیاں تو پرائمری پاس کر کے ہی اس کا ہاتھ بٹانے لگ گئیں کہ ہائی اسکول دور تھا اور ویسے بھی وہ ان کی پڑھائی کا مزید خرچ اٹھانے کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ اخلاق چودہ سال کی عمر میں بمشکل ساتویں جماعت تک ہی پہنچ سکا اس کے بعد اس نے اسکول چھوڑ کے بس کی کنڈیکٹری شروع کر دی۔ اس کے باپ نے کوشش کی کہ وہ اس کے ساتھ رہے مگر باپ کے ساتھ اسے وہ آزادی نہ ملتی جس کا وہ

انوکھا کردار

ہم سب کی زندگی میں اکثر و بیشتر ایسے کردار آتے رہتے ہیں جو کسی خاصیت کی بناء پر ہمیں یاد رہ جاتے ہیں اور جب خیالوں کے جھروکے سے وہ چہرے جھانکتے ہیں تو کبھی ہم مسکرا دیتے ہیں، کبھی دکھ ہوتا ہے اور کبھی حیرت ہوتی ہے۔ ایسا ہی ایک کردار میرے سامنے بھی آیا۔ ایک ”جمعدار“ کا۔ حیران نہ ہوں جمعدار بھی انسان ہوتا ہے۔ اگر ایک دن وہ نہ آئے تو ہر گھر کے سامنے کچرے کا ڈھیر لگ جائے۔

میرے گھر پر بھی ایک جمعدار صبح نو دس بجے کے قریب آتا تھا۔ ایک دن میں فرصت میں تھی۔ دروازے پر کچرا دیتے وقت میں کھڑی ہو گئی۔ میں نے اس کی سائیکل کے اطراف میں تین چار بلیاں کھڑی دیکھیں اور دو تین دوڑتی ہوئی آ رہی تھیں۔ میں نے اس سے پوچھا یہ بلیاں کیوں تمہارے ساتھ آ رہی ہیں۔ اس نے اپنے سینے پر صلیب کا نشانہ بنایا اور کہنے لگا۔ میں روزانہ کچرے سے ہڈیاں اور چھیچھڑے ان کو ڈال دیتا ہوں۔ شاید اسی وجہ سے یہ میرے ساتھ ساتھ چلتی رہتی ہیں۔ راہ چلتے نئی بلیاں بھی اس میں شامل ہو جاتی ہیں۔ ان بے چاریوں کا پیٹ بھر جاتا ہے۔ یہ مجھ سے مانوس ہو گئی ہیں میں ان سے مانوس ہو گیا ہوں۔ یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا اور بلیاں اس کی سائیکل کے ساتھ ساتھ چلنے لگیں۔

تسنیم زہرا کاظمی۔ کراچی

منطقۂ حارہ

سورج ساری زمین پر یکساں حرارت نہیں پھیلاتا۔ خطِ استوا پر اس کی شعاعیں ہمیشہ عموداً پڑتی ہیں۔ اسی لیے خطِ استوا سے 23-1/2 درجے عرض بلد شمال اور 23-1/2 درجے عرض بلد جنوب یعنی خطِ سرطان سے لے کر خط جدی تک کے درمیانی علاقے میں سخت گرمی پڑتی ہے۔ اس گرم علاقے کو منطقہ حارہ کہتے ہیں۔

مرسلہ: حیدر سموں۔ لاڑکانہ

متمنی تھا۔ اسے کنڈیکٹری کرتے پانچ سال ہو گئے۔ اس دوران پہلے اس نے سگریٹ نوشی شروع کی پر جلد ہی چرس پر آ گیا۔ اس کے علاوہ گالم گلوچ اور لڑائی جھگڑے بھی اس کی عادات میں شامل ہو گئے۔ ماں باپ کے پاس اتنا ٹائم تھا نہیں کہ اس کی سرگرمیوں پر توجہ دیتے۔

زندگی کی گاڑی اپنی ڈگر پہ چل رہی تھی کہ ایک واقعہ نے ان کی زندگی کا رخ ہی بدل دیا۔ اس کی ماں ایک پہاڑی پہ گھاس کاٹ رہی تھی کہ اس کا پاؤں پھسلا اور وہ ایک گہرے کھڈ میں جا گری۔ وہ ان دنوں گھاس کاٹ کے شام کو ہی گھر جاتی تھی۔ اس لیے شام تک تو اس کی گمشدگی کی کسی کو خبر ہی نہیں ہو سکی۔ اندھیرا پھیلنا شروع ہوا تو بکریاں اکیلے ہی گھر پہنچ گئیں۔ ماں کو ساتھ نہ دیکھ کے اس کی بیٹیوں نے اس کو تلاش کرنا شروع کیا۔ گاؤں کے باقی لوگ بھی ان کے ساتھ شامل ہو گئے۔ ان کے ہاتھوں میں لالٹینیں اور دیئے جل رہے تھے۔

اس کی بڑی بیٹی اسے دن کا کھانا دینے آئی تھی تو اس کی ماں نے اسے بتایا تھا کہ آج کونسی گھاس اس نے کاٹنا ہے۔ وہ اسی سمت گئی۔ اس کے ہاتھ میں لالٹین روشن تھی۔ اچانک اسے ہائے ہائے کی آواز سنائی دی۔ وہ تیزی سے اس طرف بڑھی۔ اس کی ماں دو پتھروں کے درمیاں تڑ مڑی پڑی تھی۔ اس کے سر سے بہتا خون جم چکا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں مگر اس کے منہ سے ہائے ہائے کی آواز بلند ہو رہی تھی۔ ماں کو اس حالت میں پڑا دیکھ کے وہ زور سے چلائی۔ پھر اس کا سر اپنی گود میں رکھ کے اسے پکارنے لگی۔

''امی، امی...... آنکھیں کھولیں۔''

اتنی دیر میں کچھ اور لوگ بھی آ گئے۔

''اسے تو اسپتال لے کے جانا پڑے گا۔'' ایک بزرگ اس کی حالت دیکھ کے بولے۔

روڈ کم از کم ایک گھنٹے کے پیدل فاصلے پر تھا اور کسی کو اٹھا کے لے جاتے ہوئے اس سے بھی زیادہ ٹائم لگتا۔

''خدا کے لیے انہیں کوئی اسپتال تک لے جائے۔ نہیں تو یہ مر جائیں گی۔'' اس کی بیٹی لوگوں سے فریاد کرنے لگی۔

ایک نوجوان نے آگے بڑھ کے اسے اٹھا لیا۔ کچھ اور لوگ بھی اس کے ساتھ ہو لیے۔ اتنی دیر میں اخلاق احمد بھی گھر پہنچ چکا تھا۔ اس کے چھوٹے بھائیوں نے اسے ماں کی گمشدگی کے بارے میں بتایا۔ وہ بھی اسے ڈھونڈنے نکل کھڑا ہوا۔

وہ ابھی راستے میں ہی تھا کہ لوگوں کا ایک ہجوم اس نے چلتے دیکھا۔ ان کے ہاتھوں میں لالٹینیں اور دیئے جل رہے تھے۔ وہ آپس میں زور و شور سے باتیں کر رہے تھے ساتھ ہی اسے کچھ سسکیاں سنائی دیں۔ اس نے آوازیں پہچان لیں یہ اس کی بہنوں کی آوازیں تھیں۔

وہ بھاگ کے ہجوم کے پاس پہنچا۔ اسے ایک شخص کے کندھے پر اپنی ماں نظر آ گئی۔ اس کے سر سے قطرہ قطرہ خون اب بھی ٹپک رہا تھا۔

''کیا ہوا انہیں؟'' وہ زور سے چلایا۔

اس کی بہنیں اسے دیکھ کے دوڑتی ہوئی آئیں اور اس سے لپٹ کے اونچی آواز میں رونے لگیں۔ اس نے آگے بڑھ کے اپنی ماں کو اٹھا لیا۔ پہلے وہ اسے اپنے گھر لے کے آیا باقی لوگ بھی اس کے ساتھ تھے۔ گھر لا کے اس نے ماں کو ایک چارپائی پہ ڈالا۔

اس کی رنگت بالکل زرد پڑ چکی تھی۔ خون سارا نچڑ چکا تھا۔ اس نے اس کے ماتھے پہ ہاتھ رکھا تو اسے جھٹکا لگا۔ اس کی پیشانی بالکل سرد تھی۔

''یہ تو لگتا ہے مر چکی ہیں۔'' پاس کھڑا ایک شخص زیرِ لب بولا۔

ایک بزرگ آگے بڑھ کے اس کی نبض ٹٹولنے لگے۔

کچھ دیر بعد انہوں نے نفی میں سر ہلایا اور بولے۔ ''انا للہ......''

یہ سنتے ہی اس کی بہنوں نے بین کرنا شروع کر دیئے۔ باقی عورتیں بھی ان کا ساتھ دینے لگیں۔ کچھ دیر بعد اس کا باپ بھی گھر آ گیا۔ اسے راستے میں ہی اپنی شریکِ حیات کی موت کی خبر مل چکی تھی۔ رات کو ہی تدفین کر دی گئی۔

سوئم کے بعد زیادہ تر رشتے دار اپنے گھر چلے گئے۔

اب اخلاق کے لیے مشکل دور شروع ہوا اس کی بہنیں گھر کے کام میں تو طاق تھیں مگر بھینس اور بکریوں کی دیکھ بھال ان کے لیے ممکن نہ تھی۔ کچھ دن تو ان کی ایک پڑوسن ان کے کام آتی رہی۔ بھینس کا دودھ وہ دوہ دیتی۔ باقی چھوٹے موٹے کام اخلاق کی بہنیں کر لیتیں مگر یہ سلسلہ آخر کب تک چلتا چند دن میں ہی پڑوسن نے معذرت کر لی۔ اب بھینس کی دیکھ بھال بھی مسئلہ بن گئی۔ اس مسئلے کا حل یہ نکالا گیا کہ اخلاق کی شادی اس کی خالہ زاد سے کر دی گئی۔

زرینہ اس سے چار سال بڑی تھی گھر کے کاموں کے ساتھ وہ مال مویشیوں کی دیکھ بھال میں بھی طاق تھی۔ شکل و صورت بھی مناسب تھی۔ مگر اخلاق کو زیادہ عمر کی وجہ سے وہ

شروع میں ہی زہر لگنے لگی۔ اس کے یار دوست اسے طعنے دیتے تو اسے بہت غصہ آتا۔

وہ اس کے ساتھ مار پیٹ کرنے لگا۔ شروع میں تو وہ اس کے ستم سہتی رہی مگر جلد ہی اس نے بھی لڑنا جھگڑنا شروع کر دیا۔ ایک دو بار وہ ناراض ہو کے میکے چلی گئی تو ان کے گھر کا نظام ہی درہم برہم ہو گیا۔

اس کے باپ نے اسے سمجھایا بجھایا تو وہ اسے جا کے منا لایا۔ دوسری بار جب وہ ناراض ہو کے گئی تو اخلاق نے اسے واپس لانے سے انکار کر دیا۔ باپ کے سمجھانے بجھانے کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ اسے طلاق دینا چاہتا تھا۔

اسی دوران ان کی بھینس نے بچے کو جنم دیا۔ اس کی دیکھ بھال کے لیے اسے پھر زرینہ کی ضرورت پڑی۔ وہ مجبوراً اسے منانے چلا گیا۔

زرینہ نے اپنے ماں باپ کے سامنے خوب واویلا کیا۔ وہ اسے جھولیاں اٹھا اٹھا کے بددعائیں دینے لگی۔ اخلاق اس کے ان تابڑ توڑ حملوں سے بوکھلا کے اٹھ کھڑا ہوا باہر جا کے اسے پھر بھینس کی یاد آئی۔

''زرینہ ڈرامے نہ کر بھینس نے کٹا دیا ہے چلو جا کے بوہلی بنا کے دو۔''

بھینس زرینہ کی کمزوری تھی اس نے اپنے کپڑوں کا شاپر اٹھایا اور اس کے ساتھ ہو لی۔

کچھ ماہ بعد ہی ان کے گھر ایک بیٹی نے جنم لیا۔ اس کے بعد زرینہ کی مصروفیات میں اور اضافہ ہو گیا۔ اگلے آٹھ دس سالوں میں ان کے گھر پانچ بچوں نے جنم لیا۔ پہلی دو بچیوں کی پیدائش کے بعد نوبت پھر طلاق پر پہنچ چکی تھی۔ مگر بھینس نے ایک بار پھر ان کا گھر ٹوٹنے سے بچا لیا۔

تین لڑکوں کی پیدائش کے بعد حالات کچھ معمول پر آ گئے۔ اس دوران اس کے والد بھی ایکسیڈنٹ میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اس کی تینوں بہنوں کی شادی ہو گئی۔ چھوٹے دونوں بھائی کام پہ لگ گئے وہ کبھی کبھار ہی گھر آتے۔ اخلاق کچھ عرصہ کنڈیکٹری کے بعد ڈرائیور بن گیا تھا۔ وہ پہلے بس چلاتا تھا مگر شادی کے دس بارہ سال بعد زرینہ نے ایک بھینس بیچی تو اخلاق نے اس سے رقم کا تقاضا کیا۔ وہ ٹیکسی خریدنا چاہتا تھا مگر زرینہ نے رقم دینے سے انکار کر دیا۔ اخلاق نے صندوق میں رکھی رقم چرا کے ایک ایف ایکس خرید لی۔ کچھ رقم اسے ادھار کرنی پڑی مگر وہ کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ ٹیکسی سے آمدنی ٹھیک ٹھاک تھی۔ زرینہ نے ٹیکسی دیکھی تو اس کا ماتھا ٹھنکا۔ وہ بھاگم بھاگ صندوق کے پاس پہنچی۔ سارے کپڑے الٹنے پلٹنے کے باوجود اسے رقم نہ ملی تو وہ بپھری ہوئی شیرنی بن گئی۔

اس نے باہر جا کے اخلاق کا گریبان پکڑ لیا۔ مسلسل چرس پینے سے اس کی صحت کافی گر چکی تھی۔ اس کے مقابلے میں گھر کا دیسی گھی کھا کھا کے زرینہ کافی تگڑی ہو چکی تھی۔ اس نے سب کے سامنے ہی اخلاق کو اچھی خاصی چھینٹی لگا دی۔ اس نے اس کی ناک پہ مکا مارا جس سے اس کی نکسیر پھوٹ گئی۔ اس نے خون دیکھا تو اس کی گرمی کچھ کم ہوئی۔ زبان سے بھی وہ اسے گندی گندی گالیاں دے رہی تھیں۔ گاؤں کے لوگ اس تماشے سے خوب محظوظ ہوئے۔

اس واقعے کے بعد اس کی دھاک شوہر پہ بیٹھ گئی۔ اخلاق اب اس کے سامنے کافی دبا دبا سا رہنے لگا۔

بھینس بک چکی تھی۔ اخلاق گھر میں خرچے کے لیے اسے ایک دھیلا تک نہیں دیتا تھا۔ اس سے پہلے کبھی اسے اس سے مانگنے کی ضرورت بھی نہیں پڑی تھی۔ مگر اب اسے خرچا چاہیے تھا۔ اس نے اخلاق سے خرچ کا تقاضا کیا تو وہ بھتھے سے اکھڑ گیا۔

''سودا سارا میں لاتا ہوں تم نے پیسوں کا کیا کرنا ہے؟'' وہ جھلا کے بولا۔

''سو ضرورتیں ہوتی ہیں اب سب آپ کو تو نہیں بتائی جا سکتیں ناں۔'' وہ غصے سے بولی مگر اخلاق پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ بچوں کو بھی جیب خرچ نہیں دیتا تھا۔ اس کے چار بچے اسکول جانا شروع ہو گئے تھے وہ جب صبح اسکول جاتے ہوئے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھتے تو اس کا دل کٹ جاتا۔ وہ انہیں ایک دو روپے دے کے بہلاتی۔ وہ کبھی کبھار کوئی بکری یا مرغی وغیرہ بیچتی تو اسے کچھ رقم ملتی۔ اس سے وہ بچوں کے لیے کپڑے لے آتی اور بچوں کو جیب خرچ بھی اسی میں سے دیتی۔ مگر اس طرح گزارہ مشکل تھا۔

وہ ایک دن اپنے پڑوس میں گئی تو وہاں ایک غیر مرد کو دیکھ کے ٹھٹک گئی۔

''کلثوم کدھر ہے؟'' اس نے جھجکتے ہوئے اپنی پڑوسن کے بارے میں استفسار کیا۔

''پتا نہیں شاید بکریاں چرانے گئی ہے۔'' وہ بولا۔

لہجے سے وہ پڑھا لکھا لگتا تھا۔ مگر اس کی بھوکی نظریں زرینہ کو پریشان کر رہی تھیں۔ اس کی قمیص کا چاک ادھڑا ہوا تھا جس میں سے اس کی دودھیا جلد نظر آ رہی تھی۔ وہ اسی کو گھورے جا رہا تھا۔ جیسے اسی نشانی سے اس کے پورے جسم

کے بارے میں اندازہ لگا رہا ہو۔

زرینہ کی شکل صورت گو کے عام سی تھی۔ مگر صاف رنگت کے باعث وہ کافی پُرکشش لگتی تھی۔ سخت محنت کی بدولت جسمانی لحاظ سے وہ اب بھی اسمارٹ تھی۔ وہ کہیں سے پانچ بچوں کی ماں نہیں لگتی تھی۔

''ٹھیک ہے میں شام کو آجاؤں گی۔'' وہ اس کی نظروں سے گھبرا کے بولی۔

''وہ آتی ہی ہوگی۔ آپ بیٹھیں تو سہی۔'' وہ نرمی سے بولا۔

☆☆☆

زرینہ نے کسی مرد کو پہلی بار اتنی نرمی سے بولتے سنا تھا۔ ورنہ اخلاق کی طرح گاؤں کے تقریباً سارے مرد اکھڑ لہجے میں بات کرنے کے عادی تھے۔ اس نے پلکیں اٹھا کے اسے غور سے دیکھا۔ اس کا دل دھڑکنے لگا۔ وہ چالیس سال کا ایک خوبرو شخص تھا۔ اس کی نظریں جو چند لمحے پہلے زرینہ کو ناگوار گزر رہی تھیں۔ اچانک اچھی لگنے لگیں۔

وہ سامنے والی چارپائی پر ٹک کے بیٹھ گئی۔

''آپ کدھر رہتی ہیں؟'' کچھ دیر کی خاموشی کے بعد وہ گویا ہوا۔

''یہ ساتھ ہی دو گھر چھوڑ کے تیسرا گھر ہمارا ہے۔'' وہ اپنے گھر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ''آپ کو میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا؟'' اس نے جواب دیتے ہی سوال کیا۔

''اس کا تو مجھے بھی افسوس ہے کہ اس سے پہلے آپ مجھے اور میں آپ کو کیوں نہیں دیکھ سکا۔'' وہ ٹھیٹ عاشقانہ لہجے میں بولا۔

زرینہ اس کو الجھی ہوئی۔ نظروں سے دیکھنے لگی تو وہ جلدی سے بات بدل کر بولا۔

''میں کلثوم کے تائے کا بیٹا ہوں۔ ساتھ والے گاؤں سے آیا ہوں مگر زیادہ زندگی میں نے شہر میں گزاری ہے۔''

زرینہ کو دھیمے لہجے میں بولتا وہ شخص بہت اچھا لگا۔ گو کہ اس کے پہلے جملے کی سمجھ اسے پوری طرح نہیں آئی تھی مگر پھر بھی اس کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی تھی۔

''اور کچھ پوچھنا ہے میرے بارے میں؟'' اسے خاموش دیکھ کے وہ شرارت بھرے لہجے میں بولا۔

''آپ کے بچے کتنے ہیں؟'' اس نے سادگی سے پوچھا۔

''آہ...... بچے پیدا کرنے والی ہی نہیں ہے تو بچے کہاں سے آئیں گے۔'' وہ مصنوعی سنجیدگی سے بولا۔

''کیوں جی آپ کی بیوی مرگئی ہے؟'' زرینہ کو کہاں اُتنے لچھوں کی سمجھ تھی۔ وہ الجھن زدہ لہجے میں بولی۔

''نہیں جی میں نے ابھی تک شادی ہی نہیں کی۔'' اس بار اس نے سیدھا سادہ جواب دیا جو زرینہ کو سمجھ تو آگیا۔ مگر اس کی الجھن اور بڑھ گئی۔

''کیوں جی آپ تو اتنے بڑے ہوگئے ہیں پھر شادی کیوں نہیں کی؟'' وہ پھر سادگی سے بولی۔

اس کا سوال سن کے اس شخص کے چہرے پہ مسکراہٹ نمودار ہوگئی۔

''بس کیا بتاؤں آپ جیسی کوئی حسین خاتون ملی ہی نہیں۔'' وہ مصنوعی تاسف سے بولا۔

زرینہ کا چہرہ شرم کے مارے سرخ ہوگیا۔ اس نے زندگی میں پہلی بار اس طرح کی باتیں سنی تھیں۔

وہ شخص دلچسپی سے اس کے چہرے پہ بکھرتے رنگوں کو دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر کے بعد وہ بولا۔ ''آپ نے اپنا نام ابھی تک نہیں بتایا؟''

''جی میرا نام زرینہ ہے۔'' یہ کہہ کے وہ اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

''ہمم......'' اس نے ہنکارا بھرا۔ ''اچھا نام ہے۔'' پھر وہ ذرا سے توقف کے بعد بولا۔ ''میرا نام ارشد ہے شہر میں میرا بہت بڑا کاروبار ہے اور کافی بڑا گھر بھی ہے۔ تم میرے گھر چلو گی ناں؟''

''آپ کے گھر میں اور کون کون رہتا ہے؟'' زرینہ نے جواب دینے کے بجائے الٹا سوال کیا۔

''میں اکیلا ہی رہتا ہوں۔ تم میرے ساتھ کسی دن شہر چلنا۔ میں تمہیں ڈھیر سارے کپڑے بھی خرید دوں گا۔'' وہ زرینہ کی پھٹی ہوئی قمیص کو گرسنہ نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

☆☆☆

زرینہ کا اسے تم کہہ کے پکارنا اچھا لگ رہا تھا اور اس کی دعوت سننے کے بعد وہ لال گلابی ہوگئی۔

''نورین کا ابا کہاں مجھے شہر جانے کی اجازت دے گا۔'' وہ مایوسی سے بولی۔

''تم اسے بتانا ہی نہیں، میں تمہیں شام کو گھر چھوڑ دوں گا۔ میرے پاس اپنی گاڑی ہے۔'' اس نے مشورہ دیا۔

''آپ مجھے شہر میں کوئی نوکری دلوا سکتے ہیں؟'' اس

نے سوچا اگر یہ شخص اتنا مہربان ہے تو کیوں نہ اس سے پوری طرح فائدہ اٹھایا جائے۔ ویسے بھی وہ کافی دن سے سوچ رہی تھی کہ اپنے خرچے پورے کرنے کے لیے کوئی نوکری کر لے۔ گاؤں میں روڈ کے آنے سے شہر کا فاصلہ کافی کم ہو گیا تھا۔ اب گاڑی آدھے گھنٹے میں شہر پہنچا دیتی تھی، اس لیے گاؤں کی کچھ خواتین شہر جا کے ایک فیکٹری میں نوکری کرنے لگی تھیں۔

''یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں تم جو نوکری کرنا چاہو تمہیں مل جائے گی، بس کل تم میرے ساتھ شہر چلو۔'' اس نے جال کو مزید مضبوط کیا۔

''ٹھیک ہے میں کل تیار رہوں گی۔'' وہ نیم رضامندی سے بولی۔

''تم دس بجے نکڑ پہ پہنچ جانا، میری سفید کار ادھر ہی کھڑی ہے۔''

''ٹھیک ہے میں آجاؤں گی۔ نکڑ گاؤں کی آبادی سے ہٹ کے تھی۔ اور ادھر کسی کے دیکھ لینے کا ڈر بھی نہیں تھا۔ اس لیے اس نے اپنی رضامندی دے دی، نکڑ سے آگے روڈ کچا تھا شاید اس لیے اس نے گاڑی آگے نہیں لائی تھی۔

ارشد کے چہرے پہ فاتحانہ تاثرات ابھرے وہ اپنی چارپائی سے اٹھ کے اس کی طرف بڑھا۔

زرینہ اسے اپنی طرف آتا دیکھ کے اٹھ کھڑی ہوئی۔

اس نے زرینہ کے پاس پہنچ کے اسے دونوں کندھوں سے تھام لیا۔

زرینہ کا دل کنپٹیوں میں دھک دھک کرنے لگا۔ اس نے پلکیں جھکا لیں۔

اس کا ردِعمل دیکھ کے ارشد کی ہمت بڑھی اس نے نرمی سے اس کے رخسار کو چوما۔

اسی لمحے باہر کھٹکا سا سنائی دیا، ارشد تیزی سے پیچھے ہٹا۔ زرینہ نے بھی دروازے کی طرف قدم بڑھا دیے، اس کے قدم من بھر کے ہو رہے تھے اور اس کا دل کنپٹیوں میں دھڑک رہا تھا۔

اسی لمحے کمرے کا دروازہ کھلا اور کلثوم اندر داخل ہوئی وہ زرینہ کو دیکھ کے ٹھٹک گئی اور اسے شکی نظروں سے دیکھنے لگی۔

''کدھر تھیں تم؟ میں ابھی تمہارا پتا کرنے آئی تو انہوں نے بتایا کہ تم گھر میں نہیں ہو۔'' زرینہ نے اپنی گھبراہٹ چھپاتے ہوئے اس سے سوال کیا۔

''میں بکریوں کو چرانے گئی ہوئی تھی۔ تم بتاؤ خیریت تھی ناں؟''

''ہاں خیریت ہی ہے۔ سو روپیا ادھار ہوگا تمہارے پاس؟'' اس نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

اس کا سوال سن کے کلثوم کے چہرے پہ ناگواری کے تاثرات ابھرے اور وہ اسی لہجے میں بولی۔ ''میرے پاس کہاں سے آئے پیسے ابھی تم نے پچھلا پانچ سو روپیا بھی واپس نہیں کیا۔''

''چلو ٹھیک ہے میں کہیں اور سے کر لوں گی، اور جلد ہی تمہیں باقی پیسے بھی واپس کر دوں گی۔'' اس نے ارشد کی طرف دیکھتے ہوئے سرد مہری سے جواب دیا اور دروازے کی طرف قدم بڑھائے۔

کلثوم نے اسے رسماً بھی رکنے کا نہیں کہا۔

زرینہ کو اس وقت کسی چیز کی پروا بھی نہیں تھی۔ وہ گھر جا کے کام کاج میں مشغول ہو گئی مگر بار بار اسے اپنے رخسار پر اس کے لبوں کی تپش محسوس ہونے لگتی۔

شام کو اخلاق گھر آیا تو آتے ہی اس سے پانی مانگنے لگا زرینہ اپنے خیالات میں مگن تھی کہ اسے آواز ہی نہیں آئی۔

کچھ دیر کے بعد وہ دھاڑا۔ ''کدھر مر گئی ہو تم سے پانی مانگا تھا۔''

زرینہ کو بھی غصہ آ گیا وہ اس سے بھی اونچی آواز میں بولی۔ ''فارغ نہیں ہوں میں خود پی لو۔''

☆☆☆

اخلاق نے اب اس سے مار پیٹ چھوڑ دی تھی۔ وہ مغلظات بکنے لگا۔

زرینہ خاموش رہی کچھ دیر کے بعد وہ خود ہی چپ ہو گیا۔ اسے آج جتنی نفرت اس سے محسوس ہو رہی تھی اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔

اس رات اسے بہت دیر سے نیند آئی تھی۔ وہ آنے والے دن کے حوالے سے سوچ رہی تھی۔ کبھی اسے لگتا کہ وہ کچھ غلط کرنے جا رہی ہے۔ مگر اگلے ہی لمحے اس کا دل اپنی من مانی کرنے لگتا۔

اگلی صبح اس نے جلدی سے کام کاج نمٹائے۔ اس نے اپنا تین سالہ بیٹا بھی دوسرے بچوں کے ساتھ اسکول بھیج دیا تھا۔ اخلاق صبح سویرے ہی گھر سے نکل جاتا تھا۔ آمدنی تو اس کی ٹھیک ٹھاک تھی مگر وہ ساری اضافی آمدنی چرس پہ لگا دیتا۔

کام کاج نمٹانے کے بعد اس نے غسل کیا۔ تبت کریم

لگانے سے اس کا چہرہ دمکنے لگا تھا۔ دنداسے سے اس نے ہونٹوں کو رنگا تو وہ دہکنے لگے۔ اس نے آئینے میں اپنا جائزہ لیا تو شرما گئی۔ وہ شادی کے اولین دنوں کے بعد پہلی بار کسی مرد کے لیے تیار ہوئی تھی۔

ارشد گاڑی میں اس کا پہلے سے انتظار کررہا تھا۔ یہ ایک مہران تھی مگر زرینہ اس سے بھی متاثر ہوئی۔ اس کے لیے یہ بھی مرسڈیز سے کم نہیں تھی۔ گاڑی ایک ویران جگہ کھڑی تھی وہ گاڑی میں بیٹھی تو ارشد نے ادھر ہی اسے دبوچ لیا۔ وہ برسوں کا پیاسا لگ رہا تھا۔

زرینہ نے کوئی احتجاج نہیں کیا۔

کچھ دیر کے بعد وہ پیچھے ہٹا اور گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ راستے میں بھی وہ اس سے چھیڑ چھاڑ کرتا رہا۔

وہ آدھے گھنٹے میں ہی شہر پہنچ گئے۔

"پہلے تمہارے لیے کپڑے لیں یا گھر چلیں۔ اس نے شہر میں داخل ہوتے ہی اس سے سوال کیا۔"

"آپ مجھے نقد پیسے دے دیں جی میں خود کپڑے لے لوں گی۔ ویسے بھی میں نے کلثوم کا پانچ سو روپیا دینا ہے۔ اس نے نظریں جھکاتے ہوئے جواب دیا۔"

"اوکے جیسی تمہاری مرضی۔ اس نے کندھے اچکائے۔

کچھ دیر کے بعد وہ اس کے گھر میں داخل ہورہی تھی۔ یہ پانچ مرلے پر بنا ہوا ایک منزلہ مکان تھا۔ زرینہ ہر چیز کو حسرت بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

اس دن پہلی بار زرینہ کو مرد اور عورت کے تعلق کی خوبصورتی کا صحیح طور پر اندازہ ہوا۔

دن کا کھانا ارشد نے باہر سے منگوایا۔ کھانا کھانے کے بعد وہ پھر سے ایک دوسرے میں گم ہوگئے۔ شام کو ارشد نے اسے ایک ہزار روپیا دیا تو اس نے اس سے پوچھا۔

"آپ نے کہا تھا کہ آپ مجھے نوکری دلوائیں گے؟"

"کیوں جانم یہ نوکری جو تم نے کی اس کا مزہ نہیں آیا جو اور نوکری کا کہہ رہی ہو؟" اس نے بازاری لہجے میں سوال کیا۔

"کیا مطلب؟" وہ الجھن زدہ لہجے میں بولی۔

"مطلب یہ کہ تم ہفتے میں ایک بار آجایا کرو میں تمہیں کچھ پیسے دے دیا کروں گا۔ ویسے بھی تمہیں جہاں بھی نوکری دلوائی تمہیں یہی سب کچھ کرنا پڑے گا۔"

"اچھا جی، چلیں ٹھیک ہے میں آجایا کروں گی۔" اس نے کہا۔ دل میں وہ خوش ہورہی تھی کہ اتنے پیسے ملے۔

وہ اسے اڈے تک چھوڑ آیا جہاں سے ان کے گاؤں کی گاڑیاں مل جایا کرتے تھیں۔

کچھ ہفتے اسی طرح گزر گئے لیکن اس کے بعد ارشد نے اسے پانچ سو روپے سے زیادہ نہیں دیئے تھے۔ بلکہ ایک دو بار تو اس نے ایسے ہی ٹرخا دیا۔

دو ماہ بعد زرینہ اس کے پاس گئی تو اس کے ساتھ ایک اور شخص بھی تھا۔ ارشد اسے الگ کمرے میں لے گیا اور اس سے بولا۔ "یہ شخص بہت امیر ہے تم اسے بھی خوش کرو یہ تمہیں ہزار روپیا دے گا۔ زرینہ کو پیسوں کی لت لگ چکی تھی وہ مان گئی۔ وہ دن ان تینوں نے اکٹھے گزارا تھا۔ اس کے بعد ہر ہفتے کوئی نیا مرد اس کے ساتھ ہوتا۔ ارشد بعض اوقات اسے اڈے تک چھوڑنے جاتا تھا۔ کئی دفعہ گاؤں کے لوگوں نے اسے اس کے ساتھ دیکھا، گاؤں میں اس کے متعلق چہ میگوئیاں شروع ہوگئیں۔ بات پھیلتے پھیلتے اخلاق تک بھی پہنچ گئی۔ اس نے زرینہ سے اس بارے میں استفسار کیا تو وہ ہتھے سے ہی اکھڑ گئی۔

"میں شہر میں ایک صاحب کے ہاں ہفتے میں ایک بار کپڑے دھونے جاتی ہوں۔ تم تو مجھے ایک روپیا تک نہیں دیتے مجبوراً مجھے نوکری کرنا پڑ رہی ہے۔ تم مجھے پیسے دیا کرو میں نوکری چھوڑ دوں گی۔" وہ غصے سے بولی۔

پتا نہیں اخلاق کو اس کی بات کا یقین آیا تھا یا نہیں مگر وہ پیسوں کی ڈیمانڈ سن کے خاموش ہوگیا۔

اس دوران ان کی بڑی بیٹی نورین میٹرک کر چکی تھی۔ ان کے گاؤں میں ہائی اسکول تو تھا مگر کوئی کالج نہیں تھا۔ زرینہ نے اسے شہر میں کالج میں داخلہ دلوایا۔ اخلاق نے اس پر بھی اعتراض کیا۔ مگر زرینہ .... اس کا اعتراض خاطر میں نہ لائی۔ نورین روزانہ ایک ہی گاڑی میں کالج جاتی تھی۔ اس کا اس گاڑی کے ڈرائیور کے ساتھ چکر شروع ہوگیا۔ وہ اکثر کالج جانے کی بجائے دن بھر اس کے ساتھ گھومتی رہتی۔ وہ رات کو بھی اس کے گھر آنے لگا۔ آہستہ آہستہ سب گاؤں کے لوگ بھی باخبر ہوگئے۔ زرینہ کو اس سارے معاملے کی خبر تھی مگر وہ ڈرائیور اسے بھی کچھ پیسے دے دیتا۔ اس لیے زرینہ نے ان کے تعلق پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔

اخلاق کو اس بارے میں خبر ہوئی تو اس نے اپنی بیٹی کو خوب پیٹا۔ زرینہ اس وقت گھر میں نہیں تھی۔ وہ گھر آئی تو اس نے نورین کا سوجا ہوا چہرہ دیکھا۔ وہ اس کی حالت دیکھ کے آگ بگولہ ہوگئی۔ اس نے جا کے اخلاق کا گریبان پکڑ لیا۔

1987ء سے خدمت میں مصروف

پھلبہری
قابلِ علاج مرض ہے

ملٹی
ایوارڈ
ہولڈر

اجمل زیدی

ماہر امراض

کے دورۂ پاکستان کا مستقل پروگرام

اسلام آباد

"تم نے اپنی اولاد کے لیے کیا کیا ہے۔ تمہارا اس پر کوئی حق نہیں۔ تم ہوتے کون ہو اس پر ہاتھ اٹھانے والے۔"
وہ اس کا گریبان جھنجوڑ جھنجوڑ کے پوچھنے لگی۔
وہ اس کے تیور دیکھ کے گھبرا گیا۔ وہ اس وقت تو خاموش ہو گیا مگر گاؤں کے لوگوں کی طنزیہ نظریں دیکھ کے اس کے دل پر چھریاں چلنے لگتیں۔ کئی لوگ اسے اس کے سامنے بے غیرت اور جورو کا غلام جیسے خطابات دیتے۔ آہستہ آہستہ اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور اس نے ایک بھیانک فیصلہ کر لیا۔

☆☆☆

اخلاق نے کلہاڑی کا وار زرینہ کی گردن پر کیا تھا۔ اس کی گردن سے بھل بھل بہتا خون دیکھ کر اس کی وحشت میں مزید اضافہ ہو گیا، چیخ کی آواز سے اس کے بچوں کی آنکھ بھی کھل گئی تھی۔ سب سے پہلے اس کا چھوٹا بیٹا امی امی پکارتے اس کی طرف دوڑا اس نے اس پر بھی الٹی کلہاڑی سے وار کیا۔ وہ اس کے سر پہ لگا اور وہ ادھر ہی گر کے بے ہوش ہو گیا۔ اس کی دونوں بیٹیاں چیخ و پکار کرنے لگیں۔ پہاڑی علاقہ ہونے کے باعث گھر کافی دور دور تھے۔ رات کے اس پہر سب سوئے ہوئے تھے۔ ان کی چیخ و پکار کی آواز کسی نے نہیں سنی۔ باہر لومڑی پھنکار رہی تھی جیسے وہ بھی اس وحشیانہ عمل پر بین کر رہی ہو، اس کی آواز سن کر کتے بھی بھونکنے لگے۔
مگر اندر اخلاق پر جنون سوار تھا۔ وہ بہرہ بن چکا تھا۔ وہ زرینہ پر بے دریغ وار کرتا جا رہا تھا۔ تانیہ اس کی طرف ہاتھ جوڑتے ہوئے آگے بڑھی۔ "نہیں ابو نہیں..... وہ اس سے فریاد کرنے لگی۔ مگر اسے اس وقت کوئی آواز نہیں سنائی دے رہی تھی۔ اس نے اس پر بھی کلہاڑی کا وار کیا جو اس کے سر پر لگا۔ نورین بہن کی بھی یہ حالت دیکھ کے سمجھ گئی کہ اگلی باری اسی کی ہے۔ اس نے بھاگنے کی کوشش کی مگر کلہاڑی کے ایک ہی وار سے اس کی ٹانگ کٹ کے دور جا گری۔ وہ ادھر ہی گر کے تڑپنے لگی۔ جانے اس وقت اخلاق میں اتنی طاقت کہاں سے آ گئی تھی۔ اگلا وار اس نے اس کے سر پر کیا۔ وہ اس پر بے دریغ وار کرتا گیا۔ آخر کار کلہاڑی خود اس کے ہاتھ سے نیچے جا گری۔ وہ ادھر ہی چار پائی پر بیٹھ گیا۔
باہر فجر کی اذانیں ہو رہی تھیں۔ ایک شخص نماز پڑھنے کے لیے مسجد جا رہا تھا۔ وہ ان کے مکان کے سامنے سے گزرنے لگا تو کھلا ہوا دروازہ دیکھ کے ٹھٹکا۔ ایک کمرے کی لائٹ بھی روشن تھی۔ تھوڑی بہت روشنی بھی پھیل چکی تھی۔ اسے باہر سے ہی دروازے کے قریب خون میں لت پت پڑی لاش نظر آ گئی۔ وہ ڈرتے ڈرتے اندر آیا تو اندر کا منظر دیکھ کے بھونچکا رہ گیا۔ کمرے میں خون کا تالاب لگا تھا۔ اخلاق ایک چار پائی پر بیٹھا خالی خالی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ اس کے تاثرات دیکھ کے سمجھ گیا کہ وہ اپنے آپ میں نہیں۔ وہ مسجد سے جا کے مزید لوگوں کو لے آیا۔ ان سب نے مل کے اخلاق کو ایک رسی سے باندھ دیا۔ اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ وہ انہیں خالی خالی نظروں سے دیکھتا رہا۔
زرینہ اور نورین کی لاشیں تو کئی ٹکڑوں میں بٹ چکی تھیں۔ البتہ ابرار اور تانیہ بے ہوش تھے انہیں اسپتال پہنچا دیا گیا۔ صبح ہوئی تو ہر طرف کہرام برپا ہو گیا۔ لرزہ خیز قتل کی خبر جنگل میں آگ کی طرح سارے علاقے میں پھیل گئی۔ پولیس آئی اور اخلاق کو پکڑ کے لے گئی۔
تانیہ کا خون بہت زیادہ بہہ گیا تھا۔ ایک ہفتہ زندگی و موت کی کشمکش کے بعد وہ بھی زندگی کی بازی ہار گئی۔ البتہ ابرار کو معمولی زخم آیا تھا۔ اس کا وہ زخم تو بھر گیا مگر اس کے معصوم ذہن پر جو چرکا لگا تھا۔ اس نے اسے بالکل ہی خاموش کر دیا۔
اخلاق نے اپنا جرم قبول کر لیا مگر اس کی وجہ نہیں بتائی۔ اسے پھانسی کی سزا ہو گئی۔
اس کے تینوں بچوں کو ننھیال والے اپنے گھر لے گئے۔ باقی دونوں بچے تو کچھ عرصے میں سب بھول بھال گئے۔ مگر ابرار کے ذہن پر بہت گہرا اثر پڑا تھا۔ وہ سودائی ہو گیا۔ اب وہ جوان ہو چکا ہے مگر اسے اپنا کوئی ہوش نہیں وہ دیوانوں کی طرح اِدھر اُدھر پھرتا رہتا ہے۔ اس کی اس حالت کا ذمہ دار کون تھا؟
اس کی ماں..... زرینہ؟ جس نے اپنی خواہشات و ضروریات کی تکمیل کے لیے چور راستہ اختیار کیا۔
یا
نورین جس نے باپ کی عزت کا خیال نہیں کیا۔
یا پھر
اخلاق جس نے اولاد پیدا تو کر لی مگر اپنی اولاد اور بیوی کی ضروریات پوری نہیں کیں؟
آج بھی جب کبھی میں ابرار کو دیکھتا ہوں تو میرے ذہن میں سوال پیدا ہوتا ہے مگر میرے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں۔

خود گزیدہ

محترمی
مؤدبانہ سلام
میں ایک خود گزیدہ شخص ہوں۔ جی ہاں، اپنے پیروں پر خود کلہاڑی مارنے والا۔ میں نے اپنی زندگی خود برباد کی ہے۔ میری طرح اس ملک میں ہزاروں نوجوان ہوں گے جو لڑکیوں کے دلوں کو کھلونا سمجھ کر خوب کھیلتے ہیں مگر وہ بھول جاتے ہیں کہ ہر امر کی ایک سزا بھی ہے۔ مجھے میرے فعل کی کیسی سزا ملی۔ آپ بھی ملاحظہ کریں۔

نعمان صدیقی
(کراچی)

ان دنوں دفتر کا ماحول خاصا رنگین ہو رہا تھا۔ حال ہی میں ایک نئی اسسٹنٹ سیلز منیجر حنا کا تقرر ہوا تھا۔ وہ مناسب جسامت کی حامل خاصی خوبصورت لڑکی تھی۔ دفتر کے کئی دل پھینک نوجوان پہلے ہی دن اس کے عشق میں مبتلا ہو گئے۔ وہ تھی بھی خاصی شوخ و شنگ، ہر فرد سے خوش اخلاقی سے بات کرتی تھی اور بات بات پر مسکراتی تھی۔ وہ جدید فیشن کے خاصے مہنگے اور برانڈڈ ملبوسات استعمال کرتی تھی اور خاصا مہنگا پرفیوم لگاتی تھی۔ اس کی مخصوص مہک سے اس

کی آمد کا علم ہو جاتا تھا۔

مجھے بھی وہ لڑکی پہلی ہی نظر میں بھا گئی تھی لیکن میں دوسروں کی طرح کچا کھلاڑی نہیں تھا بلکہ خوبصورت لڑکیوں کو اپنے ڈھب سے شکار کرتا تھا۔ مجھے جدید تراش کے مہنگے ملبوسات کا شوق تھا۔ میں بھی قیمتی پرفیوم استعمال کرنے کا عادی تھا اور سب سے اہم بات یہ تھی کہ میں اس ادارے میں مارکیٹنگ منیجر تھا۔ یوں حنا براہِ راست میری ہی ماتحت تھی۔

حنا سمیت اب دفتر میں تین اسسٹنٹ منیجر ہو گئے تھے۔ وسیم اور اکرم وہاں خاصے سینئر تھے۔ اکرم بال بچے والا آدمی تھا۔ وہ یوں بھی اپنے کام سے کام رکھتا تھا اس لیے وہ حنا سے بھی لیے دیے رہتا تھا۔

وسیم نے گزشتہ سال ہی ادارے میں ملازمت کی تھی۔ وہ میری طرح خوش لباس اور جامہ زیب نوجوان تھا۔ لچھے دار گفتگو کا فن بھی جانتا تھا اور میری طرح وہ بھی کنوارا تھا۔ حنا کی طرف اس کا جھکاؤ فطری تھا۔

لڑکیوں کے معاملے میں وہ کسی بھی طرح میری برابری نہیں کر سکتا تھا۔ پہلی بات تو یہ کہ وہ ایسے تعلیمی اداروں میں نہیں پڑھا تھا جہاں لڑکیوں سے اس کا واسطہ پڑتا۔ اس کے علاوہ اس پر گھر کی ذمے داریاں بھی تھیں۔ اس کے والد کسی سرکاری محکمے میں کلرک تھے اور گھریلو اخراجات کا بیشتر بوجھ وسیم کے ہی کاندھوں پر تھا۔ اس کے علاوہ میرے پاپا ایک معروف بینک میں بہت اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ میں اپنے والدین کا اکلوتا تھا اس لیے کچھ زیادہ ہی لاڈلا تھا۔ میں اپنی خاصی معقول تنخواہ میں سے کچھ بھی امی یا پاپا کو نہیں دیتا تھا۔ بہت ہوا تو کبھی ان کے لیے کوئی مہنگا گفٹ خرید لیا۔ وہ دونوں اسی میں خوش ہو جاتے تھے۔ میرے پاس جدید ماڈل کی گاڑی بھی تھی جو مجھے دفتر کی طرف سے ملی تھی۔

میں لڑکیوں سے فلرٹ کرنے میں ماہر تھا اور اب تو مجھے یہ اندازہ بھی نہیں تھا کہ اب تک کتنی لڑکیوں سے میری دوستی رہ چکی ہے۔ میں فطری طور پر حسن پرست تھا اور ہر اچھی اور خوبصورت لڑکی مجھے متاثر کرتی تھی۔

اب تک میرا واسطہ جتنی بھی لڑکیوں سے پڑا تھا حنا ان سب میں زیادہ پرکشش تھی۔ خاص طور پر اس کا جسم سانچے میں ڈھلا ہوا تھا۔ اسے دیکھتے ہی میری نگاہیں خیرہ ہو گئی تھیں لیکن میں چونکہ اس کا باس تھا اس لیے اپنا بھرم بھی برقرار رکھنا چاہتا تھا۔

حنا کو آفس میں ملازمت کرتے ہوئے ایک ماہ سے زیادہ کا عرصہ گزر گیا تھا لیکن میں نے اب تک اس سے کوئی فالتو بات نہیں کی تھی۔ اس کی آنکھوں میں مجھے اپنے لیے... توصیف نظر آتی تھی۔

ان ہی دنوں مجھے دفتر کے کام سے لاہور جانا پڑا۔ میرا خیال تھا کہ میں زیادہ سے زیادہ تین دن میں لوٹ آؤں گا۔ لیکن وہاں کام بڑھتا ہی گیا اور میری واپسی پندرہ دن سے پہلے نہ ہو سکی۔

میں واپس آیا تو حنا کے رنگ ڈھنگ ہی نرالے تھے۔ اس دوران میں نہ صرف اس میں اعتماد پیدا ہوا تھا بلکہ اس کے لباس کی تراش خراش بھی کچھ زیادہ ہی فیشن زدہ ہو گئی تھی۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ غالباً وہ میری ذات سے مایوس ہو کر وسیم میں دلچسپی لے رہی تھی۔ انہیں آپس میں ہنستا بولتا دیکھ کر میں بری طرح سلگ کر رہ گیا۔ میں نے اسی دن لنچ کے بعد وسیم کو اپنے کمرے میں بلوالیا اور اس سے گزشتہ دو ہفتے کی رپورٹ مانگی۔ مجھے اُمید تھی کہ اس کے پاس رپورٹ لکھی ہو گی اور وہ مجھے برہمی کا موقع نہیں دے گا۔

"سر...... رپورٹ ابھی مکمل نہیں ہے۔" اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "میں کل تک مکمل رپورٹ آپ کو پیش کر دوں گا۔"

وہ اپنا کام ذمے داری سے کرتا تھا۔ مجھے اُمید نہیں تھی کہ اس نے اپنے کام میں کوتاہی برتی ہو گی۔ مجھے اچانک غصہ آ گیا اور میں نے کہا۔ "میری غیر حاضری میں کیا تم جھک مارتے رہے ہو۔"

"سر...... وہ...... کچھ...... ایسی......"

"کوئی ایکسکیوز کرنے کی کوشش نہ کرو۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "مجھے ابھی ایک گھنٹے کے اندر اندر مکمل رپورٹ چاہیے۔"

وہ مرے مرے لہجے میں بولا۔ "کوشش کروں گا۔"

"کوشش نہیں بلکہ اپنی رپورٹ کمپلیٹ کرو۔ اور ہاں جاتے ہوئے ذرا اکرم صاحب کو میرے روم میں بھیج دینا۔"

وسیم کی اس حرکت سے میرا موڈ واقعی آف ہو گیا تھا۔ اگلے دن مجھے وہ مکمل رپورٹ اپنے ایم ڈی اکبر صاحب کو دینا تھی۔

تھوڑی دیر بعد اکرم صاحب آ گئے۔ وہ ادارے میں مجھ سے جونیئر تھے لیکن عمر میں کافی بڑے تھے۔ وہ سیلز

ڈیپارٹمنٹ کے نچلے درجے سے ترقی کرتے ہوئے اس عہدے تک پہنچے تھے۔ وہ دستک دے کر اندر داخل ہوئے اور بولے۔ ''نعمان بیٹا، آپ نے مجھے بلایا؟'' وہ مجھے اسی طرح مخاطب کرتے تھے۔

''تشریف رکھیے۔'' میں نے کہا تو وہ کرسی کھینچ کر بیٹھ گئے۔ میں چند لمحے کچھ سوچتا رہا پھر بولا۔ ''اکرم صاحب! آپ تو اس ڈیپارٹمنٹ میں خاصے سینئر ہیں۔ میری دو ہفتے کی غیر حاضری میں سارا نظام ہی چوپٹ ہو کر رہ گیا ہے۔ کیا میرے بعد یہاں کوئی کام نہیں ہوا ہے؟'' میں نے سرد لہجے میں پوچھا۔

''سب کچھ معمول کے مطابق ہوا ہے اور اپ ٹو ڈیٹ ہے بیٹا!'' انہوں نے کہا۔

''معمول کے مطابق ہے تو وسیم کا کام ادھورا کیوں ہے؟ کیا اس نے کوئی کام نہیں کیا؟''

''بیٹا! کام تو وسیم صاحب نے کیا ہے۔'' اکرم صاحب نے کہا۔ ''بس اس نئی لڑکی کو کام سکھانے اور سمجھانے میں کوئی کام رہ گیا ہو تو کہہ نہیں سکتا۔''

ان کا کام اپ ٹو ڈیٹ تھا۔ میں نے ان سے کہا کہ اپنی مکمل رپورٹ مجھے ای میل کریں یا اس رپورٹ کا پرنٹ آؤٹ نکال کر مجھے پہنچا دیں۔ اکرم صاحب کے جانے کے بعد میں سوچتا رہا کہ مجھے اتنا غصہ کیوں آ رہا ہے؟ اس سے قبل بھی میرے ماتحتوں نے کہیں زیادہ غیر ذمے داری کا ثبوت دیا تھا۔ یہ شاید میرے اندر کی جھنجلاہٹ تھی۔ میں حنا پر اپنا حق سمجھتا تھا اور وسیم اسے ایک طرح لے اڑا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں ارادہ کر لیا کہ وسیم کو اس کے ارادوں میں ہرگز کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔

میں نے انٹرکام کر کے حنا کو اپنے کمرے میں بلایا۔ وہ لہراتی، لچکاتی میرے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی اور اپنی بڑی بڑی معصوم آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگی۔ اس نے بہت سلیقے سے میک اپ کر رکھا تھا۔ جسم پہ چست لباس تھا اور قمیص کا گلا اتنا کشادہ تھا کہ میں اسے دیکھ کر لمحے بھر کو گھبرا گیا۔ وہ خاصی بے باکی سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

''بیٹھیے......'' میں نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ ایک شانِ بے نیازی سے بیٹھ گئی۔

''مس حنا!'' میں نے کہا۔ ''آپ کو جوائن کیے ہوئے تقریباً ڈیڑھ ماہ سے زیادہ ہو گیا ہے۔ اس دوران میں آپ نے کیا سیکھا؟''

''میں کیا سیکھ سکتی ہوں سر!'' اس نے اپنی مترنم آواز میں کہا۔ ''یہاں کوئی سکھانے والا ہی نہیں ہے۔''

''کیوں، وسیم صاحب آپ کو کچھ نہیں سکھاتے؟'' میں نے چونک کر اسے دیکھا۔

''وسیم صاحب اپنی گھریلو پریشانیوں میں مبتلا ہیں۔ گزشتہ دنوں ان کے والد کی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ وہ اسپتال میں ایڈمٹ تھے۔ وسیم صاحب یہاں کے کام نمٹا کر اسپتال کی طرف دوڑ لگاتے تھے۔ ایسے میں بھلا وہ مجھے کیا سکھاتے اور میں کیا سیکھتی؟'' اس نے منہ بنا کر کہا۔

''آپ فکر نہ کریں، اب میں آپ کو سکھاؤں گا۔'' میں نے کہا۔

''سر! آپ مجھے کام سکھائیں گے؟'' اس نے حیرت سے کہا۔ ''آپ تو خود اتنے بزی رہتے ہیں۔''

''اب تمہارے لیے وقت تو نکالنا پڑے گا۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''ویسے تم خود بھی بہت ذہین ہو۔ تمہارا تعلیمی ریکارڈ بہت اچھا ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ تم بہت جلد سب کچھ سمجھ جاؤ گی۔''

وہ میرا شکریہ ادا کر کے واپس جا رہی تھی کہ دستک دے کر وسیم کمرے میں آ گیا اور بولا۔ ''سر! میں نے تقریباً تمام کام نمٹا لیا ہے۔ بس کچھ کام باقی ہے، وہ میں آپ کو چار بجے تک دے دوں گا۔'' اس نے ایک فائل میری طرف بڑھائی جس میں اس کی رپورٹ کے پرنٹ آؤٹس تھے۔

''وسیم!'' میں نے اسے مخاطب کیا۔ ''تمہارے والد اسپتال میں ایڈمٹ ہیں اور تم یہاں کام میں لگے ہوئے ہو۔ یہ بات تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتائی؟''

''سر! میں نے جی ایم صاحب کو بتایا تھا۔ میرا خیال تھا کہ انہوں نے آپ کو بتا دیا ہوگا۔''

''تم ایسا کرو......'' میں نے کہا۔ ''کام تو چھوڑو، اکرم صاحب کام دیکھ لیں گے۔ تم آفس سے کچھ دن کی چھٹی لے لو۔ جب تمہارے والد صاحب کی طبیعت ٹھیک ہو جائے تو آ جانا۔''

وسیم نے حیرانی سے مجھے دیکھا کہ کہیں میں اس پر طنز تو نہیں کر رہا ہوں لیکن میرے چہرے پر ایسی کوئی بات نہیں تھی۔

''تم مجھے چھٹی کی درخواست دے دو۔'' میں نے نرمی سے کہا۔

''او کے سر!'' وسیم نے ممنونیت سے سر جھکا کر کہا۔

"تھینک یو سر!"
"ہاں، اگر کچھ ایڈوانس رقم کی ضرورت ہو تو اس کے لیے بھی اپلائی کر دینا۔" میں نے کہا۔
وسیم کی آنکھوں میں میرے لیے ممنونیت تھی۔ وہ میرا شکریہ ادا کر کے لوٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ چھٹی کی درخواست لے آیا۔ میں نے اس کی ایک ہفتے کی چھٹی منظور کرلی اور وہ اپنا کام اکرم صاحب کے حوالے کر کے روانہ ہوگیا۔
میں نے اس کے جانے کے بعد حنا کو بلایا اور اس سے پوچھا کہ اب تک تم نے کیا سیکھا ہے؟ اس نے بتایا کہ مجھے زیادہ سیکھنے کا موقع ہی نہیں ملا ہے۔ میں نے اس کی فیملی کے بارے میں پوچھا تو وہ اچانک سنجیدہ ہوگئی اور تلخی سے بولی۔ "کس فیملی کی بات کر رہے ہیں سر...... میری کوئی فیملی نہیں ہے۔"
"کوئی فیملی نہیں ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔
"تمہارے ماں باپ، بہن بھائی وغیرہ کوئی نہیں ہیں؟"
"میرا باپ سندھ کا ایک خاصا بڑا زمیندار ہے۔" حنا نے بتایا۔ "وہ تعلیم کی غرض سے لندن گیا تو اسے وہاں میری ماں پسند آگئی۔ وہ اس سے شادی کر کے پاکستان لے آیا۔ یہاں کے دوسرے زمینداروں اور جاگیرداروں کی طرح میرا باپ بھی پہلے سے شادی شدہ تھا۔ ان لوگوں کی شادی لڑکپن میں ہی ہو جاتی ہے۔ بیوی پرانے خیالات کی اور غیر تعلیم یافتہ ہوتی ہے مگر ان لوگوں کو شوپیس کے لیے دوسری شادی کی سوجھتی ہے۔ میری ماں کو بھی شوپیس بنا کر پاکستان لایا گیا تھا لیکن وہ دوسری عورتوں کی طرح شوپیس نہ بن سکی اور میرے ماں باپ میں کشیدگی بڑھنے لگی۔ اس وقت تک میں پیدا ہو چکی تھی۔ ان کے جھگڑے زیادہ بڑھے تو ماں نے طلاق کا مطالبہ کر دیا۔ میرے باپ نے میری ماں کو طلاق دے دی۔ باپ نے مجھے بھی اپنانے سے انکار کر دیا۔ ماں پڑھی لکھی تھی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ سفید چمڑی کی مالک تھی اس لیے اسے فوراً ہی ملازمت مل گئی۔ ہم ڈیفنس کے ایک چھوٹے سے مکان میں شفٹ ہوگئے۔ اس نے مجھے تعلیم دلوائی۔ میرا ہر طرح خیال رکھا لیکن پھر وہ بھی میری طرف سے بے اعتنائی برتنے لگی۔ مجھے بعد میں علم ہوا کہ اس نے دوسری شادی کرلی ہے۔ اس دن مجھے ایسا لگا جیسے میں اس بھری دنیا میں بالکل تنہا ہوگئی ہوں۔ میں اس وقت تک اے لیول کر چکی تھی۔ ماں کے رویے سے دلبرداشتہ ہو کر میں نے ملازمت کی تلاش شروع کر دی اور گھر چھوڑ دیا۔"
"تو اب تم کہاں رہتی ہو؟" میں نے پوچھا۔
"میں سوسائٹی کے ایک بنگلے میں پے انگ گیسٹ کی حیثیت سے رہتی ہوں۔" اس نے کہا۔
"اور اس سے پہلے جاب کہاں کرتی تھیں؟" میں نے اگلا سوال کیا۔
"کہیں بھی نہیں؟" اس نے جواب دیا۔ "گزر اوقات کے لیے دولت مند گھرانوں کے لڑکوں سے دوستیاں کر لیتی ہوں، وہی میرے تمام اخراجات اٹھاتے ہیں۔ جب کسی ایک لڑکے سے میرا دل بھر جائے تو میں کوئی دوسری اسامی تلاش کر لیتی ہوں۔"
میرے ذہن میں چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ میں تو حنا کو بہت اعلیٰ خاندان کی سلجھی ہوئی لڑکی سمجھ رہا تھا لیکن وہ اندر سے کیا نکلی؟ اس نے شاید میرا ذہن پڑھ لیا تھا، وہ ہنس کر بولی۔
"میں آپ کو مزے کی ایک بات بتاؤں۔ میں نے اپنے کسی بوائے فرینڈ کو ایک حد سے آگے نہیں بڑھنے دیا ہے۔ لڑکوں سے دوستی کرنا الگ ہے اور اس دوستی میں اپنی عزت آبرو گنوانا بالکل دوسری بات۔ میں نے آج تک اپنی آبرو کا سودا نہیں کیا ہے۔"
اب تک نہ جانے کتنی لڑکیوں سے میری دوستی رہی تھی لیکن حنا ان سب میں انوکھی تھی۔
اسی دوران میں لنچ کا وقت ہوگیا۔ میں نے اسے لنچ کی آفر کی تو اس نے قبول کر لی۔ ہم دونوں نزدیک ہی ایک صاف ستھرے اعلیٰ درجے کے ریسٹورنٹ میں جا بیٹھے۔ کھانے کا آرڈر دینے کے بعد میں نے ہنس کر کہا۔ "تم یہ مت سمجھنا کہ میں بھی تمہارا کوئی بوائے فرینڈ ہوں۔ بس کولیگ ہونے کے ناتے تمہیں یہاں لے آیا ہوں۔"
"اگر بوائے فرینڈ بھی ہوں تو کیا فرق پڑے گا۔" اس نے کہا۔ "مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔"
"میرے چند اصول ہیں حنا بی بی!"
میں نے اس سے مزید بے تکلف ہوتے ہوئے کہا۔ "میں اپنی کسی گرل فرینڈ سے شادی کا جھوٹا وعدہ نہیں کرتا۔ جب تک ہم ساتھ رہتے ہیں، اچھے دوستوں کی طرح رہتے ہیں۔ ایک دوسرے کی ضروریات کا خیال رکھتے ہیں۔ پھر ایک دوسرے سے اکتانے پر خاموشی سے اپنی راہیں جدا کر لیتے ہیں۔"

''یہی میرا بھی اصول ہے۔'' حنا نے کہا۔ ''لیکن میری بس ایک شرط ہے۔ میں......''

''تم بتا چکی ہو۔ ہماری دوستی ایک حد سے آگے نہیں بڑھے گی۔ دوسری بات یہ کہ آفس میں تم صرف میری ماتحت ہوگی۔ وہاں اگر میں تمہارے ساتھ بے اعتنائی سے پیش آؤں گا تو ناراض مت ہونا۔''

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ میں نے آفس کام کرنے کے لیے جوائن کیا ہے، عشق کرنے کے لیے نہیں۔'' یوں ہماری پہلی ملاقات بہت حوصلہ افزا تھی۔

میں نے آفس پہنچتے ہی سہیل کو یہ خبر سنا دی۔ سہیل میرا بچپن کا دوست تھا اور ان معاملات میں مجھ سے دو ہاتھ آگے تھا۔

''چل تیرے اسکور میں ایک اور گرل فرینڈ کا اضافہ ہو گیا۔'' سہیل نے ہنس کر کہا۔ ''مجھے لڑکی سے کب ملوا رہا ہے؟''

''اس سنڈے کو ہم آؤٹنگ کے لیے جائیں گے۔ تو بھی ہمیں اچانک مل جانا۔''

''میرے ساتھ ثمرین بھی ہوگی۔'' سہیل نے کہا۔

''وہ تیری نئی گرل فرینڈ......؟'' میں نے ہنس کر کہا۔

''یار! وہ اب میری گرل فرینڈ نہیں ہے، میں اس سے شادی کرنے کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔'' سہیل نے کہا۔

''تو کیا نو سو چوہے پورے ہوگئے۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''اب تو حج کرنے کے بارے میں غور کر رہا ہے۔''

''یار! بات مذاق کی نہیں ہے۔ میں واقعی ثمرین کے بغیر نہیں رہ سکتا۔'' پھر وہ ہنس کر بولا۔ ''تفصیلی گفتگو ملاقات پر ہوگی۔ مجھے ایک دن پہلے بتا دینا کہ تم کس پکنک پوائنٹ پر جاؤ گے۔'' یہ کہہ کر اس نے سیل فون کا سلسلہ منقطع کر دیا۔

وسیم چھٹی گزار کر واپس آیا تو خاصا مطمئن تھا۔

''تمہارے والد کی طبیعت اب کیسی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''اب تو وہ بالکل ٹھیک ہیں۔'' وسیم نے بتایا۔ ''میں نے انہیں اسپتال سے گھر شفٹ کر دیا ہے۔ بس تھوڑی کمزوری ہے، وہ بھی ایک آدھ ہفتے میں ٹھیک ہو جائے گی۔''

''اب انہیں مکمل طور پر آرام کراؤ۔ اب ان کی عمر جاب کرنے کی نہیں ہے۔'' میں نے ہمدردی سے کہا۔

''سر! اگر ابو نے جاب چھوڑ دی تو ہمارا بجٹ بہت بری طرح متاثر ہوگا۔ گھر کے چھوٹے موٹے اخراجات اور تمام یوٹیلٹی بلز ابو ہی ادا کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ چھوٹے بھائی کی اسکول فیس بھی ادا کرتے ہیں۔''

''میں اس سلسلے میں جہانگیر صاحب سے بات کروں گا۔'' میں نے کہا۔ جہانگیر صاحب ہماری فرم کے سی ای او تھے۔ ''تمہارا پروموشن اصولاً مئی میں ہوگا لیکن میں کوشش کروں گا کہ تمہیں اگلے ہی مہینے پروموٹ کر دیا جائے۔ پھر تمہارے والد صاحب کو جاب کی ضرورت نہیں پڑے گی۔''

☆......☆

اتوار کو میں نے حنا سمیت سہیل سے ملاقات کا پروگرام طے کر لیا۔ ہاکس بے پر سہیل کے ایک دوست کا ہٹ تھا۔ ہم اکثر وہیں جا کر ٹھہرتے تھے۔ میں ثمرین سے مل چکا تھا۔ وہ حنا کا پاسنگ بھی نہیں تھی۔ بس مجھے ایک ہی دھڑکا تھا کہ کہیں سہیل اپنی عادت سے مجبور ہو کر حنا پر ڈورے نہ ڈالے۔ وہ لڑکیوں کو گھیرنے میں ماہر تھا۔

ہاکس بے پر سہیل کی ملاقات حنا سے ہوئی۔ سہیل اس کے ساتھ بہت گرم جوشی سے ملا لیکن مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اس نے حنا پر زیادہ توجہ نہیں دی۔ وہ رسمی گفتگو کے بعد ثمرین کی طرف متوجہ ہو گیا۔ مجھے سہیل پر حیرت ہو رہی تھی کہ عام سی شکل و صورت کی ثمرین میں اسے ایسا بھلا کیا نظر آ گیا کہ وہ اس سے شادی کرنے پر آمادہ تھا۔

میں نے زیادہ دیر تک سر کھپانا ضروری نہ سمجھا۔ میری صحت پر اس سے کیا فرق پڑتا تھا کہ سہیل کس سے شادی کر رہا ہے۔ ہم نے اس دن خوب دل کھول کر انجوائے کیا اور شام کو واپسی میں حنا کو اس کے گھر چھوڑ دیا۔

وسیم بہت محنت اور لگن سے کام کر رہا تھا لیکن میں نے ایک بات نوٹ کی تھی کہ وہ حنا کو بہت حیرت کے ساتھ دیکھا کرتا تھا۔ میں جن دنوں لاہور میں تھا، ان دنوں شاید وسیم، حنا کے ساتھ خاصا بے تکلف ہو گیا تھا۔ حنا نے بھی اس کی حوصلہ افزائی کی ہوگی اس لیے وہ شاید حنا کو پسند کرنے لگ گیا تھا۔ اب وہ حنا کی اجنبیت اور بے اعتنائی سے کچھ پریشان تھا۔ مجھے اس کی پریشانی کی کوئی فکر نہیں تھی۔

ہر شام کو آفس کے بعد میں حنا کو ساتھ لیتا۔ ہم اس کے مکان پر جاتے۔ وہ فریش ہو کر اور کپڑے بدل کر باہر نکلتی تو ہم ایک قریبی ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر وقت گزارتے۔ کیونکہ حنا کی مالک مکان نے سختی کر رکھی تھی کہ یہاں حنا کا

کوئی مرد گیسٹ نہیں آئے گا۔ ہم رات گئے تک ایک ساتھ رہتے۔ کبھی آئس کریم کھاتے، کبھی لانگ ڈرائیو پر نکل جاتے۔

دو ہی مہینے میں میری یہ حالت ہوگئی تھی کہ مجھے حنا کو دیکھے بغیر چین نہیں آتا تھا۔ اب ہم دفتر کے بعد زیادہ سے زیادہ وقت ایک دوسرے کے ساتھ گزارنے لگے۔ مجھے اس کے ساتھ اس طویل رفاقت میں رہ کر یہ حیرت انگیز انکشاف ہوا کہ وہ دوستی میں ایک حد فاصل کی قائل تھی۔ ورنہ اس سے قبل میں اس کی بات کو جھوٹ ہی سمجھا تھا۔ یہ بھلا کیسے ممکن ہے کہ ایک خوبصورت لڑکی محض اپنی اداؤں اور خوش اندام وجود سے بوائے فرینڈز کی جیبیں خالی کرتی رہے۔ لیکن حنا نے یہ بات سچ ثابت کر دکھائی تھی۔

اس میں زیادہ دخل اس کے خوبصورت اور متناسب جسم کا تھا۔ وہ خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ بلا کی ذہین بھی تھی اور بہت چالاکی سے اپنی حفاظت کرنا جانتی تھی۔ دوسری طرف سہیل گردن گردن تک ثمرین کے عشق میں ڈوبا ہوا تھا اور مجھے لگ رہا تھا کہ کسی بھی دن ان دونوں کے نکاح کی خبر آسکتی تھی۔

امی میرے لیے لڑکیاں ڈھونڈتی پھر رہی تھیں۔ کچھ لڑکیاں ان کے معیار پر پوری نہیں اتری تھیں اور کچھ کو میں نے مسترد کر دیا تھا۔ ابو نے ڈھکے چھپے الفاظ میں امی کے ذریعے یہ باور کرا دیا تھا کہ میں دوستی جس لڑکی سے چاہے رکھوں مگر شادی ہماری ہی پسند سے کرنا ہوگی۔ ہاں، اس میں میری اپنی مرضی بھی ضروری ہوگی لیکن میری کوئی گرل فرینڈ میری بیوی نہیں بن سکتی تھی۔

میری کوششوں سے وسیم کا پروموشن ہوگیا تھا۔ اب اس کے حالات بھی کسی حد تک بدل گئے تھے۔ کمپنی سے اسے بھی گاڑی مل گئی تھی۔ اس نے دو مہینے پہلے اپنی بہن کی شادی بھی کر دی تھی۔ اس شادی میں، میں بھی شریک تھا۔ وہ کراچی کے ایک صاف ستھرے متوسط علاقے میں رہتا تھا۔ اس کے والد ملازمت سے ریٹائرمنٹ لے چکے تھے۔ وہ میرے بہت شکر گزار تھے کہ میری وجہ سے وسیم کو وقت سے پہلے ترقی مل گئی تھی۔

اس کی والدہ بھی میری تعریف کرتے نہیں تھک رہی تھیں۔ "نعمان بیٹا! تم تو ہمارے لیے رحمت کا فرشتہ ثابت ہوئے ہو۔" وہ محبت بھرے لہجے میں بولیں۔ "تمہاری مہربانیوں سے ہم مائرہ کی شادی کی فکر سے سبکدوش ہوسکے ہیں۔"

"کیسی بات کرتی ہیں آنٹی!" میں نے کہا۔ "سب کچھ اللہ کی مرضی سے ہوتا ہے۔ میں تو صرف ذریعہ بنا ہوں۔" میں نے دوسروں سے سنا ہوا جملہ انہیں سنا دیا۔

"اب مجھے شاہدہ کی فکر ہے۔" انہوں نے کہا۔ شاہدہ ان کی چھوٹی بیٹی تھی۔ بھرے بھرے بدن اور گوری رنگت والی لڑکی کافی قبول صورت تھی۔ وسیم کی والدہ بہانے بہانے سے اسے میرے پاس بھیج رہی تھیں۔ وہ بھی یوں شرما رہی تھی جیسے میری اس کے ساتھ منگنی ہوچکی ہے۔ میں آنٹی اور شاہدہ کی بات کا مطلب سمجھ رہا تھا لیکن ان کے لیے کچھ بھی نہیں کرسکتا تھا۔ اوّل تو مجھے شاہدہ اتنی بھی پسند نہیں آئی تھی کہ میں اسے بیوی کے روپ میں قبول کر لیتا۔ بالفرض اگر میں اسے پسند کر بھی لیتا تو امی فوراً اسے مسترد کر دیتیں۔ امی اور ابو کو اپنے عالی نسب ہونے پر بہت فخر تھا۔

ان دنوں حنا کا عجیب سا رویہ ہوگیا تھا۔ وہ کچھ چڑچڑی سی رہنے لگی تھی۔ ایک دن میں نے اس سے پوچھ ہی لیا۔ "کیا بات ہے ڈارلنگ! تم کچھ پریشان سی رہنے لگی ہو؟"

"تم جانتے ہو نعمان کہ میں زیادہ دیر تک ایک بوائے فرینڈ کے ساتھ گزارہ نہیں کرسکتی ہوں۔" اس نے صاف گوئی سے کہا۔ "اب ہمارے درمیان وہ پہلی سی گرم جوشی نہیں رہی ہے۔ شاید اب وہ وقت آگیا ہے کہ جب ہم سکون اور شرافت سے اپنی راہیں علیحدہ کرلیں۔"

میں نے چونک کر اسے دیکھا اور پھر بولا۔ "یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ میری کسی بات میں تمہیں کوتاہی نظر آئی ہے؟ میں ہر وقت تمہاری دل جوئی کرتا رہتا ہوں۔"

"بات دل جوئی کی نہیں بلکہ تبدیلی کی ہے۔" اس نے سرد مہری سے کہا۔ "آج کسٹم کا ایک ڈپٹی کلکٹر میری دوستی کا خواہش مند ہے۔ تم جانتے ہو کہ میں ایک وقت میں ایک ہی بوائے فرینڈ رکھتی ہوں۔"

"تو کیا تم نے اس کسٹم آفیسر کو پسند کرلیا ہے؟"

"ہاں، بوائے فرینڈ کے طور پر......" اس نے سرد لہجے میں کہا۔

"تم ایسا ہرگز نہیں کرسکتیں حنا!" میں نے چیخ کر کہا۔ "میں تمہیں اس کی اجازت نہیں دوں گا۔"

"تم اجازت نہیں دوگے؟" اس نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔ "میں نے تم سے اجازت مانگی ہی کب ہے۔ تم کس

اختیار کے ساتھ مجھے روک سکتے ہو، مسٹر نعمان صدیقی ؟'' اس نے تلخ لہجے میں کہا۔

''ہمارے درمیان اتنے اچھے تعلقات ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''اب تک میں نے تم سے یا تم نے مجھ سے کوئی اختلاف نہیں کیا پھر تمہارے ذہن میں یہ خیال کیوں آیا؟''

''تم شاید بھول رہے ہو کہ اس دوستی کی ابتدا کے وقت تم سے کیا کہا تھا؟'' حنا نے کہا۔ ''اگر کہو تو میں یاد دلا دوں؟''

''میرا ذہن واقعی اس وقت ماؤف ہو رہا ہے، مجھے کچھ بھی یاد نہیں آ رہا۔'' میں نے کہا۔

''لیکن مجھے سب کچھ یاد ہے۔'' اس نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''تم نے کہا تھا کہ ہم دونوں میں سے کوئی ایک دوسرے کا پابند نہیں ہوگا۔ اگر ہم میں سے کسی کو یہ دوستی گراں گزرنے لگے یا کوئی اکتا جائے تو ہمیں خوش اسلوبی سے تعلقات منقطع کرنے ہوں گے۔ میں کسی بھی موقع پر تمہیں مجبور نہیں کروں گی کہ مجھ سے شادی کرو۔'' اس کا لہجہ نہ صرف تلخ بلکہ انتہائی زہریلا بھی تھا۔

''ہاں، میں نے یہ سب کچھ کہا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن اس وقت بات اور تھی۔ تم سے دوسری یا تیسری ملاقات تھی اور مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میں تمہارا اس حد تک عادی ہو جاؤں گا کہ تمہیں چھوڑنے کا تصور بھی میرے لیے سوہانِ روح ہوگا۔''

''اب اس میں میرا تو کوئی قصور نہیں ہے۔'' اس نے اپنی خوبصورت آنکھیں جھکا کر کہا۔ ''بقول تمہارے تمہیں جلد ہی کوئی دوسری گرل فرینڈ مل جائے گی۔ کیونکہ تمہارا سابقہ ریکارڈ بھی اس بات کا گواہ ہے۔'' حنا کا لہجہ بدستور زہریلا تھا۔ ''پھر تم دو چار دن میں مجھے بھول جاؤ گے۔''

میں نے اسے بتایا تھا کہ اس سے پہلے نہ جانے کتنی لڑکیاں میری زندگی میں آئی تھیں اور ہوا کے جھونکے کی طرح گزر گئی تھیں۔

''میری بات سمجھنے کی کوشش کرو حنا!'' میں نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔ ''اب کوئی بھی لڑکی تمہاری جگہ نہیں لے سکے گی۔''

''کیوں! مجھ میں ایسی کیا خاص بات ہے؟'' اس نے کہا۔

''تم میں جو بات ہے، وہ میں تمہیں کسی بھی طرح سمجھا نہیں سکتا۔ بس میں تمہیں چھوڑ نہیں سکتا۔'' میں نے کہا۔

''اس کا صرف ایک ہی طریقہ ہے۔'' اس نے سرد اور سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''لیکن......'' اس نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

''لیکن کیا؟'' میں نے بے تابی سے پوچھا۔

''لیکن تم اسے مانو گے نہیں۔''

''تم مجھے بتاؤ تو سہی۔'' میں نے کہا۔

''اس کا صرف اور صرف ایک ہی طریقہ ہے۔'' حنا نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم مجھ سے شادی کر لو۔''

میں اس کی بات پر بالکل بھی نہیں چونکا کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ وہ کیا کہنے والی ہے۔ اگر وہ خود یہ بات نہ کرتی تو شاید میں اس سے کہتا۔

''مجھے منظور ہے۔'' میں نے حنا سے کہا۔ ''لیکن مجھے اس کے لیے کچھ وقت درکار ہوگا۔ مجھے اپنے والدین کو بھی تو راضی کرنا پڑے گا۔ پھر تمہاری امی کا بھی مسئلہ ہے کہ وہ اس رشتے پر راضی ہوں گی یا......''

''وہ تو کب کا مجھے اپنی زندگی سے نکال چکی ہیں۔ مجھے ان کی کوئی پروا نہیں۔ میں شہریت کے لحاظ سے برطانوی ہوں۔ میری پیدائش لندن میں ہوئی تھی، یوں میں برطانوی شہری ہوں۔ ہم شادی کے بعد لندن یا امریکا میں سیٹل ہو سکتے ہیں۔''

وہ مجھے بتا چکی تھی کہ اس کی پیدائش لندن میں ہوئی تھی اس لیے وہ برطانوی شہریت کی حامل تھی۔

''میں جانتا ہوں کہ تم برطانوی ہو۔'' میں نے ہنس کر کہا۔

''میں یہ بتانا چاہتی ہوں کہ امی یا میرے نام نہاد باپ نے میرے راستے میں مزاحم ہونے کی کوشش کی تو وہ کچھ بھی نہیں کر سکیں گے۔'' اس نے کہا۔ پھر وہ مسکرا کر بولی۔ ''اب اپنا موڈ ٹھیک کرو۔ آج ہماری آخری ملاقات ہے۔ ہمیں ایک دوسرے سے ہنسی خوشی رخصت ہونا چاہیے۔''

''کیا مطلب؟'' میں چونک کر بولا۔

''اب کیا میں مطلب بھی بار بار سمجھاؤں؟'' اس نے ہنس کر کہا۔ ''ہم آج کے بعد نہیں ملیں گے۔''

''لیکن یہ صرف تمہارا خیال ہے، میں تمہیں نہیں چھوڑ سکتا۔'' میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

''تو پھر مجھ سے شادی کرلو۔'' اس نے اطمینان سے کہا۔

''میں تمہیں بتا تو رہا ہوں کہ اس کے لیے مجھے کچھ مہلت درکار ہوگی۔'' میں نے کہا۔

''کتنی مہلت؟'' اس نے پوچھا۔

''مجھے کم سے کم تین مہینے تو دو۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ بے ساختہ ہنس پڑی۔ ''تین مہینے؟ تم میری طرف سے چھ مہینے لے لو۔ میں اس وقت تک تمہارا انتظار کرلوں گی۔''

''تو پھر یہ طے ہوگیا کہ یہ ہماری آخری ملاقات نہیں ہے۔'' میں نے سکون کا سانس لیتے ہوئے کہا۔

''ہاں، اب یہ ہماری آخری ملاقات نہیں ہے۔'' وہ بھی مسکرانے لگی لیکن ایک بات سن لو، ہمارا پرانا معاہدہ کینسل ہوگیا ہے۔ اب اگر تم نے پیچھے ہٹنے کی کوشش کی تو یہ میں ہرگز نہیں ہونے دوں گی۔ پہلے میں صرف تمہاری گرل فرینڈ تھی لیکن اب میں تمہاری منگیتر ہوں۔''

''میں بھلا پیچھے کیوں ہٹوں گا؟'' میں نے جذباتی ہوکر کہا۔ ''مجھے اب احساس ہوا ہے کہ تمہارے بغیر میری زندگی ادھوری ہے۔ میں برداشت نہیں کرسکتا کہ میری جگہ کوئی اور شخص لے۔''

''چلو، پھر اسی خوشی میں ہم کہیں باہر ڈنر کریں گے، لانگ ڈرائیو پر جائیں گے اور......

''ہاں ہاں، میں سمجھ گیا۔'' میں نے ہنس کر کہا۔

اس دن ہم نے نہ صرف ایک فائیو اسٹار ریسٹورنٹ میں ڈنر کیا بلکہ میں نے جذبات سے مغلوب ہوکر اس کے لیے ایک قیمتی انگوٹھی بھی خرید لی اور اس کی مخروطی انگلی میں پہناتے ہوئے بولا۔ ''یہ میری طرف سے ہماری منگنی کی یادگار ہے۔ اسے ہمیشہ سنبھال کر رکھنا۔''

حنا بھی خوشی سے پاگل ہورہی تھی۔ اس نے جذبات سے بھرپور لہجے میں کہا۔ ''نعمان! تم واحد مرد ہو جس نے مجھے اتنی عزت دی ورنہ آج تک مجھے ہر شخص نے ایک کھلونا ہی سمجھا تھا۔ میں اپنے عشق کی اس نشانی کو اپنی جان سے زیادہ عزیز سمجھوں گی۔'' اس نے انگوٹھی کو چومتے ہوئے کہا۔

پھر وہ گھڑیوں کی ایک معروف دکان کے سامنے رک گئی اور ڈسپلے میں لگی ہوئی بیش قیمت گھڑیوں کو دیکھتی ہوئی اندر داخل ہوگئی۔ مجھے تشویش لاحق ہوگئی کہ اگر حنا نے کسی بیش قیمت گھڑی کی بھی فرمائش کردی تو کیا ہوگا؟ میرے پاس اس وقت جتنی بھی رقم تھی، میں انگوٹھی کی خریداری اور ڈنر وغیرہ پر خرچ کرچکا تھا۔

اس نے بہت قیمتی اور خوبصورت رولیکس گھڑی منتخب کی اور اسے خرید لیا۔ دکان سے باہر نکلنے کے بعد میں نے اس سے پوچھا۔ ''حنا یہ تو مردانہ گھڑی ہے، تم اس کا کیا کرو گی؟''

''میں جانتی ہوں کہ یہ مردانہ گھڑی ہے۔'' حنا مسکرا کر بولی۔ ''اور مردانہ کلائی میں ہی اچھی لگے گی۔'' پھر وہ مسکرا کر بولی۔ ''لاؤ اپنی کلائی میری طرف بڑھاؤ۔''

میں نے اپنی کلائی اس کی طرف بڑھائی تو اس نے میری پرانی گھڑی اتار کر وہ قیمتی گھڑی میری کلائی پر باندھ دی اور بولی۔ ''منگنی کے موقع پر مجھے بھی تو کچھ نہ کچھ دینا چاہیے تھا نا...... اب ہماری منگنی کی تقریب مکمل ہوگئی۔'' پھر وہ ہنس کر بولی۔ ''ہاں، تمہارا ٹائم شروع ہوتا ہے اب!'' اس نے شوخ لہجے میں کہا۔ ''یہ گھڑی میں نے اس لیے دی ہے کہ تمہیں اپنی مہلت کا احساس رہے۔''

''حنا! تم میرے جذبوں کا مذاق اڑا رہی ہو۔'' میں نے پریشان ہوکر کہا۔ ''تم سمجھتی ہو کہ میں......

''ارے میں تو مذاق کررہی تھی۔'' وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ ''بس تم اب یقین کرلو کہ میں تمہاری امانت ہوں۔''

اس کے بعد ہم روزانہ ملتے رہے۔ ہمارے درمیان دنیا جہان کی باتیں ہوتیں لیکن اس دن کے بعد حنا نے بھی مجھ سے شادی کے موضوع پر بات نہیں کی تھی۔

میں ہر وقت اسی ادھیڑبن میں رہتا تھا کہ امی اور پاپا کو کیسے بتاؤں کہ میں حنا سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ پاپا تو اس شادی پر کبھی راضی نہ ہوتے۔ حنا لاکھ خوبصورت، تعلیم یافتہ اور ذہین سہی لیکن اس کا خاندانی پس منظر ایسا نہیں تھا کہ پاپا اسے بہو کی حیثیت سے قبول کرلیتے۔ اس کا باپ لاکھ دولت مند اور عزت دار سہی لیکن وہ حنا کو پہچاننے سے بھی انکار کرسکتا تھا۔ پھر اس کی برطانوی ماں تھی جو دوسری شادی کرکے بیٹھی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں پاپا کو کیسے راضی کروں گا؟ آخری صورت یہ تھی کہ میں حنا سے شادی کرنے کے بعد ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنوں کی شفقت سے محروم ہوجاتا۔ میں اس پر بھی تیار تھا۔

میں نے سوچا کہ میں سہیل سے اس سلسلے میں مدد لوں۔ وہ بچپن سے ہمارے گھر آتا تھا اور پاپا اور امی سے

بہت بے تکلف تھا۔ وہ ان لوگوں کو سمجھا سکتا تھا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ سہیل بھی ان دنوں بزنس کے سلسلے میں ملک سے باہر تھا۔

دن تیزی سے گزر رہے تھے اور حنا کی دی ہوئی مہلت میں کمی ہوتی جارہی تھی۔ میں ان ہی سوچوں کی وجہ سے کچھ چڑچڑا ہوگیا تھا۔ دفتر میں بھی کئی لوگوں سے میری تلخ کلامی ہوچکی تھی۔

اس دن میں ناشتے کی میز پر پہنچا تو امی اکیلی بیٹھی تھیں۔ خلافِ معمول پاپا اس وقت جلدی چلے گئے تھے۔ ان کی کوئی اہم میٹنگ تھی۔ امی بہت غور سے میرے چہرے کا جائزہ لے رہی تھیں۔ انہوں نے سلائس پر مکھن لگا کر مجھے دیا اور بولیں۔ ''نعمان! میں کئی دنوں سے دیکھ رہی ہوں کہ تم بہت ڈسٹرب ہو۔ کیا بات ہے بیٹا؟''

''کچھ نہیں امی......'' میں نے گڑبڑا کر کہا۔ ''بس آفس کی کچھ پریشانیاں ہیں۔''

''آفس کی کیا پریشانیاں ہیں؟'' امی نے پوچھا۔ ''کیا جہانگیر سے کوئی ان بن ہوگئی ہے؟'' امی میرے مزاج سے واقف تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ کمپنی کے سی ای او سے ان بن ہونے کی صورت میں مجھے پریشانی ہوسکتی تھی۔

''نہیں امی!'' میں نے کہا۔ ''جہانگیر صاحب تو میرا بہت خیال رکھتے ہیں۔''

''انہیں رکھنا بھی چاہیے۔'' امی نے کہا۔ ''ابھی دو مہینے پہلے تمہارے پاپا نے انہیں دو کروڑ روپے کا لون دلوایا ہے۔''

پاپا جس بینک کے پریذیڈنٹ تھے، ہماری فرم کا اکاؤنٹ اسی بینک میں تھا۔ ''اگر کوئی ایسی بات ہے بیٹا تو مجھے بتاؤ میں کل ہی جہانگیر کو گھر پر بلالوں گی۔''

''امی میں نے کہا نا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ آپ فضول میں ایسی باتیں کررہی ہیں۔''

''نعمان بیٹا!'' امی نے کہا۔ ''میں تمہاری ماں ہوں۔ مجھ سے آخر تم کوئی بات کیوں چھپا رہے ہو؟'' پھر وہ مسکرا کر بولیں۔ ''خیر نہ بتاؤ۔ ایک دن تم خود ہی سب کچھ بتاؤ گے کیونکہ پاپا کے سامنے تو تمہاری زبان بھی نہیں کھلتی۔ ہاں، آج شام کو ذرا جلدی آجانا۔''

''کیوں امی! کوئی خاص بات ہے؟''

''ہاں خاص ہی ہے۔ آج رات کی فلائٹ سے تمہاری جینی آنٹی آرہی ہیں۔''

''جینی آنٹی!'' میں نے حیرت سے کہا۔ ''انہیں پاکستان آنے کا خیال کیسے آگیا؟''

جینی آنٹی، امی کی سگی بہن تھیں جو شادی ہوکر لندن چلی گئی تھیں۔ امی اکثر ان سے ٹیلی فون پر بات کرتی تھیں۔ اکثر میں بھی ان سے بات کرلیتا تھا۔

''تم شاید بھول رہے ہو کہ اگلے ماہ آصف بھائی کی بیٹی نورین کی شادی ہورہی ہے۔'' امی نے مجھے یاد دلایا۔ ''جینی اس شادی میں شرکت کے لیے پاکستان آرہی ہے۔''

''وہ تو وہاں جاکر پوری انگریز ہوگئی ہیں۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''اردو بھی انگریزی لہجے میں بولتی ہیں۔ حتیٰ کہ اپنا اچھا بھلا نام بھی بگاڑ لیا۔'' ان کا نام زینت تھا جو لندن جاکر جینی ہوگیا تھا۔

''نورین کی شادی اگلے ماہ کے آخری ہفتے میں ہے۔ جینی آنٹی اتنے دن تک اس غریب اور پسماندہ ملک میں رہ لیں گی؟''

میری بات پر امی نے مجھے گھور کر دیکھا اور بولیں۔ ''زیادہ باتیں مت بناؤ، بس شام کو گھر جلدی آنے کی کوشش کرنا۔ جینی کو ائرپورٹ سے گھر بھی لانا ہے۔''

اس دن میں نے آفس سے نکلتے ہوئے حنا کو ٹیلی فون پر بتایا کہ آج میں نہیں آسکوں گا۔ گھر میں کچھ مہمان آنے والے ہیں۔ وہاں میری موجودگی ضروری ہے۔

''نو پرابلم!'' حنا نے خوش دلی سے کہا۔ ''میں کل تک انتظار کرلوں گی۔''

میں آفس سے نکل ہی رہا تھا کہ وسیم نے مجھے روک لیا اور بولا۔ ''سر! آج شاہدہ کے رشتے کے لیے کچھ لوگ آرہے ہیں۔ امی چاہتی ہیں کہ آپ بھی ان لوگوں سے مل لیں۔''

''وہ لوگ کس وقت آرہے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''ساڑھے چھ اور سات بجے کے درمیان پہنچ جائیں گے۔''

میں نے سوچا کہ وسیم سے انکار کردوں پھر یہ سوچ کر خاموش ہوگیا کہ جینی آنٹی کی فلائٹ رات کے ڈیڑھ بجے تھی۔ میرے پاس کافی وقت تھا۔ حنا کو تو میں نے اس لیے منع کیا تھا کہ وہ رات کو ایک ڈیڑھ بجے سے پہلے میرا پیچھا نہیں چھوڑتی تھی۔ میں خود بھی اس سے ملنے کے بعد وقت کے جھمیلوں سے آزاد ہوجاتا تھا۔ میں نے وسیم سے وعدہ کرلیا کہ میں اس کے گھر ضرور آؤں گا۔ وسیم میری بات پر خوش ہوگیا۔

☆......☆

لندن سے آنے والی قومی ائر لائن کی فلائٹ مقررہ وقت پر اتر چکی تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ جینی آنٹی کو باہر آنے میں مزید آدھا پونا گھنٹا لگ سکتا ہے۔ میں ان کے انتظار میں ٹہلتا رہا اور سگریٹ پھونکتا رہا۔

آخر خدا خدا کر کے مسافر باہر نکلنا شروع ہوئے۔ بھانت بھانت کے گورے، کالے اور رنگ دار مسافروں کو دیکھتے ہوئے مجھے جینی آنٹی کا خیال ہی نہ آیا۔ مجھے تو اس وقت ہوش آیا جب وہ میرے سر پر پہنچ چکی تھیں۔ انہوں نے میرا نام لے کر پکارا تو میں چونکا۔ اسکائپ پر میں نے انہیں دیکھا تھا۔

''جینی آنٹی!'' میں خوشی سے چلایا اور ان کی طرف بڑھا۔

اس وقت جینی آنٹی واقعی اپنے لباس اور چال ڈھال سے غیر ملکی لگ رہی تھیں۔ ان کے جسم پر چست لباس تھا۔ شانوں تک تراشے ہوئے گولڈن بال اور سرخ و سفید رنگت۔ انہیں پہلی نظر میں دیکھ کر کوئی بھی پاکستانی نہیں کہہ سکتا تھا۔

''ہائے نومی!'' انہوں نے خوشی سے چہکتی ہوئی آواز میں کہا اور مجھے گلے لگا لیا۔

میں اچانک جھینپ کر رہ گیا۔ جینی آنٹی امی کی سب سے چھوٹی بہن تھیں۔ پھر وہ اپنا بہت خیال رکھتی تھیں اس لیے اپنی عمر سے کم سے کم دس سال چھوٹی نظر آتی تھیں۔

ان کے پیچھے شوخ سی ایک لڑکی بھی کھڑی تھی۔ جینی آنٹی اس کی طرف گھومیں اور مجھ سے بولیں۔ ''نومی! یہ تہمینہ ہے میری بیٹی۔''

اس کے ساتھ ہی چودہ پندرہ سال کا ایک لڑکا بھی کھڑا تھا۔ اس سے پہلے کہ جینی آنٹی اس سے میرا تعارف کراتیں، وہ جلدی سے بولا۔ ''السلام علیکم نومی بھائی، آئی ایم جنید! آپ مجھے جونی بھی کہہ سکتے ہیں۔'' میں تہمینہ اور جنید دونوں کو پہچان گیا۔ انہیں میں نے اسکائپ پر دیکھا تھا۔

میری نظریں رہ رہ کر تہمینہ پر پڑ رہی تھیں جسے جینی آنٹی ٹمی کہہ کر مخاطب کر رہی تھیں۔ وہ اتنی خوب صورت تھی کہ اسے دیکھ کر میں مبہوت رہ گیا تھا۔

اس کی تصویر اور اس میں بہت فرق تھا۔ سنہری رنگت، بڑے بڑے براؤن بال، سرو قد اور سانچے میں ڈھلا ہوا جسم...... وہ مجھے کسی اور ہی دنیا کی مخلوق لگ رہی تھی۔

اس نے بڑی بڑی براؤن آنکھیں اٹھا کر مجھے دیکھا، پھر بولی۔ ''نومی بھائی! کیا ساری رات یہیں کھڑے رہیں گے؟'' اس کی آواز بھی اس کی طرح پرکشش اور مترنم تھی۔

''بس چلتے ہیں۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''میں سوچ رہا ہوں کہ تمہارا یہ سامان میری گاڑی میں تو نہیں آئے گا۔ مجھے کسی دوسری گاڑی کا بندوبست کرنا ہوگا۔''

''ہم تو آپ کے ڈسپوزل پر ہیں۔'' جنید نے کہا۔ ''آپ کو کسی بڑی گاڑی کا بندوبست کرنا چاہیے تھا۔''

''ہاں، میں نے ایک ٹرک والے سے بات تو کی تھی۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''لیکن عین وقت پر اس نے مجھے دھوکا دے دیا۔''

میں نے وہیں سے ایک ٹیکسی لی۔ اس کی ڈکی اور چھت کے جنگلے پر جینی آنٹی کا سامان رکھوایا۔ اور ان کا دستی سامان اپنے گاڑی میں رکھ لیا۔ یوں ہماری ائرپورٹ سے واپسی ہوئی۔

گاڑی میں میرے ساتھ پسنجر سیٹ پر تہمینہ تھی۔ عقبی سیٹ پر جینی آنٹی اور ان کا بیٹا جنید عرف جونی تھا۔

''تہمینہ!'' میں نے اسے مخاطب کیا۔ ''مجھے......''

''نومی بھائی پلیز!'' تہمینہ نے کہا۔ ''آپ بھی مجھے ٹمی کہہ سکتے ہیں۔'' اس نے میری بات کاٹ دی۔

''میں تمہیں ٹمی کہہ سکتا ہوں لیکن جو خوبصورتی اور مشرقیت تہمینہ میں ہے، ٹمی میں نہیں ہے۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''اور میں نومی نہیں نعمان ہوں۔''

''رئیلی!'' تہمینہ خوش ہو کر بولی۔ ''او کے پھر آپ مجھے تہمینہ ہی کہیں۔''

''میں یہ پوچھ رہا تھا کہ وہاں رہ کر تم نے اتنی اچھی اردو کیسے سیکھی؟'' میں اس کی اردو پر واقعی حیران تھا۔ وہاں پرورش پانے والے بچے اردو سے بالکل ہی نابلد ہوتے ہیں۔ سوائے ان چند لوگوں کے جو اپنی روایات کو سینے سے لگائے رکھتے ہیں۔

''تم شاید بھول گئے کہ تمہارے خالو جمشید اردو کے شیدائی ہیں۔'' جینی آنٹی نے کہا۔ ''وہ لندن کے ادبی حلقوں میں کافی سرگرم ہیں۔ انہوں نے اپنے بچوں کی زبان پر بھی توجہ دی ہے۔''

''اور نعمان بھائی آپ کو حیران کن بات بتاؤں؟'' جنید نے کہا۔ ''ہمارے ٹیچر برسوں پاکستان میں رہے ہیں،

انہوں نے کراچی یونیورسٹی سے ماسٹرز کیا ہے۔ وہ بھی اردو بہت اچھی بولتے اور لکھتے ہیں۔“

”حالانکہ ان کا تعلق یو کے سے ہے۔“ تہمینہ نے کہا۔

اسی دوران میں ہم گھر پہنچ چکے تھے۔ امی بے چینی سے جینی آنٹی کا انتظار کررہی تھیں۔ پاپا بھی خلافِ معمول جاگ رہے تھے۔ اس دن ہمارے گھر میں گویا رت جگے کا سماں تھا۔

جینی جتنی خوبصورت تھی، اتنی ہی ذہین بھی تھی۔ خاص طور پر اسے بے شمار شعر حفظ تھے اور وہ انہیں موقع کی مناسبت سے بہت خوبصورت انداز میں استعمال بھی کرتی تھی۔ رات بھر جاگنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ میں صبح آفس نہ جاسکا۔ میں نے ٹیلی فون پر آفس والوں کو آگاہ کردیا کہ آج میں آفس نہیں آسکوں گا۔

تہمینہ کو ہمارا گھر بہت پسند آیا۔ اس کے کشادہ کمرے، وسیع و عریض لان اور گھر میں کام کرتے ہوئے ملازمین۔ اس نے ہنس کر کہا۔ ”لندن میں اتنا بڑا مکان کسی لارڈ یا امیر ترین شخص کا ہی ہوتا ہے۔ ورنہ عام آدمی تو چھوٹے چھوٹے مکانوں اور فلیٹس میں رہتے ہیں۔ کمرے اتنے تنگ ہوتے ہیں کہ بہ قول مشتاق احمد یوسفی...... ایسا لگ رہا تھا جیسے کھرا اوڑھے پڑے ہیں۔“

شام کو تہمینہ نے لانگ ڈرائیو کا پروگرام بنالیا۔ اس پروگرام میں جنید بھی ہمارے ساتھ تھا۔

ہم گھر سے نکلنے ہی والے تھے کہ میرے فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں نے ٹیلی فون کی اسکرین پر نظر دوڑائی تو اس میں حنا کا نام تھا۔ میں نے تہمینہ سے کچھ فاصلے پر جاکر کال ریسیو کرلی اور بولا۔ ”ہاں! حنا! کیسی ہو؟“

”میں تو ٹھیک ہوں، تم کہاں غائب ہو؟ آج دفتر بھی نہیں آئے اور میرے گھر کی طرف بھی رخ نہیں کیا۔ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟“

اس کی بات پر ایک بہانہ میرے ہاتھ آگیا۔ میں نے کہا۔ ”حنا ڈارلنگ! تمہیں کیسے معلوم ہوجاتا ہے کہ میری طبیعت خراب ہے لیکن گھبراؤ مت...... میری طبیعت اتنی بھی خراب نہیں کہ تم مجھے مریض سمجھنے لگو۔ کل نہ جانے کس چیز سے مجھے فوڈ پوائزننگ ہوگئی ہے۔ اس لیے میں آج آفس بھی نہ آسکا۔ اس وقت مجھ میں اتنی ہمت بھی نہیں کہ اپنے کمرے سے نکل کر گاڑی تک جاسکوں۔ کمزوری بہت ہوگئی ہے۔“

"تمہیں کمرے سے نکلنے کی ضرورت بھی نہیں۔"
حنا نے خاص بیویوں والے انداز میں کہا۔ "تم مکمل بیڈ ریسٹ کرو، طبیعت بہتر نہ ہوئی تو کل بھی چھٹی کر لینا۔ جہاں میں نے دو دن صبر کیا ہے وہاں میں ایک دو دن مزید صبر کر لوں گی۔"
"اب میں اتنا بھی بیمار......"
"نعمان!" حنا نے میری بات کاٹ دی۔ "میں فوڈ پوائزننگ سے بہت ڈرتی ہوں۔ تم اسے ایزی مت لو اور آرام کرو۔ اب پرسوں تم سے ملاقات ہوگی...... بائے۔"
یہ کہہ کر اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔
میں سیل فون جیب میں رکھ کر مڑا تو تہمینہ میرے نزدیک کھڑی تھی۔ وہ ہنس کر بولی۔ "کسے اپنی بیماری کی جھوٹی سچی کہانی سنا رہے تھے؟"
"میرے باس تھے۔" میں نے ڈھٹائی سے جھوٹ بولا۔ "میں ان سے کہہ رہا تھا کہ شاید میں کل بھی آفس نہ آسکوں۔"
"کیوں؟" تہمینہ نے حیرت سے پوچھا۔
"بھئی تمہیں بھی تو کمپنی دینا ہے۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "اور آفس میں میری پوزیشن بہت مستحکم ہے۔" میں نے فخریہ انداز میں کہا۔ "میں اگر ایک ہفتہ بھی نہ جاؤں تو کوئی مجھ سے جواب طلب نہیں کرے گا۔ یہ سمجھ لو کہ میں سی ای او کے بعد دوسرے نمبر پر ہوں۔"
پھر ہم لوگ آؤٹنگ کا پروگرام طے کرنے لگے۔
مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ تہمینہ کی آنکھوں میں میرے لیے پسندیدگی کی جھلک موجود ہے۔ میں نے سوچا کہ جہاں اتنی لڑکیوں سے فلرٹ کیا ہے، وہاں ایک تہمینہ ہی سہی۔ وہ تو یوں بھی ایسے معاشرے کی پروردہ تھی جہاں اس قسم کی دوستیاں عام تھیں۔
میں نے باتوں باتوں میں کہا۔ "تہمینہ! ایک بات کہوں، برا تو نہیں مانو گی؟"
"ایسی کیا بات کہنے والے ہیں نعمان بھائی کہ آپ کو میرے برا ماننے کا خدشہ ہے۔"
"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "میں چاہتا ہوں کہ صرف تمہارے ساتھ آؤٹنگ کروں۔ یہ جنید......"
"نو پرابلم!" اس نے ہنس کر کہا۔ "میں اسے تو ابھی کسی نہ کسی بہانے سے کاٹ دوں گی۔"

پھر میں کچھ زیادہ مصروف ہو گیا۔ آفس کے بعد حنا کے پاس جانا تھا۔ ہم لوگ کسی ریسٹورنٹ میں وقت گزارتے تھے۔ پھر میں وہاں سے واپس آتا تھا تو تہمینہ کہیں جانے کو تیار ہوتی تھی۔
چند دن بعد مجھے احساس ہونے لگا کہ اپنی دل آویز شخصیت اور خوبصورت باتوں کے باعث تہمینہ غیر محسوس انداز میں حنا کی جگہ لے رہی ہے۔ میں نے کئی بار اس خیال کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔
کچھ دن مزید گزرنے تو مجھے احساس ہوا کہ میں حنا کے ساتھ اتنا خوش نہیں رہ سکوں گا، نہ تہمینہ کے بغیر زندگی گزار سکوں گا۔
میں ان دنوں حنا سے بھی کچھ کھنچا کھنچا رہنے لگا تھا۔ حنا میرے اس رویے کو کام کی زیادتی سمجھی۔ ان دنوں آفس میں کام بہت تھا لیکن میرے حصے کا سارا کام تو وسیم کرتا تھا۔ وہ کئی لحاظ سے میرا احسان مند تھا۔ میں ہر آڑے وقت میں اس کی مدد کرتا تھا اس لیے وہ میرا بہت احترام کرتا تھا۔
تہمینہ بہت تیزی سے میرے دل اور دماغ پر قبضہ جماتی چلی گئی اور میں یہ بھی بھلا بیٹھا کہ میں نے حنا کو اپنی محبت کا یقین دلایا ہے اور زبردستی اسے منگنی پر آمادہ کیا ہے۔ یہ میری ہی ضد تھی کہ میں نے اسے اپنا پابند کر لیا تھا۔ ورنہ وہ تو مہینوں پہلے مجھے چھوڑنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔
ایک دن کھانے کی میز پر امی نے مجھ سے پوچھا۔
"نعمان! یہ تہمینہ کیسی لڑکی ہے؟"
"اچھی لڑکی ہے۔" میں نے ان کی بات نہ سمجھتے ہوئے کہا۔
اس وقت وہاں تہمینہ بھی موجود تھی وہ فوراً کسی بہانے سے اندر چلی گئی۔
"صرف اچھی یا بہت اچھی؟" امی نے پوچھا۔
میں نے گھبرا کر پاپا کی طرف دیکھا، وہ مسکرا کر بولے۔ "بتاؤ برخوردار! آج یہ دونوں بہنیں تمہارا گھیراؤ کرنے کے چکر میں ہیں۔ میں تو صرف امپائر ہوں۔ تمہاری طرف سے کوئی منفی جواب آیا تو انگلی اٹھا دوں گا۔"
"دیکھو بیٹا!" جینی آنٹی نے کہا۔ "تم پہ کوئی جبر نہیں کرے گا۔ مجھے محسوس ہوا ہے کہ تم اور تہمینہ ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے ہو۔ ممکن ہے میرا خیال غلط ہو۔ اگر تہمینہ واقعی تمہیں اچھی لگتی ہے تو میں چاہتی ہوں کہ تمہاری اور تہمینہ کی منگنی ہو جائے۔ اگلے ماہ ان کے ڈیڈ بھی پاکستان آرہے

ہیں۔ ان کے آنے کے بعد تمہاری شادی ہوجائے گی۔''

تہمینہ چند ہی دنوں میں میرے حواس پر چھا گئی تھی۔ میں نے آہستہ سے کہا۔ ''آنٹی! جب آپ سب سمجھتی ہیں تو پھر مجھ سے کیوں پوچھ رہی ہیں؟''

''اس کا مطلب ہے تمہیں کوئی اعتراض نہیں؟'' امی نے پوچھا۔ خوشی سے ان کا چہرہ گلنار ہورہا تھا۔

''اگر تہمینہ کو کوئی انکار نہیں تو مجھے بھلا کیوں انکار ہوگا۔'' میں نے کہا۔

اس وقت ڈائننگ ٹیبل پر گاجر کا حلوا رکھا تھا۔ امی اور جینی آنٹی نے فوراً ایک دوسرے کا منہ میٹھا کرایا اور پاپا ان دونوں کو دیکھ کر بولے۔ ''بھئی مجھے تو کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ تمہاری بال پر نعمان نے چھکا مار دیا۔'' پاپا کی بات پر ہم لوگ ہنسنے لگے۔

دوسرے دن سادہ سی ایک تقریب میں تہمینہ کو میرے نام کی انگوٹھی پہنا دی گئی۔ جینی آنٹی اسی دن آصف ماموں کے بنگلے میں شفٹ ہوگئیں۔ پاپا لاکھ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور آزاد خیال سہی لیکن ان کا حکم تھا کہ اب شادی تک تہمینہ آصف ماموں کے گھر رہے گی۔ منگنی کے بعد لڑکے اور لڑکی کا ایک ہی گھر میں رہنا مناسب نہیں ہے۔

تہمینہ آصف ماموں کے گھر چلی گئی تو مجھے بہت شدت سے احساس ہوا کہ میں اسے ٹوٹ کر چاہنے لگا ہوں۔ اس وقت ایک لمحے کو بھی مجھے حنا کا خیال نہیں آیا۔ حنا سے ملنا میری مجبوری تھی کہ وہ نہ صرف میرے آفس میں کام کرتی تھی بلکہ میں جوشِ جذبات میں آکر اسے منگنی کی انگوٹھی بھی پہنا چکا تھا۔

اس وقت میں آفس سے نکلا ہی تھا کہ مجھے سڑک کے کنارے حنا نظر آئی۔ وہ مجھے رکنے کا اشارہ کررہی تھی۔ تہمینہ تو یوں بھی اب مجھ سے دور تھی اور اس سے اب صرف سیل فون پر بات ہوتی تھی۔ میرے پاس شام کا وقت خالی ہی ہوتا تھا۔

میں نے اسے دیکھ کر گاڑی روک لی۔ وہ بہت خود اعتمادی سے پسنجر سیٹ پر بیٹھ گئی۔ میں حسبِ معمول اسے لانگ ڈرائیو پر لے گیا۔ پھر ہم نے ایک جگہ ڈنر کیا اور رات گئے میں نے اسے گھر چھوڑا۔

تہمینہ سے روزانہ ہی ٹیلی فون پر گھنٹوں باتیں ہوتی تھیں۔ اس رات بھی میں سونے کے لیے لیٹا تو اس کا فون آگیا۔ وہ رسمی گفتگو کے بعد مصنوعی خفگی سے بولی۔ ''کیا

بات ہے نعمان...... تم مجھ سے اکتا گئے ہو؟''

''تم سے اکتانے کا مطلب ہے کہ خود سے اکتانا۔'' میں نے کہا پھر ہنس کر بولا۔ ''قسمت کا لکھا ٹل سکتا ہے، دریا الٹا چل سکتا ہے، چھٹ سکتی ہے سورج سے کرن، پانی میں دیا جل سکتا ہے، پر تجھ کو بھلانا مشکل ہے۔''

''ارے ارے تم نے تو شاعری شروع کردی۔'' وہ ہنس کر بولی۔

''اب شاعری نہ کروں تو اور کیا کروں؟'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ملاقات کی راہیں مسدود ہیں۔ تم یہاں آتی بھی ہو تو مجھ سے بے تکلفی سے بات نہیں کرسکتیں۔ مجھے پاپا سے بہت ڈر لگتا ہے۔''

''تم اس سے کہیں زیادہ آصف ماموں سے ڈرتے ہو۔'' تہمینہ نے ہنس کر کہا۔ ''اس لیے یہاں بھی نہیں آسکتے۔''

''ان سے تو میری جان جاتی ہے۔ حالانکہ آج تک انہوں نے کبھی ڈانٹا بھی نہیں ہے لیکن ان کی شخصیت اتنی رعب دار ہے کہ انہیں دیکھ کر ہی میرا دم نکلتا ہے۔ ویسے تم نے یہ کیوں کہا کہ میں تم سے اکتا گیا ہوں؟'' میں نے پوچھا۔

''ارے، وہ تو میں نے یونہی کہہ دیا۔'' تہمینہ نے کہا۔ ''آصف ماموں امی کو بتا رہے تھے کہ نعمان آج کل اپنے آفس کی ایک لڑکی کو گھر ڈراپ کررہا ہے۔''

اس کی بات سن کر میں سناٹے میں آگیا۔ شاید آصف ماموں نے مجھے حنا کے ساتھ دیکھ لیا تھا۔

میں نے جلدی سے بات بناتے ہوئے کہا۔ ''ڈراپ کررہا ہوں نہیں بلکہ کبھی کبھی ڈراپ کردیتا ہوں۔ اسے کمپنی کی طرف سے گاڑی ملی ہوئی ہے۔'' میں نے ڈھٹائی سے جھوٹ بولا۔ ''لیکن کبھی اس کی گاڑی پرابلم کرتی ہے تو میں اسے ڈراپ کردیتا ہوں۔ کبھی میری گاڑی ورکشاپ ہوتی ہے تو وہ مجھے ڈراپ کردیتی ہے۔''

''ارے یار! میں نے تو یوں ہی بات پوچھ لی تھی۔ تم تو پورا لیکچر دینے لگے۔''

''بات لیکچر کی نہیں ہے تہمینہ۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''آصف ماموں بہت رجعت پسند بلکہ دقیانوسی ہیں۔ وہ یوں تو کافی تعلیم یافتہ ہیں لیکن ان معاملات میں بہت سخت ہیں۔''

''ارے ان کی بات کو چھوڑو۔'' تہمینہ ہنس کر بولی۔ ''مجھے یا مما کو اس سے فرق نہیں پڑتا۔'' پھر وہ موضوع بدل کر بولی۔ ''یار کیوں نہ ہم سب کزن مل کر سنڈے کو کوئی پکنک ارینج کرلیں۔ وہاں نہ تو آصف ماموں ہوں گے نہ بینکر انکل۔'' وہ پاپا کو نہ جانے کیوں شروع سے ہی بینکر انکل کہتی تھی۔

''اوکے ڈن!'' میں نے کہا۔ ''لیکن یہ پروگرام بھی تم ہی بناؤ۔ مجھے تو بس عین وقت پر اطلاع دے دینا۔ آصف ماموں کو یہ معلوم نہ ہو کہ یہ پروگرام ہم دونوں بنا رہے ہیں بلکہ تم یہ پروگرام نورین اور ثمرین سے بنواؤ۔'' وہ فوراً اس بات پر راضی ہوگئی۔

پھر اس سے کافی دیر تک باتیں ہوتی رہیں لیکن میرا ذہن آصف ماموں میں اٹکا رہا۔ بات ختم ہونے کے بعد بہت دیر تک میں یہ ہی سوچتے سوچتے نہ جانے کب سوگیا۔

صبح میں تیار ہوکر ناشتے کی میز پر پہنچا ہی تھا کہ میرے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اسکرین پر آصف ماموں کا نام دیکھ کر میری روح فنا ہوگئی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے کال ریسیو کرلی اور بولا۔ ''السلام علیکم!''

''وعلیکم السلام!'' آصف ماموں کا لہجہ خوش گوار تھا اس لیے مجھے کچھ حوصلہ ہوا۔ میں نے پوچھا۔

''جی ماموں، کیسے یاد فرمایا؟''

''نعمان! تم آج آفس سے چھٹی کرسکتے ہو؟'' انہوں نے پوچھا۔

''خیریت تو ہے ماموں؟'' میں نے گھبرا کر پوچھا۔

''خیریت ہے بھئی۔'' مجھے ذرا صدیق کے پاس حیدر آباد جانا ہے۔ تم جانتے ہو کہ اب مجھ سے اتنی طویل ڈرائیونگ نہیں ہوتی۔

میں نے سوچا اگر میں ماموں کے ساتھ حیدر آباد گیا تو وہ لازمی طور پر یہ تذکرہ لے بیٹھیں گے۔ حیدر آباد آنے اور جانے میں تقریباً چھ گھنٹے لگتے تھے۔ اتنا وقت آصف ماموں کے ساتھ گزارنا یوں بھی میرے لیے بہت کٹھن تھا۔

''کس سوچ میں پڑگئے؟'' آصف ماموں نے مجھے ٹوک دیا۔

''ماموں! مجھے آپ کے ساتھ جانے میں کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن آج میری دو بہت اہم میٹنگز ہیں۔ کوریا سے ایک ڈیلی گیشن آیا ہوا ہے۔ لنچ مجھے اس کے ساتھ کرنا ہے اور......''

''تو پھر رہنے دو۔'' وہ سرد لہجے میں بولے۔ ''میں کوئی اور بندوبست کرلوں گا۔''

"بندوبست تو میں کر سکتا ہوں۔" میں نے کہا۔ مجھے اچانک وسیم کا خیال آگیا تھا۔ میں اپنی جگہ اسے حیدرآباد بھیج سکتا تھا۔ میں نے کہا۔ "میرا اسسٹنٹ وسیم آپ کو حیدرآباد لے جائے گا۔ بہت سلجھا ہوا اور اچھا لڑکا ہے۔ میں ابھی اسے آپ کے پاس بھیج دیتا ہوں۔"

"اس سے کہنا میں گاڑی اپنی ہی استعمال کروں گا۔ اس پر فضول میں بوجھ نہیں ڈالوں گا۔ ہوسکتا ہے ہماری واپسی کل ہو۔ تم اسے تو آفس سے چھٹی دلا سکتے ہو؟"

"جی ہاں!" میں نے کہا۔ "اسے چھٹی دینا تو میرے ہی اختیار میں ہے۔" میں نے جلدی سے کہا۔

"پھر تم اسے ایک گھنٹے بعد میری طرف بھیج دو۔" ماموں نے کہا۔

"جی بہتر ہے۔" میں نے کہا تو آصف ماموں نے فون کا سلسلہ منقطع کر دیا۔

"بھائی جان کیا کہہ رہے تھے؟" امی میرے یکطرفہ مکالموں سے سمجھ گئی تھیں کہ آصف ماموں کو کہیں جانا تھا۔

میں نے ناشتا کرتے ہوئے انہیں آصف ماموں کے بارے میں بتایا اور آفس روانہ ہوگیا۔ اس بات میں کوئی جھوٹ نہیں تھا کہ غیر ملکی وفد کے ساتھ میری میٹنگ اور لنچ تھا لیکن اس میٹنگ کو ہمارے سی ای او جہانگیر صاحب یا وسیم بھی اٹینڈ کر سکتے تھے۔

آفس جا کر میں نے وسیم کو آصف ماموں کے گھر کا ایڈریس سمجھایا اور اسے آصف ماموں کی طرف بھیج دیا۔ میں جانتا تھا کہ وسیم بہت ذہین لڑکا ہے۔ وہ آصف ماموں کو ضرور پسند آئے گا۔

شام کو مجھے کوئی کام نہیں تھا۔ میں حنا کی طرف چلا گیا تو معلوم ہوا کہ وہ بھی کہیں نکلی ہوئی تھی۔ میں نے سیل فون پر اس سے بات کی تو معلوم ہوا کہ پنڈی سے اس کی کوئی سہیلی آئی ہوئی تھی وہ اس کے ساتھ نکل گئی تھی۔

میں بور ہو کر خود ہی بلامقصد گاڑی دوڑاتا رہا اور پھر تھک ہار کر گھر آگیا۔ کھانے کے بعد جب اطمینان سے اپنے کمرے میں لیٹا تو میں نے تہمینہ کا نمبر ملایا۔

دوسری طرف گھنٹی بجتی رہی لیکن اس نے فون نہیں اٹھایا اس لیے مجھے تشویش ہوئی۔ میں نے دوبارہ نمبر ملایا تو دوبارہ بھی یہی ہوا۔ میں سمجھ گیا کہ ان موصوفہ کا فون سائلنٹ پر لگا ہوگا اور وہ خود کہیں خوش گپیوں میں مصروف ہوں گی۔

آدھے گھنٹے بعد میرے سیل فون کی گھنٹی بجی۔ میں

نے اسکرین پر نظر دوڑائی تو مجھے تہمینہ کا نام نظر آیا۔
میں نے کال ریسیو کرتے ہی کہا۔ ''تمہارے پاس تو اب میرے لیے بھی وقت نہیں ہے۔''
''بات یہ نہیں ہے نعمان!'' تہمینہ نے کہا۔ ''اس میں آصف ماموں......''
''آصف ماموں؟'' میں نے حیرت سے اس کی بات کاٹ دی۔ ''آصف ماموں کیا حیدرآباد نہیں گئے؟''
''آصف ماموں حیدرآباد میں ہی ہیں۔'' تہمینہ نے جواب دیا۔ ''وہ اپنے ساتھ مجھے اور نورین کو بھی حیدرآباد لے آئے ہیں۔''
''نورین آصف ماموں کی سب سے چھوٹی بیٹی تھی۔ تین سال پہلے اس کی شادی ہوئی تھی اور وہ حیدرآباد ہی میں رہتی تھی۔ مجھے یاد آگیا کہ ان دنوں نورین کی سسرال والوں سے کوئی ان بن چل رہی تھی۔ شاید آصف ماموں اسی سلسلے میں حیدرآباد گئے تھے۔''
''تمہیں حیدرآباد جانے کی کیا ضرورت تھی؟'' میں نے درشت لہجے میں کہا۔
''وہ اصل میں آصف ماموں نے مجھے بتایا تھا کہ وہ تمہیں لے کر حیدرآباد جائیں گے۔ نورین بھی یہی بتا رہی تھی کہ وہ جب بھی حیدرآباد جاتے ہیں۔ نعمان کے ساتھ ہی جاتے ہیں۔ اس لیے میں بھی تیار ہوگئی۔''
مجھے اس وقت اپنے آپ پر شدید غصہ آیا کہ میں نے تہمینہ کے ساتھ وقت گزارنے کا موقع ضائع کر دیا تھا اور اپنی جگہ وسیم کو بھیج دیا تھا۔ دوسرے دن شام تک وسیم کی واپسی ہوسکی۔
اسی رات تہمینہ سے فون پر میری بات ہوئی۔ وہ بہت افسوس کر رہی تھی کہ میں نے اتنا اچھا موقع ضائع کر دیا۔
''آصف ماموں نے تمہیں زیادہ بور تو نہیں کیا؟'' میں نے ہنس کر کہا۔
''آصف ماموں تو زیادہ وقت وسیم صاحب ہی سے بات چیت کرتے رہے۔ آصف ماموں کو اچھی کتابیں اور شاعری پڑھنے کا شوق ہے۔ وسیم کو بھی ادب پر خاصا عبور حاصل ہے۔ اسے اساتذہ کے بے شمار اشعار از بر ہیں۔''
''اچھا!'' میں نے حیرت سے کہا۔ ''مجھے تو کبھی احساس ہی نہیں ہوا کہ وسیم کو شعر و ادب کا بھی ذوق ہوگا؟'' میں نے ہنس کر کہا۔
''اس لیے کہ تمہیں خود شعر و شاعری سے دلچسپی نہیں ہے۔'' تہمینہ نے کہا۔ ''وسیم صاحب بہت سلجھے ہوئے انسان ہیں ان کا شعری ذوق بھی کمال کا ہے۔ آصف ماموں ان کی بہت تعریف کر رہے تھے۔''
''شکر ہے آصف ماموں کو وسیم کی وجہ سے کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔'' میں نے کہا۔ ''ورنہ میں تو یہ سوچے بیٹھا تھا کہ حیدرآباد سے واپسی پر آصف ماموں پھر مجھے جھاڑ پلائیں گے۔''
''آصف ماموں تو وسیم سے بہت خوش ہیں پھر یہ کہ وسیم کے چچا سے آصف ماموں کی پرانی دوستی بھی نکل آئی۔'' تہمینہ نے ہنس کر کہا۔
ہم لوگ دیر تک باتیں کرتے رہے پھر میں نے اس سے اتوار کو آنے کا وعدہ کر کے فون بند کر دیا۔ دوسرے دن وسیم دفتر آیا تو بہت خوش تھا۔ وہ بھی آصف ماموں کی بہت تعریف کر رہا تھا۔ اسی دن شام کو میں حنا کو لے کر لانگ ڈرائیو پر نکل گیا۔
رات کو میں گھر پہنچا تو آصف ماموں موجود تھے۔ مجھے حیرت ہوئی کہ وہ اتنی رات تک وہاں کیوں بیٹھے ہیں۔ میں آصف ماموں کو سلام کر کے کمرے میں آگیا۔ امی بھی میرے پیچھے پیچھے آئیں اور بولیں۔ ''نعمان! تم نے اتنی دیر کہاں لگا دی؟ آصف بھائی کب سے بیٹھے تمہارا انتظار کر رہے ہیں؟''
''میرا انتظار؟'' میں نے حیرت سے کہا۔ ''چلیے میں کپڑے بدل کر آتا ہوں۔''
میں اس وقت گرما گرم چائے کی ایک پیالی پی کر تہمینہ سے بات کرنے کا پروگرام بنائے بیٹھا تھا۔ اب یہ آصف ماموں نہ جانے کیوں نازل ہوگئے تھے اور مجھ سے کیا چاہ رہے تھے؟
میں ڈرائنگ روم میں پہنچا تو آصف ماموں نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔ ''کھانا تو تم باہر کھا کے آئے ہو پھر اتنی دیر کیوں لگ گئی؟''
''میں ابھی آہی رہا تھا'' میں نے جواب دیا۔
''اس لڑکی کے ساتھ کب سے چکر چل رہا ہے؟'' آصف ماموں نے اچانک درشت لہجے میں پوچھا۔
''کک...... کس لڑکی کی بات کر رہے ہیں ماموں؟'' میں نے ہکلا کر پوچھا اور پاپا کی طرف دیکھا تو وہ بھی ناگواری سے آصف ماموں کو دیکھ رہے تھے۔
''زیادہ بھولے بننے کی کوشش مت کرو نعمان!''

آصف ماموں نے کہا۔ ''میں اس لڑکی کی بات کر رہا ہوں جو تمہارے آفس میں کام کرتی ہے۔''

''وہ...... اس سے چکر...... کیسا ماموں؟'' میں نے سنبھل کر کہا۔ ''میں نے آپ کو پہلے بھی بتایا تھا کہ وہ میری اسسٹنٹ ہے اور میں اسے کبھی کبھی ڈراپ کرنے جاتا ہوں۔''

''اس کے ساتھ گھومتے پھرتے بھی ہو۔'' آصف ماموں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

میں سناٹے میں رہ گیا۔ ''ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''ہاں آج ضرور میں اسے ڈنر پر لے گیا تھا، آج اس کی سالگرہ تھی۔ آپ کو شاید علم نہیں کہ ماں باپ کے ہوتے ہوئے بھی وہ یتیموں کی سی زندگی گزار رہی ہے۔'' میں نے کہا اور مختصراً انہیں حنا کے بارے میں بتایا۔

''دیکھو نعمان!'' آصف ماموں نے سرد لہجے میں کہا۔ ''اشفاق سے تمہارا رشتہ بعد میں ہے۔ وہ میرا بچپن کا دوست ہے۔'' اشفاق تہمینہ کے والد کا نام تھا۔

''اس نے میری ذمے داری پر تہمینہ کو یہاں بھیجا ہے۔ میں یوں بھی رشتے میں تم دونوں کا ماموں ہوں۔ تہمینہ اور تمہاری منگنی بھی میرے ہی مشورے سے ہوئی تھی۔''

''آصف بھائی!'' ابو نے ناگواری سے کہا۔ ''آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟''

''میں نعمان کو صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اگر اس نے اپنی حرکتیں نہ چھوڑیں تو مجھے کچھ اور سوچنا پڑے گا۔''

''کن حرکتوں کی بات کر رہے ہیں آپ؟'' پاپا بگڑ کر بولے۔ ''میں نعمان کو اچھی طرح جانتا ہوں۔''

''میں خدانخواستہ نعمان کی برائی نہیں کر رہا ہوں۔'' آصف ماموں نے کہا۔ ''لیکن مجھے وہ لڑکی بالکل پسند نہیں ہے جسے یہ اپنی گاڑی میں ڈراپ کرنے جاتا ہے۔''

''توبہ ہے آصف بھائی!'' امی نے ہنس کر کہا۔ ''آپ نے تو میری جان ہی نکال دی تھی۔ میں سمجھی آپ نے نہ جانے نعمان کی کون سی حرکتیں دیکھ لیں۔''

پاپا کے چہرے کا تناؤ بھی کم ہو گیا۔ میں چند لمحوں تک گم صم سا وہاں بیٹھا رہا۔ پھر ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''نعمان!'' آصف ماموں نے شفقت سے مجھے پکارا۔ ''لگتا ہے تم ناراض ہو گئے ہو۔ میری بات کا برا مت ماننا بیٹا۔ شاید میں نے غصے میں کچھ زیادہ ہی تلخ زبان اختیار کر لی تھی۔'' انہوں نے اٹھ کر میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور میں ان کے سینے سے لگ گیا۔

اس رات تہمینہ سے میری بات ہوئی تو میرا موڈ بحال ہو گیا۔ میں اب سنجیدگی کے ساتھ حنا سے پیچھا چھڑانا چاہتا تھا۔ میں کسی ایسے بہانے کی تلاش میں تھا کہ میں اس سے ہمیشہ کے لیے تعلقات منقطع کر لوں۔ میں دیر تک اس موضوع پر سوچتا رہا لیکن مجھے کوئی ایسا سنگین الزام نہیں سوجھا جسے بنیاد بنا کر میں حنا سے تعلقات ختم کر لیتا۔ تہمینہ جب سے میری زندگی میں آئی تھی، حنا کی ذات میرے لیے کشش کھو چکی تھی۔

دوسرے دن میں آفس جاتے ہوئے بھی اسی بات پر غور کر رہا تھا۔ میں آفس جا کر بیٹھا ہی تھا کہ سہیل کا ٹیلی فون آ گیا۔ اس سے بات کر کے اچانک مجھے ایک خیال آ گیا۔ میں نے اس سے کہا۔ ''یار سہیل! تو شام کو مجھ سے ملاقات کر سکتا ہے؟ میں جانتا ہوں کہ تو ثمرین کے ساتھ ہو گا لیکن یار ایک شام کے لیے تو اس سے کوئی بھی بہانہ کر لینا۔''

''ایسی کیا آفت ہے۔'' سہیل نے کہا۔ ''میں شام کو خود تم سے ملنے والا تھا۔ ثمرین آج کل اپنے چچا کے گھر گوجرانوالہ گئی ہوئی ہے۔ اس کے کزن کی شادی ہے۔''

''پھر تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''میں شام کو تیرا انتظار کروں گا۔''

شام کو سہیل سے ملاقات ہوئی تو ہم ایک پُرسکون ریسٹورنٹ میں جا بیٹھے۔ سہیل نے ہنس کر پوچھا۔ ''یار! وہ تیری مہندی کہاں ہے؟'' وہ حنا کو مہندی کہہ کر چھیڑا کرتا تھا۔ ''کیا تیرا اس سے جھگڑا ہو گیا؟''

''یار! ساری پریشانی اسی کی وجہ سے ہے۔'' میں نے کہا۔

''کیسی پریشانی؟'' سہیل نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

''اب وہ میرے لیے ناقابلِ برداشت ہو گئی ہے۔ میں اس سے پیچھا چھڑانا چاہتا ہوں۔''

''تیری طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' سہیل نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''پہلے تو نے خود ضد کر کے اس سے منگنی کی اسے مستقبل کے سہانے خواب دکھائے۔ اب وہ تیرے لیے ناقابلِ برداشت ہو گئی ہے؟''

''بس یار! وہ میری بھول تھی۔'' میں نے سر جھکا کر کہا۔ ''تو میرے لیے ایک کام کرے گا؟'' میں نے کہا۔

''میں تیرے کسی بھی کام سے انکار نہیں کرتا۔'' سہیل نے کہا۔

"تو پھر تو کچھ دن کے لیے حنا کو اپنے ساتھ لے جا۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

"کیا؟" سہیل نے اتنی بلند آواز میں کہا کہ اردگرد بیٹھے ہوئے لوگ ہماری طرف دیکھنے لگے۔ "تو ہوش میں تو ہے؟"

"ہاں یار! اس سے پیچھا چھڑانے کا بس یہی ایک طریقہ ہے۔"

"اور میں ثمرین کو چھوڑ دوں؟" سہیل نے درشت لہجے میں کہا۔

"میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ تو دو چار دن کے لیے حنا کو اپنے ساتھ لے جا۔ اسے یہ ظاہر کرنا جیسے تو اسے میری لاعلمی میں لے جا رہا ہے۔ میں اسی واقعے کو بنیاد بنا کر اس سے قطع تعلق کرلوں گا۔" میں نے ڈھٹائی سے کہا۔

"یار! یہ تو اس لڑکی پر ظلم ہوگا۔ جب تجھے اس سے شادی کرنا ہی نہیں تھی تو اسے مجبور کیوں کیا تھا۔ وہ تو تیری گرل فرینڈ تھی اب وہ......"

"یار! یہ تقریر چھوڑ!" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "تو اسے بس کسی طرح لے جا۔ میں جانتا ہوں کہ تو میرے لیے یہ کرے گا۔"

"کوشش کروں گا کہ وہ میرے ساتھ جانے پر راضی ہوجائے۔ میں اس کے سامنے تیری برائی بھی کروں گا۔ تجھے برا بھلا بھی کہوں گا۔ تو ناراض مت ہونا۔"

"تو مجھے گالیاں بھی دے گا تو میں برا نہیں مانوں گا۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"ٹھیک ہے پھر میں اسے کچھ دنوں کے لیے لے جاؤں گا۔ لیکن تو ایک مرتبہ پھر سوچ لے کہ......"

"میں نے سوچ لیا ہے۔" میں نے کہا۔

"میں پرسوں صبح اسے اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ تو آفس سے اس کی چھٹی کا بندوبست کردے۔" سہیل نے کہا۔

"وہ سب میں کرلوں گا۔" میں نے جلدی سے کہا۔ میرے ذہن سے ایک بڑا بوجھ ہٹ گیا تھا۔

دوسرے دن حنا دفتر آئی تو کچھ کھوئی کھوئی سی تھی۔ نہ جانے وہ کیا سوچ رہی تھی لیکن اس روپ میں وہ بہت اچھی لگ رہی تھی۔ میرا دل ایک مرتبہ پھر ڈانواں ڈول ہوگیا لیکن فوراً ہی مجھے تہمینہ کی پرکشش شخصیت کا خیال آگیا۔

میں شام کو گھر جانے کے لیے نکلا تو حنا میرے انتظار میں فٹ پاتھ پر ایک طرف کھڑی تھی۔ میں نے غیر ارادی

پروفیسر منور مرزا

(1933ئ۔ 7 فروری 2000ئ)

معلم، ادیب، شاعر اور ماہر اقبالیات۔ وہ مرزا ہاشم الدین کے ہاں بھیرہ ضلع سرگودھا میں پیدا ہوئے۔ گورنمنٹ ہائی اسکول سرگودھا سے میٹرک، زمیندار کالج گجرات سے ایف اے اور بی اے کے امتحانات پاس کیے۔ پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے اردو، ایم اے عربی اور ایم اے فلسفہ کیا۔ ابتداء میں ریلوے میں کمرشل کلرک پھر محکمہ انہار میں ضلعدار کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ اکتوبر 1953ء میں گورنمنٹ کالج فیصل آباد میں لیکچرار کے طور پر ان کی تعیناتی ہوئی۔ آٹھ برس گورنمنٹ کالج فیصل آباد اور بیس برس گورنمنٹ کالج لاہور میں تدریسی فرائض انجام دیئے۔ پنجاب یونیورسٹی شعبہ اقبالیات کا صدر رہنے کے بعد اقبال اکیڈمی لاہور کے ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ انجمن حمایت اسلام لاہور اور مجلس اقبال فیصل آباد و لاہور کے رکن رہے۔ علامہ اقبال پر سند کا درجہ رکھتے ہیں۔

مرسلہ: اظہر حسین زیدی۔ ملتان

طور پر اس کے نزدیک گاڑی کی۔ وہ جلدی سے گاڑی میں بیٹھ گئی۔

میں نہ چاہتے ہوئے بھی اسے لے کر روانہ ہوگیا۔ پہلے اس نے آئس کریم کھانے کی فرمائش کی پھر لانگ ڈرائیور پر چلنے کو کہا۔ میں نے یہ سوچ کر اس کی بات مان لی کہ یہ میری اس سے آخری ملاقات ہے۔ رات کو ہم نے ایک ساتھ کلفٹن کے ایک ریسٹورنٹ میں ڈنر کیا۔ میں اسے چھوڑ کر گھر پہنچا تو کافی رات ہوگئی تھی۔

دوسرے دن میں آفس پہنچا تو ہمارے سی ای او جہانگیر صاحب نے کہا۔ "نعمان تیاری کرلو، تمہیں شام کی فلائٹ سے دبئی جانا ہے۔ میں بہت مصروف ہوں ورنہ میں خود ہی وہاں جاتا۔ یہ کام بہت ضروری ہے۔ اگر یہ ڈیل فائنل ہوگئی تو ہمیں کروڑوں کا فائدہ ہوسکتا ہے؟"

"سر! وہ تو ٹھیک ہے لیکن حنا بھی ایک ہفتے کی چھٹی پر ہے۔ میں بھی چلا گیا تو یہاں کے کام کون دیکھے گا؟"

"تم یہاں کی فکر مت کرو۔ وسیم اور اکرم صاحب

ہیں۔ وہ سب سنبھال لیں گے۔ بس ہر حال میں تمہیں یہ ڈیل فائنل کرنی ہے۔'' انہوں نے کہا۔

میں اسی وقت آفس سے نکل گیا۔ مجھے گھر جا کر پیکنگ بھی کرنا تھی۔ یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ گھر جاتے ہوئے مجھے ایک سگنل پر سہیل اور حنا نظر آئے۔ وہ سہیل سے یوں مسکرا مسکرا کر باتیں کر رہی تھی جیسے اسے برسوں سے جانتی ہو۔ میں ان کی پشت پر تھا اس لیے ان کی نگاہ مجھ پر نہیں پڑی۔ پھر سگنل کھلنے پر سہیل مخالف سمت میں مڑ گیا۔ میرے دل پر آرے چل رہے تھے۔ دل چاہ رہا تھا کہ کسی طرح حنا کو روک لوں۔ میں نے اسے کال کرنے کے لیے اپنا سیل فون بھی نکال لیا تھا لیکن مجھے تہمینہ کا خیال آ گیا۔ میں اسے کال کرنے کی ہمت نہ کر سکا۔

میں اسی شام دبئی روانہ ہو گیا۔ دبئی میں میرا کام کچھ زیادہ ہی بڑھ گیا۔ اور مجھے واپسی میں ایک ہفتے کے بجائے دو ہفتے لگ گئے۔

میں واپسی میں امی، پاپا اور تہمینہ کے لیے بہت سے تحفے لے کر آیا تھا۔

امی خلافِ معمول بہت چپ چپ تھیں۔ میں ان کی اداسی کا سبب پوچھنے ہی والا تھا کہ سہیل کا فون آ گیا۔ وہ مجھے فوری طور پر اسی مخصوص ریسٹورنٹ میں بلا رہا تھا جہاں ہم ہمیشہ جایا کرتے تھے۔

میں نے کہا۔ ''یار میں ابھی ابھی تو دبئی سے لوٹا ہوں۔ ابھی تو راستے کی تھکن بھی نہیں اتری۔''

''تو کیا دبئی سے پیدل آیا ہے۔'' سہیل نے کہا۔

''یار! ایسی بھی کیا ایمرجینسی ہے؟'' میں نے کہا۔

''ایمرجینسی ہی ہے۔'' سہیل ہنس کر بولا۔

''ہاں! آتے ہوئے میرے لیے گفٹ بھی لیتے آنا۔ میں نے شادی کر لی ہے۔''

''تم نے شادی کر لی ہے؟'' میں اچھل پڑا۔ ''پھر تو مجھے آنا ہی پڑے گا۔ میں گفٹ تیرے لیے نہیں بلکہ بھابی کے لیے لاؤں گا۔''

گھر میں داخل ہوا تو وہاں مجھے ایک بار پھر امی کا اداس اور مغموم چہرہ دکھائی دیا۔ میں نے بے چین ہو کر پوچھا۔ ''کیا بات ہے امی...... آپ اتنی پریشان کیوں ہیں؟''

''یہ سوال تو تم اپنے آپ سے کرو۔ تم نے مجھے اور اپنے پاپا کو ذلیل کر کے رکھ دیا۔ آصف بھائی کے منع کرنے کے باوجود تم پھر اس لڑکی کے ساتھ گھومتے ہوئے نظر آئے۔

آصف بھائی اس دن بہت خراب موڈ میں یہاں آئے تھے۔ انہوں نے الٹی سیدھی باتیں کیں تو تمہارے پاپا بھی آپے سے باہر ہو گئے۔ انہوں نے اسی وقت منگنی توڑنے کا اعلان کر دیا۔''

''پاپا نے میری منگنی توڑ دی؟'' میں نے اضطراب کے عالم میں پوچھا۔ ''امی پلیز، مجھ پر یہ ظلم نہ کریں۔ آپ ابھی آصف ماموں کے گھر جائیں اور......''

''اب میں وہاں کیا لینے جاؤں؟'' امی نے تڑپ کر کہا۔ ''آصف بھائی نے دوسرے ہی دن تہمینہ کی شادی بھی کر دی تھی؟''

''اتنی جلدی؟'' میں حیرت سے گنگ رہ گیا۔

''یہ سب انہوں نے تمہارے پاپا کو دکھانے کے لیے کیا تھا۔ ان دونوں میں بہت تلخ کلامی ہوئی تھی۔''

مجھے ایسا لگا جیسے میں اندر سے بھربھری مٹی کی طرح بکھرتا جا رہا ہوں۔ میرے ذہن میں آندھیاں چل رہی تھیں۔ میں گھر سے نکل گیا اور دیر تک یوں ہی بلا مقصد سڑکوں پر گاڑی دوڑاتا رہا۔

مجھے ہوش آیا تو میں اس علاقے میں پہنچا جہاں وسیم رہتا تھا۔ میں نے سوچا کچھ دیر اس سے بات کر کے اپنا غم ہلکا کر لوں گا۔

وسیم مجھے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ پھر خوش ہو کر بولا۔ ''ارے سر! آپ بہت اچھے موقع پر آئے ہیں۔ آپ دبئی میں تھے تو اچانک مجھے شادی کرنا پڑی۔''

تھوڑی دیر بعد کسی نے مترنم آواز میں مجھے سلام کیا۔ مجھے ایسا لگا جیسے کسی نے میرے سر پر لٹھ دے مارا ہو۔ میں گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ میرے سامنے تہمینہ سجی سنوری کھڑی تھی۔ گویا وسیم کی شادی تہمینہ سے ہوئی تھی۔ میرا ذہن ماؤف ہو کر رہ گیا تھا۔ مجھے زور کا چکر آیا اور میں دوبارہ صوفے پر بیٹھ گیا۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ آصف ماموں کو اتنی جلدی تہمینہ کے لیے رشتہ کہاں سے مل گیا تھا۔ وہ وسیم سے بہت متاثر تھے۔

میں نے سوچا یہ میرے اعمال کی سزا ہے۔ میں نے اب تک نہ جانے کتنی لڑکیوں کے دل دکھائے تھے۔ حنا کے ساتھ تو میں نے بہت ظلم کیا تھا۔ اس کے بعد میں نے اب تک شادی نہیں کی ہے۔ میں شادی کر بھی لوں تو اپنی خوشیوں کو نہیں لوٹا سکتا۔ اپنے تباہ شدہ مقدر کو نہیں بدل سکتا۔

محترم مدیر!
السلام علیکم
لوگ دوسروں کی آپ بیتیاں لکھتے ہیں لیکن میں اپنی آپ بیتی بھیج رہی ہوں مجھ سے محبت کرنے کی غلطی سرزد ہوئی ہے۔ اس غلطی کی سزا میں نے اپنے لیے خود تجویز کی ہے۔ ہو سکتا ہے آپ کو یہ سزا عجیب لگے لیکن کھلی آنکھوں سے اپنے معاشرے کا جائزہ لیں تو میں صحیح نظر آؤں گی۔ پلیز میرا وہی نام کہانی پر استعمال کریں جو میں نے لکھا ہے۔ شناختی کارڈ والا نام اگر آپ نے دے دیا تو میرے گھر والے مجھے قتل کر دیں گے۔

زیتون خان
(کراچی)

موبائل فون کی گھنٹی پھر بجی تھی۔ بجتی ہی رہی میں نے اس کی طرف دیکھا بھی نہیں۔
''دیکھ تو لے...... کس کی کال ہے۔''
''اسی کی ہے اور کون ہوگا۔''
''ہوسکتا ہے کوئی اور ہو۔ تیرے اور بھی ملنے جلنے والے ہیں۔ عزیز رشتے دار ہیں۔ ہوسکتا ہے کسی کو تجھ سے کوئی ضروری کام ہو۔''
''ارے یار! تو سمجھتی کیوں نہیں۔'' میں نے جھنجلا کر

ہاتھ میں پکڑے اخبار کو پرے پھینکا۔ ''یہ اسی کی کال ہے۔ اس کے علاوہ اور کسی کے پاس اتنا فالتو وقت نہیں کہ......''

''تو اخبار نہ پڑھا کر۔ اخبار پڑھ پڑھ کر تیرا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ اس موئے اخبار میں جانے کیا کیا لکھا ہوتا ہے۔'' گل جان نے اخبار کو نفرت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

گھنٹی بجتے بجتے بند ہو گئی تھی۔ گل جان نے سیل فون اٹھا کر اس کا ایک بٹن دبایا۔ پھر دھیرے سے بولی۔ ''ہاں! یہ تو اسی کا نمبر ہے۔''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ذرا توقف کے بعد وہی بولی۔ ''کیا اس سے تو کبھی بات نہیں کرے گی؟''

''نہیں۔''

''تیرے اس سلوک سے اس کے دل پر کیا گزرے گی؟''

''اس کے دکھ میں اور اضافہ ہوگا۔''

''تو پھر...... تو اس سے ایک بار بات کیوں نہیں کر لیتی۔''

''اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اس کا زخم اور ہرا ہو جائے گا۔ اس کا دکھ دوگنا ہو جائے گا۔ اس لیے یہی بہتر ہے کہ اس سے بات ہی نہ کی جائے۔''

''تو اتنی سنگدل ہو جائے گی۔ اس نے تو کبھی سوچا بھی نہیں ہوگا؟''

''شاید ایسا ہی ہو۔''

''اس سے ایک بار بات تو کر لے۔ شاید اس کے بے قرار دل کو قرار آ جائے۔''

''نہیں گل جان! اس سے بات کروں گی تو اس کی بے چینی اور بڑھ جائے گی اور میں اسے مزید انگاروں میں لوٹتا دیکھنا نہیں چاہتی۔ میں نے بڑی مشکلوں سے اپنے آپ کو قابو میں رکھا ہے۔'' یہ کہتے کہتے میں بے قابو ہو گئی تھی اور اپنے آنسوؤں کو روک نہیں سکی تھی۔ گل جان نے آگے بڑھ کر مجھے اپنے سینے سے لگا لیا تھا اور میری پیٹھ تھپتھپانے لگی تھی۔

گل جان میری پڑوسی ہے۔ میری دوست ہے۔ ایسی دوست جو میری ہم راز بھی ہے۔ اس کے علاوہ اور کسی کو معلوم نہیں علی نواز کو کبھی میں نے ٹوٹ کر چاہا تھا۔ دل کی گہرائیوں سے اس سے پیار کیا تھا۔ علی نواز جو میرا کلاس فیلو تھا۔ یونیورسٹی میں میرے ساتھ پڑھتا تھا۔ پہلے اس سے صرف ہائے ہیلو تک راہ و رسم تھی۔ پھر دوستی ہو گئی اور ہم دونوں ایک دوسرے کو اپنے لیے ناگزیر سمجھنے لگے اور پھر وہ وقت بھی آیا جب یہی وجہ تھی اپنے مستقبل کے لیے پروگرام بھی بنانے لگے۔ علی نواز عام لڑکوں سے مختلف تھا۔ موڈ، مزاج اور طبیعت کے لحاظ سے بڑا سلجھا ہوا اور شریف النفس ہیلو ہائے سے بڑھتے بڑھتے ہمارے تعلقات عشق کے مدارج تک پہنچ گئے تھے مگر اس نے کبھی بھی کسی چھچھورے پن کا مظاہرہ نہیں کیا۔ عام لڑکوں کی طرح بے ہودہ مذاق نہیں کیا۔ ہمیشہ مجھ سے تھوڑے فاصلے پر رہا۔ اسے دیکھ کر آنکھوں کو جتنا نور اور دل کو سرور حاصل ہوتا تھا اس سے کہیں زیادہ اس کے اخلاق، اطوار اور رکھ رکھاؤ پر پیار آتا تھا اگر کوئی خوب صورت، خوب سیرت بھی ہو تو سوچیے، وہ کتنا پیارا ہوگا۔

ہم دونوں کا یونیورسٹی میں یہ آخری سال تھا۔ علی نواز مجھ سے کہتا تھا۔ ''امتحان کے ختم ہوتے ہی میں کسی اچھی ملازمت کے لیے کوشش شروع کردوں گا اور پھر برسر روزگار ہونے کے بعد اپنا رشتہ تمہارے گھر بھجواؤں گا۔''

میں نے ازراہ مذاق اس سے پوچھا۔ ''نوکری کرنے سے پہلے بھی تو رشتہ بھجوا سکتے ہو۔ نیک کام میں دیر کیوں؟''

''ارے یار! لڑکی والے سب سے پہلے پوچھتے ہیں۔ لڑکا کیا کرتا ہے؟ نوکری کرتا ہے یا نہیں؟ کرتا ہے تو کیا تنخواہ ہے؟''

''ہاں ایسا تو ہوتا ہے۔ میں تو بھول ہی گئی تھی۔ اس بات کا اطمینان کیے بغیر والدین کیسے اپنی بیٹی کا ہاتھ کسی ایسے آدمی کے ہاتھ میں دے دیں جو کماتا نہ ہو۔ کمائے گا نہیں تو بیوی کو کیا کھلائے گا؟''

وہ مسکرایا۔ ''تم تو خاصی سمجھ دار ہو گئی ہو۔ بہت دور کی باتیں بھی سوچنے لگی ہو۔''

''سوچنا پڑتا ہے ناجی۔'' میں نے بھی اسی موڈ مزاج میں کہا۔ ''کل کلاں کو ہمیں بھی اپنی بیٹی کے رشتے کے وقت ایسی باتوں کا خیال رکھنا ہوگا تو ابھی سے کیوں نہ اس کی پریکٹس کی جائے۔''

اس نے زور سے قہقہہ لگایا تھا۔ میری ہنسی بھی اس کے قہقہے میں شامل تھی۔ دوسری طرف فلک کج رفتار ہم پر ہنس رہا تھا۔ ہمارا تمسخر اڑا رہا تھا۔

ہمارا امتحان ساتھ خیریت کے اختتام پذیر ہوا۔ ہم دونوں کے پرچے بہت اچھے ہوئے تھے اور ہمیں اچھے

ڈویژن سے پاس ہونے کی اُمید تھی۔ اب ہم یونیورسٹی نہیں جاتے تھے اس لیے ہماری ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ البتہ موبائل فون کے ذریعے ہماری بات ہو جاتی تھی۔ ایک دن اس نے کہا۔

''زیتون خان! آج مجھ سے ملونا۔''

''کیوں کیا کوئی خاص بات ہے کیا؟''

''ہاں ملو گی تو بتاؤں گا۔''

اور جب میں اس سے ملی تو وہ بہت خوش تھا۔

''تمہارے لیے ایک خوش خبری ہے۔'' وہ ذرا رکا پھر بولا۔

''مجھے ایک نوکری مل گئی ہے۔ بہت اچھی نوکری۔'' میں خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔ میرے چہرے پر کوئی ری ایکشن نہ دیکھ کر اس نے مجھے ٹوکا۔ ''کیا تمہیں اتنی بڑی، اتنی اچھی خبر سن کر خوشی نہیں ہوئی؟''

''ہوئی، پہلے پوری خبر تو بتاؤ۔ کون لوگ ہیں، کس کا دفتر ہے۔ کون سی کمپنی ہے۔''

''ارے یار! بہت بڑا ادارہ ہے۔ ملٹی نیشنل کمپنی ہے۔ پنجاب میں اس کا ہیڈ آفس ہے۔ یہاں کراچی میں اس کا زونل سیٹ اپ قائم ہوا ہے۔ مجھے سلیکٹ کرلیا گیا ہے۔ تین مہینے تک میری ٹریننگ ہوگی اس کے بعد نوکری پکی ہو جائے گی۔''

''گڈ۔'' میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''کیا تمہیں خوشی نہیں ہوئی؟''

''ابھی تک تو تم نے پوری خبر نہیں بتائی، کتنے لوگوں نے تمہارے ساتھ مقابلے کے امتحان میں شرکت کی۔ پرچہ کتنا ٹف تھا اور......''

''اگرچہ میرے مقابلے میں بہت سے اُمیدوار بہت تجربہ کار تھے مگر اس کے باوجود انہوں نے میرا انتخاب کرلیا۔''

''مگر کیوں...... کیسے؟''

جب انہوں نے پوچھا۔ ''کہاں رہتے ہو؟'' تو میں نے جواب دیا۔ ''دہلی کالونی میں۔''

''تو کیا تم پنجابی ہو؟''

''جی ہاں۔''

''وہ لوگ بہت خوش ہوئے اور میرا اسلیکشن ہوگیا۔''

''چلو، تمہارے پنجابی ہونے کا ایک فائدہ تو ہوا۔''

ذرا توقف کے بعد اس نے مسرور لہجے میں کہا۔

''اب مجھے تمہارے گھر اپنا رشتہ مانگنے کے لیے دیر نہیں کرنی چاہیے۔''

''ہاں، آج کل میرے گھر، میرا رشتہ مانگنے والوں کی لائن لگی ہوئی ہے۔ عام رشتوں کے علاوہ بڑے بڑے گھروں کے رشتے بھی آرہے ہیں۔ ایک رشتہ ایک زمیندار گھرانے کے لڑکے کا تھا۔ لڑکے کے والد اندرون سندھ کے ایک بڑے زمیندار ہیں مگر ہمارے گھر والوں نے انکار کردیا کہ وہ لوگ سندھی ہیں۔''

''بس اتنی سی بات پر۔ چلو اچھا ہی ہوا۔'' علی نواز نے خوش ہو کر کہا۔

''اور ایک رشتہ۔'' میں نے اس کی بات پر توجہ دیے بغیر کہا۔ ''ایک ایسے لڑکے کا آیا جو دبئی میں ایک بڑی ملازمت کرتا ہے مگر میرے والدین نے اسے بھی مسترد کردیا۔ اس لیے کہ یہ لوگ بلوچی تھے۔'' میں ذرا رکی وہ بڑے غور سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اپنی بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''ایک رشتہ ایک ایسے لڑکے کا آیا جو امریکا کا رہائشی ہے۔ گرین کارڈ ہولڈر ہے۔ وہاں اس کا ایک ڈیپارٹمنٹل اسٹور ہے۔''

''اوہ! یہ تو بڑا زبردست رشتہ ہے۔'' علی نواز بیچ میں بول پڑا۔

''مگر ان سے بھی معذرت کرلی گئی کہ وہ لوگ اردو اسپیکنگ ہیں۔''

علی نواز نے اطمینان بھرا سانس لیا۔ ''اس کا مطلب ہے میرے لیے اب تک دروازہ کھلا ہے۔ مجھے فوراً اپنی والدہ کو تمہارے گھر بھجوانا چاہیے۔''

''مت بھیجو۔'' میں نے مختصر جواب دیا۔

''کیوں؟'' اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔

''تم لوگ پنجابی ہو۔ اس لیے تمہاری اماں کو بھی ٹکا سا جواب مل جائے گا۔''

ایک دم اس کی ساری خوش فہمی دور ہوگئی تھی۔ ''پھر تمہارے گھر والے کس سے تمہاری شادی کریں گے؟''

''کسی پختون سے۔ کسی پٹھان خاندان کے لڑکے سے۔''

''چاہے وہ لڑکا تمہارے معیار کا نہ ہو۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ نہ ہو۔ اچھی ملازمت نہ کرتا ہو۔ چاہے وہ......''

''کسی تندور میں روٹی لگاتا ہو۔'' میں نے گویا اس کا جملہ پورا کرتے ہوئے کہا۔

''کیا یہ ظلم نہیں؟ زیادتی نہیں؟ ہم سب مسلمان

ہیں۔ ایک اللہ، ایک رسول ایک قرآن کو ماننے والے ہیں۔ ایک ہی ملک پاکستان کے باشندے ہیں۔ پھر یہ تفریق کیوں؟''

''ہم ایک ملک کے باشندے ضرور ہیں مگر ہمارا معاشرہ ایک نہیں۔ ہم پہلے سندھی ہیں بلوچی ہیں، پنجابی ہیں، پٹھان ہیں، بعد میں پاکستانی ہیں۔''

''مگر زیتون! ہمارے مذہب نے تو ہر کلمہ گو کے لیے عرب اور عجم کا فرق ختم کر دیا ہے۔''

''مذہب کو اب ہم لوگ کتنی اہمیت دیتے ہیں۔ تم اچھی طرح جانتے ہو علی نواز! اور میں تم کو یہی بتانے کے لیے تم سے ملنا چاہتی تھی کہ تم مجھے بھول جاؤ۔ میں تمہیں بھول جاؤں گی۔ ہم تم ایک دوسرے کے نہیں ہو سکتے۔ کبھی نہیں ہو سکتے۔ اس ملک اور اس معاشرے میں جہاں مسلمان ہونا پاکستانی ہونا کافی نہیں۔''

''یہ باتیں ہمیں اس وقت کیوں نظر نہیں آئیں جب ہم نے محبت کی تھی؟''

''محبت اندھی ہوتی ہے نا۔ اس لیے محبت کرنے والوں کو ایسی باتیں سجھائی نہیں دیتیں۔ حالات اور واقعات کا جب سامنا ہوتا ہے تو اس حقیقت سے پردہ اٹھتا ہے۔ تب اس بات کا پتا چلتا ہے کہ تم پنجابی ہو اور میں پٹھان۔ اس لیے ہماری شادی نہیں ہو سکتی۔'' میں ذرا رکی۔ اپنی بھرائی ہوئی آواز کو قابو کرنے کی کوشش کی پھر بولی۔ ''ان حالات میں، میں یہی کہہ سکتی ہوں کہ محبت بھی ضروری تھی بچھڑنا بھی ضروری ہے۔''

علی نواز اضطراری کیفیت میں ٹہلنے لگا۔ ''یہ کیا ہو گیا؟ اس طرح ہم کیسے زندہ رہ سکیں گے؟'' وہ خود کلامی کے انداز میں کہہ رہا تھا۔

کیا اس لیے تقدیر نے چنوائے تھے تنکے
بن جائے نشیمن تو کوئی آگ لگا دے؟

میں خاموشی سے اسے دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی۔ اسے ایک اچھی نوکری ملنے کی جتنی خوشی تھی اس سے کہیں زیادہ غم، زیادہ دکھ اس بات سے ہوا ہے کہ اس کی محبت اس کی چاہت کا بیڑا ایک دم غرق ہو گیا ہے۔ کیا میں نے اسے اس حقیقت سے آگاہ کر کے غلطی کی؟

اچانک وہ میری طرف جھپٹا اور میری کلائی پکڑ کر اپنی طرف کھینچتے ہوئے بولا۔ ''چلو زیتون! ہم کہیں بھاگ جائیں۔ کہیں جا کر ایک دوسرے کے ہو جائیں۔ اس معاشرے کے رسم و رواج کو ٹھکرا کر اپنی دنیا آباد کر لیں۔''

آج اس نے پہلی بار میرا ہاتھ پکڑا تھا۔ اس کے چہرے سے وحشت برس رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے خوف جھانک رہا تھا۔ میں نے اپنی کلائی سے اس کا ہاتھ ہٹاتے ہوئے کہا۔ ''پاگل نہ بنو...... عقل و ہوش سے کام لو...... کیا تم اس دنیا میں نہیں رہتے؟ اخبار نہیں پڑھتے؟ ٹی وی نہیں دیکھتے؟''

اس نے ہونقوں کی طرح میری طرف دیکھا۔ جیسے پوچھ رہا ہو۔ ''آخر تم کہنا کیا چاہتی ہو؟ تمہاری ان باتوں کا کیا مطلب اور مقصد ہے؟''

''لاہور کی سترہ سالہ لڑکی زینت نے بھی تو اپنے محبوب کے ساتھ اپنی پسند کی شادی کر لی تھی۔ اس معاشرہ کے رسم و رواج کو ٹھکرا کر اپنی دنیا آباد کر لی تھی مگر اس کا انجام کیا ہوا؟ اس معاشرے نے کیا انہیں معاف کر دیا؟ موقع ملتے ہی اس کے گھر والوں نے اسے جھانسا دے کر گھر بلایا اور مٹی کا تیل چھڑک کر اسے زندہ جلا دیا۔''

میں ذرا رکی۔ پھر بولی۔ ''میں جب بھی اپنے تصور میں زینت کو زندہ جلتے ہوئے تڑپتے ہوئے چیختے چلاتے ہوئے دیکھتی ہوں تو میرا پورا وجود لرزنے لگتا ہے۔'' میں اس وقت بھی کانپ رہی تھی جیسے مجھے سخت سردی لگ رہی ہے۔ ''علی نواز! میں اس طرح مرنا نہیں چاہتی۔ میں نہیں چاہتی کہ میرا بھائی اور میری ماں، تمہارے ساتھ بھاگ کر شادی کرنے کے جرم میں غیرت کے نام پر مجھے ایسی بھیانک موت مار دیں۔ علی نواز! میں زندہ رہنا چاہتی ہوں اور تمہیں بھی زندہ دیکھنا چاہتی ہوں۔ مجھ سے زیادہ تمہارے ماں باپ کو تمہاری ضرورت ہے۔''

''مگر زیتون! کیا میں تم سے بچھڑ کر...... تمہارے بغیر زندہ رہ سکوں گا؟''

''تمہیں زندہ رہنا ہو گا علی نواز! اپنے لیے نہیں اپنے والدین کے لیے۔ ذرا سوچو غور و فکر کرو انہوں نے کتنے دکھ جھیل کر، اپنی بہت سی خواہشوں کو قربان کر کے تمہیں اعلیٰ تعلیم دلوائی۔ اس قابل بنایا کہ تم ان کا سہارا بنو۔ انہیں سکھ پہنچاؤ۔''

''زیتون! تم اتنی ظالم نہ بنو۔ میرے بارے میں بھی سوچو۔ کیا میں تمہارے بغیر زندہ رہ سکوں گا؟''

''تمہیں زندہ رہنا ہو گا علی نواز! میری دو دن کی محبت کو بھول جاؤ۔ اپنے ماں باپ کی سالہا سال کی محبت کو یاد

کرو۔ ان کے لیے اپنے آپ کو زندہ رکھو۔ میرا خیال دل سے نکال دو۔ ورنہ...... تمہارا کوئی اور قدم...... تمہارا کوئی اور ارادہ......کوئی اور مرضی...... تمہارے لیے بھی موت کا سبب بنے گی اور میرے لیے بھی۔ میری ماں کو زینت کی ماں پروین کی طرح ''نیک پروین'' بننے میں دیر نہیں لگے گی اور میں ابھی مرنا نہیں چاہتی۔''

''تو تم......'' اس نے وحشت بھری نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مجھ سے شادی نہیں کرو گی؟''

''نہیں۔ تم سے شادی نہیں کروں گی۔''

''انکار کر رہی ہو؟''

''ہاں۔''

اس موقع پر اس کا جوری ایکشن تھا۔ میں اسے بیان نہیں کر سکتی۔

''میرے انکار پر۔'' میں نے کہا۔ ''تم چاہو تو مجھے بابر سولنگی کی طرح گولی مار لو یا پیٹرول چھڑک کر آگ لگا دو یا تیزاب سے نہلا کر مجھے عبرت کا نشان بنا دو۔ اگرچہ میں مرنا نہیں چاہتی مگر تمہارے ہاتھوں سے مرنا گوارا کر لوں گی۔ جس طرح بابر سولنگی نے شادی سے انکار پر اپنی محبوبہ ثانیہ کو گولی مار کر ہلاک کر دیا تھا اور اس کی لاش کو کمبل میں لپیٹ کر دو دریا کے علاقے میں پھینک دیا تھا۔ تم بھی مجھے مار کر کہیں پھینک دو۔''

اتنا کہہ کر میں وہاں رکی نہیں۔ آندھی اور طوفان کی طرح واپس آ گئی مگر اپنے گھر نہیں گئی۔ گل جان کے گھر جا کر اس کی مسہری پر ڈھیر ہو گئی۔ گل جان نے مجھے زار و قطار روتے ہوئے دیکھا تو گھبرا گئی۔

''کیا ہوا...... کیا ہوا......!''

''سب کچھ ختم ہو گیا۔ جل کر بھسم ہو گیا۔''

جب میں جی بھر کر رو چکی تو بولی مگر میری بات گل جان کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ فوری طور پر تو میں اسے سمجھانے سے قاصر تھی۔ تھوڑی دیر بعد جب میری حالت قدرے نارمل ہوئی تو میں نے علی نواز سے آخری ملاقات اور اس موقع پر ہونے والی باتیں اسے بتائیں۔

''مگر تو نے شادی سے کیوں انکار کر دیا؟''

''اس کے علاوہ اور کیا کرتی؟ کیونکہ میرے بھائیوں اور ماں نے آنے والے رشتوں سے ثانیہ کے گھر والوں کی طرح کھل کر کہنا شروع کر دیا تھا کہ ہم اپنی برادری ہی میں شادی کرتے ہیں، غیروں میں شادی نہیں کرتے۔ پھر میری

حسن انتخاب

داور حشر میرا نامۂ اعمال نہ پوچھ
اس میں کچھ پردہ نشینوں کے بھی نام آتے ہیں
تاثیر

اس غیرت ناہید کی ہر تان ہے دیپک
شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو
مومن خان مومن

چھریاں چلیں کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے
امیر مینائی

آگے کسو کے کیا کریں دست طمع دراز
اک ہاتھ سو گیا ہے سرہانے دھرے دھرے
میر تقی میر

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ
سینے میں ایک آگ برابر لگی ہوئی
شیفتہ

وہ اشک بن کے چشم تر میں رہتا ہے
عجیب شخص ہے پانی کے گھر میں رہتا ہے
حزیں قادری

مرسلہ: حنیف ادیب۔ لاہور

شادی علی نواز سے کیسے ہوتی؟ یہ بات تو اسے بتانے کی تھی کہ ہماری شادی کبھی نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ تم ہماری برادری کے نہیں اور ہمارے ہاں غیروں میں شادی نہیں ہوتی۔''

''پہلے تو یہ بتا۔'' گل جان بولی۔ ''یہ جو تو نے بابر سولنگی اور ثانیہ کا اسے حوالے دیا ان کا کیا قصہ ہے؟''

''تو اخبار پڑھتی نہیں اور ٹی وی میں صرف ڈرامے دیکھتی ہے۔ اس لیے تجھے کچھ معلوم نہیں کہ اس ملک اور اس معاشرے میں کیا کچھ ہوتا ہے۔''

''کیا کروں، اخبار ہمارے گھر میں آتا نہیں اور ٹی وی پر گھر کے سارے لوگ ڈرامے اور ناچ گانوں کے پروگرام دیکھتے ہیں تو بتا، بابر سولنگی اور ثانیہ کے بارے میں، ایک چاہنے والے نے اپنی محبوبہ کو کیوں گولی مار کر ہلاک کر دیا اور یہ واقعہ کہاں ہوا؟''

''اسی کراچی کا واقعہ ہے۔ ثانیہ گلستان جوہر کی رہائشی اور ایم بی اے کی طالبہ تھی۔ بابر سولنگی کمپیوٹر آپریٹر ہے۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

دونوں کی محبت جانے کیسے پروان چڑھی۔ بابر سولنکی نے ثانیہ کے گھر شادی کا پیغام بھجوایا تو ثانیہ کے گھر والوں نے یہ کہہ کر معذرت کرلی کہ ہم غیروں میں شادی نہیں کرتے۔''

''اس انکار پر بابر سولنکی نے محبوبہ کو قتل کردیا؟''

''ہاں۔ ثانیہ کو اس نے ملاقات کے بہانے بلایا تھا۔ جب ثانیہ گھر نہیں واپس آئی تو اس کے گھر والوں نے تھانے جاکر رپورٹ لکھوائی اور پھر کئی دنوں کے بعد اس کی لاش دو دریا کے علاقے سے کمبل میں لپٹی ہوئی ملی تو اس کے گھر والوں نے بابر سولنکی پر شبہ ظاہر کیا۔ اس سنگ دل نے گرفتاری کے بعد اعتراف جرم کرلیا۔''

ذرا دیر تک گل جان گم سم بیٹھی رہی پھر بولی۔ ''جب تو نے علی نواز سے کہا۔ میرے انکار پر تو بھی بابر سولنکی کی طرح مجھے مار دے تو اس نے کیا کہا؟''

''میری محبت اتنی خود غرض نہیں نہ میں اتنا کمینہ ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپالیا اور شاید رونے لگا تھا کہ میں وہاں مزید رکی نہیں۔ رکتی تو اس کی حالت مجھ سے دیکھی نہ جاتی۔''

''کیا تو اس کے بغیر زندہ رہ سکے گی؟''

''پتا نہیں۔''

''تو تو پڑھی لکھی ہے۔ میری طرح جاہل نہیں۔ کیا ان باتوں کا تجھے علم نہیں تھا۔ جب تو نے ایک غیر پختون لڑکے سے محبت کی تھی۔ تجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے؟''

''نہیں، میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا، اسی کراچی میں رہ کر پل بڑھ کر میں جوان ہوئی تھی۔ میرے گھر والے بھی یہاں کے رسم و رواج میں رچ بس گئے تھے۔ سب سے ملتے جلتے تھے۔ میرے بھائیوں نے بھی میرے کالج اور یونیورسٹی میں پڑھنے سے روکا نہیں تھا۔ غیر پختونوں سے ان کی دوستی بھی تھی۔ اس لیے شاید غیر شعوری طور پر میں یہ سوچتی تھی کہ اب ہم لوگ روایتی پٹھان نہیں رہے ہیں۔ اس منی پاکستان میں اس کے رنگ میں رنگ گئے ہیں۔ اس لیے اس میٹرو ویل ٹو میں رہتے ہوئے میں دہلی کالونی کے رہائشی علی نواز سے قریب سے قریب تر ہوتی گئی۔ میں نے نہ اپنے آپ کو پٹھان سمجھا نہ اسے پنجابی۔ وہ ہر طرح سے ایک شریف لڑکا تھا۔ ایک اچھے خاندان کا چشم و چراغ تھا۔ اس لیے میرا خیال یہی تھا کہ جب تعلیم مکمل کر کے وہ نوکری کرلے گا تو ہم دونوں شادی کرلیں گے۔ ہم دونوں کے گھر والے یہ رشتہ بخوشی قبول کرلیں گے مگر...... مگر شاید یہ میری بھول تھی۔ میرے گھر والے اپنی بہت سی روشن خیالی کے باوجود اندر سے اب تک روایتی پٹھان ہیں۔ اس کا اندازہ مجھے اس وقت ہوا جب انہوں نے میرے لیے آنے والے اچھے سے رشتوں کو یہ کہہ کر ٹھکرا دیا کہ ہم غیروں میں شادی نہیں کرتے۔ ہم پختون ہیں اور پٹھان لڑکے ہی سے بیٹی کی شادی کریں گے۔ اب میرے لیے کسی خوش فہمی میں مبتلا رہنا ممکن نہیں تھا۔ علی نواز پنجابی ہے اس لیے میرے گھر والے ایک غیر پختون لڑکے سے میری شادی پر کیسے رضامند ہو جاتے؟ یہ بات اسے بتانے کی نہیں تھی جو میں نے دل پر جبر کر کے اسے بتا دی۔ اس پر اس کا جوری ایکشن ہونا چاہیے تھا وہ ہوا۔ اس نے جذبات میں آکر گھر سے بھاگ کر شادی کرلینے کی تجویز دی۔ مگر مجھے بخوبی معلوم ہے کہ ایسی پسند کی شادیاں کبھی کامیاب نہیں ہوتیں۔ اپنی روایتوں میں جکڑے ماں باپ، بھائی بہن، ایسے باغی جوڑے کو معاف نہیں کرتے اور غیرت کے نام پر اپنے ہاتھوں انہیں قتل کردیتے ہیں۔ آئے دن ایسی خبریں اخباروں میں چھپتی ہیں اور ٹیلی وژن پر دکھائی جاتی ہیں۔ اس لیے میں نے گھر سے بھاگ کر شادی کرنے کی تجویز بھی مسترد کردی۔ اس لیے کہ محبت ہی سب کچھ نہیں اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا۔

''مگر زیتون! ذرا دل پر ہاتھ رکھ کر بتا کیا وہ اس طرح تجھ سے جدا ہو کر زندہ رہ سکے گا؟''

''اسے زندہ رہنا ہوگا۔ وقت بڑے سے بڑے زخم بھر دیتا ہے۔ جس طرح میں نے یہ زہر غم پی لیا ہے اور اس کے بغیر زندہ رہنے کا عزم کرلیا ہے اسی طرح اسے بھی میرے بغیر زندہ رہنا ہوگا۔''

''اور اگر وہ تیرے گھر آکر رونا پیٹنا اور فریاد کرنا شروع کردے تو کیا ہوگا؟''

''اللہ کا شکر ہے کہ نہ میں نے کبھی اسے اپنا گھر کا پتا دیا تھا نہ اس کے گھر کا پتا معلوم کیا تھا۔ اس لیے میرے گھر تک اس کے آنے کا کوئی کھٹکا نہیں۔ زیادہ سے زیادہ وہ مجھے موبائل پر فون کرے گا اور بس......''

اور اب...... اس کی کال آتی ہے تو میں اس کا نمبر دیکھ کر فون نہیں اٹھاتی، کچھ دنوں بعد وہ مجھے فون کرنا بھی بند کردے گا۔

پیچ کا آدمی

قابلِ احترام معراج رسول صاحب
السلام علیکم
میں کل ہی اس شخص سے ملا ہوں۔ اس کی زندگی پر ایک محنت نے اتنا گہرا اثر ڈالا ہے کہ اب وہ اس کے نام کی مالا جپتا ہے۔ اس لیے کہ اس نے مرتے مرتے بھی ایک اتنا بڑا احسان کردیا ہے کہ وہ چاہ کر بھی اس قرض کو اتار نہیں سکتا۔

محمد ظفر حسین
(کراچی)

میرا معمول تھا کہ فجر کی نماز کے لیے اٹھتا تو مسجد جانے کے لیے گھر سے نکلتے وقت مسواک جیب میں رکھ لیتا، گھر سے مسجد کا فاصلہ خاصا تھا، راستے میں کھیل کا ایک میدان تھا جسے باؤنڈری وال بنا کر پارک کی شکل دے دی گئی تھی اور پھر سڑک تھی جسے عبور کرتے ہی مسجد کا مرکزی دروازہ آجاتا، میں گھر سے نکلتے ہی مسواک نکال لیا کرتا اور مسجد تک پہنچتے پہنچتے مسواک سے فارغ ہو کر اطمینان سے وضو کرتا اور پھر نماز پڑھ کر میدان میں چہل قدمی کرتا ہوا واپسی کی راہ لیتا۔ برسوں سے میرا یہی معمول تھا، صبح صبح فجر کے وقت جو تازہ ہوا مل جاتی وہ پھر پورا دن کہاں ملتی ہے۔ کیونکہ دن نکلتے ہی سڑکوں پر گاڑیوں کا کثیف دھواں اور گرد و غبار پوری فضا کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا۔

میری نوکری حب، بلوچستان میں تھی۔ صبح صبح نکلنا پڑتا، اس لیے نماز سے فارغ ہوتے ہی گھر پہنچ

کر دیگر معمولات نمٹا کر ناشتا کرتا اور پھر باہر آ کر بس کا انتظار کرنے لگتا۔ ہماری کمپنی نے ایک مہربانی کر رکھی تھی کہ آنے جانے کے لیے پک اینڈ ڈراپ کی سہولت مہیا کر دی تھی، چونکہ راستہ بہت لمبا اور تھکا دینے والا تھا لہٰذا اکثریت بس میں آتے جاتے سوتے ہوئے ملتی۔ یہ ایک بیزار کن اور تھکا دینے والا سفر تھا اور تو اور واپسی کا سفر تو اور بھی ناخوشگوار ہو جاتا، خاص کر جب ٹریفک جام ملتا، اور یہ سلسلہ اکثر ہی ہوتا۔ کسی نہ کسی بات پر کوئی نہ کوئی جماعت بیچ سڑک پر ڈیرہ ڈالے احتجاج کر رہی ہوتی، شہر میں آئے دن ہونے والے ہنگاموں اور پھر اس کے بعد احتجاجوں کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی صورتِ حال پر بے بس ہو کر تماشا دیکھنے کی عادت تو ہو ہی چکی تھی مگر آہستہ آہستہ لوگوں پر ان سب باتوں کے خاموش اثرات بھی ظاہر ہونا شروع ہو رہے تھے، کچھ لوگ بات بے بات تکرار کے عادی تو کچھ لوگ بے حسی کا لبادہ اوڑھنے پر مجبور اگر اپنے غصہ کو مجبوراً دبایا تو ڈپریشن، اور اگر اظہار کیا تو ہائی بلڈ پریشر جیسی بیماریوں کے تحفے الگ، اچھے خاصے سمجھ دار اور میچور لوگوں کے ساتھ نئی نسل نے بھی اس کا ایک عجب علاج ڈھونڈ لیا تھا۔ صبح سویرے ہی منہ میں گٹکے اور ماوہ کو ایسے چبا رہے ہوتے جیسے چبا چبا کر اپنا غصہ اپنی صحت پر اتار رہے ہوں اور بے حسی کی چادر اوڑھ کر دنیا کے ہر غم سے آزاد ہو کر بے نیازی کا مظاہرہ کرنے پر مجبور ہیں، صبح کے وقت سلام کا جواب بھی ہوں ہاں کے انداز میں دے کر نیم وا آنکھوں کے ساتھ منہ چلاتے ہوئے سیٹ سے ٹیک لگا کر ان دیکھے سپنوں میں ایسا کھو جاتے کہ پھر فیکٹری کے گیٹ پر بس کے رکنے پر ہی ان کی آنکھیں کھلتیں۔ ایک دو بڑی عمر کے اشخاص ایسے بھی تھے جو بس میں چڑھتے ہی بلا تکان ہر موضوع پر بولنا شروع ہو جاتے، حالات حاضرہ پر گرما گرم تبصرہ، امریکا کو کیفر کردار پہنچانے سے لے کر یہود اور ہنود کی بین الاقوامی سازشوں اور بکاؤ سیاستدانوں کے احوال تک سناتے۔ سفر کے آخر تک ان کی یہ چیخ پکار جاری رہتی۔

مجھے پتا ہی نہ چلا کہ نہ چاہتے ہوئے بھی میں ماحول کے اس تناؤ کا شکار ہو رہا ہوں، گھر میں گھستے ہی مجھے بچوں کے شور اور ان کی فرمائش بری لگنے لگتیں، بیوی کچھ کہنے کے لیے زبان کھولتی تو میں غصے میں آ کر کمرے سے باہر اور کبھی گھر سے باہر نکل جاتا۔ ٹی وی کھولو تو اس میں وہی بم دھماکے۔ اخبار میں بھی مرنے والوں کی باتیں، ٹارگٹ کلنگ، چوری ڈاکے اور اغوا برائے تاوان کی خبریں۔ تنگ آ کر میں نے اخبار اور دوسرے چینل دیکھنے چھوڑ دیئے اور صرف پی ٹی وی چینل دیکھنا شروع کر دیا جس میں ملک کی مثالی ترقی دکھائی جاتی ہے، عوام کی فلاح و بہبود کے لیے شاندار منصوبوں کا ذکر ہوتا ہے۔ ایسا لگتا کہ ٹارگٹ کلنگ، بھتا خوری، مہنگائی کرپشن کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے اگر کوئی مسئلہ ہے تو وہ امریکن سنڈیوں کا مسئلہ ہے جس سے ملک کو بچانا ضروری ہے ورنہ تو راوی چین ہی چین لکھ رہا ہے۔ نیوز کاسٹر خبریں پڑھتے ہوئے ایسے مسکراتے رہتے جیسے ملک میں خوشحالی اور امن و امان کا دور دورہ ہو، جبکہ درحقیقت اس شہر کے رہنے والے نفسانفسی کے دور میں جی رہے تھے اور آہستہ آہستہ میری اور دوسرے لوگوں کی طرح مختلف ذہنی بیماریوں کا شکار ہوتے جا رہے تھے۔

☆☆☆☆

مسجد کے راستے میں پڑنے والے اس پارک کے جنوبی کنارے پر کچھ پتھارے اور ٹھیلے والوں نے قبضہ جمایا ہوا تھا، جہاں پر فروٹ، سبزی اور گوشت والے آ بیٹھے تھے، ایک کونے میں موچی نے بھی عارضی ٹھکانا بنا لیا تھا، دن کے وقت اچھی خاصی رونق ہوتی تھی پر رات ہوتے ہی یہاں نشہ باز اور ہیرونچی آ کر اپنا ڈیرہ جما لیتے اور صبح ہوتے ہی ادھر ادھر نکل جاتے۔ وہ تو شکر ہے کہ آبادی کے بڑھتے ہی مشہور کی گئی ان افواہوں کا بھی خاتمہ ہو گیا تھا جسے سوچ کر مجھے بھی اکثر جھرجھری سی آ جاتی تھی کہ گراؤنڈ کی شمالی دیوار جہاں پر سالہا سال پرانے چند ایک اونچے گھنے برگد اور نیم کے درخت تھے وہاں پر سایہ ہے، وہ جگہ بھاری ہے۔ کئی دفعہ راتوں میں لوگوں کو وہاں سر کٹا بھی نظر آیا تھا اور دن کے علاوہ رات کو بچے بڑے گزرنے سے کتراتے تھے۔ نزدیکی مارکیٹ کا ایک چوکیدار پوری رات میں وقفے وقفے سے یہاں بھی چکر لگا لیا کرتا تھا کیونکہ فروٹ اور سبزی والوں کے ٹھیلے رات کو بھی وہیں موجود رہتے۔

اس دن صبح صبح میں اپنے روزانہ کے معمول کے مطابق چہل قدمی کرتا ہوا گراؤنڈ کے جنوبی حصے کی طرف پہنچا ہی تھا کہ میری ملاقات اس سے ہو گئی۔

مگر وہ سر کٹا نہیں، ایک جیتا جاگتا انسان تھا۔ صبح صبح فضا میں ہلکی سی خنکی ہو جاتی ہے وہ زمین پر پڑا ہوا اپنے جسم کو نیم دائرے کی شکل میں دونوں ہاتھوں کو ٹانگوں میں دبائے سر کو تقریباً گود میں لیے بے خبر سو رہا تھا۔ ایک کتا نزدیک ہی

اس کے پاس لیٹا تھا۔ میرے وہاں پہنچتے ہی وہ چوکنا ہوا اور بھونکنا شروع کر دیا۔ یہ ایک لازمی امر تھا کہ سوئے ہوئے شخص کی آنکھ بھی اس پُرشور آواز سے کھل گئی، اس نے نیم وا آنکھیں کھول کر دیکھا پھر انگڑائی لیتے ہوئے اٹھ بیٹھا۔

جیسے ہی اس کی نظر مجھ سے ملی مجھے اندازہ ہو گیا اس نے مجھے اپنی مخصوص دلچسپی والی نگاہوں سے دیکھا ہے، اس کی کاجل بھری مسلی ہوئی آنکھوں میں انجانی سی چمک عود آئی ہے، یہ لمحاتی سا دورانیہ تھا جس سے گزر کر میں نے اپنا رخ دوسری طرف کیا اور اپنے راستے کی طرف قدم بڑھا دیے کہ اس کی آواز آئی۔ ''بابو جی چائے تو پلا دو۔''

''کون سا ہوٹل کھلا ہے ابھی۔'' میں نے جھنجلا کر اسے دیکھا۔

''یہاں نہیں کھلا تو کیا ہوا، بیس روپے دے دو، بس اڈے پر جاؤں گا، وہ والا تو چوبیس گھنٹے کھلا ہوتا ہے۔'' وہ جان چھوڑنے کی بجائے جان کو ہٹلر ہونے والا لگتا تھا۔

''تم ہو کون ہو؟'' میں نے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ وہ آج پہلی دفعہ ہی اس علاقے میں نظر آیا تھا۔

وہ ایک دم سے کھڑا ہوا، ذرا ترچھا ہو کر ایک ہاتھ کمر پر رکھا، سر کو بڑے ناز سے ہلکا سا خم کیا۔ پھر سینے پر دوسرا ہاتھ رکھ کر بڑی ادا سے بولا۔ کنیز کو ''پاکیزہ'' کہتے ہیں۔

''معاف کرو۔'' میں نے اس کی نوٹنکی پر بیزاری سے جان چھڑاتے ہوئے کہا اور تیزی سے آگے بڑھ گیا۔

پیچھے سے اس نے صدا لگائی!! ''غریبوں کی سنو، وہ تمہاری سنے گا۔ تم ایک پیسا دو گے وہ دس لاکھ دے گا۔''

اس نے اپنی پھٹی ہوئی آواز میں گانا شروع کیا اور میدان کے کونے تک اس کی آواز جیسے میرا پیچھا کرتی رہی۔

صبح کی سیر کا سارا لطف غارت ہو گیا تھا، میں نے گھر پہنچ کر جلدی میں ناشتا کیا اور پھر تیار ہو کر بس اسٹاپ کی طرف چل دیا۔

ہمارے محلے میں ہر جمعرات کو ایک ہیجڑہ خیرات مانگنے کے لیے آیا کرتا تھا۔ وہ کافی عرصے سے آ رہا تھا اور محلے کے ہر گھر سے خیرات و عطیات لے جایا کرتا، ان لوگوں کے بھی علاقے بانٹے ہوئے تھے، یہ کوئی نیا اس علاقے میں وارد ہوا تھا، ابھی تک اس نے کوئی صدا وغیرہ بھی لگانا شروع نہیں کی تھی۔

اگلے کئی دنوں تک میں نے اسے بس شام کو اِدھر اُدھر پھرتے دیکھا اور پھر رات گئے وہ میدان کے اس کونے میں پڑ کر سو جاتا، گویا یہ اس کا عارضی ٹھکانا تھا۔

پھر اکثر ہی ایسا اتفاق ہونے لگا کہ اس کا سامنا ہو جاتا، وہ بلاوجہ کمبل ہونے کی کوشش کر رہا تھا، ایک دن وہ اچانک سامنے آ گیا اس نے تالیاں پیٹتے ہوئے گانا شروع کیا۔

''ماہی آوے گا میں پھلاں نال دھرتی سجاواں گی، جھلاں گی پکھیاں بڑا اپکھ کہندیاں اکھیاں''

اس نے بڑی ادا کے ساتھ اپنی بھنوؤں کو مہارت سے اچکاتے ہوئے میرا استقبال کیا، لگتا تھا کمبخت جیسے میرے ہی انتظار میں بیٹھا ہوا تھا، میں نے جھنجلا کر راستہ بدل لینا چاہا تو وہ ایک دم سے راستے میں آ کھڑا ہوا۔

''مجھے دل میں بسا لو، پلکوں میں چھپا لو، مجھے دھڑکن بنا لو بجنا۔'' اس نے والہانہ انداز میں میرے آگے پیچھے جھومتے ہوئے نیا گانا شروع کر دیا۔

کیا مصیبت ہے کمبخت نے پیچھا ہی پکڑ لیا ہے۔ میں نے ناگواری سے سوچا۔ ''دور ہٹو'' میں نے حتی الامکان اسے اپنے سے دور رکھنے کی سعی کرتے ہوئے اس کی پیش رفت سے خود کو بچایا اور دھمکی دی کہ اگر اس نے آگے بڑھنے کی کوشش کی تو اسے پولیس کے حوالے کر دوں گا۔

کچھ دنوں تک وہ نظر نہیں آیا تو میں نے سکون کا سانس لیا۔ مجھے لگا کہ وہ کسی اور ٹھکانے کی طرف نکل گیا ہے ایسے لوگوں کا کوئی مستقل ٹھکانا کہاں ہوتا ہے، میں دل ہی دل میں مطمئن سا ہو گیا تھا۔

☆☆☆

میں اپنی نوکری کی ٹینشن میں ایسا پھنس کر رہ گیا تھا کہ ہفتوں گزر جاتے اور یہ اتفاق ہی ہوتا کہ ہم سب مل کر اکھٹے بیٹھ کر کھانا کھاتے، ورنہ بیوی نے تو پہلے ہی میرا مزاج دیکھتے ہوئے بچوں کو الگ کھانا دینا شروع کر دیا تھا، اور بچوں نے بھی مجھ سے دور اور الگ تھلگ رہنے میں ہی اپنی عافیت سمجھ لی تھی، میں نے اپنے اردگرد ایک خول چڑھا لیا تھا، بیوی سارا دن گھر کے کام کاج کرتی، کھانا پکاتی، بازار جاتی، سبزی ترکاری، گوشت خرید کر لاتی۔ پہلے ہم دونوں میاں بیوی اکھٹے بچت بازار چلے جایا کرتے، کئی دفعہ دکانداروں سے قیمتوں پر بحث و مباحثہ کے دوران میں ایسا تناؤ پیدا ہوتا کہ تنازعہ کی سی صورتِ حال پیدا ہونے لگتی۔ منہ

جھٹ سبزی فروش اور ٹھیلے والے چن چن کر ایسے جملے کستے کہ بس آگ ہی لگا دیتے۔ رفتہ رفتہ میں نے اپنی ذمہ داریوں سے جان چھڑاتے ہوئے خود کو ایک مخصوص خول میں بند کر لیا۔ گھر والوں سے لاتعلق ہوتا چلا گیا، میرے گھر پہنچتے ہی بچے اِدھر اُدھر ہو جاتے اور بیوی جھٹ کھانا نکالنے کچن میں گھس جاتی، رات کا کھانا نو بجے تک کھا کر عشاء کی نماز اور تھوڑی سی چہل قدمی کرتا اور رات دس بجے سو جاتا۔ گھر کے کیا مسائل ہیں، بچوں کی فرمائشیں، اسکول کے جھنجھٹ یہ سب بیوی دیکھتی تھی۔ وہ بیچاری گھر کے ماحول میں تناؤ نہ پیدا ہونے دینا چاہ رہی تھی، میرے بھڑکتے ہوئے مزاج اور جارحانہ رویے سے بچنے کے لیے کوئی مسئلہ سامنے رکھنے کے بجائے خاموشی سے اسے حل کرنے کی کوشش میں لگی رہتی تھی۔ ایک لگی بندھی زندگی کے اصول طے کر لیے گئے تھے۔ میری لاتعلقی گل کھلا رہی تھی، مجھے بہت عرصے بعد پتا چلا کہ نویں جماعت کے امتحان میں بیٹا ایک پیپر میں فیل ہو گیا۔ اس سے بڑی بچی نائلہ فرسٹ ایئر میں تھی، میٹرک میں اس کا اے گریڈ آیا تھا اور قدرتی طور پر ماشاء اللہ بہت ذہین تھی اور بنیادی تعلیمی معیار کے مطابق اب تک بظاہر اچھی جا رہی تھی۔ بیٹا پرائمری تک تو صحیح چل رہا تھا اس لیے مجھے ان کی پڑھائی کی کوئی فکر نہیں تھی۔ میں نے اس بارے میں استفسار کیا تو پتا چلا کہ ماں کے نسبتاً نرم رویے اور باپ کی توجہ نہ دینے پر سارا دن گلی کے بچوں کے ساتھ کرکٹ میں لگا رہتا ہے، رہی سہی کسر انٹرنیٹ اور کمپیوٹر گیمز نے پوری کر دی ہے۔ ایک نیا ٹرینڈ اور شروع ہوا ہے کہ ویک اینڈ پر پہلے تو بڑی عمر کے لڑکے نائٹ میچ کھیلا کرتے تھے اب چھوٹی عمر کے بچوں نے بھی اس میں حصہ لینا شروع کر دیا ہے۔ اپارٹمنٹس کے 13، 14 سال کی عمر کے کمسن بچے بھی پوری رات گھر سے باہر کھیل کود کے عادی بنتے جا رہے ہیں۔ آجکل کے بچوں نے نرمی کا فائدہ اٹھا کر والدین کا ناک میں دم کر رکھا ہے۔ والدین نے بھی ان کی ضد کے آگے ہار مان لی ہے، مجھے نہیں یاد کہ آخری دفعہ میں نے کب بچوں کو پڑھائی کے بارے میں نصیحت کی تھی۔ ان کے اسکول، کتابوں، یونیفارم اور روزمرہ کے روٹین کے بارے میں پوچھا تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ ماں کتنی ہی سخت کیوں نہ ہو، ایک وقت ایسا آتا ہے کہ بچے بڑے ہو کر اس پر آنکھیں نکالنا شروع کر دیتے ہیں، باپ کو ہر حال میں اپنی ذمہ داری نبھانی چاہیے۔

مسئلے مسائل زندگی کا حصہ ہوتے ہیں اگر انہیں سر پر سوار کر لیا جائے تو مسائل کم نہیں ہوتے بڑھ جاتے ہیں، گھر کے بڑے ہونے کے ناطے میری جو ذمہ داریاں تھیں میں اس سے بری الذمہ نہیں ہو سکتا تھا، مسائل سے منہ موڑ کر ان کا سامنا نہ کرنے کی میری یہ روش غلط تھی اور غلطی بانجھ نہیں ہوتی، مزید غلطیوں کو جنم دیتی ہے، اور عنقریب میری یہ غلطی ایک ایسی ہی بڑی غلطی کا پیش خیمہ بنتے جا رہی تھی۔

رات کے تقریباً دو ڈھائی بجے کا وقت ہوگا، پیاس اور گرمی سے آنکھ کھل گئی، بہت زور کی پیاس لگی تھی، بیوی سارے دن کی تھکی بے خبر سو رہی تھی، میں نے خاموشی سے اٹھ کر دروازہ کھولا کہ مبادا کسی کی نیند خراب نہ ہو، کچن کی لائٹ جلانے ہی والا تھا کہ برابر کے کمرے سے کسی کی سرگوشیوں میں بات کرنے کی آواز سن کر ٹھٹک گیا۔ کمرے میں ہلکی سی روشنی تھی، غالباً کمپیوٹر اسکرین آن تھی، رات کے سناٹے میں ہلکی سرگوشیوں کی بازگشت میں چند الفاظ میرے کانوں میں گونجے تو اندازہ ہوا کہ نائلہ کسی سے ناراضگی کا اظہار کر رہی تھی، انداز روٹھا روٹھا سا تھا، اتنی رات کو کس سے بات کر رہی ہے؟ میں نے دل میں سوچا!!

''ضرور کسی سہیلی سے تکرار ہو رہی ہوگی۔'' میں نے دل ہی دل میں کہا۔ اسکول اور کالج میں پڑھائی کو لے کر بچوں کے آپس میں اختلافات ہو ہی جاتے ہیں۔ کبھی محنت سے تیار کیے گئے نوٹس واپس نہ دینے پر تو کبھی نصابی کتاب کے وقت پر واپس نہ لوٹانے پر میرے دل میں شک کے کسی ناگ نے سر بھی نہ اٹھایا، کیونکہ مجھے اپنے بچوں پر پورا اعتماد تھا، نائلہ فرسٹ ایئر میں آ چکی تھی، گو کہ اب اس نے جوانی کی حدود میں قدم رکھ دیا تھا مگر میرے سامنے تو ابھی تک معصوم بچی ہی تھی، ابھی چند دن پہلے تک تو اس کی معصوم شرارتوں سے گھر میں رونق لگی رہتی تھی، ہاں کالج جانے لگی تو اس کے کھلنڈرے پن میں کچھ کمی آئی اور کچھ سنجیدہ اور ذمہ دار رویے کا مظاہرہ کرنے لگی تھی۔ میں نے سوچا صبح اٹھ کر فائزہ سے ضرور اس کا ذکر کروں گا کہ بچوں کو اتنی رات گئے تک جاگنے کی اجازت نہ دے۔

دوسرے دن میں اس بات کو بھول گیا۔ پھر ایک دن ہوا یوں کہ صبح سویرے بس اسٹاپ پر کمپنی کی بس کا انتظار کر رہا تھا کہ رانگ سائیڈ سے آنے والے تیز رفتار رکشا نے ٹکر مار دی، گو کہ مجھ تک پہنچتے اور بریک لگاتے لگاتے اس کی اسپیڈ میں خاصی کمی آ گئی تھی مگر پھر بھی میں اس کی ہلکی سی ٹکر

سے نیچے گر پڑا، بظاہر اس وقت کوئی شدید چوٹ وغیرہ تو نہیں آئی پر کافی زور سے زمین پر گرا تو کچھ دیر کے لیے حواس مختل سے ہو گئے۔ رکشا والے نے ہی اتر کر مجھے اٹھایا، صبح صبح کا ٹائم تھا۔ بس اسٹاپ پر سوائے میرے اور کوئی نہیں تھا، کچھ حواس بحال ہوئے تو میں نے رکشا والے کا محاسبہ کیا کہ وہ کیوں اتنی تیز رفتاری سے بغیر احتیاط کے رانگ سائیڈ سے آ رہا ہے مگر اس نے تو الٹا مجھ پر ہی چڑھائی کر دی!!

''بھائی صاحب ایک تو آپ خود بے خبر ہو کر سڑک پر کھڑے ہو اور مجھ سے کہہ رہے ہو کہ دیکھ کر نہیں چلاتے۔'' وہ مجھ پر آنکھیں نکال کر بولا۔ ''میں تو روز اس وقت اسی راستے پر آتا جاتا ہوں، آج تک کسی نے مجھے نہیں ٹوکا، آئندہ آپ خود احتیاط کریں یہ سڑک ہے اپنا گھر نہیں، صبح صبح مجھے لیٹ کرا دیا، سواری انتظار کر رہی ہو گی۔''

اس نے بکتے جھکتے الٹا مجھے موردِ الزام ٹھہرایا اور آناً فاناً رکشا اسٹارٹ کیا پھر زن سے نکل گیا۔

میں کافی دیر یونہی حیران و پریشان کھڑا سوچتا رہا۔ پورے ملک میں یہ وبا پھیلی ہوئی ہے۔ اپنی غلطی کوئی بھی نہیں مانتا۔ رانگ سائیڈ پر سفر کرنا کوئی جرم نہیں کیونکہ ہر ایک کو پتا ہے کہ بانی پاکستان کی تصویر والا کاغذ کا ایک ٹکڑا ان کو قانون سے بچا لے گا۔ اس رکشا والے کی غلطی نہیں تھی جب آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہو تو کس کو الزام دیا جائے۔

دن بھر کام کاج میں طبیعت بوجھل رہی مگر شام کو دفتر سے واپسی پر طبیعت ایسی خراب ہوئی کہ ڈاکٹر کے پاس جانا پڑ گیا۔ پورے جسم میں شدید اینٹھن اور درد محسوس ہو رہا تھا، ہلکا ہلکا بخار بھی شروع ہو چکا تھا۔ ڈاکٹر نے بتایا۔ یہ اسی صبح والی ٹکر کا شاخسانہ ہے، پین کلرز کے ساتھ ایک انجکشن لگایا اور مجھے دو دن کے آرام کا مشورہ دے ڈالا۔

درد کے مارے صبح دفتر جانے کی ہمت ہی نہیں ہوئی، میں نے بھی ڈاکٹر کی ہدایات پر عمل کرنے میں ہی عافیت جانی۔

دو دن گھر پر رہا تو یاد آیا کہ فائزہ نے کب سے مجھے لڑکے کے فیل ہو جانے کے بارے بتایا تھا، پڑھائی کو ترجیح دینے کی بجائے اس کے کھیل کود اور ویک اینڈ کی مصروفیات کے بارے میں بھی آگاہ کیا تھا۔ دو دن میں نے گھر میں رہ کر اس کے خوب کان کھینچے، محلے میں ہی ایک فائنل ایئر کے زیرِ تعلیم انجینئر جو ٹیوشنز بھی پڑھا رہے تھے ان سے اپنے بیٹے کو ٹیوشن پڑھانے کی بات کر لی اور دوسرے ہی دن سے اس نے وہاں جانا شروع کر دیا۔

نائلہ پڑھائی میں ویسے تو بہت اچھی تھی مگر اسے کالج میں کچھ نصابی مسائل کو حل کرنے میں دشواری کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا، اور پھر ویسے بھی کالج کھلتا ہی کتنے دن کے لیے ہے۔ گرمیوں کی طویل چھٹیاں، مختلف تہواروں، سرکاری و غیر سرکاری منائے جانے والے دن، فیسٹیول اور ہر دوسرے دن حالات کی خرابی کے باعث ہونے والی بے تحاشہ چھٹیاں، جن کی وجہ سے کورس کمپلیٹ نہ ہوتا، اور پھر ویسے بھی آجکل تو کوچنگ سینٹرز میں پڑھے بغیر اچھا گریڈ لانا محال سمجھا جانے لگا ہے۔ گلی گلی کھل جانے والے کوچنگ سینٹرز نے اسکول اور کالجز میں دی جانے والی تعلیم اور اساتذہ کی کارکردگی پر سوالیہ نشان لگا دیا ہے۔

انہی دنوں گھر سے کچھ فاصلے پر ایک مشہور کوچنگ سینٹر کی نئی شاخ کا افتتاح ہوا تھا۔ وہ زیادہ دور بھی نہیں تھا بس ایک پیڈسٹرین برج عبور کر کے مین روڈ کراس کرنا تھا، میں نے اپنی بیوی فائزہ سے مشورہ کر کے نائلہ کو وہیں ایڈمیشن دلوا دیا جہاں اسی محلے میں رہنے والی اس کی کالج کی ایک اور سہیلی بھی پڑھ رہی تھی۔ نائلہ کا دیر تک جاگنا اور نیٹ پر چیٹنگ کرنے والی بات میرے ذہن سے نکل چکی تھی۔

دو دن گھر پر آرام کرنے کے بعد پھر سے وہی ٹینشن والی لائف شروع ہو گئی تھی، میں پھر سے اپنی مخصوص ڈگر پر چل پڑا۔

☆☆☆☆☆

کچھ دن گزرے ایک دن صبح سویرے پھر اسی ہجڑے سے سامنا ہو گیا، رمضانوں کی آمد تھی، رات سے ہی گرمی اور حبس کا سا موسم ہو رہا تھا، ابھی فجر کی نماز سے فارغ ہو کر مسجد سے نکلا ہی تھا کہ ہلکی ہلکی بوندا باندی سی شروع ہو گئی، موسم بڑا سہانا ہو رہا تھا، میں نے سوچا کہ آج اس موسم میں ذرا لمبی چہل قدمی ہو جائے تو موسم کا لطف دوبالا ہو جائے۔

ابھی گراؤنڈ کا چکر لگا کر فارغ بھی نہیں ہوا تھا کہ بوندا باندی میں شدت سی آ گئی اور ہلکی پھوار کے ساتھ بارش شروع ہو گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے تیز بارش کی شکل اختیار کر لی۔ اس اثناء میں گراؤنڈ کے جنوبی حصے میں بنی

ہوئی دکان کے چھپر تلے بارش سے پناہ حاصل کرنے کی کوشش کا ارادہ لیے آگے بڑھا ہی تھا کہ وہ نظر آ گیا، وہ بھی بارش سے بچنے کے لیے وہیں پناہ لے چکا تھا، میں نے ناگواری سے اسے دیکھ کر اپنا راستہ بدلنا چاہا، اب چاہے بھیگنا بھی پڑتا تو میں اس چھپر میں اس کے ساتھ کھڑا نہ ہوتا، اس کی ناگوار باتیں میرے بس سے باہر تھیں۔ میں نے قدم آگے کی طرف بڑھائے ہی تھے کہ اس نے والہانہ انداز میں گانا شروع کیا۔ ”کچھ دیر تو رک جاؤ، برسات کے بہانے، کرلیں گے چار باتیں اسی بات کے بہانے،،

اس نے اپنی پھٹی آواز میں گانا شروع کیا اور میں لاحول پڑھتا، بارش میں بھیگتا اپنے راستے پر چل دیا۔ ”ارے رک جاؤ بابو۔ بابو رکو، سنو تو سہی۔“ اس کی آواز میدان کے آخری کونے تک میرا پیچھا کرتی رہی مگر میں نے مڑ کر نہیں دیکھا اور سیدھا گھر پہنچ کر ہی دم لیا۔ اگلے دن وہ نظر نہیں آیا۔ کہیں جا کر مرگیا ہوگا، میں نے دل ہی دل میں اسے کوسا۔

چند دنوں کے بعد رمضان شروع ہوگئے۔

رمضان کی آمد کے ساتھ ہی روزمرہ کی مصروفیات اپنی انتہا کو پہنچ گئیں، اتنی سخت گرمی اور کام کے معمولات میں آنے والی سخت تبدیلی نے دماغ کی چولیں ہلا ڈالیں تھیں، گوکہ روزہ رکھنا ہی روزہ دار کے صبر کی آزمائش ہوتی ہے مگر اس کے برعکس صبر کی بجائے جھنجلاہٹ کا مظاہرہ دیکھنے میں آرہا تھا، نجانے کیوں ہم لوگوں میں صبر ختم ہوتا جا رہا ہے، گھر سے بازار، بازار سے لے کر کاروبار اور نوکری کے معاملات، ہر جگہ بے صبری، بلاوجہ تیزی..... شارٹ کٹ..... سب جگہ ڈنڈی ماری جانے لگی ہے، سرکاری نوکری کی تو بات ہی اور ہے، وہاں تو ویسے ہی عام دنوں میں کام کم اور چھٹیاں زیادہ..... اور لوگوں کو بھی بلاوجہ تنگ کیا جاتا ہے۔ اب تو پرائیوٹ اور کاروباری سیکٹر میں بھی لوگوں کا عمومی رویہ بدلتا جارہا ہے۔ بڑے تاجر سے لے کر ٹھیلے والے، درزی، نائی، حلوائی سب کے سب اس ماہ مقدس کا احترام بھول کر لوٹنے کھسوٹنے میں لگ جاتے ہیں ہر چیز مہنگی اور نایاب۔ دو نمبر اشیاء خریدنے پر مجبور..... ہمارے علاقے میں شام کے وقت سڑکوں پر کھلے عام پھل فروش منہ میں گٹکے دبائے، احترام رمضان کی پرواہ کیے بغیر ایک دوسرے سے نازیبا انداز میں مصروف گفتگو رہتے ہیں اور اپنی اسی ہنسی مذاق کے دوران گاہکوں سے جھوٹ بول کر مہنگے دام اپنا مال بیچ رہے ہوتے ہیں۔

سحری میں جلدی اٹھنے کے لیے رات کو جلدی سونا لازمی ہے ورنہ صبح آنکھ کھلنا بہت مشکل ہے۔ ہمارے محلے میں رمضان شروع ہوتے ہی بے فکر نوجوانوں کے آفیشل رت جگے شروع ہوجاتے ہیں اور یہ رت جگے صبح اٹھ کر کام پر جانے والے اور جلدی سونے والوں کی نیندیں اڑا دینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے۔ نجانے کیوں آجکل کے والدین اپنے بچوں کو ساری ساری رات گھر سے باہر رہنے پر سرزنش نہیں کرتے۔

کہیں ٹیپ بال ٹورنامنٹ تو کہیں بیڈمنٹن کے میچز، سب سے برا پہلو تو یہ ہے کہ یہ سب گلی کے اندر گھروں کے بیچ میں ہونا شروع ہوگیا ہے۔ تیز لائٹس لگا کر بیچ میں نیٹ لگایا اور چل بھئی ہلا گلا پارٹی شروع۔ احساس نام کی کوئی چیز باقی نہیں بچی، یہ کوئی نہیں سوچتا کہ کوئی دن بھر کا تھکا ہارا اپنے گھر میں آرام کررہا ہے یا کوئی امتحان کی تیاری، اور تو اور طاق راتوں میں بھی اس قدر طوفان بدتمیزی مچایا جانے لگا ہے کہ گھر کی خواتین ٹھیک سے عبادت بھی نہیں کرسکتیں۔

میں نے اپنا روٹین چینج کردیا تھا۔ صبح سحری کرکے گھر پر ہی نماز پڑھ لیتا۔ اور کچھ دیر آرام کرکے نوکری پر نکل جایا کرتا تھا۔ رات کو عشاء اور تراویح پڑھ کر فوراً سو جایا کرتا، گھر کے دروازے بند کرکے محلے کے نوجوانوں اور بچوں کے شور وغل سے نجات حاصل کرنے کوشش کرتا مگر لائٹ نے اتنا تنگ کیا کہ بتا نہیں سکتا۔ اچانک چلی جاتی اور پھر کھڑکی دروازے کھولنے پڑتے، گلی میں ہونے والی رت جگوں کی محفلوں سے آنے والا شور سونے کی مہلت ہی نہ دیتا اور نتیجہ بے آرامی کی صورت میں سارا دن موڈ آف رکھتا۔

عید سے کچھ دن پہلے کی بات ہے۔ طاق راتوں کا آغاز ہوچکا تھا۔ محلے کے کچھ بچے بڑے ذوق وشوق سے اعتکاف میں بیٹھے تھے۔ میں نے ستائیسویں شب کو مسجد میں جاگنے کا ارادہ کیا، کیوں کہ دوسرے دن اتوار کی چھٹی آرہی تھی۔ عشاء کی نماز اور تراویح کے بعد تھوڑا آرام کرکے تقریباً رات بارہ بجے مسجد میں آگیا۔ بڑے عرصے کے بعد بہت اچھا موڈ بنا کر مسجد میں عام لوگوں کی طرح آنا بہت بھلا لگ رہا تھا ورنہ تو اس نوکری اور آنے جانے والے لمبے سفر نے مجھے تھکا کر کسی کام کا نہ چھوڑا تھا۔

دو بجے تک نفل، وظائف اور تلاوت میں وقت گزرنے کا پتا ہی نہ چلا۔

میں نے آنے کے ساتھ ہی مسجد کی اندرونی حصے کی صفوں میں جگہ سنبھال لی تھی اور کافی دیر سے ایک ہی جگہ پر عبادت میں مشغول تھا۔ تین بجے صلاۃ وتسبیح کا اہتمام تھا۔ میں نے سوچا کہ کچھ دیر کے لیے مسجد کے صحن میں بیٹھ کر تازہ ہوا لے کر فریش ہو جاؤں۔ مسجد کا صحن بھی کھچا کھچ بھرا ہوا تھا، معتکف حضرات کی مختلف ٹولیاں ٹکڑیوں میں بیٹھی نظر آ رہی تھیں، کہیں دین کی بات تو کہیں درس چل رہا تھا اور کچھ ایسے بھی بے خبر لوگ تھے جو اس رات بھی مسجد میں اپنے اسمارٹ فون آن کیے مصروف تھے۔ ایجادات اور نئی ٹیکنالوجی انسان کے فائدے کے لیے ہوتی ہے۔ مگر فی زمانہ یہ موبائل اور جدید نیٹ ورک ایک ایسا فتنہ ہے جس سے مسجد میں بھی چھٹکارا نہیں، 3G,4G موبائل کنکشن سے دنیا بھر کی معلومات آپ کی ہتھیلی پر ہیں۔ ہر قسم کا اخلاقی یا غیر اخلاقی مواد موبائل پر دستیاب ہے۔ سرکاری طور پر بھی کوئی چیک اینڈ بیلنس نہیں۔

صلوٰۃ وتسبیح سے فارغ ہو کر اجتماعی دعا ہوئی، مسجد میں سحری کا انتظام موجود تھا، مگر میرا گھر پر ہی سحری کا پروگرام تھا، میں مسجد سے نکل آیا، باہر خوشگوار ہوا سی چل رہی تھی، ماحول پر ایک پُرنور دلفریب فضا سی طاری تھی، میں نے اپنا مخصوص راستہ پکڑا، اور بڑے مزے سے چہل قدمی کرتا گھر کی طرف رواں دواں تھا کہ اندھیرے میں سے۔ کسی نے صدا لگائی!!

بابو جی دھیرے چلنا۔ پیار میں ذرا سنبھلنا۔
ہو بڑے دھوکے ہیں۔ بڑے دھوکے ہیں اس راہ میں!

یہ وہی کمبخت تھا، نجانے کہاں سے دوبارہ برآمد ہو گیا تھا،

میں نے حتی الامکان کوشش کی کہ اسے نظر انداز کروں مگر غالباً وہ کہیں نزدیک ہی تھا۔ دو قدم دور ہی چلا ہوں گا کہ وہ میرے نزدیک آ گیا۔

''کچھ شرم کرو۔ آج بڑی رات ہے، لوگ مسجد میں عبادت کر رہے ہیں۔ تم گانے گا رہے ہو، جاؤ جا کر کچھ اللہ کو بھی یاد کر لو، بھولے سے نماز بھی پڑھ لیا کرو کبھی!'' میں نے اس کے کچھ بولنے سے پہلے ہی اس کو لتاڑا۔

''کیا کریں کون ہمیں مسجد میں گھسنے دے گا۔'' وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''ہم بھی اللہ کو مانتے ہیں۔ رمضان میں اپنی بساط بھر روزے بھی رکھتے ہیں، نماز بھی پڑھتے ہیں۔ مگر دکھاوا نہیں کرتے۔'' اس نے میری بات کا طنزیہ انداز میں جواب دیا۔

''اگر مسجد میں نہیں جا سکتے تو اس کا مطلب ہے سڑک پر ناچ گانا شروع کر دو۔ آنے جانے والے لوگوں کو تنگ کرو۔'' میں نے بے زاری سے کہا۔

''تو کیا کریں اسی ناچ گانے سے تو ہماری روزی روٹی بندھی ہوئی ہے۔ ہم لوگ شادی بیاہ اور بچوں کی پیدائش پر ناچتے گاتے ہیں، اور کوئی دوسرا دھندا یا جسم فروشی نہیں کرتے۔'' اس نے صاف گوئی سے اپنے بارے میں بتایا۔

اس کی اس دیدہ دلیری پر میں نے غصہ بھری نگاہوں سے اسے دیکھا تو وہ جلدی سے بولا۔ 'اچھا چلو آج سے گانا بجانا بند، میں نے تو نعت بھی سیکھ رکھی ہے۔

''تو شمع رسالت ہے...... آقا...... تیرا پروانہ......''
اس نے اپنی بھاری کھردری آواز میں محلے کی مسجد میں پڑھی جانے والی مقبول نعت گنگنانا شروع کر دی۔

''ہوں... رمضان میں نعتیں اور پھر وہی ناچ گانا۔''
اس نے چونک کر میری جانب دیکھا، اور میں حسبِ عادت سر جھٹک کر چل دیا۔

☆☆☆☆

چاند رات سے ایک دن پہلے کی بات ہے، فیکٹری میں جلدی چھٹی کر دی گئی تھی، جمعرات سے عید کی چھٹیاں شروع تھیں، تین دن کی چھٹی اور پھر اتوار کو ملا کر ٹوٹل چار دن کی چھٹی بنتی تھی۔ چار دن کی چھٹی کا سوچ کر ہی دل میں طمانیت کا احساس بھر گیا تھا۔ رات نو بجے کا ٹائم ہو گا کہ گلی میں ایک مانگنے والی کی صدا سنائی دی۔ مجھے وہ آواز کچھ جانی پہچانی سی لگ رہی تھی، کوئی اپنی بھاری سی آواز میں نعت پڑھتے ہوئے خیرات مانگ رہا تھا۔ وہ آواز نزدیک آتے آتے بالکل ہمارے گھر کے نزدیک آ گئی۔ وہ عین میرے گھر کے سامنے کھڑے ہو کر صدا لگا رہا تھا۔ میں وہ آواز پہچان گیا۔ یہ وہی ہجڑا تھا جس سے میری مڈبھیڑ ہو جاتی تھی۔ مجھے لگا جیسے وہ کمبخت مجھے ستانے کے لیے ہی آ کر یہاں کھڑا ہوا ہے۔ میں سوچ رہا تھا کہ کسی نے کچھ پیسے اسے دیئے اور وہ وہاں سے ٹل گیا۔ جانے سے پہلے دیر تک ڈھیروں دعائیں دیتا رہا تھا وہ۔

''کیا ضرورت ہے ان ڈھونگیوں کو کچھ دینے کی؟''
میں نے بیوی سے ناراضگی سے پوچھا۔

"ارے ڈھونگی نہیں یہ بیچارے ہوتے ہیں. کون سی ان بیچاروں کی کوئی لگی بندھی نوکری ہوتی ہے۔ کسی کا کیا لیتے ہیں، بس دعا ہی دیتے ہیں۔ دیکھا نہیں کس طرح دل سے ہمارے بچوں کی خیر مانگ رہا تھا۔ کل جب نائلہ نے اسے کھانا دیا تو کتنی دعائیں دے کر گیا ہے۔ اس کی صحت، درازی عمر اور اچھے نصیب کی۔ اللہ ان کی دعائیں سنتا ہے۔" بیوی نے اس کی طرف داری کی۔

"کیا کہا۔ یہ کل بھی آیا تھا؟ کیا روز آتا ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"نہیں روز تو نہیں کبھی کبھی آتا ہے۔ عموماً شام کے وقت آتا ہے، آپ کے کام سے لوٹنے سے پہلے، اس لیے آپ نے دیکھا نہیں ہوگا۔" بیوی نے بتایا۔

اگلے دن چاند رات تھی وہ پھر مانگنے آیا۔ وہ صدا لگا کر نعتیہ اشعار پڑھتا اور ڈھیروں دعائیں دیتا، بڑی بے تکلفی سے باجی، باجی کہہ کر گھریلو خواتین کو مخاطب کرتا، کافی ہمدردیاں سمیٹ لی تھیں اس نے۔

موقع بھی ایسا تھا، لوگ خیرات کرنے میں بخل نہیں کر رہے تھے۔

محلے میں جو خسرا ہر جمعرات کو مانگنے کے لیے آتا تھا، وہ صرف صدا لگا کر تالیاں پیٹ کر مانگا کرتا تھا مگر اس ڈھونگی خسرے نے ایک نیا کام شروع کیا کہ مشہور نعتوں کے اشعار پڑھ کر لوگوں کی ہمدردیاں حاصل کرنے لگا۔

نجانے مجھے کیوں لگتا جیسے وہ ہمارے گھر کے سامنے کچھ زیادہ دیر لگاتا ہے، میری جھنجلاہٹ میں اس کی آواز سن کر اضافہ ہو جاتا، اس کی معنی خیز مسکراہٹ یاد کر کے میرے دماغ میں سوئیاں سی چبھنے لگتیں۔

اگلے دن عید تھی میں نے چوکیدار کو سختی سے منع کر دیا کہ اس ہجڑے کو گلی کے اندر نہ آنے دے، مگر چوکیدار نے بتایا کہ گلی میں ویسے ہی ہم لوگوں نے پیشہ ور عادی بھکاریوں پر پابندی لگائی ہوئی ہے۔ گلی کے کچھ لوگوں نے کہا ہے کہ آج کل عید کے دن ہیں۔ کھانا وغیرہ بچ جاتا ہے،، لہٰذا اسے آنے سے نہ روکیں۔ اگر آپ کو اعتراض ہے تو یونین کے صدر سے بات کر لیں۔"

میں نے یونین کے صدر سے بات کی تو انہوں نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔ "نہیں بابا نہیں...... یہ معصوم لوگ ہیں، یہ مستحق لوگ ہیں۔ اللہ والے ہوتے ہیں، ان کی بددعا نہیں لیتے۔ یہ تو خصوصی رعایت کے حقدار ہیں، میں برداشت سے کام لوں۔" صدر صاحب مجھے سمجھاتے ہوئے بولے۔

"برداشت سے کام لوں۔" وہی تو ختم ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر سوچا۔

☆☆☆☆

جب سے یہ نیا کوچنگ سینٹر کھلا تھا، اس کے ساتھ ہی ایک فاسٹ فوڈ ریسٹورنٹ، آئسکریم پارلر بھی کھل گئے تھے، اس کے ساتھ ہی گول گپے، چاٹ، دہی بھلے اور ایک دو پھل فروٹ کی ریڑھی والوں نے بھی یہیں ڈیرہ جما لیا تھا، ہر وقت اسٹوڈنٹ کا رش اور خصوصاً شام کے وقت چہل پہل میں اضافہ ہو گیا تھا، اس رش کی وجہ سے ملحقہ اوور ہیڈ برج پر بھی لوڈ بڑھ گیا تھا۔ جب سے سگنل فری کوریڈور وجود میں آئے ہیں سڑکوں پر ٹریفک کے جناتی رش کے بہاؤ میں بے انتہا اضافہ ہوا ہے۔ پہلے تو سڑک کے بیچوں بیچ کھڑے ہو کر تھوڑا تھوڑا کھسک کھسک کر روڈ کراس کر لیتے تھے مگر اب تو ایک کے بعد ایک اتنی تیز رفتاری سے گاڑیاں آگے پیچھے سے دن دناتی ہوئی زن سے گزر جاتی ہیں کہ ایک لمحے کے لیے تو اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ جاتی ہے۔ موٹر سائیکل سوار تو کسی کی پرواہ ہی نہیں کرتے، انہیں آگے نکلنے کی اتنی جلدی ہوتی کہ وہ یہ بھی نہیں دیکھتے کہ روڈ کراس کرنے والا ان کی اس تیز رفتاری سے گھبرا کر کسی اور گاڑی سے ٹکرا سکتا ہے۔ اور کچھ شرارتی نوجوان تو جان بوجھ کر تیز رفتار بائیک راہگیروں کے نزدیک لا کر انہیں ڈرا دینے کو تھرل کا نام دیتے ہیں۔

نائلہ نے کوچنگ سینٹر میں داخلہ لیا۔ اس کا بھی گزرنے کا یہی راستہ تھا اسی پیڈسٹرین برج پر ایک واقعہ ہو گیا جس کی تفصیل مجھے کافی عرصے بعد ملی لیکن تسلسل قائم رکھنے کے لیے ساتھ ساتھ بتا رہا ہوں۔ ہوا یہ تھا کہ ایک دن پیڈسٹرین برج کراس کرتے ہوئے وہ ایک نوجوان سے ٹکرا گئی، کتابیں گر گئیں، وہ نوجوان کھسیا کر رہ گیا مگر نائلہ کی سہیلی خاموش نہ رہ سکی اور بغیر سوچے سمجھے غصے سے نوجوان کو انگلش میں باسٹرڈ کہہ دیا۔

نوجوان بھی خاموش نہ رہ سکا اور اس نے کرارہ جواب دیا۔

اس تو تو...... میں میں کے دوران بات بڑھتی گئی، نائلہ کی سہیلی عالیہ بھی کم نہ تھی اور ترکی بہ ترکی جواب دیتی رہی اس کی اسٹوپڈ اور ایڈیٹ کے بیچ نوجوان نے بھی جواباً

تنگ آکر اسے "بچ" کہہ دیا تو عالیہ نے غضب ناک ہو کر ایک زوردار تھپڑ اسے رسید کر دیا۔

اس دوران کچھ منچلے جو وہاں سے گزر رہے تھے، انہوں نے لڑکیوں کی سائیڈ لی اور اس نوجوان کی وہ پٹائی لگائی کہ اس کی درگت بن گئی۔ غالباً وہ بھی اسی کوچنگ سینٹر کے اسٹوڈنٹ تھے۔

ان میں سے ایک نے تو انہیں گھر تک باحفاظت پہنچانے کی از خود ذمہ داری لے لی۔ گلی کے کونے پر گیٹ میں داخل ہونے تک وہ ان کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا آیا تھا۔

دوسرے دن وہ نوجوان جو انہیں باحفاظت گھر تک چھوڑنے گلی کے گیٹ تک آیا تھا وہ بھی اسی کوچنگ سینٹر میں انہیں نظر آیا، وہ انگلش لینگویج کا اسٹوڈنٹ تھا۔

اس نے مسکرا کر بے تکلفی سے انہیں دیکھا، سلام کیا اور خیریت پوچھ لی۔

نائلہ کی دوست بہت بولڈ بنتی تھی، اس نے بھی مسکرا کر جواب دیا اور کل والی بات پر اس کا شکریہ ادا کیا۔

"مائی گڈ نیم از اشعر!" اس نے انگلش میں اپنا تعارف کرایا۔

"می عالیہ اینڈ مائی فرینڈ نائلہ۔" نائلہ کی دوست عالیہ بھی مسکراتے ہوئے بولی۔

وہ روزانہ ہی نظر آنے لگا تھا، کبھی کبھی ہیلو ہائے کے دوران وہ مسلسل انگریزی میں ہی ان سے بات کرتا۔

دونوں سہیلیاں پڑھائی میں تو اچھی تھیں اور اچھے اسکول میں پڑھنے کی وجہ سے انگلش بھی بول اور سمجھ لیتی تھیں مگر روانی نہیں تھی، اس لیے بعض دفعہ اٹک جایا کرتی تھیں۔

ایک دن اشعر نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ بھی دوسرے سبجیکٹ کے ساتھ ساتھ انگلش لینگویج کی کلاس میں داخلہ لے لیں کیونکہ پڑھائی کے ساتھ انگلش بولنی بھی آنی چاہئے، صرف لکھنا پڑھنا ضروری نہیں، اسپیکنگ پاور بہت ضروری ہے۔ بات صحیح تھی، ویسے ہی وہ اشعر کی انگلش کے رعب تلے دبی ہوئی تھیں۔ دونوں سہیلیاں راضی ہوگئیں۔ گھر سے بھی اجازت مل گئی اور ان دونوں نے دوسرے سبجیکٹس کے ساتھ انگلش لینگویج کی ایکسٹرا کلاسز لینی شروع کر دیں۔

انگلش لینگویج کی کلاس بہت ہی انٹرسٹنگ ثابت ہو رہی تھی۔ انگلش ٹیچر بھی زیادہ عمر کا نہیں، کوئی پچیس سال کے لگ بھگ ہوگا مگر بہت ہی پرانا کھلاڑی تھا۔ کلاس کے دوران ایسا جوش ابھار دیتا تھا کہ ڈسکشن کا مزہ آجاتا تھا، بہت ہوشیاری سے اس نے اپنی کلاس کے طلباء کے درمیان دو افراد یعنی ایک لڑکا اور ایک لڑکی پر مشتمل کئی گروپ بنا دیئے جن کا آپس میں ڈسکشن کا مقابلہ ہوتا اور ہارنے والے کو ٹریٹ دینی پڑتی، محض چند دنوں کی واقفیت ان نوجوان طالبعلموں کو قریبی فاسٹ فوڈ ریسٹورنٹ یا آئسکریم پارلر لے آتی، پھر جوابی ٹریٹ اور یہ سلسلہ چل نکلتا۔ یہ ایک اَن دیکھا جال ہوتا جو ان کے گرد آہستگی سے اپنا تانا بانا بنتا چلا جاتا۔ وہ انگلش ٹیچر خود بہت بڑا اٹھرکی تھا اسے استاد کہنا بھی اس پیشے کی توہین تھی۔ اسٹوڈنٹ کی لسننگ پاور کا مسئلہ حل کرنے کے لیے ایسی ایسی انگلش موویز دیکھنے کے مشورہ دیتا تھا جن کے نام سن کر ہی اسٹوڈنٹس کو پسینا آجاتا اور تو اور وہ تو کلاس میں اپنے اسٹوڈنٹ کو معنی خیز سلینگ ورڈز بھی بڑے آرام سے سکھا دیا کرتا۔ اس کا کہنا تھا کہ جب بھی کوئی زبان سیکھو تو سب سے پہلے اس کی گالیاں ضرور سیکھو۔

نائلہ اور عالیہ بھی اس نوجوان اشعر کے ساتھ کئی دفعہ ٹریٹ کے چکر میں آئسکریم پارلر جا چکی تھیں۔ یہ پارلر آہستہ آہستہ ڈیٹ پوائنٹ بنتا جا رہا تھا۔

وہ نوجوان جوتے کھا کر اپنی بے عزتی بھولا نہیں تھا۔ چند ہفتوں بعد وہ پھر اسی راستے میں انہیں ملا، موقع دیکھ کر اس نے ان پر جملہ کسا۔ عالیہ تو فوراً ہی غصے میں کچھ جواب دینے کا ارادہ رکھتی تھی مگر نائلہ کے ہاتھ دبا کر اشارہ کرنے پر مصلحتاً چپ رہی۔ اور وہ دونوں خاموشی سے کترا کر گزر گئیں۔

چند مہینے اسی طرح گزر گئے۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ اس واقعے کی اطلاع اپنے گھر والوں کو دیتیں مگر دونوں ہی اس بات کو چھپا گئیں۔ انہوں نے اپنے انگلش ٹیچر سے بات کی جسے اگر استاد کے بجائے دشمن کہا جائے تو بہتر ہوگا۔ بعد میں پتا چلا کہ اس ٹیچر نے ان دونوں کو اس چھیڑ خانی کرنے والے نوجوان کی کلاس لینے کے لیے انگریزی کے سلینگ ورڈز پر مشتمل ابیوزڈ جملوں، گالیوں اور اخلاق سے عاری گفتگو کی پریکٹس بھی کروائی تھی۔

☆☆☆☆

شام کا وقت تھا، اوور ہیڈ برج پر اچھا خاصہ رش تھا، دونوں سہیلیاں اپنی کلاس اٹینڈ کرنے کے بعد واپس آرہی تھیں، ٹھیک اسی وقت مذکورہ نوجوان جس سے ان کی جھڑپ ہو چکی تھی وہ برج کی دوسری طرف سے آرہا تھا۔ شاید یہ محض اتفاق تھا یا کہ وہ جان بوجھ کر انہیں تنگ کرنے کا پلان بنائے

بیٹھا تھا۔ بہر حال اس برج پر پہلے کی طرح ان کا پھر آمنا سامنا ہونے جا رہا تھا۔ عالیہ اس کی بکواس پر پہلے ہی اچھی خاصی تپی ہوئی تھی، نائلہ بات کو بلاوجہ آگے بڑھانا نہیں چاہ رہی تھی اسی کے سمجھانے پر وہ اب تک خاموش تھی ورنہ بصورت دیگر انگلش ٹیچر نے اسے پوری تیاری کروائی تھی۔

ہمارے یہاں کی عوام کو سڑک اور فٹ پاتھ پر چلنے کا سلیقہ نہیں ہے، اول تو فٹ پاتھ پہلے ہی قبضہ مافیا نے گھیر کر ٹھیلے، خوانچے وغیرہ لگا کر پیدل چلنے والوں کے لیے بند کر دیے ہیں اور عوام الناس خصوصاً خواتین بشمول بچے سڑک کے بیچوں بیچ چلنا اپنا حق سمجھتے ہیں اور اگر بالفرض فٹ پاتھ خالی بھی ہوں تو بھی ہم لوگ بجائے فٹ پاتھ کے سڑک پر ہی چلنے کے عادی بن چکے ہیں۔

اگر دو خواتین اکٹھی ہوں تو خواتین کو یہ زعم ہوتا ہے کہ گزرنے والے راستوں پر مرد انہیں خود راستہ دیں، وہ ذرا سی زحمت نہیں کرتیں کہ سمٹ کر دوسروں کو راستہ دے دیں۔ اور اگر مرد حضرات بھی جلدی میں ہوں یا ڈھٹائی کا مظاہرہ کریں تو اس کا نتیجہ ٹکراؤ کی صورت نکلتا ہے۔ اس برج پر بھی اکثر ایسی ہی صورتِ حال دیکھنے میں آتی کیونکہ برج کا آدھا حصہ چھوٹے پتھارے والوں اور فقیروں نے گھیر رکھے تھے۔ جب طالبات اکٹھی ہو کر چلتیں تو کبھی دو ہو کر ساتھ چلتی ہوئی آتیں۔ اس برج کی چوڑائی ہی اتنی تھی کہ اس پر بیک وقت آنے جانے کے لیے دونوں طرف سے صرف سنگل لائن ہی بن سکتی تھی، اب اگر مرد حضرات ہی بچ کر گرل کی طرف ترچھے ہو کر ان خواتین کو راستہ دے دیں تو ٹھیک ورنہ خواتین خود سے سنگل لائن کی پابندی بالکل نہیں کرتی تھیں اور اکثر ہی اس کشمکش میں دونوں طرف سے مخالفین کی مڈبھیڑ ہو جایا کرتی تھی جس میں زیادہ تر خواتین کی ہی غلطی ہوتی تھی۔ یہ ایک بے ڈھنگا سچ ہے مگر بات وہی تربیت کی آجاتی ہے۔ بہر حال اس دن بھی غالباً غلطی اس نوجوان کی نہیں تھی کہ نائلہ ہی اس سے جا ٹکرائی تھی اور بات کہاں سے کہاں جا پہنچی تھی کہ وہ نوجوان ان کے پیچھے ہی پڑ چکا تھا، اپنی بے عزتی کو بھولا نہیں تھا۔

نائلہ اور عالیہ برج کے درمیان پہنچ چکی تھیں، دونوں ہمیشہ کی طرح سنگل لائن کی بجائے عادتاً سائیڈ بہ سائیڈ چل رہی تھیں۔ لوگ انہیں خود راستہ دے کر نکل رہے تھے، ایسے میں وہ مذکورہ نوجوان ان کے بالکل نزدیک پہنچ چکا تھا، آمنے سامنے پہنچ کر اس نے اپنا منہ پل کی دوسری طرف کر لیا اور ایسے انجان بن گیا جیسے اس نے انہیں آتے ہوئے دیکھا ہی نہیں، مخالف سائیڈ سے آنے والی نائلہ اور عالیہ یہی سمجھ رہی تھیں کہ وہ انہیں ایک طرف ہو کر رستہ دے دے گا اور حسبِ عادت کچھ نہ کچھ فقرے بازی کرتا چلا جائے گا مگر اس نے منہ دوسری طرف کر کے توجہ ہٹالی تھی۔ اس وقت عالیہ اس کی مخالف سائیڈ پر تھی اصولاً تو عالیہ کو ہی ایک طرف ہو کے راستے سے ہٹ جانا چاہیے تھا مگر وہ بھی انا اور ضد میں ایک تھی، پیچھے نہ ہٹی اور نتیجہ تصادم کی صورت اختیار کر گیا، دونوں کے کندھے ٹکرا گئے۔ عالیہ زور سے چیخی تھی۔ ''یو بلائنڈ.....ڈرٹی سوائن۔''

''کانٹ یو سی، بلڈی۔''

عالیہ نے انگلش میں یاد کرے سارے ابیوزڈ اور سلانگ ورڈز کی بوچھاڑ کر دی۔

نوجوان نے بھی ٹوٹی پھوٹی انگلش میں کچھ بولنے کی کوشش کی مگر جب اس نے دیکھا کہ عالیہ کی تیز رفتار انگریزی گالیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا تو اس نے اپنی زبان میں جو ہلکی گالیاں یاد تھیں اسے سنا دیں۔

عالیہ بہت منہ پھٹ تھی۔ نائلہ کے سمجھانے پر بھی رک نہیں رہی تھی، نائلہ بھی اس نوجوان کو تھوڑا بہت برا بھلا کہہ کر خاموش ہوگئی تھی مگر عالیہ مان کر نہیں دے رہی تھی۔

''منہ توڑ دوں گی تمہارا! یو باسٹرڈ۔''

''اور میں تمہارا یہ منہ کہیں دکھانے کے لائق نہیں چھوڑوں گا۔'' نوجوان بھی بہت غصے میں تھا۔

''گھٹیا شخص!!'' عالیہ بھی اب اپنی اوقات پر آگئی تھی اس کا انگلش کا کوٹا پورا ہو چکا تھا۔

اس پورے واقعے کو کوئی ایک منٹ سے زیادہ نہیں ہوا ہوگا، راہگیروں کی مداخلت سے ان لوگوں کے درمیان بیچ بچاؤ کی کوششوں کے درمیان ہی یہ ساری گفتگو چل رہی تھی۔ غلطی ان دونوں لڑکیوں کی بھی نظر آ رہی تھی مگر پھر بھی لوگوں کی ہمدردی انہی کے ساتھ تھی، اور یہ اتفاق تھا کہ اس وقت اسٹوڈنٹس وہاں نظر نہیں آ رہے تھے ورنہ اس دفعہ بھی نوجوان کا پٹنا لازمی تھا۔

''دفعہ ہوتے ہو یا بلاؤں کسی کو۔'' عالیہ نے پل کی دوسری جانب کوچنگ سینٹر کے باہر جمع ہوتے اسٹوڈنٹ کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''بھول گئے پہلی والی مار۔''

''بھولا نہیں ہوں! بہت جلد یاد کراؤں گا تمہیں بھی وقت آنے دو۔'' وہ جاتے جاتے پیچھے مڑا اور دانت پیس کر

بولا۔

والدین کی طرف سے دی گئی آزادی کا یہ غلط فائدہ تھا جو کہ ان بچیوں نے اس وقت اٹھایا تھا۔ اگر وہ چاہتیں تو اسے نظر انداز بھی کر سکتی تھیں، مگر اس دو بدو زبانی مقابلے میں اس نوجوان سے کسی بھی طرح کم نہیں رہی تھیں بلکہ کچھ زیادہ ہی اسے لتاڑنے میں کامیاب رہی تھیں۔ اتنی بدتمیزی کے بعد وہ لڑکا کیا کرنے والا تھا ابھی انہیں اس کا اندازہ نہیں تھا۔

دوسرے دن عالیہ اس واقعے کی رپورٹ اپنے انگلش ٹیوٹر کو دینے کے لیے اتنی بے چین ہوئی کہ اپنے مقررہ وقت سے پہلے ہی وہ دونوں سہیلیاں کوچنگ سینٹر پہنچ گئیں، انگلش لینگویج کی کلاسز کے لیے عمارت کے اوپری حصے میں جگہ مخصوص کی گئی تھی، جہاں پر ایک وسیع و عریض ٹیرس بھی موجود تھا، جہاں شام کو اچھا خاصا اسٹوڈنٹ کا رش ہوتا تھا۔

انگلش ٹیچر کی اس وقت کوئی کلاس نہیں تھی اور وہ شام کو ہونے والی کلاسز کے لیے کچھ ضروری تیاری کر رہے تھے۔ وہ اکیلے ہی تھے۔ اپنی اسٹوڈنٹس کو بڑی میٹھی اور دلآویز مسکراہٹ سے ویلکم کیا۔

دونوں ہونہار اسٹوڈنٹس نے انہیں کل والے واقعے سے آگاہ کیا اور عالیہ کی دھواں دار انگلش کی تعریف ہوئی۔

''وہ بیچارہ تو کچھ بول ہی نہیں پا رہا تھا، عالیہ کی اسٹریٹ لینگویج کے جواب میں۔'' نائلہ نے مسکرا کر اپنی سہیلی کی تعریف کی۔

''اور جواباً اردو میں گالیاں دینے لگا۔'' عالیہ فخر سے بولی۔

''اوہ.... اچھا....'' سر نے گھبرا کر حیران ہونے کی ایکٹنگ کی۔ ''بس تو پھر اب آپ لوگوں کو اردو میں بھی گالیوں کی ٹریننگ دینی پڑے گی کسی دن۔'' سر نے ان کی ہمت بندھائی۔

اس دن کی کلاس کا موضوع نام نہاد روشن خیالی اور اس عطائی استاد کی مہربانی کی بدولت ان اجنبی طالب علموں کو صرف مہینا بھر پرانی جان پہچان والی کلاس فیلوز لڑکیوں کا ہاتھ تھامنے کا سنہری موقع ہاتھ آیا جن کے والدین نے بھی خواب میں بھی اپنی بچیوں کا ہاتھ کسی نامحرم یا اجنبی کے ہاتھ میں اس طرح دینے کا تصور بھی نہ کیا ہوگا۔ یہ ایک لمحہ فکریہ ہے۔ کیا ہمارے مذہب میں لڑکے اور لڑکیوں کی ایسی تعلیم کی اجازت دی گئی ہے، ویسے تو اس کوچنگ سینٹر میں اور بھی کئی لیڈیز اور جینٹس اساتذہ پڑھا رہے تھے مگر وہ ٹھرکی استاد شاید اسی لیے اپنے مخصوص اسٹائل اور کلاس میں اس طرح کے اچھوتے رومانٹک موضوعات کی بناء پر نوجوان طلبہ میں اسقدر مقبول ہو رہا تھا کہ اس کی کلاس میں شرکت کے خواہشمند طلباء کی بھیڑ لگی رہتی تھی۔

اور تو اور، عالیہ کی دلیری پر انہوں نے اس دن کے بعد اس کا نام ''مس کلاشنکوف'' رکھ دیا تھا۔ سر نے فخریہ سب کو بتایا کہ کس طرح ان کی ہونہار شاگرد مس عالیہ نے اپنے انگریزی کے تابڑ توڑ حملوں اور تیز رفتار سلینگ ورڈز کے ذریعے اس نوجوان کو پسپا ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔

اس نوجوان کی قسمت کچھ عجیب انداز میں بار بار اس کا سامنا ان لڑکیوں سے کروا رہی تھی اور ہر بار اسے ہی پسپا ہونا پڑ رہا تھا۔ اسے اتفاق کہیے یا اس نوجوان کی بری قسمت کہ وہ جس فاسٹ فوڈ میں کام کرتا تھا اسی فاسٹ فوڈ میں اس کوچنگ سینٹر کے طلبہ کا آنا جانا لگا رہنے لگا تھا۔ اصل میں یہاں کا پُرسکون ماحول اور اسپائسی بروسٹ سب کو بھا گیا تھا اور ٹریٹ والے چکر میں ہر دوسرے دن وہاں ان کا آنا ہونے لگا۔ اس نوجوان نے کئی دفعہ دونوں سہیلیوں کو بمعہ اشعر اور دوسرے کچھ اسٹوڈنٹس کے ہمراہ اپنے اس ریسٹورنٹ میں آتے دیکھا تھا، بڑی مشکلوں سے اب تک وہ اپنے آپ کو ان کا سامنا کرنے سے بچا پایا تھا مگر ایک دن اس کی قسمت اس کا ساتھ چھوڑ گئی۔ نائلہ کی نظر سب سے پہلے اس پر پڑی۔

''یہ لوفر تو یہاں بھی آ گیا۔'' اس نے عالیہ کے کہنی ماری۔

عالیہ غصے میں اٹھی اور اس پر برس پڑی تھی، ابھی معاملہ کسی کی سمجھ میں بھی نہ آیا تھا کہ اشعر اور دیگر لڑکوں نے اس کا گریبان پکڑ کر کئی تھپڑ لگا دیے، جتنی دیر میں کچھ لوگوں نے اٹھ کر بیچ بچاؤ کرایا، اتنی دیر میں اس نوجوان کی طبیعت صاف ہو چکی تھی۔ مزید یہ کہ وہ لوگ وہاں رکے نہیں اور جھٹ سے اپنی موٹر سائیکل اسٹارٹ کیں اور یہ جا وہ جا۔

مگر اس کے بعد ریسٹورنٹ کے منیجر نے اس نوجوان سے اس معاملے میں باز پرس کی تو وہ کوئی خاطر خواہ جواب نہ دے پایا۔ اپنی صفائی پیش نہ کرنے کی پاداش میں اسے نوکری سے ہاتھ دھونے پڑ گئے۔

☆☆☆☆

اوپر بیان کردہ تمام باتیں بعد میں میرے علم میں آئی

تھیں لیکن زیب داستاں کی خاطر مجھے پہلے بیان کرنا پڑا۔اس لیے میں دوبارہ سے حال کے واقعات میں آجاتا ہوں یوں بھی میری قنوطیت پسندی میں کوئی فرق نہ پڑا تھا، زمانہ اپنی مخصوص رفتار سے چل رہا تھا، میں نے کچھ دن گھر کے معاملات میں دلچسپی دکھائی، بچوں کی تعلیم کے لیے کیے گئے اپنے چند اقدامات کو مناسب سمجھ کر مطمئن ہوگیا، زندگی پھر اسی ڈگر پر آگئی۔ میں نے بے حسی کی چادر اوڑھ لی، آنکھیں بند کرکے پھر سے نوکری کو اپنی ذات کا محور بنالیا۔

ایک دن عشاء کی نماز پڑھ کر گھر کے نزدیک پہنچا ہی تھا کہ پیچھے سے کسی نے مجھے آواز دی۔

میں نے مڑ کر دیکھا تو وہ ہمارے پڑوسی احتشام صاحب تھے۔میں ان کی جانب متوجہ ہوا۔

انہوں نے جھجکتے ہوئے جو کچھ بتایا اس کا خلاصہ یہ تھا۔

وہ اکثر رات گئے مطالعے سے تھک کر ہواخوری کے لیے اپنی ٹیرس پر آکر کھڑے ہوجاتے تھے، اس نے جبران کو ہمارے زینے میں کھڑے دیکھ لیا تھا، اس سے پہلے کئی دفعہ زینے کے سامنے اس کے ہم عمر دوستوں کو سگریٹ اور شیشہ پینے کی محفل سجائے دیکھ چکے تھے۔ رات کے دو ڈھائی بجے کسی کا کیا کام کہ دوسرے کے گھر کے آگے محفل سجا کر بیٹھ جائے، دال میں کچھ کالا تھا۔وہ بغور اسے دیکھنے لگے۔جبران آدھی رات کے وقت چوری چھپے ہمارا زینہ چڑھ رہا تھا، مزید یہ کہ ہمارے گھر کا بھی دروازہ خاموشی سے کھلتے دیکھا اور ایک سایہ کو باہر زینے میں آتے دیکھا۔جبران ہمارے محلے کے رہائشی بینک آفیسر ارشاد صاحب کا سب سے چھوٹا بیٹا تھا جو ابھی حال ہی میں انٹرمیڈیٹ کا ایگزام دے کر فارغ ہوا تھا۔ وہ اسی اپارٹمنٹس کے آخری یونٹ میں سیکنڈ فلور پر رہتا تھا۔

احتشام صاحب کا ماتھا ٹھنکا، وہ کچھ دیر یونہی کھڑے رہے، پھر کچھ سوچ کر نیچے اتر آئے، ہمارے زینے کے سامنے کھڑے ہو کر انہوں نے ایسے ہی جھوٹ موٹ موبائل نکالا اور فرضی کال ملا کر بات کرنے کی ایکٹنگ کرنے لگے، ان کا خیال تھا کہ اس طرح سے ان کی آواز سن کر وہ دونوں فریقین بھی ہوشیار ہو جائیں گے اور مبادا کسی غیر اخلاقی حرکت کا خیال دل میں نہ لائیں گے۔ بقول ان کے وہ زینے کے اندر جانے کی ہمت تو نہ کر سکے اور نہ ہی انہوں نے گلی کے چوکیدار کو اس کے بارے میں کچھ بتایا۔انہیں ڈر تھا کہ اس بات سے لڑکا اور لڑکی کی رسوائی تو ہوتی ساتھ میں خاندان کی بھی جگ ہنسائی لازم تھی۔

بہرحال موبائل فون والی ان کی تدبیر کارگر ہوئی اور دونوں چوکنے ہو گئے۔ احتشام صاحب اپنے اپارٹمنٹ کی طرف واپس ہوئے اور اپنے ٹیرس سے چھپ کر دیکھا کہ ایک سایہ فوراً ہی ہمارے زینے سے نکل کر گاڑیوں کی آڑ لیتا کہیں آگے کی طرف نکل گیا۔ یہ جبران ہی تھا، اس کے ساتھ ہی ہمارے گھر کا بیرونی دروازہ خاموشی کے ساتھ کھلا اور بند ہوا۔ رات کی اس تاریکی میں گلی میں لگائے گئے مرکری لیمپ کی دھندلی روشنی میں انہیں ایک شبیہ سی گھر کے اندر داخل ہوتی نظر آئی تھی۔ بقول ان کے یہ نائلہ تھی۔

مجھے احتشام صاحب کی باتیں انتہائی زہر لگ رہی تھیں۔ کون اپنی بچی پر اس طرح کا الزام قبول کرے گا۔ احتشام صاحب بزرگ اور جہاندیدہ آدمی تھے، میرا ردِعمل دیکھ کر فوراً بولے۔ ”نائلہ میری اپنی بچی کی طرح ہے میں نے اسے اپنے سامنے کھیلتے کودتے اور بڑے ہوتے دیکھا ہے۔اگر مجھے اس کی عزت کا خیال نہ ہوتا تو اسی رات شور مچا کر گلی کے لوگوں کے سامنے دونوں کو پکڑوا دیتا اور دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہو جاتا۔میرا خیال ہے یہ کچی عمر کا جذباتی ابال ہے، گھر جا کر ٹھنڈے دماغ سے سوچیے، بچوں سے غلطی ہوتی ہے اور والدین کا کام انہیں پیار سے سمجھانا ہوتا ہے، آپ باپ ہیں اس لیے اسے جا کر شفقت سے سمجھائیں وہ سمجھ جائے گی اگر میں نائلہ کو اپنی بچی کی جگہ نہ سمجھتا تو آپ سے ذکر بھی نہ کرتا، ایک دن خود بخود کسی اور کی زبانی آپ تک یہ بات پہنچ جاتی، اور شاید اس وقت تک بہت دیر ہو جاتی، یہ میرا فرض تھا کہ میں نے آپ کو باخبر کیا، آگے آپ کی مرضی۔“

احتشام صاحب مجھے گم صم چھوڑ کر چل دیے۔

مجھے احتشام صاحب کی بات پر یقین نہیں آیا تھا۔کوئی بھی اپنی اولاد کو غلط نہیں سمجھتا۔فائزہ ایک بہت اچھی ماں تھی مجھے بھی اپنے بچوں کی تربیت پر پورا یقین تھا، اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو یقیناً ماں کو ضرور علم ہوتا اور وہ مجھ سے ضرور بات کرتی۔ مجھے پتا تھا کہ گلی کے بچے زینوں میں چھپ کر سگریٹ پیتے ہیں اور رات کو دیر تک بیٹھ کر وائی فائی استعمال کرتے ہیں۔ صبح جب میں نماز کے لیے مسجد جاتا تو سگریٹ کے بے شمار ٹوٹے زینے پر نظر آتے جو اس بات کا ثبوت تھے کہ وہاں کوئی اسموکنگ کرتا ہے اور یہ ان گلی کے لڑکوں کے

علاوہ کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا۔ اور رہی زینے میں کسی لڑکے کے کھڑے رہنے کی بات تو ہو سکتا ہے کہ کبھی کبھی اپنے کسی بڑے سے بچنے کے لیے وہ بچے اوپر سیڑھیوں میں جا کر چھپ جاتے ہوں، یا پھر اس دن جبران کو پتا چل گیا ہو کہ احتشام صاحب اسے سگریٹ پیتا ہوا دیکھ رہے ہیں اور وہ ڈر گیا ہو کہ کہیں وہ اس کے گھر والوں سے شکایت نہیں کر دیں، اس لیے وہ ان سے بچ کر اوپر زینے کی طرف چلا گیا ہو، ہمارے کچن کے کچرے کا ڈسٹ بن رات ہوتے ہی داخلی دروازے کے باہر رکھ دیا جاتا ہے تاکہ صبح سویرے سوئیپر وہاں سے اٹھا لے۔ رات گئے دیر سے یاد آنے پر کوئی نہ کوئی اسے نکال کر باہر رکھ دیتا ہے، شاید ٹھیک اسی وقت ہی کسی نے دروازہ کھول کر ڈسٹ بن باہر رکھا ہو اور احتشام صاحب غلط فہمی کا شکار ہو گئے ہوں۔

گھر آکر میں نے اس مسئلے پر کسی سے کوئی بات نہیں کی اور سوچتا رہا کہ ایسا کون سا مناسب حل نکالا جائے جس سے احتشام صاحب کی غلط فہمی بھی دور ہو جائے اور مجھے بھی ایسی شرمناک بات کی تصدیق اپنے گھر والوں سے نہیں کرنی پڑے۔ ایک ہفتہ گزر گیا اور میں بس اسی خیال میں غلطاں و پیچاں رہا کہ کس طرح اس مسئلے کو سلجھا پاؤں کہ کمپنی میں سالانہ آڈٹ کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ اس دفعہ ہماری کمپنی iso سرٹیفکیشن کی تیاری کر رہی تھی جس کے لیے کمپنی کی ہائی مینجمنٹ بھی میدان میں اتر آئی تھی۔ کام کا پریشر مزید بڑھ گیا تھا۔ اس تیاری میں جت کر کسی بات کا ہوش نہ رہا اور احتشام صاحب والی بات میرے ذہن سے کچھ عرصے کے لیے محو ہو گئی۔

☆☆☆☆

وقت کا پہیا گھوم رہا تھا، اس بات کو مہینے سے زیادہ ہو چکا تھا۔

اس دن فجر کی نماز کے لیے نکلا، رات سے تیز ہواؤں کے جھکڑ سے چل رہے تھے اور گرد و غبار کے ساتھ فضا میں مٹی اڑتی رہی تھی، گراؤنڈ کے نزدیک پہنچا، ایک تو ویسے ہی فضا گرد آلود سی تھی اس پر پارک کے جنوبی کونے میں کسی نے کچرے میں آگ لگائی ہوئی تھی، کثیف دھواں اور کچرا جلنے کی ناگوار مہک فضا میں رچی ہوئی تھی، میں پارک میں داخل ہو کر گاڑھے دھوئیں سے بچ کر ایک طرف نکلنا چاہتا تھا کہ ایک آواز سنائی دی۔ بابو جی دھیرے چلنا۔ پیار میں ذرا سنبھلنا۔

منیر احمد خاں

(1936ء۔1999ء)

پاکستان کے نامور ایٹمی سائنس دان اور سابق چیئرمین پاکستان ایٹمی توانائی کمیشن۔ وہ قصور میں مقبول احمد خاں کے ہاں پیدا ہوئے۔ دوران تعلیم مسلم لیگ کے لیے بھی کام کیا۔ 1949ء میں الیکٹرک پاور میں انجینئرنگ کالج لاہور سے گریجویشن کیا۔ فل برائٹ اسکالرشپ پر امریکا کی ریاست جنوبی کیرولینا کے انجینئرنگ کالج سے ایم ایس سی کی ڈگری لی۔ انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ آف نیوکلیئر ٹیکنالوجی کا کورس بھی مکمل کیا۔ علم السیاسیات میں بھی ایم اے کیا اور امریکا ہی میں ملازمت اختیار کرلی۔ 1957ء میں وی آنا میں انٹرنیشنل اٹامک ایجنسی میں چلے گئے اور 1971ء تک وہیں خدمات انجام دیں۔ جنوری 1972ء سے 1991ء تک پاکستان ایٹمی توانائی کمیشن کے چیئرمین رہے۔ اس حیثیت سے انہوں نے پاکستان میں پرامن ایٹمی پروگرام کے لیے نمایاں خدمات انجام دیں۔

مرسلہ: اخلاق عثمانی۔ کراچی

ہو بڑے دھوکے ہیں۔ بڑے دھوکے ہیں اس راہ میں۔

یہ وہی ہیجڑا تھا اور لہک لہک کر گا رہا تھا۔

میں نے آواز کی سمت دیکھا!!

وہ ہوا کی مخالف سمت میں دھوئیں سے بچ کر بستر لگائے بیٹھا تھا۔

یہ ایک نیا ڈراما تھا، وہ جب بھی نظر آتا کوئی نیا تماشا بنائے بیٹھا ہوتا، کوئی نیا گل کھلا ہوتا، اس نے گویا مجھے ستانے کا تہیہ کر لیا تھا۔ اس کی ہر بات مجھے اپنی ذات پر نشانہ بنی نظر آتی۔ میں چاہتا تو اپنا راستہ بدل سکتا تھا اور آیندہ اس راستے پر سے نہ گزرتا۔ گراؤنڈ کے مغربی کنارے والے گیٹ سے بھی ایک راستہ نکل کر مسجد کی طرف جاتا تھا مگر مجھے جھنجلاہٹ سی سوار تھی کہ یہ راستہ میرا روزانہ کا معمول

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایتُ اللّٰہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللّٰہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،
حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ،
سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی،

جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

تھا اور ایک معمولی سا آدمی جسے آدمی بھی کہنا آدمیت کی توہین ہو، اس بیچ کے آدمی کی وجہ سے میں اپنا معمول تبدیل کرتا، میں رک کر اسے دیکھتے ہوئے نفرت سے سوچ رہا تھا کہ اس نے ایک پرانے فلمی گانے کی تان لگائی۔
''کچھ بولو نا...... بولو نا...... بولو نا!!
اس دل کے آنگن میں آنا ہے تم کو۔''
ابھی اس کی تال اور سُر جما بھی نہیں تھا کہ میں نے سلگتے ہوئے لہجے میں سوال داغ دیا۔ ''یہ آگ کیوں لگائی ہے؟''
میرا سوال سن کر اس کی بے ڈھنگی تان کو بریک لگی۔
''سردی لگ رہی تھی بابو۔'' اس نے سردی سے ٹھٹھرنے کی جذباتی اوور ایکٹنگ کی ''اور مچھر بھی بہت ہوگئے ہیں۔ اسی لیے آگ لگالی۔''
''سردی لگ رہی تھی تو کسی اور جگہ جا کر مرو، کمبل اوڑھ لو۔ اس کچرے میں آگ لگانی ضروری ہے کیا؟'' میں نے آگ بگولہ ہو کر کہا۔
''ہائے اللہ، کتنا خیال ہے میرا تمہیں بابو، قسم سے کمبل لاکر دے دو نا مجھے! ٹھنڈ لگدی وے میتوں۔ ٹھنڈ لگ دی۔'' اس نے انگڑائی لیتے ہوئے جھوم جھوم کر ایک بیہودہ سا فلمی گانا شروع کر دیا۔
یہ تو خوا مخواہ خود ہی کمبل ہو رہا ہے میں اس کے عامیانہ پن سے تنگ آکر جانے ہی لگا تھا کہ اس نے فرمائش کر دی! ''لال رنگ کا کمبل لا کر دینا بابو جی، مجھے لال رنگ بہت پسند ہے۔ تمہارے بچوں کو دعا دوں گی۔'' اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے مخصوص انداز میں دعائیں دینی شروع کر دیں۔
''کب لا کے دو گے کمبل بابو۔ میں انتظار کروں گی تمہارا۔'' اس کی دعائیں رکیں تو اس نے نخرے سے پوچھا۔
''قیامت کے دن.....'' میں نے چڑ کر کہا۔
''ارے جب تک تو شاید میں مر ہی نہ جاؤں۔'' اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر مرنے کی ایکٹنگ کی اور گاتے ہوئے بولا۔ ''ہم پہ یہ کس نے ہرا رنگ ڈالا ... اللہ.... ہمیں مار ڈالا۔''
''تو مر جاؤ میری بلا سے۔ کسی دن اکڑ جانا اس سردی میں۔''
''مرنا تو سب کو ہے بابو!..... پر مرنے سے پہلے میری ایک خواہش پوری کردو۔'' اس کی آنکھوں میں شرارت ناچ رہی تھی۔ ''مرنے سے پہلے مجھے ایک بار گلے سے ہی لگا لو پھر چاہے کاندھا بھی نہ دینا۔'' اس نے وارفتگی کا اظہار کر کے میری جان ہی جلا ڈالی۔
اس دفعہ تو میں اپنا غصہ برداشت ہی نہ کر سکا، وہ حد سے بڑھتا جا رہا تھا، میری صبح کی سیر کا تو بیڑہ غرق ہو ہی گیا تھا۔ میں نے سوچا کہ بہت ہوگئی آج ذرا اس کی طبیعت صاف کر ہی دوں، بہت دنوں سے اسے برداشت کرتا آرہا تھا، اب اسے لگام دینا لازمی ہو گیا تھا۔
''کیا دماغ خراب ہے تمہارا۔'' میں چراغ پا ہو گیا۔ ''کیا مطلب ہے اس کا کہ کاندھا نہ دینا؟'' میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''پہلے یہ بتاؤ تم لوگوں کی بھی میت دیکھی ہے کسی نے آج تک؟ کبھی جنازہ اٹھتے ہوئے سنا ہے تم لوگوں کا؟'' میرے لہجے میں کوٹ کوٹ کر طنز بھرا ہوا تھا۔ ''آئندہ سوچ سمجھ کر بات کرنا اور اپنی اوقات میں رہنا اگر پھر بھی ایسی بیہودہ بکواس کی تو ایسا علاج کرواؤں گا کہ دوبارہ اس علاقے میں نظر بھی نہیں آؤ گے۔'' میں نے قطعیت سے کہا۔
میری جارحانہ اور بے رحمانہ باتیں سن کر اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا تھا اور اب اس مسکراتی آنکھوں میں شوخی کی جگہ اچانک یاسیت نے لی تھی۔
وہ کچھ دیر میری آنکھوں میں دیکھتا رہا۔ پھر ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''صحیح کہہ رہے ہو بابو جی! ہماری اوقات ہی کیا ہے، مگر کیا ہم انسان کہلانے کے بھی مستحق نہیں؟ کیا ہمارا دل نہیں چاہتا کہ ہم بھی کسی کو دوست سمجھ کر تھوڑا بہت ہنس بول لیں، دو چار باتیں کر لیں۔ اور یہ بات تو سولہ آنے ٹھیک ہی کہی ہے کہ ہمارا جنازہ تو کبھی ہوتا ہی نہیں۔'' اس کی سرمہ بھری اداس آنکھوں میں دسمبر کی ویران سرد راتوں کا سناٹا سا اتر آیا تھا اور پھر اس نے بڑبڑاتے ہوئے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔
''ہمارا جنازہ نہیں ہوتا....، ہمارا جنازہ نہیں ہوتا۔''
وہ گردن ہلاتے ہوئے بار بار یہی الفاظ دہرائے جا رہا تھا۔

☆☆☆☆

شب و روز اپنی مخصوص ڈھب پر رواں دواں تھے۔ وہ خسرہ اب کافی دنوں سے مجھے پارک یا آس پاس نظر نہیں آرہا تھا، نہ ہی محلے میں اس کی صدا سنائی دے رہی تھی۔ میں مطمئن ہو گیا تھا، اس لیے دوبارہ سے میں پھر اسی ادھوری بات کی طرف آجاتا ہوں۔

وہ نوجوان جس کی عالیہ اور نائلہ سے مڈبھیڑ ہوتی رہی تھی وہ بھی کچھ دنوں سے ان کے راستے میں نہیں آیا تھا، اس دوران وہ دونوں متواتر نزدیکی فاسٹ فوڈ ریسٹورنٹ اور آئسکریم پارلر کے علاوہ سفاری پارک میں اپنے کوچنگ سینٹر کے ساتھیوں کے ہمراہ آؤٹنگ پر جاچکی تھیں، مگر ان سب باتوں کے درمیاں ایک اور اہم بات تھی وہ یہ کہ عالیہ اور اشعر کے بیچ انڈراسٹینڈنگ ڈیولپ ہونی شروع ہوگئی تھی اور اس سے بھی بڑھ کر ایک بات یہ تھی کہ احتشام صاحب نے مجھ سے جبران اور عالیہ کے متعلق جو بات کہی تھی وہ حقیقت پر مبنی تھی۔ جس کا ادراک بعد میں ہوا۔ نائلہ نے جب تک میٹرک نہیں کیا تھا وہ پورے محلے میں یہاں سے وہاں بغیر کسی روک ٹوک کے آتی جاتی تھی۔ ہمارے اپارٹمنٹس کے داخلی دروازے کے ساتھ ایک چھوٹا سا کمرشل ایریا وجود میں آگیا تھا جس میں کچھ دکانیں، بیکری اور سبزی فروش کے ٹھیلے بھی کھڑے رہتے تھے۔ اس کمرشل حصے میں محلے کی خواتین بچوں اور بچیوں کا بھی آنا جانا لگا رہتا تھا، جبران نے بھی نائلہ کو وہاں آتے جاتے، ضرورت کی اشیاء خریدتے دیکھا تھا، ویسے بھی یہ جگہ نوجوانوں کی بھی پسندیدہ آماجگاہ تھی جہاں وہ سرِشام اپنی پتلی پتلی ٹانگوں پر اسکن فٹ جینز چڑھائے، نت نئے عجیب وغریب ہیئر اسٹائلز کے ساتھ ایک ہاتھ میں سگریٹ اور دوسرے میں لیٹسٹ موبائل لیے آتی جاتی نوعمر بچیوں پر نظر رکھتے اور ساتھ ہی ساتھ موقع ملنے پر فقرے بازی کرتے۔ نائلہ نے میٹرک کے بعد جیسے ہی کالج میں قدم رکھا اس کے اندازواطوار میں خود بخود تبدیلی آگئی۔ اس عمر میں بچے اور بچیوں دونوں کو خصوصی توجہ اور تربیت درکار ہوتی ہے مگر آجکل والدین اس عمر کے بچوں کو بجائے اچھی تربیت کے ایک نامناسب سی آزادی دے رہے ہیں، اور وہ آزادی ہے تعلیم کے نام پر دی گئی آزادی۔ بظاہر یہ ایک بہت اچھی بات ہے کہ والدین اپنی اولادوں کو اچھے اسکول اور تعلیم دلوانے کے حق میں ہیں مگر اس کا طریقۂ کار طے کرنے کی ضرورت ہے، خصوصاً لڑکیوں کے لیے تو یہ بہت ضروری ہے۔ بچوں کو ایک دم سے بغیر کسی چیک اور بیلنس کے فریڈم مل جائے تو وہ آپے سے باہر ہوجاتے ہیں اور بس یہیں سے ساری خرابی شروع ہوتی ہے۔ والدین کی دی گئی اس آزادی کا نئی نسل ناجائز طریقے سے فائدہ اٹھارہی ہے، یہ ٹھیک ہے کہ آجکل میاں بیوی گاڑی کے دو پہیے بنے ہوئے ہیں، جن بچوں کے ماں اور باپ دونوں جاب کرتے ہیں ان کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ اپنے بچوں کی سرگرمیوں پر باقاعدگی سے نظر رکھ سکیں مگر کوشش کرکے کم از کم ہفتے دس دن میں ان کے اسکول کالج اور ٹیوشن وغیرہ کے معاملات پر نظر رکھ لینی چاہیئے، بچوں کے دوستوں اور ملنے جلنے والوں کا پتا رکھنا چاہیے، وہ انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا پر کیا کچھ دیکھ رہے ہیں اور ان کو کیا دیکھنا اور کیا نہیں دیکھنا چاہیے یہ سب بچوں کو اب بتانا ضروری ہے ورنہ کسی کو نہیں معلوم کہ آدھی رات کو ایک لڑکا اور لڑکی اپنے کمپیوٹر آن کیے کیا دیکھ رہے ہیں۔

بہرحال ان دونوں سہیلیوں نے والدین کی دی گئی آزادی کا ناجائز فائدہ اٹھایا تھا، جبران اپنے نوعمر دوستوں کے ساتھ کرکٹ کھیلنے کے بہانے ہمارے گھر کے سامنے منڈلانے لگا تھا اور کبھی جب ان کی کرکٹ بال ہماری ٹیرس پر آجاتی تو وہ بال لانے کے بہانے نائلہ سے بات کرنے کی کوشش کرتا، اسی طرح اس نے کچھ دن بعد نائلہ کی توجہ حاصل کرنی شروع کردی، وہ بڑی چالاکی سے کام لے رہا تھا، کبھی کبھی ضرورت پڑنے پر ہمارے گھر کے چھوٹے موٹے کام کردیا کرتا تھا جیسے بازار سے کچھ سودا سلف لادینا وغیرہ۔ وہ عام لڑکوں کی طرح چھچھورا پن کی بجائے شرافت سے نائلہ کے دل میں جگہ بنا رہا تھا اور اس میں کامیاب بھی ہو رہا تھا۔ رفتہ رفتہ نائلہ نے بھی اس میں ایک انجانی سی دلچسپی محسوس کرنی شروع کی۔ ہمارے گھر کا ماحول ویسے تو اتنا لبرل نہ تھا مگر کالج آتے جاتے، محلے میں ہلکا پھلکا مذاق اور اشاروں میں بات چلتے چلتے فون نمبرز کے تبادلے تک آپہنچی اور جبران اس سے ملنے کوچنگ سینٹر تک آپہنچا۔ عالیہ اس معاملے میں اس کی رازدار تھی۔ اس نے اس کی بھرپور حوصلہ افزائی کی۔ کوچنگ سینٹر میں ان کی طرف سے دی جانے والی ٹریٹ میں جبران بھی انوائٹ ہونے لگا، عالیہ نے سب کے سامنے اس کا تعارف اپنے کزن کی حیثیت سے کرایا تھا۔

اس پٹنے والے نوجوان نے نوکری سے نکالے جانے کے بعد پکا ارادہ کرلیا تھا کہ وہ ان دونوں مغرور لڑکیوں کو سبق سکھائے گا۔ نوکری سے ہاتھ دھو لینے کے بعد اس نے کچھ دنوں سے خاموشی کے ساتھ ان دونوں سہیلیوں کے معمولات کا جائزہ لینا شروع کردیا تھا، وہ کب کوچنگ سینٹر آتی ہیں، ان کے چھٹی اور گھومنے پھرنے کا وقت وغیرہ نوٹ کررہا تھا۔ وہ اپنی تضحیک بھولا نہیں تھا بلکہ دل ہی دل

میں خلش لیے ان کے خلاف جوابی کارروائی کا ارادہ باندھ رہا تھا اور مناسب موقع کے انتظار میں تھا۔ وہ نوجوان اس شہر کا نہیں تھا کسی دور دراز پسماندہ علاقے سے بوجہ تعلیم یہاں آیا تھا، وہ قانون کی تعلیم حاصل کررہا تھا، صبح کو لاء کالج اور پھر شام کو اسی باربی کیو ریسٹورنٹ میں پارٹ ٹائم جاب کرتا تھا، اس نے اپنے کالج کے دوستوں سے ان دونوں لڑکیوں کے ہاتھوں اپنی تذلیل کا تذکرہ کیا تھا، اس کے کالج کے یہ دوست کھاتے پیتے بااثر گھرانوں کے بگڑی ہوئی اولاد تھے۔ قانون کی ڈگری صرف اپنے ذاتی فائدے کے حصول کے لیے حاصل کرنا ان کا مقصد تھا، شہر کے پوش ایریا میں کرائے کے فلیٹ میں وہ بے فکرے دوست ٹھہرے ہوئے تھے جہاں ان کی مصروفیات کو پوچھنے والا کوئی نہیں تھا، انہوں نے اس نوجوان کو دونوں لڑکیوں کو اٹھا لینے کا مشورہ دیا، پہلے تو وہ نوجوان اس انتہائی اقدام کے حق میں نہ تھا مگر کچھ دنوں بعد اس کا ارادہ تبدیل ہوگیا، دراصل اس نے ان دونوں کے بارے میں یہی اندازہ لگایا کہ اس طرح آزادی سے گھومنے پھرنے والی لڑکیوں کے لیے وہی سزا ہونی چاہیے جس کا اس کے اوباش دوستوں نے مشورہ دیا تھا، اس نے فیصلہ کرلیا کہ اپنی توہین کا بدلہ اتارنے کا صحیح وقت آگیا ہے۔ اس نے اپنے دوستوں کے ساتھ پلان بنالیا۔

دونوں سہیلیوں کے امتحان نزدیک آرہے تھے، کوچنگ سینٹر نے کچھ کمزور اور پیچھے رہ جانے والے طلبہ کے لیے ایکسٹرا کلاسز کا انعقاد کیا تھا، امتحانات کی تیاری کے دوران انہیں گھومنے پھرنے کا خوب موقع مل رہا تھا کیونکہ گھر والوں کو ویسے ہی یہ یقین دلا دیا گیا تھا کہ آج کل ایکسٹرا کلاسز چل رہی ہیں اور اس کی آڑ میں اب وہ شام کو بھی دیر تک آؤٹنگ پر رہ سکتی تھیں، پہلے پہل وہ زیادہ سے زیادہ آٹھ نو بجے تک گھر واپس آجاتی تھیں مگر اب انہیں دس بجے تک کی چھوٹ مل رہی تھی۔ آجکل ایک نئی پاکستانی مووی کی بڑی دھوم تھی، کئی دفعہ کوچنگ سینٹر میں اس کے بارے میں ڈسکشن ہو چکی تھی، ویسے تو اس کے سارے شو ہاؤس فل جارہے تھے اور ٹکٹ ملنے میں کافی مشکل پیش آرہی تھی کہ اشعر کو کہیں سے اس فلم کے اسپیشل شو کے پاس مل گئے، فلم کا شو 6 سے 8 بجے تھا۔ مگر مسئلہ یہ تھا کہ واپسی پر بہت دیر ہو جاتی اور پھر جمعہ کے دن سے تین دن تک روزانہ شام کو سات سے نو بجے ان کی پریکٹیکل کی ایک خصوصی کلاس تھی، اگر وہ کلاس مس کرتے تو بہت نقصان ہوتا، بس ایک راستہ تھا وہ بھی یہ کہ وہ اسٹوڈنٹ جو پارٹ ٹائم جاب کرتے تھے ان کے لیے اسی دن وہی خصوصی پریکٹیکل کی کلاس نو سے گیارہ بجے بھی رکھی گئی تھی، ان دونوں سہیلیوں نے بہانے بنا کر اپنے ٹیوٹر سے اپنی سات بجے والی کلاس کو 9 سے 11 بجے والی کلاس سے تبدیل کروالیا، گھر پر بھی بتا دیا کہ امتحان کی خصوصی تیاری کے سلسلے میں وہ شام سے رات گیارہ بجے تک کوچنگ سینٹر میں کلاسز اٹینڈ کریں گی۔ معاملہ چونکہ پڑھائی کا تھا اور کوچنگ سینٹر بھی کون سا دور تھا لہٰذا اجازت مل ہی گئی۔ اب پروگرام پکا تھا۔

دونوں سہیلیوں کو گھومنے پھرنے، کھانے پینے کا ایسا چسکا پڑا تھا کہ جس کا نشہ اترنے کا نام نہیں لے رہا تھا، والدین کی عزت کو ایک طرف رکھ کر وہ بڑی آزادی سے خود ہی اپنے حقوق کا استحصال کررہی تھیں۔

جمعہ کی شام فلم شو کے اختتام پر اشعر اور جبران نے دونوں سہیلیوں کو کوچنگ سینٹر کے گیٹ پر اتارا۔ وہ دونوں اپنی پریکٹیکل کی کلاس میں بروقت پہنچ گئی تھیں۔

نائلہ اور عالیہ پریکٹیکل کی تیاری میں ایسی مصروف ہوئیں کہ دیکھتے ہی دیکھتے گیارہ بج گئے اور ان کے جانے کا ٹائم ہوگیا۔ کلاس ختم ہوتے ہی وہ دونوں باہر نکلیں تو وہ بوائز اسٹوڈنٹ کے غول کے بیچ بس وہ دو ہی طالبات تھیں، لڑکوں نے جلدی جلدی اپنی موٹر بائیک نکالیں اور جھٹ سے یہ جا اور وہ جا، لینگویج کی آخری کلاس والوں سمیت سب کو جانے کی جلدی تھی۔ کتنوں کو صبح سویرے کالج یا اپنی جاب پر پہنچنا تھا، وہ دونوں بھی ان کے بیچ خراماں خراماں چلتی ہوئی پیڈسٹرین برج تک آگئیں، برج پر سناٹا تھا۔ یہ دونوں شاید اس برج پر اکیلی تھیں، سارے دن کی تھکن اور پریکٹیکل کی تیاری کے باوجود ان پر ایک خماری سی طاری تھی، فلم بہت شاندار تھی، فلم کا آدھا حصہ بنکاک میں فلمایا گیا تھا، گو کہ فلم مکمل پاکستانی ہی تھی مگر ہیرو اور ہیروئن پر فلمائے گئے جذباتی مناظر فلم کی جان تھے۔ فلم کے جاندار گانوں اور اس پر ہیروئن کے بولڈ ڈانس نے حد کردی تھی عالیہ اور نائلہ دونوں کو اس فلم کا ہیرو بھا گیا تھا، دونوں سہیلیاں لڑکوں کو فلم کے ہیرو جیسی ڈریسنگ اور ہیئر اسٹائل رکھنے کا مشورہ دے کر چھیڑتی رہی تھیں۔ وہ دونوں ماحول سے بے خبر خطرے سے بے نیاز ہنستی بولتی خوشی سے سرشار چلی آرہی تھیں کہ پل کی دوسری جانب کی سیڑھیاں اترتے ہی ان پر اچانک ہی اک افتاد آپڑی۔ ابھی انہوں نے آخری سیڑھی پر قدم رکھا ہی تھا

کہ اندھیرے سے دو ہٹے کٹے نوجوان برآمد ہوئے اور دونوں نے ایک ہاتھ سے ان کا منہ دبایا اور دوسرے ہاتھ سے ان کے بازوؤں کو سختی سے جکڑ کر ایک جانب کھینچنا شروع کردیا۔

دونوں سہیلیوں کے لیے یہ اچانک آجانے والی صورتِ حال اس قدر غیر متوقع تھی کہ ان کی تو سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ ہوا کیا ہے، گھڑی بھر کے لیے تو دونوں پر سکتہ سا طاری ہوگیا تھا، پھر جب کچھ اوسان بحال ہوئے تو سمجھ آیا کہ انہیں زبردستی اغوا کیا جارہا ہے۔

وہ دونوں کمزور لڑکیاں ان مسٹنڈے نوجوانوں کے سامنے کچھ بھی نہیں تھیں، پھر بھی بھرپور مزاحمت کررہی تھیں عالیہ بہت دلیر اور تیز طرار بنتی تھی مگر اب کچھ بھی نہ کرپارہی تھی۔ اس وقت وہاں سناٹا تھا، اکا دکا راہگیروں اور پل کی دوسری جانب چند پان شاپ اور ایک دو بند ہوتی دکانوں میں چند ایک گاہکوں کے کچھ نہ تھا۔

سروس روڈ پر ان بدمعاشوں نے اپنی گاڑی کھڑی کر رکھی تھی۔ قریب تھا کہ وہ بدمعاش ان کمزور لڑکیوں پر قابو پا کر انہیں اپنی گاڑی میں دھکیل دینے میں کامیاب ہوجاتے کہ ایک عجیب سی بات ہوئی۔

پل کے نیچے سے کسی نے انہیں للکارا۔ ''اے چھوڑ دو۔ چھوڑ دو ان بچیوں کو...... کمینو...... حرامزادو......''

اتنے لوگوں میں کسی نے ان کو للکارہ تھا تو وہ بھی ایک خسرے نے۔ اس نے اندھیرے میں پل کے نیچے سے اچانک نکل کر بڑھک لگائی تھی۔

یہ وہی خسرا تھا جو مجھے اکثر تنگ کیا کرتا تھا اور جسے آخری بار میں نے اس بری طرح جھاڑا تھا کہ پھر وہ میرے سامنے نہیں آیا تھا، اس خسرے نے اس پل کے نیچے سردی کی راتیں گزارنے کے لیے اپنا نیا ٹھکانا بنایا تھا۔

اللہ کی شان کہ اس خسرے نے خدائی امداد کے مصداق ایسی انٹری دی کہ ان اوباشوں کی گرفت لڑکیوں پر کچھ ڈھیلی ہوگئی اور لڑکیاں جو مسلسل زور آزمائی اور مزاحمت کررہی تھیں ان کی گرفت سے کچھ دیر کے لیے آزاد ہوگئیں۔

''چھوڑ دو بے غیرتو بچیوں کو اب ہاتھ نہ لگانا دوبارہ۔'' وہ خسرا آگے بڑھتا چلا آیا۔

''پیچھے ہٹ۔'' اسلحہ بردار غنڈے نے غراتے ہوئے خبردار کیا۔

''دفعہ ہو جا ہیجڑے کی اولاد...... ورنہ ابھی ٹھوک دوں گا۔'' دوسرے نے دھمکایا۔

''ہیجڑا ہوں تو کیا ہوا۔ میرے ساتھ میرا اللہ تو ہے نا۔'' خسرے نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اب میری لاش پر سے لے کر جانا ان بچیوں کو۔'' اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر تالی پیٹتے ہوئے ان اوباشوں کو کھلا چیلنج دیا۔ اس ہیجڑے میں نہ جانے کہاں سے اتنی دلیری آگئی تھی کہ وہ نتائج سے بے پرواہ ہوکر ان کے سامنے ڈٹ گیا تھا۔

چند لمحوں کے اندر اس خسرے نے ان اوباشوں کی توجہ ان بچیوں پر سے ہٹا دی تھی۔ بچیاں اپنے ہاتھ چھڑا کر آزاد ہوچکی تھیں۔ وہ خسرا اب بچیوں اور اوباشوں کے بیچ میں آکھڑا ہوا تھا۔

''تیری یہ جرأت۔'' ایک اوباش نے اپنا ریوالور سیدھا کرتے ہوئے اس کا رخ خسرے کی طرف کیا۔

خسرے نے اچانک ہی بڑی تیزی سے لات گھمائی کہ وہ بدمعاش اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور پلٹ کر پیچھے جا گرا اور ساتھ ہی اس کا ریوالور بھی اس کے ہاتھ سے نکل کر نیچے گر پڑا۔ یہ سب کچھ اتنا غیر متوقع تھا کہ اس کے دوسرے ساتھی ہکا بکا سے رہ گئے۔

''تم بھاگو میری بچیو بھاگو۔ اللہ تمہارا نگہبان۔''، یہ لمحاتی سا دورانیہ تھا۔ اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے خسرے نے بچیوں کو بھاگ جانے کا اشارہ کیا۔

اسی دوران شاید سڑک پر موجود اکا دکا راہگیروں نے بھی ہمت کر کے شور مچادیا۔

لڑکیوں نے موقع غنیمت جان کر سامنے دوڑ لگادی۔ سڑک پر کافی ہلچل مچ چکی تھی، ان اوباشوں کا ایک ساتھی نیچے گرا ہوا تھا اور لوگ مسلسل شور مچارہے تھے۔ اس پورے معاملے میں وہ مذکورہ نوجوان کار سے باہر نہ نکلا تھا، طے یہی ہوا تھا کہ وہ ان دونوں سہیلیوں کی نشاندہی کر کے گاڑی میں بیٹھا رہے گا اور باقی کام اس کے دوست سنبھال لیں گے، ایک تو وہ اس طرح کے مجرمانہ کاموں کا عادی نہ تھا اور اس پر بگڑتی ہوئی صورتِ حال پر وہ کچھ خوفزدہ سا ہورہا تھا۔ وہ کچھ کرنے کی بجائے بس اب اپنے دوستوں کو مسلسل واپسی کا مشورہ دے رہا تھا۔

وہ بھی کچھ گھبرا سے گئے تھے، دونوں لڑکیاں ان کی گرفت سے آزاد ہوکر بھاگ چکی تھیں صورتِ حال بدل چکی تھی اور جو لوگ پہلے وہاں ان کے اسلحے سے ڈر کر دبک گئے

تھے وہ بھی اب محتاط انداز میں شور مچاتے نزدیک آتے جا رہے تھے ان غنڈوں نے لوگوں کو ڈرانے کے لیے ایک دو ہوائی فائر کیے اپنے گرے ہوئے ساتھی کو اٹھایا۔ گاڑی اسٹارٹ کی اور وہاں سے بھاگنے ہی میں اپنی عافیت سمجھی۔

عجیب معاملہ ہو گیا تھا۔ وہ غنڈے ان بچیوں کو اٹھانے آئے تھے اور ناکام ہو کر بھاگ رہے تھے۔ وہ خسرا اب ان کی گاڑی کے سامنے بڑی بے خوفی سے کھڑا تالیاں پیٹ پیٹ کر انہیں بددعائیں دے رہا تھا۔ وہ نوجوان جو خسرے کی لات کھا کر گرا تھا وہ کار میں بیٹھا خفت اور شرمندگی کے بعد اب بڑی نفرت اور غیظ وغضب بھری نگاہوں سے اس خسرے کو دیکھ رہا تھا۔

وہ کار تھوڑی آگے گئی کہ پھر تیزی سے ریورس ہوئی اور عین اس خسرے کے سامنے آکر گاڑی کے اندر سے لگاتار پانچ چھ فائر ہوئے اور پھر وہ کار آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔

جب تک لوگ نزدیک پہنچے، وہ خسرا اپنا سینہ پکڑ کر زمین پر گر چکا تھا۔

کسی نے فوراً ایمبولنس اور پولیس کو فون کر دیا۔ جب تک ایمبولنس وہاں تک پہنچی وہ خسرا اپنی آخری سانسیں لے رہا تھا، اسے غالباً تین سے چار گولیاں سینے پر لگی تھیں۔ وہ دونوں سہیلیاں وہاں سے کچھ دور سہمی ہوئی کھڑی روئے جا رہی تھیں۔ کچھ لوگ انہیں دلاسہ اور تسلیاں دے رہے تھے۔

آج ان کی جان و عزت اس خسرے کی وجہ سے بچ گئی تھی، وہ ان کا محسن تھا۔ نائلہ نے اس دوران اس کو پہچان لیا تھا، وہ جب بھی اسے کھانا یا کچھ خیرات دیا کرتی تھی تو وہ اسے بڑی دعائیں دیا کرتا تھا۔

وہ خسرا اسپتال پہنچنے سے پہلے ہی دم توڑ چکا تھا، بعد میں لوگوں نے بتایا کہ اپنے آخری لمحات میں وہ اکھڑی ہوئی سانسوں میں کہہ رہا تھا، ہمیں گلے تو لگاتے۔ ہمارے جنازے کو کندھا ہی دے دینا، کندھا دے دینا۔ وہ عالم نزع میں بس یہی گردان کیے جا رہا تھا۔

☆☆☆

پولیس حسب معمول وہاں تاخیر سے پہنچی تھی، وہاں اندھیرے میں کسی نے گاڑی کے نمبر پر دھیان نہیں دیا تھا۔ نائلہ کی زبانی ہمیں سارے واقعے کا علم ہوا اس نے گھر پہنچ کر بعد میں جب ہمیں ساری کہانی سنائی تھی، میرے پے در پے سوالات نے باقی کہانی بھی سامنے لا دی تھی اور مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا تھا۔ قصوروار ہم بھی تھے جنہوں نے ان پر مناسب نظر نہ رکھی تھی، میری اکتاہٹ اور گھر کے کاموں سے جان چھڑانا اس کا سبب بنا اور جس کا نتیجہ بھگت رہے تھے،، بدنامی سے بچنے کے لیے بہتری اسی میں تھی کہ اس معاملے میں اپنی زبان بند ہی رکھی جاتی۔ عینی شاہدین کی زبانی مجھے پتا چلا کہ ان بچیوں کی عزت و جان کی قیمت اسی خسرے نے اپنی جان دے کر چکائی ہے۔ مجھ پر شرمندگی طاری تھی اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا، پھر بھی میں نے اس خیراتی ادارے کو جس نے اس خسرے کی میت وصول کی تھی وہاں جا کر انہیں پیش کش کی کہ اس خسرے کی تدفین کے سارے اخراجات میں برداشت کروں گا، مزید برآں یہ کہ اس کا جنازہ بھی عام لوگوں اور دیگر مسلمانوں کی طرح اٹھایا جائے گا۔ گھر آنے سے پہلے میں نے فیصلہ کر لیا تھا۔

آج تک کسی نے ایسا دیکھا نہ سنا جو آج ہونے جا رہا تھا، جس کسی نے بھی یہ سنا حیرت سے کہنے والے کا بس منہ دیکھتا ہی رہ گیا، بات ہی کچھ انوکھی نرالی سی تھی مگر تھی ایک دم سچی...... بچپن سے یہی سنتے آرہے ہیں کہ کبھی کسی نے خسرے کا جنازہ نہیں دیکھا ہے، آج جب مسجد سے یہ اعلان لوگوں نے اپنے کانوں سے سن لیا تو انہیں یقین آیا کہ یہ انہونی سی بات ہونے جا رہی تھی۔

میں نے مولوی صاحب سے شرعی رائے لی تھی، انہوں نے بخوشی اس بات کی اجازت دی، شرعی طور پر جنس کے تعین کے لیے کچھ احکامات دیئے، میت کو غسل دینے والے کو آگاہ کیا۔ غسل دینے والے نے معائنہ کیا تو قریب تر جنس کا تعین ہو گیا۔ مولوی صاحب نے بتایا کہ اس دنیا میں جو بھی مسلمان پیدا ہوا ہے یا مرتے وقت مسلمان تھا اس کی نماز جنازہ فرض ہے۔ بحر حال اس خسرے کو اسلامی طریقے سے مقامی قبرستان میں ہی دفن کیا گیا، اس کے جنازے کو کاندھا دینے والے بھی کافی لوگ تھے، اس کا نام تو پتا نہیں تھا مگر میں نے ایک کتبہ بنوا کر اس پر یہ عبارت لکھوالی تھی کہ ”اس جگہ ایک انسان دوست سو رہا ہے“۔

قبرستان سے واپسی پر اچانک بادل گھر آنے لگے، ہلکی ہلکی بوندا باندی سی شروع ہو گئی تھی، ٹپ ٹپ کرتی بوندوں نے کچھ ہی دیر میں بارش کی صورت اختیار کر لی تو یوں لگا کہ جیسے اپنی جان گنوا کر میری عزت بچانے والے اس محسن کی موت پر آسمان بھی رو پڑا ہو۔